READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

سسپنس ڈائجسٹ

انشائیہ — جون ایلیا — 07
تختِ شاہی کے انتخابِ رات واثرات کا مشاہدہ

آپ کے خط — مدیرہ علی — 08
سسپنس کی محفل مشاورت میں قارئین کی تیکھی، شیریں باتیں، گلے شکوے اور پرخلوص مشورے

سلسلے وراثت کے — ڈاکٹر ساجد امجد — 16
ماضی کا آئینہ... بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

سزا — تنویر ریاض — 65
خونی رشتوں کی محبت اور تحفظ کا خوبصورت اظہار

شیش محل — اسماء قادری — 76
اسرار و تحیر کے پردوں میں لپٹی سطر سطر رنگ بدلتی وارداتوں کی عجیب داستان

درپردہ — کبیر عباسی — 109
گن گن کر نیکیاں کرنے والوں کی ان دیکھی بدی کا احوال

نشانہ — شکر لطیف — 115
جرائم کی دنیا میں رشتوں کے بیوپار کا گورکھ دھندا

تقاضائے انصاف — مرزا امجد بیگ — 126
انصاف کے تقاضوں کو سمجھنے والوں کی عقل کا دلچسپ مظاہرہ

جلد 47 • شمارہ 07 جولائی 2017 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 فون [illegible] E-mail: [illegible]

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

www.paksociety.com

دوسرا دشمن
159 ثمر عباس
معاشرے میں انسان سے دوری
اور جانوروں سے محبت کا دہرا معیار

محفلِ شعر و سخن
172 قارئین
آپ کے ہاتھوں سجی ایک انجمن رنگ رنگ
آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

اعتماد شکن
175 ظفر اقبال ظفر
اس ہم سفر کا قصہ جسے سفر کی فکر تھی اور نہ ہی ہم سفر کی

وقت
182 حسام بٹ
ایک جرائم باز کی بازی گری... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک طویل داستان

بُری عورت
219 مہتاب خان
ٹوٹے ہوئے گھروں کے بکھرے ہوئے رشتوں کا المیہ

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
231 ضیا تسنیم بلگرامی
دنیا کو ٹھکرانے والے اور آزمائشوں میں خوش رہنے والے ایک ولی کا قصہ

آنکھیں
243 منظر اسلم
"دیکھنے والو! آنکھیں بڑی نعمت ہیں..." ایک نابینا کا فسانہ

غرقِ محبت
246 طلعت جاوید مغل
روح کو روح سے میل تال اور محبتوں کے مثالی اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسین • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

انشائیہ

جون ایلیا

بادشاہ گر

جانے کس ستم ظریف نے کب اور کہاں نوکر شاہی کا لفظ ایجاد و اختراع کیا تھا۔ اس ستم ظریف موجد اور مخترع کے وہم وگمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہ لفظ یا وہ دو لفظی مرکب شہنشاہوں، شاہوں اور حکمرانوں اور شانوں پر پیر تسمہ پا بن کر سوار ہو جائے گا اور سکہ چاہے کسی بھی بادشاہ کا چلے اور شاہی چاہے کسی بھی خاندان کی ہو مگر ''حکومت'' نوکر شاہی کے قبضے ہی میں رہے گی۔

جسے اس بات پر شک ہو اور جو اس بیان پر یقین کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس کرتا ہو، وہ تاریخ اٹھائے اور وزیروں اور ''امیروں'' کا جاہ وجلال اور اوج کمال دیکھے۔ یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی ہیں کہ ان کے تزک واحتشام کے سامنے ہارون الرشید کا اہتمام اور انصرام ماند پڑ جاتا ہے اور وہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ آخر کار جعفر برمکی کا سر قلم کرا کے اور اس کے باپ یحییٰ برمکی کو تباہی کا نشانہ بنا کر ہی ہارون ان دونوں باپ بیٹوں سے نجات پاتا ہے اور حقیقی معنوں میں ''خلیفہ ہارون رشید'' کی حیثیت حاصل کرتا ہے۔

ابوالفضل اور فیضی ہیں کہ ان کے اثر رسوخ کے آگے مہابلی اکبر کے نورعین شہزادہ سلیم کی ایک نہیں چلتی، یہاں تک کہ اسے ابوالفضل سے گلوخلاصی حاصل کرنے کے لیے قاتل کے خنجر آبدار کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہم یحییٰ برمکی، جعفر برمکی اور ابوالفضل اور فیضی کے علمی مرتبے کے منکر نہیں ہیں اور ان کی عظمت مسلم ہے۔ ہم تو صرف نوکر شاہی کے تعلق سے ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

سیدان بادشاہ گر ہیں کہ جسے چاہیں تخت پر بٹھائیں اور جسے چاہیں تخت سے اتار دیں۔ انہی کے اشارے سے زندگی کے چراغ گل ہوتے ہیں اور انہی کے اشارے سے شہزادے آزاد زندگی کا سانس لیتے ہیں۔

ہم چند صدیوں ہی کی تاریخ کو کیوں دیکھیں۔ دو ہزار، تین ہزار اور چار پانچ ہزار برس پہلے کے دور پر نظر ڈالیں۔ فراعنہ ہوں یا قیصر وکسریٰ کے پُرجلال دربار، ہر جگہ اور ہر بارگاہ عالی میں وزیران باتدبیر اور امیران باتوقیر اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والی نوکر شاہی کی حکومت نظر آئے گی۔ ٹکسالوں میں سکہ شاہوں کے نام کا ڈھلتا ہے اور سلطنت میں حکم ان کی نوکر شاہی کا چلتا ہے۔

شہنشاہی اور نوکر شاہی کی ناک میں اگر نکیل ڈالی تو وہ جمہوریت نے ڈالی لیکن یہ وہیں ممکن ہو سکا جہاں واقعی عوام کی مرضی اور منشا سے حکومتیں بنتی اور بدلتی ہیں اور جن کی ناخوشی اور برہمی سے ایوان ہائے حکومت اور اورنگ ہائے سلطنت لرزہ براندام ہوتے ہیں۔

ہم نے یہ ملک جمہوریت کے نام پر بنایا تھا لیکن نوکر شاہی سے تعلق رکھنے والے ایک ''غلام'' نے اس جمہوریت کا گلا ایسا گھونٹا کہ پھر وہ ڈھنگ سے پنپ نہ پائی۔ اب ہمارے یہاں جمہوریت کے نام پر جو انتشار پھیلا ہوا ہے، اس نے نوکر شاہی کو بے لگام کر دیا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا اہلکار جسے چاہے نہال کر دے اور جسے چاہے اسے عبرت ناک زوال کا نمونہ بنا دے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کی حرمت کو چاہے تار تار کر ڈالے۔ کوئی بھی نہیں ہے جو ان کی دست برد سے محفوظ ہو۔ ان کے نزدیک کسی کی بھی شخصیت اور آبرومندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

ایسی صورتِ حال، ایسی وحشت ناک اور دہشت ناک صورتِ حال کسی بھی جمہوری حکومت کو راس نہیں آتی۔ راس آ ہی نہیں سکتی اور کوئی بھی منتخب حکمران دوبارہ عوام کے دربار میں بار نہیں پاتا۔ اس لیے اپنے حکمرانوں سے ہماری استدعا ہے کہ وہ نوکر شاہی کو اپنے قابو میں لائیں، اس کے تابع مہمل بن کے نہ رہیں۔ اسی میں حکمرانوں کی بقا ہے اور اسی میں عوام کی بہبود ہے۔

یہاں ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ نوکر شاہی کوئی قومی پس منظر نہیں رکھتی۔ یہ تو انگریزی سامراج کا ''کرم پرورانہ'' تحفہ ہے جس سے ہمیں نوازا گیا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو عوام کا طبق الٹنے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ اس گروہ کو اس کی حد میں رکھا جائے اور اسے آزاد اور جمہوری معاشرے کے آداب سکھائے جائیں۔ یہی ملک اور قوم کے لیے نسخۂ نجات ہے۔

☆☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آپ کے خط

عزیزانِ من!
السلام علیکم!

جولائی 2017ء کا شمارہ ماہِ رمضان کے دوران شائع ہو رہا ہے۔ جب سارا پاکستان رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں سے فیض اٹھانے اور عبادت و ریاضت کو مکمل یکسوئی اور ذہنی و قلبی سکون کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے لوڈ شیڈنگ کے مصنوعی بحران میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے میں چڑچڑاپن، نیند کی کمی اور موسمِ گرما کی گرماگرمی نے اچھے بھلے انسان کو بھی بداخلاق اور بیزار طبیعت بنا ڈالا ہے۔ ساری دنیا کے ممالک اپنے اپنے مذہبی تہواروں اور خاص ایام میں عوام کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ہم جو دین اسلام پر چلنے والے ہیں کتنی بے حسی سے اپنوں کو جہنم میں جھونکنے کا سبب بنتے جا رہے ہیں۔ مہنگائی تو ہے ہی اپنی جگہ مسلم لیکن بجلی فراہم کرنے والے اداروں اور ہمارے قائدین اور بااختیار طبقے کی بے حسی اور بے توجہی نے تمام شہریوں کو اچھے دنوں کی امید سے متنفر کر دیا ہے۔ آخر کب تک عوام کو ان مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کون سنے فریاد ان کی...... اندھیر نگری اور چوپٹ راج شاید اسی کو کہتے ہیں۔ گورنمنٹ چاہے کوئی بھی ہو ہمیشہ عوام کو مسائل کا تحفہ ہی دیا ہے۔ کبھی کسی نے انہیں خلوصِ نیت سے حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دوسری جانب رمضان المبارک کی آمد پر ملک کے مختلف علاقوں سے گداگروں کے قافلے کے قافلے بڑے بڑے شہروں میں منتقل ہو کر شہریوں کی زندگی کو اجیرن کرنے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ کیا ان کی روک تھام کے لیے کوئی اصول، کوئی قانون نہیں ہے کہ اس طرح منشیات سمیت کئی جرائم میں نہ صرف اضافہ ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ مقامی شہریوں کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر الگ...... ایسے میں ان کے لیے فٹ پاتھ بہترین رہائش گاہ بن کر معاشرے کی عجیب منظرکشی کرتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس چمن کا مالی خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔ ٹیکسوں کی مد میں عوام کو لوٹنے والے بھلا عوام کو بدلے میں کیا سہولت اور سکون دے رہے ہیں...... مگر اس سوال کا جواب کسی سیاستدان، کسی افسر یا طبقہ اشرافیہ میں سے کسی کے پاس نہیں ہوگا۔ خیر یہ تو کچھ تلخ حقائق تھے جن پر کب سے لکھا اور بولا جا رہا ہے مگر...... رمضان المبارک کے بعد عید کے خوشگوار لمحات کے لیے تمام مسلمان منتظر ہوتے ہیں۔ حکومت چاہے کتنی ہی بے حس ہو جائے مگر عید کے ان لمحات میں ہمیں ہرگز بے حسی کا مظاہرہ نہیں کرنا بلکہ اپنے اردگرد بے شمار حقداروں کو اپنی آمدنی اور سہولیات میں سے کچھ حصہ ان تک بھی پہنچانا ہے تاکہ انہیں بھی چند لمحات خوشی اور بے فکری کے میسر آ جائیں اور اللہ کے یہاں ہمیں سرخروئی بھی مل جائے۔ ادارے کی جانب سے تمام اہالیانِ وطن کو ڈھیروں عید کی مبارک باد...... خوشیاں بانٹنے سے ہی خوشیاں ملتی ہیں اور عزت کرنے سے ہی عزت بھی...... ایک دوسرے کا خیال رکھیے اور اب ذرا رخ موڑیے اپنی اس محفل کی جانب کہ جہاں ہر طبقہ فکر کے لوگ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے بینر تلے یکجا ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ ہمارے ملکی حالات و معاملات میں سدھار پیدا کرے۔ (آمین)

☩ پائندہ خان سلیمان خیل، فیروز وٹواں ضلع شیخوپورہ سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''ماہ جون کا سسپنس ایک دن کی تاخیر سے مل گیا۔ بک اسٹال پر ایک دوست سے ملاقات ہوئی، جو ایک ڈائجسٹ خرید رہا تھا۔ دکاندار نے اس سے 90 روپے لیے۔ میں نے وہ ڈائجسٹ اس سے لے کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ اس کے صفحات بھی سسپنس سے کافی کم ہیں تقریباً 200 صفحات تھے۔ کاغذ بھی انتہائی ناقص تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر اس کی کہانیوں کا سرسری جائزہ لیا تو میں حیران ہو گیا کہ کہانیوں کے نام پر انتہائی واہیات قسم کا مواد تھا۔ میں نے اپنے دوست کو پچھلے ماہ کا سسپنس دیا تو اس نے مجھے کل آ کر بتایا کہ یار آپ نے مجھے سسپنس کا تعارف پہلے کیوں نہیں کروایا۔ اتنا اچھا اور کم قیمت، معیاری کاغذ اور انتہائی اچھی کہانیاں ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ تو سسپنس کی محبت ہے کہ ہمیں کم قیمت میں ملتا ہے ورنہ تو اس کی قیمت جتنی بھی زیادہ ہو اتنی ہی کم ہے۔ (آپ کی محبت کا بہت شکریہ جناب)۔ سب سے پہلے انشائیہ سے آغاز کیا۔ جون صاحب کے انشائیہ پہچان کی اپنی پہچان ہے۔ جون صاحب ٹھیک کہتے ہیں، اگر ہم چوروں کو کوتوال سمجھنا چھوڑ دیں اور قزاقوں کو سالار کارواں سمجھنا چھوڑ دیں اور اچھے برے کی پہچان کریں تو یقینی طور پر یہ معاشرہ سدھر جائے گا۔ اس کے بعد ہم پہنچے اپنی پیاری بزم میں جہاں پیارے دوست ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تو جناب ملاقات ہوئی دوست محمد صاحب سے، جناب کیا کہنے دوست محمد صاحب آتے ہی کرسیِ صدارت پر قبضہ کر لیا ہے۔ مبارک ہو آپ کو۔ یہ آپ سے سسپنس کی محبت ہے جناب۔ پھر جناب ہم نے کرسیِ وزارت کی طرف دیکھا تو محمد صفدر معاویہ صاحب کو براجمان پایا۔ صفدر صاحب آپ کو وزارت مبارک ہو۔ اس کے بعد دوسرے دوستوں کے تبصرے پڑھے۔ اس کے بعد ملاقات ہوئی ڈاکٹر ساجد امجد صاحب سے ''شکن در شکن'' میں، سلطان مسعود نے خود کو محمود کا جانشین صحیح معنوں میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ثابت کر دیا ہے لیکن اس کا انجام انتہائی دردناک ہے۔ اس کو اپنے بھائی پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ اقتدار کے لیے تو بھائی بھی بھائی کو مروا دیتے ہیں۔ اس کے بعد ''شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی'' پڑھی ..... ویلڈن ضیا تسنیم بلگرامی صاحب، شاہ صاحب نے پادری سے مناظرے میں اس کے ناپاک منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ بارش سے متعلق شاہ صاحب کی کرامت نے ایمان تازہ کر دیا۔ باقی واقعات کا بے چینی سے انتظار ہے۔ ''نفس کا قیدی'' میں آخر کار ملک صاحب نے جیلا کے قتل کا اصل محرک معلوم کر لیا۔ شیلا نے حسد میں مبتلا ہو کر اپنے بھائی کا ہی خون کر ڈالا۔ اس کے بعد ''شیش محل'' پڑھی۔ اس قسط میں یہ بات خوشی کا باعث بنی کہ جولیٹ نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا اسلامی نام بھی رکھا گیا یعنی جولیٹ جمیلہ بن گئی۔ اس کے بعد آخری صفحات کی طرف چھلانگ لگائی۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی ہر تحریر ہی دل کو چھو لینے والی ہوتی ہے۔ ''غرقِ محبت'' بہت اچھی تحریر ہے۔ طاہر صاحب نے چوڑیروں کی حویلی کا جو منظر بیان کیا ہے۔ وہ وڈیروں کی حویلیوں کا صحیح عکس ہے۔ وڈیروں اور جاگیرداروں کے عادات و اطوار اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ شاہ فرمان نے اپنے کارندے شیرو کے ذریعے قیمتی باز چرایا اور اس میں شاہ زمان کی بھی ملی بھگت ہے۔ دونوں بھائیوں نے حضور چانڈیو اور شوکت سیال سے جو محاذ آرائی کی ہے، وہ وڈیروں کی بے مقصد دشمنیوں کی صحیح عکاسی ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ دلاور کی سویرا سے محبت کیا رنگ دکھاتی ہے۔ اس کے بعد جس تحریر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ منظر امام صاحب کی ''ایک لمحہ'' ہے۔ ڈاکٹر ذیشان نے محبت کا ادھار چکا کر خود کو اپنی نیچر کی محبتوں کا مقروض کر دیا ہے۔ یہ کہانی محبت کی لازوال تحریر ہے۔ بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ ''رقم کی واپسی'' میں گلور یا نے بڑی چالاکی سے خود کو پاگل بنا کر چوری کی رقم کو چھپایا۔ وسیلہ خاتون کی ''دوراہا'' دلچسپ تحریر ہے۔ کلنٹن نے رینالڈ کے قاتل کو گرفتار کر کے قرض پر غالب نہیں آنے دیا اگرچہ قاتل اس کا محسن بھی تھا۔ ''دوراہا انتقام'' میں جیمز کو اس کی بیوی ریٹی کے قتل کے الزام میں سزا ہوتی ہے۔ اس کا انکشاف کیتھرین نے جیمز کی بے وفائی کی وجہ سے کیا۔ ''نفسیاتی مریض'' کبیر عباسی کی جاندار اور سبق آموز تحریر ہے۔ خدمتِ خلق کا جذبہ رکھنے والے یقیناً نہ تو نفسیاتی مریض ہیں اور نہ احمق ہیں اور جو ایسا سمجھتے ہیں وہ خود نفسیاتی مریض ہیں۔ ''نامراد'' مختصر سی اچھی تحریر ہے۔ امینڈا جیولری بھی چرا نہ سکی اور گرفتار بھی ہو گئی ..... نعمان اسحاق کی تحریر ''فضا'' کوئی خاص تاثر پیدا نہ کر سکی۔ ایم اے راحت کی ''مقصدِ حیات'' ایک بامقصد تحریر ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ منفی ذہنیت سے ہمیشہ نقصان ہوتا ہے اور لالچ ہمیشہ ذلت سے دوچار کرتی ہے۔ فاروق بیگ کا منفی منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اکبر حسین کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ یہ اچھی بات ہے۔ ''محفلِ شعر و سخن'' صفدر صاحب اور نعیم پاشا کے شعر پسند آئے باقی دوستوں کے اشعار بھی اچھے ہیں۔ اس مرتبہ قدرے فرصت تھی تقریباً سارا سسپنس پڑھ لیا۔ ''وقت'' ابھی شروع کی ہے۔ علی گاڑی کے ڈرائیور جس کی مشابہت فریڈی کروگر سے ملتی ہے، سے خوفزدہ نظر آتا ہے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔''

✠ زرین آفریدی حیدر آباد سے شاملِ محفل ہو رہی ہیں۔ ''جب ہمارا یہ تبصرہ پیش ہو گا رمضان کریم کی بابرکت ساعتیں آ چکی ہوں گی۔ (جی بالکل آ گئیں)۔ میری یہ اچھے موسموں کی پیاری دعا ہے کہ رب کریم ہم مسلمانوں پر نظرِ کرم فرمائے اور ہمیں امن و سکون والی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین)۔ ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ جون 2017ء 16 مئی کو مل گیا۔ سرورق بہت بہترین اور ہمارے فیورٹ رنگوں سے مزین تھا۔ پچھلے ماہ ہماری غیر حاضری کی وجہ بینش صدیقی کی شادی خانہ آبادی تھی۔ جو کہ 22 اپریل کو انجام پائی۔ (مبارکاں جی..... مٹھائی کہاں ہے پھر؟) اب بینش صاحبہ ہمیں چھوڑ کر اپنے پیا جی کے ساتھ مستقل سیٹل ہو گئیں۔ لیکن سسپنس ڈائجسٹ کی ذمے داری میرے پر ڈال گئیں کہ دیارِ غیر میں اللہ پاک کے بعد میاں صاحب اور اپنا یہ ڈائجسٹ ہی سہارا ہیں۔ (زبردست)۔ جون سسپنس ڈائجسٹ میں فہرست پر نظر پڑی تو دل خوشی سے جھوم گیا کہ سب پسندیدہ رائٹرز تھے لیکن جب سانحہ ارتحال سامنے آیا تو بے حد دکھ ہوا۔ ہمارے لکھاری ہمارا اثاثہ ہیں۔ یکے بعد دیگرے تین عظیم لکھاری ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔ ایم اے راحت صاحب بہت عظیم انسان اور بہترین مصنف تھے۔ یہ ہم سب قارئین کا بڑا نقصان ہے۔ اللہ سائیں ان کو غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔ یہ اداریے نے بہت اچھا کیا کہ ان کی تحریر بھی اس شمارے میں شامل کی۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب ہمیں اچھے اور برے کی پہچان بتا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ وہ ہمیں حق و باطل، صحیح و غلط اور اچھے، برے کی پہچان دے۔ ان کا یہ پیرا دل آفرین لگا کہ سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ پہچان سے کام لو اور صیادوں کو بانہاں نہ سمجھو۔ یہ تمہاری آزادی کے بیری ہیں، یہ لوگ اپنے سوا سب کو دل گیر اور اسیر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں ان کا عیش اور آسائش ہے سو پہچان سے کام لو اور ان کے کسی بھی دھوکے میں نہ آؤ۔ اداریہ بھی ہمارے دل کو لگا۔ پاکستان اور پاکستانیوں کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کبھی کبھی تو اپنے پاکستانی ہونے پر شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ (یہ سوچنا غلط ہے) اپنی محفل میں داخل ہوئے تو دوست محمد بھائی کو کرسی صدارت پر پایا۔ تبصرہ واقعی شاندار تھا، مبارک باد۔ اس سے پہلے می کے شمارے میں عامر خان آفریدی بھائی کو دیکھ کر بھی بہت خوشی ہوئی۔ محمد صفدر بھائی بہترین وزارت دے رہے تھے۔ طاہرہ گلزار جی کا تبصرہ کچھ الگ انداز لیے ہوئے تھا جیسے ان کا تبصرہ کسی اور نے لکھا ہو، عامر آفریدی بھائی کی طرح۔ تبصرہ کافی مثبت انداز میں تھا۔ ناہید یوسف جی کے ہر تبصرے میں کھانے کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بہت ذکر ہوتا ہے، ہاں بھائی کیوں نہ ہو اسلام آباد سے جو ہو، کیونکہ اسلام آباد والے ویسے بھی کھانے کے شیر ہیں لکڑ ہضم، پتھر ہضم۔ عوام بیچاری دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مہتاب احمد بھائی آپ حیدرآباد کے کون سے علاقے میں رہتے ہیں۔ رانا حبیب کے تبصرے میں کوئی نہ کوئی بات انوکھی ضرور ہوتی ہے۔ اب شادیوں پر ریسرچ شروع کردی۔ مہیش کمار بھی اچھا تبصرہ کرنے میں کامیاب رہے۔ مراسلے کا ٹھیکا تو ادارہ سسپنس نے وزیر خان، بٹل کو دیا ہوا ہے۔ (تو یہ ٹھیکا آپ لے لیں ...... آپ کو کس نے روکا ہے؟) محفل شعر و سخن میں تینوں اعزازی اور رعنا رضوی عنبرین لاشاری، اختر پرویز، اسما فیصل، عاصم خان کے انتخاب قابلِ تحسین رہے۔ غرق محبت کا پچھلے ماہ سے انتظار شروع ہوگیا تھا۔ رسالہ ہاتھ میں آتے ہی آخری صفحات پر نظر ڈالی۔ جب پڑھنا شروع کیا تو کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ طاہر جاوید مغل صاحب زندہ باد...... سطر سطر سحر طاری ہوتا گیا۔ ایسا لگا ہمارے سامنے موو ی چل رہی ہو۔ کردار دلاور، جیسا نام ویسا کام۔ سویرا، حویلی کا ماحول، سب بہت ہی زبردست۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ شکن در شکن، ڈاکٹر ساجد امجد صاحب بہت اعلیٰ لکھتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے بیٹوں ... امیر محمد اور مسعود کی لازوال داستان بے حد متاثر کن رہی۔ تاج و تخت کا حصول انسان کو مرواتا آیا ہے۔ نفس کا قیدی، ملک صفدر حیات صاحب اور حسام بٹ کی عمدہ کاوش، زر، زمین اور زن کا مسئلہ ازل سے جاری و ساری ہے۔ نبیلہ کے حصول کی خاطر شکیل نے سگے بھائی جمیل کا بے دردی سے قتل کردیا۔ ملک صاحب بھی بال کی کھال اتارنے والے بندے ہیں۔ اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہنے والے مصنف کے مقصد حیات، ایم اے راحت صاحب کو خراج تحسین ہے۔ سسپنس ادارہ ہم قارئین کے جذبات کو سمجھتا ہے بہت شکریہ، کہانی بھی لاجواب تھی۔ منصور اور شاہ میر جیسے بے روزگار نوجوان نوکری کے لیے ہاتھ پاؤں مار کر کچھ نہ کچھ تو حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ فاروق بیگ اور اکبر حسین کا تعلق بھی خوب رہا۔ ایک لمحہ اور منظر امام صاحب مختصر لیکن جذبات سے بھرپور، احسان اتارنا اور ادھار واپس کرنا بڑے دل والوں کا کام ہے جیسے ڈاکٹر ذیشان نے اپنی ٹیچر پر کیا ویلڈن سر۔ سلیم انور صاحب کی نامراد میں رائٹرز کے بیچ حسد و رقابت میں امینڈا اور جیکسی کی دوستی بھی داؤ پر لگ گئی۔ امینڈا کی چوری پکڑی گئی اور شرمسار ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے روح پرور حالات و واقعات پڑھ کر دلی سکون حاصل ہوا۔ جزائے خیر ضیاء تسنیم بلگرامی۔ رقم کی واپسی تنویر ریاض اچھی اسٹوری رہی۔ بیٹی کی جگہ ماں اچھی سراغ رساں ثابت ہوئی۔ کبیر عباسی صاحب کی نفسیاتی مریض بھی متاثر کرگئی۔ دوسروں کو سائیکو سمجھنے والے خود نفسیاتی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ شیش محل اور اسما قادری جی ویلڈن ...... داستان اپنے پورے جوبن پر ہے۔ آخر کار جولیٹ کو اپنے شکار کا سراغ مل ہی گیا۔ اب وہ اپنے انجام تک بھی پہنچ جائے گا۔ وقت اور حسام بٹ صاحب کا تو وقت چل رہا ہے۔ یہ داستان بھی سپر ڈوپر چل رہی ہے، کیا کہنے لاجواب...... جون 2017ء کا سسپنس ڈائجسٹ تو سر سے لے کر پاؤں تک سج دھج کر ہمیں ملا۔ پورا ڈائجسٹ صفاچٹ کرلیا کہ آگے رمضان کریم کی نیک ساعتیں آرہی ہیں جس میں صرف عبادات ہی عبادات ہوں گی۔ (ماشاءاللہ...... ہم بھی آپ کی دعاؤں کے طالب ہیں)۔''

✠ مسز صدیقی کا کراچی سے مئی کے شمارے پر تبصرہ۔ ''پچھلے دنوں چشمے کا نمبر بڑھ گیا اس وجہ سے کافی دیر سے تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ امید ہے بیٹی مرحا گل، طاہرہ گلزار، زرین آفریدی، بیٹے ملک صفدر، عبدالغفور، قدرت اللہ سب مزے میں ہوں گے۔ مئی کے شمارے میں کھوٹا سکہ نے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ کیا شاندار کہانی ہے، پڑھ کر مزہ آگیا نام تو نیا تھا مصنفہ کا مگر کہانی زبردست تھی عورت کا انتقام بھی خوب تھی۔ دھیان بھی اچھی تھی۔ اکثر باہر یہ سب ہوتا ہے۔ دھکا بھی اچھی تھی۔ انوکھی قربت الگ رنگ لیے ہوئے دلچسپ لگی۔ ابھی کچھ پڑھنی باقی ہیں۔ سب بیٹے بیٹیوں سے میرے لیے دعا کی درخواست ہے۔ سب کے لیے ہزاروں دعائیں۔''

✠ عبدالجبار رومی انصاری چوہنگ سٹی لاہور سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''پیاسی نگاہوں میں تیرا انتظار ہے۔ سرورق کی من موہنی سی دوشیزہ کے لیے بس اتنا ہی کہوں گا بہت پیاری ہے اور ذاکر انکل کے ہاتھوں کا خوبصورت شاہکار ہے۔ اپنی تحریروں میں ہمیشہ زندہ رہنے والے ایم اے راحت بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کی کہانی ''مقصدِ حیات'' زبردست رہی۔ بیرسٹر کی شاطرانہ منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی اور اکبر حسین کی بند آنکھیں بھی کھل گئیں اور ان کے اپنے خون نے جوش مارا تو سارے حالات و واقعات اس کے حق میں ہوتے چلے گئے۔ باقی منصور اور شاہ میر نے جو ہاتھ پاؤں مارے انہوں نے بہت محظوظ کیا...... جون ایلیا کی پہچان بھی کافی محظوظ کن تھی جو لوگوں کو خاص تاکید سے کہہ رہے ہیں کہ پہچان سے کام لیں۔ دھوکے بازوں، ظالموں اور غلام ذہنوں کے جھانسے میں ہرگز ہرگز نہ آئیں۔ ہاں نا آگے الیکشن بھی آرہے ہیں تو اپنے نمائندوں کو سچ کی بنا پر ووٹ دے کر منتخب کرنا جو پاکستان کی حقیقی نمائندگی کریں اور دشمن کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات کرنے والے ہوں۔ بہرحال پہچان کو مدنظر رکھیں۔ حکمرانوں کے بلند و بانگ دعوؤں کے باوجود، لوڈشیڈنگ، پانی کی کمیابی اور بے روزگاری تو جوں کی توں موجود ہے خیر سبھی قارئین کو رمضان کریم مبارک ہو۔ دوست محمد کا عمدہ اور صدارتی تبصرہ لائقِ تحسین رہا۔ اسی طرح بھائی محمد صفدر معاویہ نے بھی بھرپور انداز اپنایا اور سویٹ دوست طاہرہ گلزار بھی اپنے عمدہ تبصرے کے ساتھ خوشی سے مسرور دکھائی دیں۔ باقی سب نے بھی عمدہ تبصرہ نگاری کی ویلڈن۔ راستے کا تعلق چلنے سے ہے بیٹھنے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے نہیں۔ بیٹھا شخص منتظر ہے اور سویا ہوا راہنما ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے زبردست جواب نے ریذیڈنٹ کو پریشان کردیا۔ اہلِ ایمان اور اولیاء اللہ کی یہی شان ہے کہ وہ باطل کے سوالوں کا حق کے ساتھ ایمان افروز جواب دیتے ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر نے سماں باندھ دیا۔ ایسی ہی تحریروں کے بقیات پڑھنے کو دل شدت سے منتظر ہوتا ہے اور ہمیں بھی اس کی اگلی تحریر کا انتظار ہے۔ غزنوی کے بیٹے مسعود غزنوی نے بھی اپنے عہد کو یادگار بنادیا جو مسلسل سرکشوں کے ساتھ نبرد آزما رہا اور کبھی ہمت نہیں ہاری۔ مردِ مجاہد سلطان مسعود تو ہمیشہ ثابت قدم رہا مگر اس کی فوج آخر ہمت ہار بیٹھی۔ محترم ڈاکٹر ساجد امجد کی تاریخی کہانی زبردست رہی۔ کبھی کبھی ایک فیصلہ انسان کی پوری زندگی بدل دیتا ہے ایسے ہی شیش محل کی خوبصورت دوشیزہ نے اپنے لیے ایک اچھا فیصلہ کیا اور جولیٹ سے جمیلہ بن گئی اور زندگی ایک دم پُرسکون ہوگئی۔ اس کی ہمراز چاند بانو کی خوشی بھی دیدنی ہے۔ کہانی میں اب کے روانی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ نفس کا قیدی شیلا چھپا رستم بن رہا تھا مگر کب تک۔ ملک صاحب کڑی سے کڑی ملا کر آخر اس تک پہنچ گئے۔ حسد اور جلن نے شیلا سے بھائی کو مروادیا تو شیلا کے انجام کے ساتھ شیطان بابا بھی انجام کو پہنچے۔ یہ شیطان کے چیلے عامل ہر دور میں عام عوام کو بے وقوف بناتے آرہے ہیں اور جن سے گھناؤنے جرائم کا انکشاف ہوتا ہے جیسے ابھی حال ہی میں سرگودھا کا واقعہ خون کے آنسو رلا دینے والا تھا۔ جانے کب ایسے عوامل سے جان چھوٹے گی۔ انسان کی اہم چیز ضرورت ہے جسے پورا کرنے کو وہ دوستی بھی کرتا ہے اور محبت بھی۔ ڈیلفینا نے تو علی کو بتادیا۔ اب دیکھتے ہیں علی کو کتنا وقت لگتا ہے ڈیلفینا اور اس کی کمپنی کو سمجھنے میں جو پہلے ہی اس کی پراسرار شخصیت سے محوِ حیرت ہے۔ بس ہم بھی دیکھتے ہیں وقت اس کے ساتھ کیسی چال چلتا ہے اور ابھی تو وقت زبردست جا رہی ہے۔ غرق محبت جو دلاور کے لیے لیلیٰ دی بانک ثابت ہو رہی ہے پہلا حصہ زبردست رہا۔ بہت پسند آئی کہانی۔ روہی کے وڈیروں کی دھاک کہاں تک بیٹھتی ہے، یہ آگے چل کے پتا چل جائے گا ابھی تو دلاور میاں سویرا کی شادی سے ہی افسردہ نظر آرہے ہیں اور سویرا اپنے وڈیرے شوہر شاہ زمان سے افسردہ ہیں۔ رن رنگیلڑی روہی میں غرق محبت کی اگلی تحریر کا شدت سے منتظر ہوں۔ محفل شعر و سخن سے عنبرین لاشاری، ریاض بٹ، سائرہ نواب اور مہتاب احمد کے شعر زبردست رہے۔''

✠ **اشفاق شاہین** لاہور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''سسپنس اس بار بھی بروقت ہی مل گیا۔ سرورق کوئی خاص پسند نہ آیا۔ اداریے پر پہنچے۔ پہچان میں بہت عمدہ طریقے سے انہوں نے ہمیں اپنے اندر چھپے اوصاف کو نمایاں کرنے کی سعی کی لیکن دراصل ہم غلامانہ ذہن کی پیداوار ہیں، جب تک ہم اپنے اندر چھپے، جو معصوموں کی کھال میں بھیڑیے ہیں ان کو تختہ دار تک نہیں پہنچائیں گے، یہ سب ہمارا مقدر بنتا رہے گا یعنی غلامی۔ محفل میں پہنچے، میرا خط اس بار واقعتاً ہی راستہ بھول گیا شاید۔ بہرحال دوست محمد کرسی صدارت پر براجمان، بہت مبارک ہو۔ صفدر معاویہ، طاہرہ گلزار، عبدالجبار رومی، پائندہ خان، ناہید یوسف، مہتاب احمد، رانا حبیب بہترین تبصروں کے ساتھ محفل کی شان تھے۔ حسبِ معمول سب سے پہلے ایک ہی نشست میں شیش محل سے دو دو ہاتھ کیے۔ تحریر میں تیزی بھی آگئی۔ فاروق اب اپنے بڑوں سے ملے گا تو یقیناً جمیلہ کے ساتھ چاند بانو بھی ہوگی دیکھو اب کیا تکون بنے گی۔ راٹھور انجام کو پہنچا لیکن فاروق اپنے آبا و اجداد کی پامالی پر ازحد دکھی ہوا۔ کہانی اب انجام کی جانب رواں دواں، اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار۔ وقت میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ ڈیلفینا کی زندگی کے پرت کھلنے کے ساتھ اب اسد علی بھی پہلو سے تو بچ گیا اب آخر میں کیا نئی مصیبت آئی دیکھیں اس سے کیسے نمٹتا ہے۔ غرق محبت، لاجواب دلاور کے ساتھ ہاتھ تو ہوگیا، سویرا کی صورت، اب لگتا ہے کہ وہی پھیرو پھر چوری ہوگیا ہے اور یہی ٹاسک دلاور کو سونپا جائے گا۔ بہترین تحریر۔ ایم اے راحت کے مقصد حیات نے بھی ازحد متاثر کیا۔ اس کے انجام نے تو لطف دوبالا کردیا، روبانہ کا کردار دلچسپ رہا۔ نعمان اسحاق کی قضا بھی مختصر مگر پراثر تحریر تھی۔ اچھی لگی۔ دہرا انتقام بھی خوب رہی۔ ہاں مختصر مختصر میں نفسیاتی مریض میں کبیر عباسی نے خوب جوہر دکھائے اپنے قلم کے۔ واقعتاً ہم سب نفسیاتی ہیں جو نارمل ہے وہ ہمیں ابنارمل لگتا ہے۔ ڈاکٹر کی سوچ سے ہم بالکل متفق ہیں۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے۔ نفس کا قیدی ملک صفدر حیات خاص مزہ نہ دے پائی۔ شروع میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ شیلا مجرم ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حالات و کمالات زندگی سے آگاہی ہوئی، معلومات میں بھی اضافہ ہوا۔ محفل شعر و سخن میں انتخاب بہت عمدہ رہا۔ وسیم اکرم، ناہید یوسف، صبا سحر اور جنید احمد ملک کا انتخاب متاثر کن اور لاجواب تھا۔ رمضان کا آغاز ہے، عید کی تیاریاں ہیں۔ تمام احباب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عید مبارک اور ان لمحات میں اپنے اردگرد ان غربا و مساکین کا ضرور خیال رکھیے جو عید کی خوشیوں کو ترس رہے ہوتے ہیں۔''

✠ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ''سب سے پہلے تعزیت، میرے پسندیدہ اور مایہ ناز قلمکار ایم اے راحت صاحب کی رحلت کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ موصوف کی لاتعداد جناتی کہانیاں پڑھ رکھی ہیں۔ تعجب ہے تازہ کہانی ''مقصد حیات'' میں کسی جن پری کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ تازہ کہانی کے عنوان میں مصنف کا نام بھی چھپا ہوا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ راحت صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے...... (آمین) بات تو افسوس کی ہے مگر صبر لازم ہے۔ ایم اے راحت کی کچھ کہانیاں ابھی محفوظ ہیں جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں گی)۔ پچھلے ماہ یہ عاجز شدید علیل تھا، اس لیے محفل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں حاضر نہ ہوسکا معذرت۔ (اللہ آپ کو صحت دے)۔ ماہ جون 2017ء کے سسپنس کا سرورق حسبِ معمول حسبِ روایت دلکش تھا۔ اس بار جون صاحب کا انشائیہ زبردست تھا، کافی ساری نصیحتیں بھی تھیں اور اس پر عمل کرے تو آدمی انسان بن جائے۔ ''رقم کی واپسی'' کافی سے زیادہ الجھی ہوئی اور گنجلک کہانی تھی کہانی کو سمجھنے کے لیے ازسرنو مطالعہ کرنا پڑا (واقعی؟) ''ایک لمحہ'' پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''شیش محل'' میں ماہ بہ ماہ تجسس اور سسپنس بڑھتا ہی جارہا ہے۔ کہانی کے اختتام پر... منحوس قادر شاہ نے اپنے جس کلائنٹ کا ذکر کیا وہ صدفی صد دلدار آغا ہی ہے۔ ''دوراہا'' ...... ہمارے وطن عزیز کی پولیس کو کہانی دوراہا ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ ''نفس کا قیدی'' ملک صاحب حسب معمول اور حسب روایت اپنا کام جاری وساری رکھا ہوا ہے۔ کہانی نہ صرف دلچسپ بلکہ بہت ہی دلخراش بھی تھی۔ ''دہرا انتقام'' نے بھی خوب لطف بہم پہنچایا۔ ''نفسیاتی مریض'' نے کافی متاثر کیا۔ ''نامراد'' نہایت مختصر اور نہایت پر اثر۔ ''وقت'' ...... وقت وقت کی بات ہے، ایک وقت ایسا تھا میں دعا مانگا کرتا تھا کہ بٹ صاحب کی کوئی طویل قسط وار کہانی سسپنس میں چھپے، سو وہ وقت آ ہی گیا۔ قسط وار کہانی چھپ رہی ہے۔ تیسری قسط بھی آ گئی۔ (شاید بہت دل سے دعا کی تھی آپ نے)۔ اس کہانی کی دو اہم اور خصوصی باتیں میں نے نوٹ کی ہیں پہلی اہم بات یہ کہ اس کا عنوان ہی اہم اور خاص ہے اگر غور کیا جائے، دوسری اہم اور خاص بات یہ کہ لفظ وقت کے نو معنی ہیں اور نو کے نو معنی اس کہانی پر فٹ بیٹھتے ہیں قارئین غور کریں۔ ''قضا'' پسند نہیں آئی۔ ''غرق محبت'' مغل صاحب نے اس بار کچھ منفرد رومانی کہانی لکھی۔ کہانی جاندار اور شاندار ہے۔ اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اشعار کی محفل میں سبھی اشعار قابلِ داد تھے۔ خصوصاً ظفر اقبال ظفر اور ریاض بٹ کے اشعار پڑھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔''

✠ مرحا گل، رمنا گل درابن کلاں سے خط لکھ رہی ہیں۔ ''امتحانات کی مصروفیات کی وجہ سے سسپنس کا پچھلا شمارہ بھی نہ پڑھ پائے کہ جون کا شمارہ آ پہنچا۔ تو سوچا کہ اتنے عرصے کی غیر حاضری کے بعد ہم بھی اپنی محفل میں قدم مبارک رکھ دیں۔ سو اس سوچ کو عملی جامہ پہنائے آپ کے روبرو ہیں ہم رمنا گل (مہربانی ہے جناب کی)۔ ٹائٹل کی حسینہ اپنی اداس آنکھوں اور اداس سے ہیئر اسٹائل کے ساتھ کھڑی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی، سو ہم نے اس کو اس کے اداس موڈ میں ہی رہنے دیا اور چلے اپنی محفل کی طرف، ویسے اپنی کہنے کا حق ہے نا! (بالکل بالکل ...... آپ ہی کی تو محفل ہے)۔ جہاں آج کل ہم نہیں تو رنگینیاں بھی نہیں کیونکہ ہم سے ہے زمانہ۔ اداریے میں سیاستدانوں کی سیاسی چالوں کا ذکر تھا۔ کاش کہ ان ہی پر الٹ جائیں یہ چالیں اور فرماتے کیا ہیں جناب سیاستدان کے 2018ء تک لوڈشیڈنگ ختم ہوجائے گی۔ (کمال کے دعوے ہیں سنتے رہیے)۔ ملک میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے پینے کا صاف تو کیا میلا پانی بھی نہیں ہے۔ بس ان کو کیا فکر ان کا معیار اس قدر اونچا ہے کہ معمولی سے نزلے زکام کے لیے لندن، امریکا یاترا کی جاتی ہے اور غریب تڑپتے رہ جاتے ہیں۔ یہ دل دکھانے والی باتیں تو چلتی ہی رہیں گی۔ کرسی صدارت پر دوست محمد خان براجمان تھے۔ مبارک باد جناب قبضہ ہی نہ فرمالیجیے گا کرسی پر سیاستدانوں کی طرح (جو ممکن ہی نہیں ہے) سب سے بہترین تبصرہ تھا پائندہ خان سلیمان خیل کا۔ اتنا زبردست اور تفصیلی تبصرہ میں نے پہلے تو نہیں دیکھا لیکن دوسری مرتبہ پڑھا ہے پہلی مرتبہ اپنا پڑھا تھا نا! بھیا جی! رانا حبیب الرحمٰن تبصرہ اچھا۔ یاد کرنے کا شکریہ اور آپ کے سوال کا جواب ...... جہاں تک ہمارا ناقص خیال ہے تو لو میرج کی نسبت ارینج میرج زیادہ کامیاب ہوتی ہے جبکہ لو میرج میں لفظ Love حرف غلط کی طرح مٹ جاتا ہے اور صرف میرج رہ جاتی ہے۔ اکثر اوقات وہ بھی نہیں رہتی۔ ماں باپ کی پسند سے شادی کیجیے خوش رہیے۔ شیش محل اچھی جارہی ہے۔ آخر فاروق کے دشمنوں کا خاتمہ ہوا اور جولیٹ کی ہمدردی، چاند بانو کی سادگی اچھی لگی، شاید نہیں یقیناً جولیٹ اور فاروق مل ہی جائیں گے اور آخر میں آپ نے سارے سسپنس کا بیڑا غرق کردیا۔ دلدار آغا کا نام لکھ ہی دیتیں۔ وقت کہانی تو صرف وقت ہی ضائع کر رہی ہے معذرت کے ساتھ اور مغل انکل آپ کے قلم کا جادو ان دنوں کچھ بے اثر سا ہونے لگا ہے اور یہ ہیرو جی اتنی جلدی محبت میں غرق ہوگئے۔ ہیروئن کا نام اچھا ہے لیکن ہیرو کا نام پسند نہیں آیا۔ عمران، شاہ زیب اور خاور جیسا ڈبنگ نام چنتے نا آپ۔ بہرحال شادی شدہ ہیروئن سویرا، ہر پھڈے میں کودنے والا ہیرو، کہانی پسند آئی۔ نفسیاتی مریض عام سی کہانی لیکن یہی معاشرے کا حال ہے اس طرح کے نفسیاتی مریض ہمارے ہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ پلیز کاشف زبیر کی پرانی کہانیاں شائع کریں نا اور مریم خان کیوں نہیں لکھ رہیں؟ اشعار میں صفدر معاویہ، وسیم اکرم، پرویز اختر کے اشعار اچھے لگے۔ (آپ کی فرمائش پر غور کیا جارہا ہے)۔''

✠ زاہد احمد خان کا شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی سے پچھلے شمارے پر تبصرہ۔ ''مئی 2017ء کا دلفریب شمارہ اس مرتبہ بھی اپریل کی 17 تاریخ کو مل گیا مئی جو کہ مزدوروں کا مہینا ہے مگر ایسی مزدوروں پر ظلم کی داستانیں بھی ہیں جو آج تک ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ ایسے سرمایہ داروں کے لیے سزا ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نظر پڑی، بھئی بہت ہی عمدہ کاوش ہے ذاکر صاحب کی ویلڈن، بیک گراؤنڈ میں شاید ایک غائب دماغ پروفیسر صاحب اتنی پیاری لڑکی کو چھوڑ کر اپنے مطالعے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ ایلیا صاحب اپنی دانش کی وجہ سے ہی عوام کے دلوں میں زندہ ہیں۔ بے شک بقول آپ کے ہمارے سیاستداں ایک دوسرے میں کیڑے نکالتے رہتے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہیں لیکن عوام کے لیے کوئی اچھائی کا کام نہیں کرتے۔عوام مہنگائی کے بوجھ تلے دبتے چلے جارہے ہیں۔پیٹرول سے لے کر خوردنی اشیا اور پھل فروٹ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی ہیں۔اگر یہ حکومتیں اربوں روپے کے یہ بڑے بڑے منصوبے چھوڑ کر صرف مہنگائی کم کرنے پر توجہ دیں جو کہ عوام کی اصل ضرورت ہے تو ملک میں خود بخود خوشحالی آجائے گی۔سب سے پہلے شیش محل کی طرف نکل گئے تو بھئی باپ بیٹی ٹرین میں ہی مل گئے جولیٹ بے وقوفی میں اپنے باپ سے چھپتی پھر رہی تھی قدرت نے باپ سے ملادیا۔فاروق بھائی نے اچھا کیا کہ کیتھرائن کو پاکستان بھجوادیا ہے۔چاند بانو اور جولیٹ کیمپ میں مل گئی ہیں۔آگے چل کر فاروق بھائی کے لیے مشکلات پیدا ہوں گی۔راٹھور کا کانٹا نکل جائے تو فاروق بھائی پاکستان روانہ ہوں گے کیونکہ ولدار آغا بھی کراچی میں اپنے بھیانک انجام کا منتظر ہے۔اس کے بعد وقت کے دھارے میں شامل ہوئے اس سلسلے کی پہلی قسط ہم نے پچھلے ماہ پڑھی تھی۔ہم تو سمجھ رہے تھے کہ علی صاحب کوئی سیدھے سادھے سیلز مین ہوں گے۔وہ تو باقاعدہ خطرناک فائٹر ہیں۔سلطان صاحب کا علی کو اس کے ماں باپ کے بارے میں نہ بتانا اور ان لوگوں پر بار بار حملے ہونا اور شارو کا غائب ہوجانا لگتا ہے اس کہانی کے ڈانڈے پاکستان میں کسی سے مل رہے ہیں یا مل جائیں گے۔کوزہ گر درویشوں کے دربار میں حاضری دی۔بے شک اللہ جس کو رشد و ہدایت کے لیے اپنے پیارے بندوں میں سے چن لے تو وہ پہلوانی کیا دنیا جہان کی دولت کو ٹھوکر مار دیتے ہیں۔امیر کلال کے دربار میں آکر ایمان تازہ ہوا۔عزت دار میں بیگ صاحب نے ایک بے گناہ کو پھانسی کے پھندے سے نجات دلوائی۔بے شک بیگ صاحب کی کہنہ مشقی و مہارت کسی تعریف کی محتاج نہیں ہے لیکن اس کہانی کا دردناک پہلو یہ ہے کہ اس کہانی کی ہیروئن سعدیہ بے چاری بہت ہی دردناک موت ماری جاتی ہے جس کی وجہ سے پوری کہانی میں افسوس رہا۔‘‘

✠ احمد خان توحیدی کی آمد راولپنڈی سے۔’’شمارہ جون، 19 تاریخ کو مل گیا۔اول میں ساتھیوں کو مقدس رمضان المبارک کی مبارک قبول ہو۔پیشگی عید مبارک قبول ہو۔پہچان۔جون ایلیا۔کیسے پہچانیں کراچی سے آئے خود کو عالم باعمل مجاہد اسلام اور حاجی کہنے والوں نے بھی جن پر اندھا اعتماد تھا۔محفل خطوط دوست محمد چارسدہ اچھا تبصرہ، کرسی صدارت مبارک ہو۔صفدر معاویہ خانیوال، پائندہ خان سلیمان خیل تبصرے اچھے مگر طویل۔بے بی گڑیا طاہرہ گلزار پشاور دنیا میں بہت نیک لوگ دیر نہ کریں کچھ حاصل کرنے کے لیے ایثار کرنا پڑتا ہے۔ڈاکٹر ساجد، شکن در شکن بچے اپنے مضمون تیار کررہے ہیں۔ایک لمحہ، منظر امام ہر بار لاجواب اسٹوری لاتے ہیں۔شیش محل خوب جارہی ہے، انجام جاننے کے لیے بے تاب ہیں۔وسیلہ خاتون کی دوراہا۔کہانی میں انگلش کے بجائے اردو نام فرض کرلیا کریں تو زیادہ بہتر ہوگی (نفس کا قیدی) ملک صفدر حیات اور بیگ صاحب سدا اصل مجرم تک پہنچ جاتے ہیں۔وقت حسام بٹ کی تحریر بہت اچھی ہے، اندر انگریزی نام سے بوریت ہوتی ہے۔مقصد حیات بیوٹی فل اسٹوری ہے۔طاہر جاوید مغل صاحب، غرق محبت میں ماروی کو پھر لے آئے۔فل تبصرہ اگلی قسط کے بعد کروں گا۔باقی کہانیاں ابھی زیر مطالعہ ہیں۔‘‘

✠ محمد خواجہ کراچی مئی کے شمارے پر تبصرہ لے کر حاضر ہیں۔’’مئی کا شمارہ کچھ تاخیر سے ملا۔سرورق پر معصوم دوشیزہ اداس ہے، دور ایک شخص بھی بہت اداس بیٹھا ہے۔جون ایلیا بہت خوب لکھتے ہیں۔ہمارے خیالات اور احساسات کی بالکل صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔اعتماد اور بھروسا ٹوٹ چکا ہے۔ہم عوام ذہنی طور پر منتشر ہوچکے ہیں، تمام لیڈر ایک دوسرے پر گند اچھال رہے ہیں۔نتیجہ کوئی بھی صاف نظر نہیں آتا، عوام اگر ایک دل ہوں، خدا سے گڑگڑائیں تو شاید اللہ کی رحمت ہمارے ساتھ ہو۔ابھی سے رمضان میں لوٹ مچانے کی تیاری ہے۔ہم غربت، مہنگائی، بجلی اور پانی کی قلت کا شکار ہیں، کتنا ڈپریشن ہے، اللہ ہماری غلطیوں کو معاف کرے اور ایک بہتر راستے کی طرف ہم کو ڈال دے۔(آمین)۔دوستوں کی محفل بہترین تبصروں کے ساتھ حاضر ہے۔بہت ہی دلچسپ اور نہایت شوق سے لوگ پڑھتے ہیں۔فتح مکرر: بڑی عمدہ تاریخی کہانی۔ایک غلام کی ذہانت اور ترقی کا عروج، جنگوں کی اتنی لاجواب عکاسی، ذہن میں ایک فلم کی طرح چلتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ میدان کارزار کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔یہ طرز تحریر کا کمال ہے کہ قاری اپنی ذات سے بیگانہ ہوجاتا ہے۔ہمارے تاریخ کے طالب علموں کو چاہیے کہ اس طرح کی تحریروں سے فائدہ اٹھائیں۔(جی بالکل درست کہا آپ نے...... بہت سہولت کے ساتھ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے)۔ناسور: ایک ستم زدہ شخص کی دردناک کہانی۔تحریر میں بہت زیادہ غم ناک مناظر ڈالے گئے۔لیکن ایک بات ذہن کو نہیں بھاتی کہ وہ گونگا تھا لیکن اس نے پوری کہانی میں اشاروں سے اپنی بے گناہی کا اظہار کیوں نہیں کیا۔بس خاموشی سے ستم سہتا رہا اور مر گیا۔(بس یہی تو کہانی کا حاصل تھا)۔شیش محل: دلچسپ تحریر۔بڑی تیز رفتاری سے اپنا ٹریک تبدیل کرتی ہوئی ربن دادا کی موت اور برصغیر کی آزادی کی خونچکاں داستان بڑی تفصیل سے جاری ہے۔لگتا ہے سب کچھ اجڑ کے رہ گیا ہے۔انتقام بھی فاروق دادا اور اس کے ساتھیوں کے لیے چیلنج بن گیا ہے۔وہ کامیاب بھی ہورہے ہیں۔لیکن ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔آگے دیکھیے مصنفہ کیا کیا رنگ بکھیرتی ہیں۔(اس بار سارے رنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکے ہیں)۔کھٹے انگور: ایک محاورے کو بنیاد بنا کر ایک چھوٹی سی کہانی۔جس کی تھیم ہی لومڑی اور ہاتھ نہ آنے والے انگور کے گرد گھومتی ہے۔بہت غور کرکے پڑھنے والی کہانی۔ٹیڑھی کھیر: یورپ کی زندگی کی عکاس۔ایک عورت کی بے بسی اور دوسری عورت جو وکیل ہے، بجائے مدد کرنے کے وہ ایسی چال چل گئی کہ ایک عورت نے اپنی ذہانت سے دوسری عورت کو مات

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دے دی۔ عزت دار: وکیل امجد بیگ کا ایک اور شاہکار کیس۔ ایک عورت کی مکاری اور بہترین منصوبہ بندی، جس کی بنا پر ایک معزز اور بے قصور شخص کو آہنی شکنجے میں جکڑ دیا۔ لیکن وکیل صاحب کی دانشمندی اور پیشہ ورانہ ذہانت نے اصل مجرم کو پکڑوا ہی دیا اور مظلوم کو باعزت بری کروا دیا۔ بہت عمدہ کہانی۔ انوکھی قربت: ڈاکٹر ثمیر شاہ ہمیشہ ہی بہت دلدوز کہانیوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی سب سے منفرد بات ہے کہ وہ عام انسانوں کی تکلیف کو منظر عام پر لاتے ہیں۔ واقعی اس کہانی میں عورت اور مرد کی انتہائی محبت اور قربت اور ان کا بچھڑ جانا اور اس وفادار عورت کی عقیدت بھری جذباتی وابستگی نے آنکھیں نم کر دیں۔ دھیان: مغرب کے ماحول میں رچ بس جانے والی نئی نسل اور عاقبت نااندیش ماں باپ کے درمیان کشمکش کا سبق آموز قصہ لیکن شکر ہے نئی نسل راہِ راست پر آ گئی۔ کھوٹا سکہ: یہ بھی مغرب کی ایک آلودہ کہانی۔ ایک بیکار بیٹا۔ ایک بدکردار ماں اور ایک اچھے باپ کی داستان۔ بیٹا اپنی ماں کے قتل کو اپنے باپ کا کارنامہ سمجھ بیٹھتا ہے۔ اس ناکارہ نوجوان جو نشے کا بھی عادی ہے لیکن اپنے باپ کو بچانے کے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگا دیتا ہے لیکن ایک ذہین سراغ رساں اس گتھی کو اپنی ذہانت سے سلجھاتا ہے۔ بہت دلچسپ کہانی اور سبق آموز بھی۔ وقت: حسام بٹ کے جادو بھرے قلم کی سلسلہ وار کہانی۔ ایک باعزم اور بہادر نوجوان جو ایک اپاہج بوڑھے شخص کا وارث بھی ہے۔ انجانے میں ایک خطرناک مافیا سے ٹکرا جاتا ہے اور سنسنی خیز واقعات جنم لینا شروع ہو جاتے ہیں۔ کہانی ہر قدم پر ایک خطرناک اور ہیجان انگیز رخ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ دیار غیر کی فسوں کاری اور مشرقی اقدار کی جنگ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ تعزیت: گاؤں کا ایک ناسمجھ لڑکا جو دل ہار جاتا ہے اور دل میں بسی محبت کے لیے ایک کے بعد ایک قتل کر گزرتا ہے۔ اس کی سمجھ پر دل حاوی ہو جاتا ہے اور زندگی کی بازی ہار بیٹھتا ہے۔ بھنور: اس شمارے کی آخری کہانی ایک لاجواب اور ایکشن سے بھرپور ایک جواں مرد میڈیا سے تعلق رکھنے والے شخص نے اپنی فنی مصروفیت میں ایک ایسی ویڈیو بنالی جس میں سرکاری مگرمچھوں کے راز تھے۔ وہ مشکلات میں پھنستا ہی چلا گیا۔ مگر اپنی جواں مردی اور حب الوطنی کی وجہ سے خدا کی مدد حاصل ہو گئی۔ کہانی نہ صرف دلچسپ رہی بلکہ بڑی سبق آموز بھی۔ کترنیں اور لطائف، اشعار کی محفل بہت لاجواب۔ (رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ)۔''

✠ ادریس احمد خان کی ناظم آباد، کراچی سے آمد۔ ''سب سے پہلے نظر ٹائٹل گرل پر پڑی جو زبانِ حال سے ڈاکر صاحب کی مہارت بیان کر رہی تھی۔ اندر جون ایلیا حکمت کے موتی بکھیر رہے تھے۔ انشائیہ حسب حال تھا جس میں آئینہ دکھایا جاتا ہے اور دنیا کی حقیقت عیاں کی جاتی ہے جسے بصیرت والے ہی پہچانتے ہیں اور بے بصیرت کیا جانیں کہ ہم کیا ہیں اور اس بے حس معاشرے میں کیا ہو گئے ہیں۔ منفی کو منفی اور مثبت کو اگر مثبت سمجھا جائے، سچ اگر بولا جائے گا تو وہ منفعت بخش ہو گا اور زندگی کی کسی راہ پر محسوس ہو گا کہ ہمارا بولا ہوا سچ ہمارے کام آ رہا ہے اور جھوٹ تو جھوٹ ایسی بیماری ہے جو ایک جھوٹ بولنے پر اس کی وسعت ستر جھوٹ تک بڑھا دیتی ہے اور یہ ایسا مرض ہے جو لاعلاج ہوتا جاتا ہے کیونکہ جھوٹا انسان کتنا ہی سچ بولنے کی کوشش کرے، اس کے منہ سے ہمیشہ جھوٹ ہی نکلے گا۔ اداریہ بھی کچھ خوش آئند نہ تھا۔ ہاں اگر کچھ نیا ہے تو وہ الیکشن کے چرچے شروع ہو چکے ہیں اور اس شور وغل میں اصل مسائل پس پشت چلے جائیں گے کہ کس سیاسی راہنما نے کتنا مال بنایا کتنا عوام کے لیے خرچ کیا جو اس کے اصل حقدار ہوتے ہیں۔ عوام کے لیے بنیادی ضرورت روزی روٹی ہے، تعلیم کا فقدان ہے۔ علاج معالجے کی جو حالت ہے، ٹوٹی ہوئی سڑکیں ہیں۔ صفائی کی کیا حالت ہے جو ہمارے دین کا حصہ بھی ہے۔ پانی کی جو صورت حال ہے بجلی کی جو ضرورت ہے، غرض مسائل کے کوہ گراں ہیں جو حل ہوتے ہیں چیونٹی کی رفتار سے۔ مسلمانانِ عالم کے لیے خوشخبری کہ رمضان شریف شروع ہونے والے ہیں ہماری طرف سے ڈائجسٹ کے سب ہی دوستوں اور ادارے کو بہت بہت مبارک باد اور دنیا کے مسلمانان کو بھی مبارکباد۔ ناموں کی فہرست پر نظر پڑی تو دوست محمد سرفہرست تھے، مبارکباد۔ تبصرہ بھی اچھا لگا اور تبصرہ پسند کرنے کا بھی شکریہ۔ آپ کے صفحے پر ایک بہت ہی افسوسناک خبر پر نظر پڑی۔ دل کی دھڑکنیں جیسے رک گئیں۔ عالمی شہرت رکھنے والے منفرد لکھنے والے ایم اے راحت انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)۔ ادبی دنیا میں ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ قارئین ان کی جادو اثر تحریروں میں کھو جاتے تھے۔ اللہ ان کے درجات کو بلند کرے۔ آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی کہانی تاریخ کے جھروکوں سے پیش کی..... ''شکن در شکن'' میں پڑھنے میں بہت فرحت محسوس کی جس سے آگاہی کے در وا ہوئے۔ دوسری کہانی رقم کی واپسی اچھی تحریر تھی۔ پھر ''ایک لمحہ'' منظر امام کی کہانی تھی۔ وہ جس طرح لکھتے ہیں واقعی ان کا ایک الگ انداز ہے کہ تحریر کا ہر ہر لفظ دلوں کو جھنجوڑ دیتا ہے۔ خدا کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اس کے بعد شمیش محل جس کے لیے تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ واقعی اساقاری ایسا لکھنے والی ہیں کہ دلوں کو موہ لیتی ہیں کہ آخری لفظ تک نظریں تحریر سے نہیں ہٹتیں۔ دورا بھی اچھی لگی۔ ''دہرا انتقام'' بھی بہتر تحریر لگی۔ ''نفسیاتی مریض'' نے بھی متاثر کیا۔ محفل شعر وسخن میں منتخب اشعار نے بھی کافی محظوظ کیا۔ ''نامراد'' میں ایک رائٹر نے دولتمند بننے کے لیے جرم کیا مگر جرم کتنی ہی منصوبہ بندی سے کیا جائے مجرم اپنی کسی چھوٹی سی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔ وقت بہترین انداز میں چل رہی ہے۔ حسام بٹ صاحب کی بہت اچھی تحریر ہے۔ قضا بھی اچھی تحریر تھی۔ اس کے بعد دلوں کو ایمان کی روشنی سے جلا دینے والی تحریر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تھی۔ آخری صفحات کی کہانی خوبصورت ترین تھی، مقصد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حیات جوایم اے راحت کی تحریر تھی۔“

✠ محمد صفدر معاویہ، تحصیل وضلع خانیوال سے شریکِ محفل ہیں۔ ”سرورق کو ایک خوبصورت پر اداس ماڈل سے سجایا گیا۔ سو پہچان سے کام لو اوران میں سے کسی کے دھوکے میں نہ آؤ۔ جون ایلیا محترم بڑی خوبصورتی سے پہچان کا مفہوم سمجھاتے نظر آئے۔ آپ کا اداریہ پڑھا سچ فرماتے ہیں آپ کہ اب تو تمام سیاسی لیڈروں کے دلوں میں غریب عوام کا درد جاگ اٹھا ہے۔ بس یہی کوئی ایک سال کے لیے مطلب الیکشن تک پھر تو کون میں کون۔ ہم پورا سال جون کا انتظار کرتے ہیں کہ شاید بجٹ میں کوئی ہمارا بھلا ہو جائے پس 10 فیصد تنخواہ بڑھا کر 20 فیصد مہنگائی کر دی جاتی ہے۔ ہمارے تو کچھ پیسے بڑھ جاتے ہیں پر ان لوگوں کا کیا بنا ہوگا جو پہلے ہی غربت کی چکی میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اللہ اپنا کرم کرے تمام مسلمانوں پر جو صرف اس لیے اپنا مال روک کر رکھتے ہیں کہ رمضان میں اپنے مسلمان بھائیوں کو لوٹیں گے۔ اللہ ان کو عقل سلیم عطا کرے۔ آمین۔ اپنی محفل میں آئے تو ...... پشاور سے دوست محمد بہترین تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان نظر آئے، مبارک ہو جی۔ وزارتِ عظمیٰ کی کرسی ہمارے حصے میں آئی۔ رومی بھائی کا بہترین تبصرہ پسند آیا۔ پشاور آتے ہوئے جب خیبر میل لاہور رکتی ہے تو آپ سے ملنے کو دل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایم اے راحت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبرِ جمیل اجرِ عظیم عطا کرے۔ بے شک یہ اردو ادب کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ ناہید یوسف کی بہترین تشریف آوری، مہتاب احمد، مہیش کمار، رانا حبیب الرحمٰن بھی محفل میں بھرپور شرکت کرتے ہوئے۔ اللہ تمام اسیران پر اپنا کرم کرے۔ سب سے پہلے کہانیوں میں ڈاکٹر ساجد امجد کی شکن در شکن پڑھی جہاں پر محمود کی وفات کے بعد وہی ازلی خون ریزی اور حکمرانی کی کشمکش شروع ہوگئی۔ اس کے بعد شیش محل پڑھی جہاں پر فاروق نے راٹھور کو ٹھکانے لگا دیا اور خود بھی مسئلے سے دوچار ہوا تو ڈاکٹر پرکاش کی صورت مدد میسر آگئی پہچاننے کے باوجود انسپکٹر نے نہیں پکڑا کہ اسے راٹھور سے نفرت تھی‘ جولیٹ نے اسلام قبول کرلیا بہت خوشی ہوئی۔ انجلی بھی مشرف بہ اسلام ہوئی۔ فاروق کو اپنوں پر ٹوٹی قیامت کا پتا چل گیا تو ان کا دشمن خود ذلیل وخوار ہو رہا ہے۔ فاروق کی پاکستان روانگی اور آخر میں جولی کے سامنے ایک مرتبہ پھر دلدار آغا نام آگیا۔ حسام بٹ کی وقت پڑھی جو اس دفعہ پہلی دو قسطوں کی نسبت بہترین تھی۔ جیسا ڈیلفی اور اس کا گرو اسد علی پر ظاہر کر رہے ہیں، شاید ایسا ہی ہو پر مجھے لگتا ہے جیسی سازش ہو رہی ہو اس کے خلاف اگلی قسط میں مزید انکشافات کا امکان ہے۔ تنویر ریاض کی رقم کی واپسی پڑھی جو کہ گزارے کے قابل تھی۔ منظر امام ایک لمحہ کی صورت ایک مختصر پر عمدہ تحریر لے کر آئے۔ نہایت ہی سبق آموز تحریر تھی۔ وسیلہ خاتون کی دوراہا پڑھی۔ کلنٹن ایک ایسے عذاب میں پھنسا کہ نہ وہ نگل سکتا تھا نہ اگل سکتا تھا۔ فورمین کی صورت پر آخر میں جیت تو قانون کی ہوئی پر کلنٹن کو نوکری چھوڑنی پڑی۔ ملک صفدر حیات کی نفس کا قیدی پڑھی جو ملک صاحب کے کیسوں میں سے ایک ہولناک کیس تھا۔ جہاں پر بھائی نے بھائی کی گردن ماردی، ذرا بھی ترس نہ آیا اس کو جمیل عرف جیلا پر۔ پلاننگ تو اس کی اچھی تھی پر تعویذ نے اس کو پھنسوا دیا۔ ملک صاحب نے کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے شکیل عرف شیلا اور اس کے ڈبا پیر معاون کو پکڑ لیا۔ محمد یاسر اعوان کی دہرا انتقام بھی اچھی رہی۔ کبیر عباسی کی نفسیاتی مریض اچھی تحریر تھی جہاں پر نفسیات کے ڈاکٹر کی ساری زندگی ہی اس کے مریض امیر نے بدل ڈالی۔ محفل شعروسخن بھی عمدہ رہی۔ سلیم انور کی نامراد میں امینڈا کو گلے پڑ گیا۔ نعمان اسحاق کی قضا بھی اچھی تحریر تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ایک بہت بڑی اور اعلیٰ پائے کی شخصیت اللہ کے کامل ولی بے شک آپ کے کارنامے رہتی دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ ایم اے راحت کی مقصدِ حیات بھی بہت عمدہ تحریر تھی جہاں پر اپنی انا کی بھینٹ چڑھے انسان اکبر حسین کو راہ راست پر لانا جن کا وہ منہ دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا، وہی اس کے محافظ بن گئے اور فاروق کی چال اسی پر الٹ دی۔ مہوش نے منصور کو سب کچھ بتا دیا۔ اس طرح اکبر حسین کا تو بھلا ہوگیا کہ اسے احساس ہوگیا کہ زندگی تو اپنوں کے ساتھ ہے۔ آخر میں عظیم رائٹر طاہر جاوید مغل کی غرق محبت پڑھی۔ واہ واہ کیا تحریر ہے پہلے تو اس کو عام طور پر بھی اختتام تک لے جانے کے لیے پانچ سات قسطیں ضرور ہوں گی۔ اگر یہ لمبی چلے تو کم از کم 4 سال تک چلے گی۔ دلاور تو سویرا کی محبت میں گوڈے گوڈے غرق ہو چکا ہے۔ سویرا سے ملاقات عجیب طریقے سے ہوئی اور پھر دلاور کی دنیا رنگین بھی ہوگئی اور ساتھ میں ویران بھی اور بھی بہت کچھ ہے پڑھنے کو جس میں شاہ زمان، شاہ فرمان، پیر فضل، شوکت سیال اور حضور چانڈیو کی چپقلش بہت آگے جائے گی۔ کترنوں نے بھی بہت مزہ دیا۔ آخر میں سب کو روزوں کی اور پھر عید کی دلی مبارک۔ اگلا شمارہ ہمارے پاس آنے تک تیسرا عشرہ شروع ہوگا۔ لہٰذا تمام قارئین اور خصوصاً ادارہ جاسوسی سے منسلک تمام افراد کو روزوں اور عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ (آپ کو بھی سب بے حد مبارک باد)۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔
سنعیہ منظور، لاہور۔ مہتاب احمد‘ حیدر آباد۔ صبا سحر، کراچی۔ عاصم خان، کوئٹہ۔ جہانگیر احمد، ملتان۔ دلدار پرویز، پشاور۔ فہیم خان، سرگودھا، اسلم شیخ، سکھر۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت انگیز واقعات

سلسلے وراثت کے

ڈاکٹر ساجد امجد

سورج کے ڈوبنے اور ابھرنے کے درمیان رونما ہونے والے واقعات اپنی مخصوص ڈگر پر چلتے ہوئے اپنے اپنے عہد کے اعتبار سے رقم ہوتے رہتے ہیں اور ... جہاں تخت و تاج کی کشمکش ہو اس دربار کا منظر نہ صرف ابتری کا شکار ہوتا ہے بلکہ کوئی بھی کردار اپنی ذات میں مطمئن نہیں رہتا۔ اورنگ زیب عالمگیر کو بھی اپنی موت کے بعد برپا ہونے والی تباہی صاف نظر آرہی تھی۔ حصولِ اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہو کر اس کے شہزادے ایک دوسرے کی جان کے دشمن بن کر باپ کو کڑی آزمائش میں ڈال چکے تھے۔ ان شہزادوں کی ہمدرد بہن کا اپنے ایک چہیتے بھائی کے لیے خاص پیغام تھا کہ "قیدیوں کے خواب بھی قیدی ہوتے ہیں ... آزاد رہو گے تو خواب سفر کرتے ہوئے خود بخود تخت تک پہنچا دیں گے۔" لہٰذا اسی پس منظر میں یہ سارے بھائی قید سے بچنے کے لیے غلط حکمتِ عملی سے ایک دوسرے کی جان لے بیٹھے اور بالآخر شاہ عالم ... ان میں سے اورنگ زیب کا ایک بیٹا مختصر سی مدت کے لیے سلطنت کا مختارِ کل بن بیٹھا لیکن ... تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ وراثت کے سلسلے ایسا دائرہ ہر صورت مکمل کرتے ہیں اسی تناظر میں شاہ عالم کی بادشاہت بھی انتہائی قلیل مدت میں فنا ہو گئی کیونکہ اس سلسلے کو ابھی اور دراز ہونا تھا۔

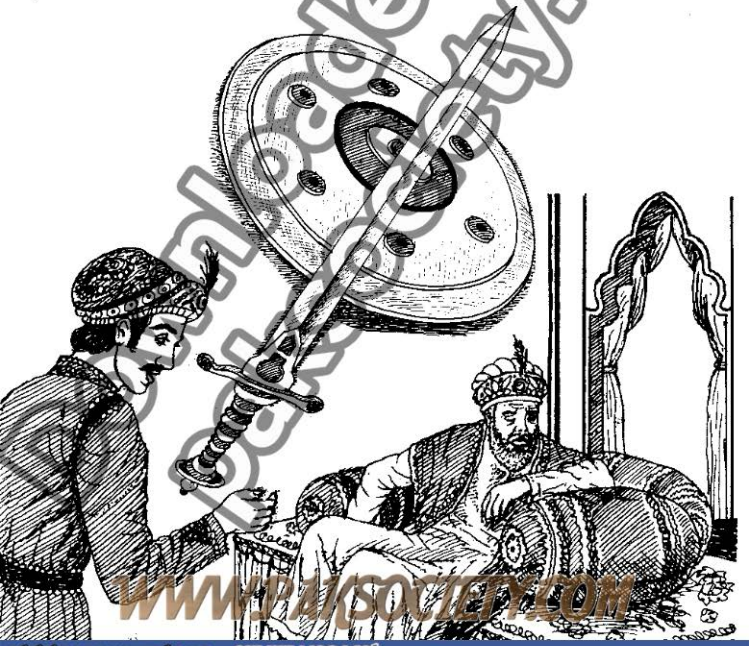

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ابھی بستر علالت، بستر مرگ نہیں بنا تھا کہ حصول تخت کے ارادوں نے خواب دیکھنے شروع کردیے۔ بادشاہ کی تجربہ کار آنکھیں نیتوں کے فتور کو بہ غور دیکھ رہی تھیں۔ شہزادہ شاہ عالم کی جانب سے تو وہ مطمئن تھا کہ وہ ہندوستان سے بہت دور کابل میں تھا لیکن اعظم شاہ اور کام بخش کی آنکھیں کچھ اور ہی بتا رہی تھیں۔ خصوصاً اعظم شاہ پھرا ہوا شیر بنا ہوا تھا۔ اسے اپنی بہادری پر بڑا ناز تھا۔ اس کے پاس ایک تجربہ کار فوج موجود تھی۔ نامی گرامی امراء بھی اس کے حق میں تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی بہن زیب النسا بھی اس سے بہت محبت کرتی تھی اور اسے تخت شاہی پر جلوہ افروز دیکھنا چاہتی تھی۔ اتنی حمایتوں کے بعد ممکن نہیں تھا کہ وہ شہزادہ کام بخش کے وجود کو برداشت کرتا۔ دل میں چھپی ہوئی عداوت باہر نکلنے کے لیے بے قابو ہو رہی تھی۔ اس نے کام بخش سے چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ یہ منظر بالکل وہی تھا جو دورِ شاہجہانی میں دارا شکوہ اور عالم گیر کے درمیان تنازع کا سبب بنا تھا اور جس کا اختتام شدید خون ریزی پر ہوا تھا۔

اس کی آنکھ بند ہوتے ہی لشکر میں جو تباہی مچنے والی تھی، اورنگزیب عالم گیر کو صاف نظر آ رہی تھی۔

بیماری کے بعد عالم گیر کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی لیکن دونوں شہزادوں کے طور طریقے نہیں بدلے تھے۔ اعظم شاہ کی نظروں میں کام بخش کا وجود کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی بڑا واقعہ رونما ہوتا، اورنگزیب نے ضروری سمجھا کہ کام بخش کی حفاظت کا بندوبست کردیا جائے۔ اس نے ایوانِ شاہی کے چیدہ افراد کو چشم تصور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سلطان حسن عرف سیر ملنگ پر جا کر ٹک گئیں۔ سلطان حسن کی بہادری اور وفاداری مسلمہ تھی۔ وہ کئی مرتبہ ایسے امتحانوں میں کامیابی سے پورا اترا تھا۔ چند لمحے نہیں گزرے تھے کہ سلطان حسن اس کے حضور حاضر تھا۔

حکیم حمید الدین خاں اس کے سرہانے بیٹھے تھے۔ کنیزیں دست بستہ کھڑی تھیں۔ بادشاہ کے اشارۂ ابرو کو سب نے سمجھ لیا۔ جب تخلیہ ہوگیا تو ارشادِ شاہی ہوا۔

''حسن خاں! ہم نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ شہزادہ کام بخش کی جان خطرے میں ہے۔''

''غلام کو تمام حالات کا علم ہے لیکن حضور کے گوش گزار اس لیے نہیں کیا کہ اسے چغلی سمجھا جاتا۔ عتابِ شاہی کے خوف نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کردیا۔''

''تمہاری وفاداری سے یہی توقع کی جاسکتی تھی۔ دونوں ہمارے بیٹے ہیں۔ ہمیں دونوں سے محبت ہے۔ اعظم شاہ حصولِ اقتدار کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے لیکن ابھی ہم زندہ ہیں۔ ہم تمہیں کام بخش کی نگرانی پر مامور کرتے ہیں۔ اعظم شاہ کو وقت راہِ راست پر لے آئے گا۔''

''آپ اپنی صحت کی فکر فرمائیں۔ شہزادہ حضور اب میری ذمے داری ہیں۔''

''حسن خاں! اگر ہمارے کام بخش کو کوئی گزند پہنچی تو ہمارا عتاب تمہیں بھی زندہ نہیں رہنے دے گا۔''

''یہ غلام اپنی گردن خود اتار کر آپ کے قدموں میں رکھ دے گا۔''

''بس، اب تم جاؤ۔'' بادشاہ نے کہا اور آنکھیں بند کرلیں۔

اگلے دن جب کام بخش باپ کی تیمارداری کے لیے حاضر ہوا تو حسن خاں اپنی جمعیت کے ساتھ شہزادے کے ساتھ تھا۔ اتفاق یہ ہوا کہ اعظم شاہ بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے جب یہ منظر دیکھا تو دل کا حال آنکھوں سے ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے حقارت کی ایک نظر کام بخش پر ڈالی اور باپ کے پاس سے اٹھ گیا۔

یہ محض اتفاق نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ حسن خاں اپنی جمعیت کے ساتھ ہر وقت کام بخش کے ساتھ رہتا ہے۔ دن رات شہزادے کی حفاظت کے لیے کمر بستہ رہتا ہے۔

اب اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ اعظم شاہ نے از خود یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ بادشاہ اپنا تاج و تخت کام بخش کے حوالے کرنے کا خواہاں ہے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے اس نے کام بخش کی حفاظت کا اہتمام کیا ہے تاکہ وہ محفوظ رہے۔

اس نے دبے لفظوں میں حسن خاں کی شکایت بادشاہ کے حضور پہنچائی لیکن بادشاہ نے جواب تک دینا ضروری نہیں سمجھا۔ حسن خاں کے انتظامات اسے اپنی توہین معلوم ہو رہے تھے۔ بادشاہ کی شہ پا کر حسن خاں بھی بے باک ہوگیا تھا۔ وہ اعظم شاہ کو خاطر میں نہیں لا رہا تھا بلکہ دربار کے اکثر امراء بھی کام بخش کی حمایت میں حسن خاں کے ساتھ ہوگئے تھے اور واضح طور پر دو گروہ بن گئے تھے۔ اعظم شاہ کے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ نواب زیب النسا سے ملاقات کرے اور آنے والی رکاوٹوں سے آگاہ کرے لیکن اس موقع پر زیب النسا سے ملنا خطرے سے خالی نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا۔ اس کی نگرانی کی جارہی تھی۔ سب جانتے تھے کہ زیب النسا، اعظم شاہ کے حق میں ہے۔ اس ملاقات کو سازش کا حصہ سمجھا جاتا۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ کسی طرح اس تک ''رقعہ'' پہنچایا جائے اور کسی قابلِ اعتبار کنیز کے ذریعے اسے زیب النسا تک پہنچادیا جائے۔ اس نے یہ رقعہ لکھا اور کنیزِ خاص ''چمپا'' کے حوالے کردیا۔

''تجھے رات کے اندھیرے میں نواب زیب النسا تک جانا ہے اور یہ رقعہ ان تک پہنچانا ہے لیکن یاد رہے، یہ راز کسی پر کھلنے نہ پائے۔''

یہ حکم سن کر کچھ دیر کے لیے چمپا بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ شاید اس کام کے خطرے کو بھانپ گئی تھی۔ اعظم شاہ نے اس کی خاموشی کا کچھ اور مطلب لیا۔

''جیسے ہی تو اس رقعے کا جواب لے کر آئے گی میں تیرا منہ موتیوں سے بھردوں گا۔''

''شہزادہ حضور! آپ کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر پکڑی گئی تو آپ کے عتاب سے نہیں بچ سکوں گی۔''

''ہمیں معلوم ہے کہ ہماری نگرانی کی جارہی ہے۔ اگر یہ رقعہ پکڑا گیا تو ہم اسے اپنی تقدیر سمجھیں گے۔ اگر راز کھلنے پر تو کسی اور کے عتاب میں آئی تو اسے اپنی تقدیر سمجھنا۔''

چمپا نے رقعہ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ اس خط کو نواب زیب النسا تک پہنچنا تھا لیکن راستے ہی سے اچک لیا گیا۔ یہ خط چمپا سمیت سلطان حسن تک پہنچ گیا۔

''تجھے یہ خط کس نے دیا تھا؟''

''شہزادہ اعظم شاہ نے۔''

''یہ خط کہاں پہنچانا تھا؟''

''حضرت نواب زیب النسا کے حضور۔''

''تجھے معلوم ہے اس سربمہر خط میں کیا لکھا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''اب تک ایسے کتنے ''خط'' پہنچا چکی ہے؟''

''ایسا پہلی مرتبہ ہورہا ہے۔''

یہ رقعہ چونکہ سربمہر تھا اس لیے سلطان حسن نے اسے کھولنا اور پڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ چمپا کو اپنی قید میں رکھا اور ''رقعے'' کو وہاں پہنچادیا جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے تھا یعنی بادشاہ اورنگزیب عالمگیر تک پہنچادیا گیا۔

سلطان حسن الٹے قدموں لوٹ آیا تھا اور عالمگیر کی نظریں عبارت پر جم گئی تھیں۔

''کیا موجودہ صورتِ حال دیکھ کر آپ کو دورِ شاہجہانی کا خیال نہیں آتا؟ مجھے تو آتا ہے۔ دادا حضور بھی دارا شکوہ کی جانب داری فرمایا کرتے تھے اور نتیجے میں خون ریزی ہوئی تھی۔ ابا حضور بھی بڑے بیٹے کا حق مار کر کام بخش کے حوالے کرنا چاہتے ہیں جبکہ وہ مجھ سے چھوٹا ہے اسی لیے انہوں نے حسن خاں کو شہزادے کا نگران بنادیا ہے تاکہ وہ ان کی وفات تک زندہ رہ سکے اور تاج و تخت اس کے حوالے کیا جائے۔ حسن خاں کی نظروں میں مجھے دشمن بنادیا گیا۔ وہ معمولی ملازم ہے لیکن میرا ادب نہیں کرتا۔ اس بے ادب کی گوشمالی میرے لیے دشوار نہیں لیکن ابا حضور کا ادب مانع ہے لیکن یہ ادب زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گا۔ آپ اس کا کوئی حل نکالیے ورنہ مجھے گستاخ بنتے دیر نہیں لگے گی۔''

اورنگزیب نے اسی رقعے کی پشت پر یہ عبارت درج کردی۔

''حسن خاں کی موجودگی کی اہمیت ثابت ہوگئی کہ اس کی طرف سے اس قدر خوف و ہراس پیدا ہوگیا ہے۔ ہم بہت جلد کام بخش کو کسی اور جگہ رخصت کرکے تمہارا خوف دور کردیں گے۔''

یہ رقعہ جیسے ہی اعظم شاہ تک پہنچا، اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ یہ سمجھنے میں بھی دیر نہیں لگی کہ اس کا خط پکڑا گیا ہے لیکن یہ سمجھنے میں دیر ہوئی کہ اس کا خط اسی کو واپس کیوں کیا گیا ہے۔ یہ عقدہ بھی اس وقت حل ہوگیا جب خط لانے والا اس سے مخاطب ہوا۔

''شہزادہ مکرم! خط کی پشت پر لکھی عبارت بھی ملاحظہ فرمالیں۔''

اس کی حیرانی اس وقت دور ہوگئی جب اس نے کاغذ کی پشت پر شاہی مہر لگی دیکھی اور عبارت پر نظر ڈالی۔ اس کی نظریں عبارت کی آخری سطر پر جم گئیں۔

''ہم محمد کام بخش کو کسی اور جگہ رخصت کردیں گے۔''

خط لانے والا واپس چلا گیا تھا اور وہ اس جملے پر غور کررہا تھا۔ ''ہم محمد کام بخش کو کسی اور جگہ رخصت کردیں گے۔'' پھر اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔

''طویل بیماری نے ابا جان کی عقل کو متاثر کیا ہے۔ بھیجنا تو مجھے چاہیے تھا۔ وہ کام بخش کو میرے راستے سے ہٹا کر میرا کام آسان فرمارہے ہیں۔ کام بخش کے چلے جانے کے بعد ان کی تیمارداری کے لیے صرف میں رہ جاؤں گا۔ تاج و تخت پر قبضہ کرنا میرے لیے کتنا آسان ہوجائے گا۔ جب تک کام بخش واپس آئے گا، میں انتظامات سنبھال چکا ہوں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گا۔ تقدیر مجھ پر خود بخود مہربان ہو رہی ہے۔''

اورنگزیب کی طبیعت سنبھلتے سنبھلتے پھر بگڑ گئی تھی۔ دونوں شہزادے تھے کہ بپھرے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ یہ خبریں برابر موصول ہو رہی تھیں کہ اعظم شاہ، سلطان حسن کی جمعیت کو ٹھکانے لگانے کے لیے سامان کر رہا تھا۔ آخر بادشاہ نے کام بخش کو شاہانہ سروسامان کے ساتھ بیجاپور چلے جانے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ حکم بھی دیا کہ وہ نوبت نقارہ بجاتے ہوئے کوچ کرے۔ یہ دیکھ کر شہزادہ اعظم شاہ زخمی سانپ کی طرح بل کھانے لگا مگر دم مارنے کی مجال نہ تھی، خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ کام بخش سیکڑوں میل دور چلا گیا۔ اب وہ اکیلا رہ گیا ہے، جو چاہے گا کرے گا۔ سب سے بڑا بھائی بہادر شاہ (شاہ عالم) پہلے ہی کابل جا چکا تھا۔

اس کا یہ اطمینان محض دو تین دن ہی جلوہ افروز رہا اور پھر چہرے پر ایسی زردی چھائی کہ بیمار بادشاہ سے بھی زیادہ بیمار نظر آنے لگا۔ اس کا سبب وہ حکم تھا جو بادشاہ کی طرف سے جاری ہوا تھا۔

''ہم تمہیں صوبۂ مالوہ پر متعین کرتے ہیں۔''

کام بخش کے چلے جانے کے بعد وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا کام آسان ہو گیا لیکن مشکل تو اور بڑھ گئی تھی۔ بادشاہ کی اس چال نے اسے نڈھال کر دیا۔ کس خوبصورتی سے ہم دونوں بھائیوں کو جدا کر دیا گیا۔ اب جو ابا جان کی وفات کے وقت پہلے حاضر ہو جائے گا، مملکت کا حق دار وہی ہوگا۔ پہلے آنے والا کام بخش بھی ہو سکتا ہے۔ میں دوڑ میں شامل گھوڑا نہیں ہوں کہ بھاگتا پھروں۔ میں چاہوں تو مالوہ جانے سے انکار کر سکتا ہوں۔ وہ پنجرے کے قیدی کی طرح اپنی خواب گاہ میں ٹہل رہا تھا۔ کام بخش اس کی دسترس سے دور جا چکا تھا۔ وہ اپنا غصہ اتارتا تو کس پر۔

وہ دو دن اپنی خواب گاہ میں اسی طرح بند رہا پھر اسے اپنی بہن نواب زیب النسا کا خیال آیا۔ مجھے مالوہ جانا چاہیے یا نہیں؟ ان سے بہتر مشورہ مجھے کون دے سکتا ہے۔

زیب النسا نہایت عالم فاضل تھی۔ عربی فارسی کے جملہ فنون پر ماہرانہ دسترس رکھتی تھی۔ شاعرہ تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں نہایت مہارت رکھتی تھی۔ بادشاہ تک اس سے مشوروں کا طالب رہتا تھا۔ وہ اعظم شاہ کو عزیز بھی بہت رکھتی تھی لہٰذا کسی صائب مشورے کی توقع تھی۔ آخری ملاقات کا بہانہ بھی تھا۔ وہ اس کی ڈیوڑھی پر پہنچ گیا۔

زیب النسا پہلے ہی تمام حالات سے واقف تھی۔ بھائی کا چہرہ دیکھ کر آنے کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اعظم شاہ کچھ کہتا، اس نے پہلے ہی پوچھ لیا۔

''تم نے ابھی تک ابا جان کے حکم کی تعمیل نہیں کی؟''

''آپ بھی یہی چاہتی ہیں کہ ہم ''مالوہ'' چلے جائیں۔''

''اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

''ہم انکار بھی کر سکتے ہیں۔''

''گرفتار کر لیے جاؤ گے۔''

''ہم مقابلہ کریں گے۔''

''تمہارے مقابل شاہی فوج ہوگی۔''

''تو کیا میں تخت کے خواب دیکھنا چھوڑ دوں؟''

''قیدیوں کے خواب بھی قیدی ہوتے ہیں۔ آزاد رہو گے تو خواب سفر کر کے خود بخود تمہیں تخت تک پہنچا دیں گے۔''

''آپ یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ ابا جان کی وفات کے وقت کام بخش قریب تر ہوگا۔ مجھ سے پہلے پہنچ کر تخت نشینی کا اعلان کر دے گا۔''

''یہ فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دو اور فی الحال مالوہ چلے جاؤ۔''

شاید وہ اس نصیحت کے بعد بھی مالوہ جانے میں دیر لگاتا لیکن بادشاہ اس تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ایک سخت گیر داروغہ مقرر کر کے اعظم شاہ کو صوبۂ مالوہ کے بندوبست کے لیے روانہ کر دیا۔

بیٹوں کی روانگی کے بعد وہ مطمئن تھا کہ دونوں بھائی ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں۔ خانہ جنگی کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

بیٹوں کے رخصت ہوتے ہی بادشاہ کی حالت پھر بگڑ گئی۔ جب حکیموں کی دوائیں بے اثر ہونے لگیں تو نجومیوں کے بنائے ہوئے زائچوں سے مدد لی جانے لگی۔ حکیم حمید الدین خاں پلنگ کی پٹی پکڑے بیٹھے تھے۔ انہوں نے نجومیوں کی تجویز سے آگاہ کیا۔

''ایک قیمتی ہاتھی اور الماس صدقے میں دیا جائے تو بہتری کی امید ہوگی۔''

''نہیں، یہ ہندوؤں اور ستارہ پرستوں کا طریقہ ہے۔''

بادشاہ نے اختلاف کیا۔ ''صدقہ ہی چاہتے ہو تو چار ہزار روپے قاضی القضاۃ کے پاس اس تاکید کے ساتھ بھیج دو کہ یہ تمام رقم غریبوں میں تقسیم کر دی جائے۔''

☆☆☆

مالوہ کے جنگلوں میں رات ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ اس اندھیرے میں ایک سوار اپنے گھوڑے کو جتنی تیز دوڑا سکتا تھا دوڑا رہا تھا۔ اندھیرے نے کئی جگہ ٹھوکریں بچھا رکھی تھیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لیکن گھوڑا ہوشیار تھا کہ اپنے سوار کو جنگل سے باہر لے آیا۔

اعظم شاہ دن بھر کی مصروفیت کے بعد سونے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ چوب دار نے کسی قاصد کے آنے کی خبر سنائی۔ وہ ہڑبڑا کے خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔ یہ کون سا وقت ہے کسی قاصد کے آنے کا۔ بے اختیار اس کا دھیان دکن کی طرف گیا۔

قاصد کو اس کے حضور پیش کر دیا گیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ قاصد احمد نگر کی طرف سے آیا ہوگا لیکن اس کی امیدوں پر اس وقت پانی پھر گیا جب اسے معلوم ہوا کہ یہ قاصد ''ملا عاقل'' کی طرف سے آیا ہے۔ لفافے پر بھی ملا عاقل کا نام تحریر تھا۔ اس نے ملا عاقل کا نام سنا ضرور تھا لیکن ملاقات نہیں تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ ملا عاقل اسے خط لکھ رہا تھا۔ اس نے خط کو ایک طرف رکھا اور کچھ انعام دے کر قاصد کو اسی وقت روانہ کر دیا۔

قاصد کے روانہ ہونے کے بعد اس نے بے دلی سے لفافہ چاک کیا لیکن خط پر نظر پڑتے ہی اس کی مایوسی امید میں بدل گئی۔ یہ خط ملا عاقل نے اسے نہیں بھیجا تھا بلکہ ملا عاقل کے لفافے میں اس کی بہن زیب النسا کا خط تھا۔

''تمہارے نام براہِ راست خط بھیجنے میں پکڑے جانے کا خوف تھا اس لیے ملا عاقل کے پردے میں تمہارے نام خط بھیج رہی ہوں جو تمہیں مل جائے گا۔ ملا عاقل سے بہت سے علمی کاموں کے سلسلے میں خط کتابت رہتی ہے..... کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا اس لیے یہ سہارا لیا ہے۔ والی نعمت شدید علیل ہیں۔ ان کی علالت کی خبریں چھپائی جا رہی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اب بچنے کی کوئی امید نہیں۔ میری اس اطلاع کو حکم سمجھو اور فوراً روانہ ہو جاؤ۔ تمہیں ہر حال میں کام بخش سے پہلے پہنچنا ہے۔ تم پہنچو اس عرصے میں، میں تمہارے لیے راہ ہموار کرتی ہوں۔''

اس سے آگے بھی کچھ لکھا ہوگا لیکن اب اسے کچھ پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا یہ سوچنا بجا تھا کہ عین ممکن ہے کہ کام بخش کو بھی اس کے کسی مہربان نے اطلاع دے دی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے بادشاہ نے خود اس کے نام رقعہ لکھ دیا ہو اور وہ مجھ سے پہلے پہنچ جائے۔ مجھے ابھی اور اسی وقت احمد نگر کی طرف روانہ ہونا ہے۔

اس نے اسی وقت امیروں اور سرداروں کا اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس میں بھی اسی خدشے کا اظہار کیا گیا کہ ممکن ہے کام بخش وہاں پہلے سے موجود ہو لہٰذا اسے پورے فوجی ساز و سامان اور خزانے کے ساتھ احمد نگر روانہ ہونا چاہیے۔ (جہاں بادشاہ اس وقت ٹھہرا ہوا تھا)۔

اس نے اس رائے سے اتفاق کیا اور روانگی کی تیاری اس انداز میں کی جیسے وہ کسی جنگ پر جا رہا ہو۔ لشکر، خیمے، قناتیں، اونٹوں پر لدا ہوا خزانہ، ایک شہر تھا جو روانہ ہو رہا تھا۔

اس بھاری سامان کے ساتھ فاصلہ آہستہ روی سے کٹ رہا تھا لیکن وہ مطمئن تھا کہ خط کے مطابق بادشاہ علیل تھا، مرا نہیں تھا۔

دن بھر چلنے کے بعد وہ بادشاہی لشکر سے بیس کوس کے فاصلے پر تھا کہ مخالف سمت سے ایک سوار آتا نظر آیا۔ اس سوار کو گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

یہ سوار بارگاہِ شاہی سے یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ اورنگزیب کا انتقال ہو گیا ہے۔

اس اطلاع کے بعد اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اسی سست رفتاری سے سفر جاری رکھے اور لشکر کے ساتھ تیز رفتاری سے چلا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے لشکر کو پیچھے چھوڑا اور جریدہ یلغار کرتا ہوا چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچ کر ''گلال بار'' (بادشاہی احاطہ) میں داخل ہو گیا۔ اس کا اس طرح اچانک پہنچ جانا سب کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ یہ خبر کسی کو نہیں تھی کہ جس وقت اسے اطلاع ملی، وہ محض بیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ وہ پہلے پہنچ گیا تھا اس لیے اسی کو تخت نشیں ہونا تھا لہٰذا اس وقت جتنے امیر وہاں جمع تھے، سب نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس سے تعزیت بھی کی اور دبے لفظوں میں مبارک باد بھی دی۔ زیب النسا کی کوششوں سے بہت سے امیر پہلے ہی اس کے حق میں ہموار ہو چکے تھے۔

بادشاہ کے کفن دفن کے بعد شہزادہ اعظم شاہ عمدۃ الملک اسد خاں کے ہم رکاب دوسرے امیروں اور محل کی عورتوں کو تسلی دلاسا دیتا رہا اور انہیں اپنے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ خزانہ، جواہر خانہ، توپ خانہ اور دوسرے بادشاہی شعبوں کا جائزہ لیا اور ساری تفصیلات درج کرا کے ان چیزوں کو جو ساتھ رکھنے کے لائق تھیں، علیحدہ کرا دیا۔ سخت گیر داروغہ مقرر کیے تاکہ بار برادری اور سفر کی تیاری کا جلد از جلد انتظام کریں۔ ہندوستان اور ایران کے منجموں اور ستارہ شناسوں کی تجویز پر تخت نشینی کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی۔

اعظم شاہ کا بیٹا بیدار بخت اس کی نیابت میں احمد آباد پر مقرر تھا۔ اس تک بھی یہ خبریں پہنچ رہی تھیں۔ باپ کے نکل جانے کے بعد وہ بھی اس فکر میں تھا کہ وہ بھی احمد آباد سے کوچ کر جائے لیکن وفاداری پاؤں کی زنجیر بنی ہوئی تھی۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ باپ کی اجازت کے بغیر احمد آباد چھوڑ دے۔ وہ اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ اعظم شاہ کی طرف

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے حکم نامہ موصول ہو تو وہ روانہ ہو۔

اعظم شاہ نے تخت نشیں ہونے میں دیر نہیں کی۔ اس نے نامور امراء کے اتفاق سے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور تخت نشیں ہو گیا۔

بیدار بخت کے مشیر اسے نہایت صائب مشورہ دے رہے تھے کہ اسے اکبر آباد پہنچ کر خزانے پر قبضہ کر لینا چاہیے۔

ابراہیم خاں ناظم نے اس سے ملاقات کی اور اپنا تجربہ اس پر نثار کر دیا۔

''آپ اپنی فوج لے کر اکبر آباد پہنچ جائیں۔ آپ کے خسر مختار خاں وہاں کے صوبہ دار ہیں۔ وہاں کے خزانے میں کروڑوں روپے، اشرفیاں اور دیگر ساز و سامان ہے۔ وہ سب آپ کے قبضے میں ہو گا۔''

''میں والد کی اجازت کے بغیر یہ قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ میرے لیے لازمی ہے کہ میں ان کے حکم کا انتظار کروں۔''

''یہ مت بھولیے شہزادے کہ تخت کے وارث اور بھی ہیں۔ آپ سے پہلے کوئی اور وہاں پہنچ گیا تو قلعہ دار قلعے کی چابیاں اس کے حوالے کرنے میں دیر نہیں کرے گا۔''

''آپ کہتے ہیں تو میں ابا جان کی اجازت کے لیے خط لکھے دیتا ہوں۔''

اعظم شاہ اتنا محتاط تھا کہ اسے اپنے بیٹے پر بھی بھروسا نہیں تھا۔ اکبر آباد جانے کی بات سنی تو اس وہم میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں بیدار بخت خود بادشاہ نہ بن بیٹھے۔ وہ اسے دار الخلافہ سے دور رکھنا چاہتا تھا لہٰذا حکم بھیجا کہ وہ مالوہ کی سرحد پر پہنچ جائے اور وہاں حکم ثانی کا منتظر رہے اور جب تک بادشاہی لشکر پہنچ نہ جائے، وہاں سے آگے نہ بڑھے۔

شہزادے کو اکبر آباد جانے سے روکنا ایسی غلطی تھی جس پر بعد میں اسے کف افسوس ملنا پڑا۔

☆☆☆

شہزادہ کام بخش کو اورنگزیب نے بیجاپور روانہ کیا تھا۔ اس نے ابھی چالیس پچاس کوس کا فاصلہ طے کیا تھا اور ایک مقام قلعہ پرینڈہ پر پہنچ کر بیجاپور پر قبضے کی تیاریاں کر ہی رہا تھا کہ اسے باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ یہ واقعہ ہی ایسا تھا کہ تلوار کے قبضے میں اس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور پھر پہلے سے زیادہ مضبوط ہو گئی۔ صدمے نے اس کی طاقت کم کر دی تھی لیکن یہ سوچ کر رگوں میں خون دوڑنے لگا کہ اعظم شاہ اس سے پہلے پہنچ چکا ہے اور تخت نشینی کا اعلان بھی کر چکا ہے۔ اب جو ہو گا یہ تلوار ہی فیصلہ کرے گی۔ یہ سوچتے سوچتے وہ ایک مرتبہ پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اسے بیجاپور جانا چاہیے یا احمد نگر کی طرف لوٹ جائے جہاں اس کا بھائی پہلے ہی پہنچ چکا ہے اور تخت نشیں بھی ہو چکا۔ میری غیر موجودگی نے اسے یہ موقع دے دیا۔ یہ حق میرا ہے۔ میرے حق میں بہت سے امراء ہیں جو میری حمایت کریں گے۔ وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا یا پہنچ چکا تھا مگر کسی مشیر سے اپنے فیصلے کی تائید چاہ رہا تھا۔ اسے اپنے لشکر میں موجود امین خاں کا خیال آیا۔ یہ ترک امیر بہادر بھی تھا، تلوار کا دھنی بھی اور سیاسی داؤ پیچ بھی خوب جانتا تھا۔ بہادروں کی ایک بھاری جماعت بھی اس کے ہمراہ تھی۔

''امین خاں کو ہمارے حضور حاضر کیا جائے۔''

اونچی پیشانی، مضبوط جبڑوں اور لمبے ہاتھوں والا ایک شخص شہزادے کے خیمے میں داخل ہوا۔ شہزادہ اسے دیکھ کر یوں لپکا جیسے کوئی اپنے نجات دہندہ کو دیکھ کر لپکتا ہے۔

''امین خاں! تم نے کچھ سنا؟''

''شہزادہ عالی مقام! آپ اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہیں؟ آپ کو ایسا پریشان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ خیریت تو ہے؟''

''ہم پوچھ رہے ہیں آپ تک کوئی خبر پہنچی؟''

''مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ احمد نگر سے کوئی قاصد آیا تھا۔ آپ کو کیا حکم ملا، یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''حکم دینے والا اب اس دنیا میں نہیں رہا۔''

''اس کا مطلب ہے.....''

''جی ہاں۔ شہنشاہِ ہند اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

''خدا جانے والے کی مغفرت فرمائے۔'' امین خاں نے کہا اور کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کر لی۔ ''میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں لیکن یہ وقت تعزیت کا نہیں، یہ سوچنے کا ہے کہ اب کیا کیا جائے۔''

''ہم نے آپ کو اسی لیے طلب کیا ہے۔ ایسے وقت میں وفادار ہی صائب مشورہ دے سکتے ہیں۔''

''غلام کی رائے تو یہی ہو سکتی ہے کہ بیجاپور کا خیال چھوڑ کر احمد نگر کی طرف لوٹ جائیے۔ اس سے پہلے کہ اعظم شاہ وہاں پہنچے، آپ کو وہاں موجود ہونا چاہیے۔''

''وہ وہاں پہنچ چکا ہے۔''

''اتنی جلدی؟''

''وہ شاید وفات کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی مالوہ سے روانہ ہو چکا تھا۔ یہ بھی ہمارے خلاف سازشوں کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں معلوم ہے ہمشیرہ حضور اس کے حق میں تھیں۔ انہی کی اطلاع پر وہ احمد نگر آ گیا ہو گا جبکہ ہمیں ابا حضور کی بیماری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے بے خبر رکھا گیا۔''

''یہ وقت سازشوں کی دریافت کا نہیں، سازشوں سے ٹکراؤ کا ہے۔''

''ہم بیجاپور پہنچتے ہی اپنی تخت نشینی کا اعلان کردیں گے۔''

''یہ آپ کی سخت غلطی ہوگی۔ آپ کو اکبر آباد جانا چاہیے کیونکہ شہزادہ اعظم شاہ اب تک اکبر آباد کی جانب روانہ ہوچکا ہوگا۔ ہمیں اس کا راستہ روکنا ہوگا۔ اسے دارالخلافے تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ آپ کو اکبر آباد پہنچ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہیے۔''

''بیجاپور پہنچ کر ہمیں لشکر جمع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے بعد ہم بہ آسانی اعظم شاہ سے ٹکرا سکتے ہیں۔''

''یہ شہزادوں کی ضد ہے ورنہ اس میں سیاسی فائدہ کچھ نہیں۔''

''امین خاں! یہ ضد نہیں ہماری عقل کا فیصلہ ہے۔ ہم نے بیجاپور جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ہم آپ کو حکم دیں گے کہ آپ بھی ہمارے ہمراہ چلیں۔''

''جب آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میری زبان انکار کرنے سے قاصر ہے۔''

امین خاں نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا لیکن چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے شہزادے کے فیصلے سے اتفاق نہیں۔ صاف انکار کو بھی مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا۔ اس نے گردن جھکائی اور خیمے سے باہر نکل کر اپنے لشکر میں پہنچ گیا۔

اپنے خیمے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کسی نتیجے تک پہنچ چکا تھا لہٰذا خیمے میں قدم رکھتے ہی اس نے اپنے سرداروں کو طلب کیا اور انہیں چند احکامات دے کر رخصت کردیا۔

رات ابھی گئی نہیں تھی کہ وہ چلا گیا۔ بیجاپور کی طرف نہیں احمد نگر کی جانب۔ اعظم شاہ بادشاہت کے اعلان میں پہل کرچکا تھا۔ اس کا ساتھ دینے کا مطلب انعام کی فراوانی تھی۔ اس کے پاس پہنچنے کا مطلب اسے ہمیشہ کے لیے اپنا احسان مند کرنا تھا۔ اس نے اعظم شاہ کے مقابلے میں کام بخش کو رکھ کر دیکھا تو وہ اس کے مقابلے میں بزدل نظر آیا۔ میں بزدلوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ایک امیر سے کہا اور لشکر کو تیز رفتاری سے چلنے کی ہدایت کی۔

خیمے اسی طرح لگے ہوئے تھے لیکن ان خیموں میں سناٹوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔

رات گزری، صبح نمودار ہوئی۔ کام بخش کو رات کے کیے ہوئے فیصلے یاد آئے۔ امین خاں نے اس کے ساتھ چلنے کا

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

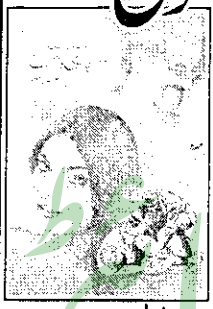

جولائی کے
گرم موسم کا
تر و تازہ شمارہ

بنیادی خرابی

دہشت و سیاست کے پیچ و خم سے گزرتے وحشت انگیز کھیل کا سنسنی خیز احوال..... **ایچ اقبال** کے قلم کا کمال

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا **طاہر جاوید مغل** کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت..... **عبدالرب بھٹی** کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

اسماء قادری اور **روبینہ رشید** کی سنسنی خیز و ولولہ انگیز کاوشیں.....

ان کے علاوہ

منظر امام، تنویر ریاض، سلیم انور، کبیر عباسی، جمال دستی، تمکین رضا اور عکس فاطمہ کی طبع زاد و ترجمہ کہانیاں

چٹنی تکہ چٹنی

آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عہد کیا تھا لہٰذا اس نے امین خاں کو طلب کرنے کے لیے اپنے محافظ سلطان حسن کو اس کے پاس بھیجا۔ وہ روانہ ہوا پلٹ کر آیا بھی لیکن عجیب خبر ساتھ لایا۔

''خیموں کی بستی میں انسانوں کا نشان تک نہیں۔''

''کیا مطلب ہے؟''

''امین خاں اپنے لشکر سمیت فرار ہوگیا ہے۔ اس کے یوں چلے جانے سے ہمارے لشکر میں بھی افراتفری مچی ہوئی ہے۔ سپاہیوں کی ہمتیں پست ہوگئی ہیں۔''

''سلطان حسن! یہ خبر کسی طرح بھی ہمارے لیے اطمینان کا باعث نہیں لیکن ہم بیجاپور جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ تم لشکر میں جاؤ اور کسی طرح سپاہیوں کو ہمارے ساتھ بیجاپور چلنے پر آمادہ کرو۔''

''شہزادہ عالم! ہمیں حکم ہوتا کہ اپنی گردن اپنے ہاتھ سے اتار کر رکھ دو تو یہ ہمارے لیے آسان ہوتا۔ لشکر میں یہ خبر پھیل چکی ہے کہ اعظم شاہ بادشاہت کا اعلان کر چکا ہے۔ انعام کے لالچ میں امین خاں کی طرح اور بہت سے اعظم شاہ کے پاس جانے کی سوچ رہے ہوں گے۔''

''تم بھی انہیں انعام کا لالچ دے سکتے ہو۔ ان سے وعدہ کرو کہ بیجاپور پہنچ کر وہاں کے قلعوں سے ملنے والی دولت لشکر میں تقسیم کر دی جائے گی۔''

''مجھے تو یہ کام پھر بھی مشکل نظر آتا ہے۔''

''کام مشکل نہ ہوتا تو ہم تمہارے سپرد کیوں کرتے۔ ہم ہمیشہ تمہارے احسان مند رہیں گے اور احسان اتارنے کی قیمت تم جانتے ہو۔''

حسن خاں اتنا کوڑھ مغز نہیں تھا کہ اس واضح اشارے کو نہ سمجھتا۔ انعام کے اس لالچ نے اسے لشکر میں بھیج دیا۔

اس نے اپنی چرب زبانی سے لشکر کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ بیجاپور جانے پر رضامند ہوگئے۔ حسن خاں کے ہاتھوں میں کھیلتا ہوا کام بخش بیجاپور کے سامنے پہنچ گیا۔ اسے ناز تھا کہ وہ اورنگزیب کا وارث ہے، ہندوستان کی بادشاہت کا وارث ہے۔ قلعہ دار اس کے استقبال کے لیے باہر آئے گا۔

کام بخش کو بڑا دھچکا اس وقت لگا جب اس کے استقبال کے لیے کوئی نہیں آیا۔ اس گستاخی کے باوجود اس نے قلعہ دار نیاز خاں کے پاس پیغام بھجوایا کہ قلعہ اس کے سپرد کر دیا جائے۔ قلعہ دار نے قلعہ سپرد کرنے سے انکار کر دیا۔ نہ صرف انکار کر دیا بلکہ برج و فصیل کو مستحکم کر کے مدافعت پر آمادہ ہوگیا۔ کام بخش کو بھی یقین ہوگیا کہ بزورِ شمشیر ہی قلعہ فتح ہوگا۔

اس نے بھی قلعے کے دروازے پر مورچا بندی کرا دی۔

چند روز کے محاصرے کے بعد حسن خاں کی کوشش سے پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ حسن خاں قلعے کے اندر گیا اور نیاز خاں سے ملاقات کی۔ نیاز خاں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اورنگزیب کی وفات ہوگئی ہے۔ وہ بضد تھا کہ چابیاں اسی وقت حوالے کرے گا جب اورنگزیب کی جانب سے حکم پہنچے گا۔ حسن خاں نے بڑی مشکل سے یہ باور کرایا کہ اورنگزیب کی وفات ہو چکی۔ جب یہ خبر پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی تو اس نے چابیاں حوالے کر دیں۔

قلعے کی چابیاں ملتے ہی اس نے بیجاپور اور اس کے اطراف کا بندوبست اور نظم و نسق کو سنبھال لیا۔ جب امن و امان پوری طرح بحال ہوگیا تو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ''دین پناہ'' کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔

در دکن زد سکہ بر خورشید و ماہ
بادشاہ کام بخش دین پناہ

تخت نشینی کے بعد کام بخش نے سات آٹھ ہزار سوار فراہم کیے اور مزید ایک قلعے کی تسخیر کے ارادے سے کوچ کر دیا۔ سید نیاز خاں قلعہ دار بیجاپور بھی ہمراہ تھا لیکن زیادہ دیر تک کام بخش کی رفاقت کا متحمل نہ ہوسکا اور اسے چھوڑ کر اعظم شاہ کے پاس بھاگ گیا۔

امین خاں کے فرار کے بعد یہ دوسرا دھچکا تھا جو شہزادہ کام بخش کو پہنچا تھا۔

کام بخش نے گلبرگہ پہنچ کر قلعے پر قبضہ کر لیا اور حسن خاں کی تجویز پر سادات بارہہ میں سے ایک شخص سید جعفر کو قلعہ دار مقرر کر کے قلعے کی طرف پیش قدمی کر دی جو عالمگیر کی وفات کے بعد اس کے قبضے سے نکل گیا تھا اور مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ پریا ناٹک یہاں حکمرانی کر رہا تھا۔

پریا نے محصور ہو کر پندرہ بیس دن تک مدافعت کی، آخر حسن خاں کی وساطت سے قلعے پر کام بخش کا قبضہ ہوگیا۔

☆☆☆

احمد نگر اور اکبر آباد سے بہت دور کابل کی سرزمین پر اورنگزیب کے ایک اور وارث شاہ عالم کی یہ آخری رات تھی۔ اسے باپ کی وفات کا علم ہو چکا تھا۔ صبح ہوتے ہی اسے لاہور اور پھر اکبر آباد روانہ ہونا تھا تاکہ تاج و تخت کی رسا کشی میں وہ بھی شریک ہوسکے جو اعظم شاہ اور کام بخش کے درمیان پہلے ہی جاری تھی۔ اسی رات اس نے امیروں کا اجلاس طلب کیا اور اس میں یہ طے ہوگیا کہ صبح روانہ ہونا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بیل

عثمان دراق بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے عتابی کو دیکھا کہ وہ بغداد کے شامی دروازہ میں کھڑے روٹی چبا رہے ہیں میں نے کہا "حضرت یہ کیا؟ آپ کو لوگوں کے سامنے اس طرح روٹی چباتے حجاب مانع نہیں آتا؟"۔۔۔ عتابی نے جواباً پوچھا "کسی بیل میں اگر بہت سے بل بندھے ہوں اور تمہیں اُن کے سامنے روٹی کھانی پڑ جائے تو کیا تمہیں حجاب مانع آئے گا؟"

میں نے جواب دیا "نہیں تو"

اس پر عتابی نے وضاحت کی کہ عامۃ الناس ذہنی طور پر بیل ہی ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں نے اس جواب کو پسند نہ کیا، مگر چپ ہو رہا۔ عتابی میرے دل کی کیفیت بھانپ گئے اور کہنے لگے "دیکھو مَیں ابھی ثابت کیے دیتا ہوں کہ عوام محض بیل ہیں اور اس سطح سے ہرگز بلند تر نہیں"۔

یہ کہہ کر عتابی ایک دکان کے تھڑے پر چڑھ گئے اور لوگوں کو پکارنا شروع کر دیا "اے لوگو اِدھر آؤ میں تمہیں ایک پتے کی بات بتاؤں، وہ بات جس میں تم سب کا فائدہ ہے"۔

لوگ ان کے ارد گرد اژدہام کرنے لگے، جب ہجوم خاصا ہو گیا تو آواز بلند خطاب کیا "اے میرے دوستو اور بھائیو! ایک سے زیادہ معتبر راویوں نے بیان کیا ہے کہ جس شخص کی زبان کی نوک ناک کی نوک کو چھو لیتی ہے وہ دوزخ میں نہیں جائے گا"۔

یہ سنتے ہی تمام افراد نے زبانیں نکال لیں اور کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح اپنی زبان کی نوک کو ناک کی نوک تک پہنچا لیں۔

مَیں یہ تماشا دیکھنے میں محو تھا کہ عتابی نے مجھ سے کہا "دیکھا مَیں نہ کہتا تھا کہ یہ لوگ محض بیل ہیں"۔

مرسلہ: محبوب ارشد لاہور

فتح اللہ خاں نہایت نامور امیر تھے۔ انہوں نے ایک مہم میں ایسے کارنامے انجام دیے کہ اورنگزیب نے انہیں "عالم گیری" کا خطاب دیا۔ نہایت منہ پھٹ تھے۔ اورنگزیب کے سامنے ایسی باتیں بے دھڑک کہہ دیا کرتے تھے جو کوئی اور نہیں کہہ سکتا تھا۔ سر سے اوپر ہو گئے تھے لیکن بدن لوہے کا اور دل فولاد کا تھا لیکن دربار میں سازشوں سے ایسے نالاں ہوئے کہ کابل میں تعیناتی کی درخواست پیش کر دی۔ بادشاہ ان کی درخواست ٹال نہ سکے اور انہیں کابل بھیج دیا جہاں شاہ عالم صوبہ داری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ شہزادے نے ان کی آمد کو اپنے لیے نیک فال سمجھا۔ وہ اس کے بزرگ بھی تھے اور نہایت بہادر بھی۔ ان کا آنا شہزادے کی طاقت میں بے پناہ اضافہ کر سکتا تھا۔ شہزادے نے ان پر نوازشوں کی بارش کر دی۔ طبیعت رنگین پائی تھی لہٰذا ایک کنیز وردانہ ان کی نظروں میں آ گئی تھی۔

شہزادے کی مجلس سے اٹھے تو انہیں وردانہ کا خیال آیا۔ کیا خبر پھر اس سے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ وردانہ معمولی سی کنیز تھی لیکن جب سے ان کی نظروں میں آئی تھی، کنیز سے ملکہ بن گئی تھی۔ الگ محل میں رہنے لگی تھی۔ دولت میں کھیل رہی تھی۔

محل میں ہر طرف خاموشی تھی۔ پہرے داروں کے سوا کوئی بھی بیدار نہیں تھا کہ چوب دار نے فتح اللہ خاں کی آمد کی اطلاع دی۔ وردانہ کو ناگوار تو گزرا لیکن وہ کوئی اور نہیں فتح اللہ خاں تھے۔ انہیں انکار کیسے کر سکتی تھی۔

فتح اللہ خاں کو ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ وردانہ استقبال کو کیوں نہیں آئی۔ اتنے ناوقت آنا ہوا تھا۔ وردانہ سوگئی تھی۔ بیدار ہونے اور تیار ہونے میں وقت تو لگ ہی جاتا ہے۔ فتح اللہ خاں کو بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی۔ بے نیام تلوار ان کے ہاتھ میں تھی۔ نیند کا جھونکا جو آیا تو تلوار چھوٹ کر فرش پر گری، ایک چھناکا ہوا۔ فتح اللہ خاں کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے جھک کر تلوار اٹھالی۔ اسی وقت سولہ سنگھار کیے، خوشبوؤں میں بسی وردانہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"خان صاحب! ہم نے ابھی ایک آواز سنی تھی۔ آپ کے گوش مبارک تک بھی پہنچی ہو گی۔"

"ہمارے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر فرش پر گری تھی۔ اسی کی آواز ہو گی۔"

"ہم تو پھر کہیں کے نہ رہے۔ آپ کے ہاتھ سے تلوار بھی چھوٹنے لگی ہے۔ یہ آپ کا نہیں ڈھلتی عمر کا قصور ہے۔"

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس نے نادانستگی میں بڑی نازیبا بات کہہ دی تھی لیکن فتح اللہ خاں اس وقت کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتے تھے اور پھر بات سچ بھی تھی کہ وہ اسی کے قریب پہنچ رہے تھے۔

زبان تھی جو پھسل گئی لیکن دردانہ کو فوراً احساس ہوگیا۔ وہ اپنی اور فتح اللہ خاں کی خفت مٹانے کے لیے سامنے سے ہٹ گئی۔

واپس آئی تو ہاتھ میں صراحی اور ساغر تھا۔ اس نے ساغر بھرا۔

''اس وقت ہم اس ارادے سے نہیں آئے۔''

''ارادہ کوئی بھی ہو، آپ ہمارے مہمان تو ہیں۔''

''تم کہتی ہو تو.....'' فتح اللہ خاں نے جامِ شراب اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''آپ آج کچھ بدلے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔''

''تم نے یہ سوچا بھی کیسے!''

''کوئی پریشانی ضرور ہے ورنہ آج سے پہلے پہلا جام آپ ہمارے ہاتھ سے پیتے تھے۔ آج آپ نے یہ موقع نہیں دیا۔ ہاتھ بڑھایا اور جام ہمارے ہاتھ سے لے لیا۔''

''دردانہ! یہ بتاؤ تم ہمیں کتنا چاہتی ہو؟''

''اب ہمارے کہنے کی باری ہے کہ آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟''

''اگر میں تم سے دور چلا جاؤں؟''

''وہ دن ہماری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم سے آپ کا دل بھر گیا ہے۔''

''ہمارا دل نہیں بھرا، حالات ہمیں تم سے دور کرنے پر آمادہ ہیں۔''

''ہم بھی تو سنیں ایسے کیا حالات ہوگئے۔''

''شہنشاہ اورنگزیب کا انتقال ہوگیا ہے۔''

''اللہ خیر کرے۔ تصدیق ہوگئی یا.....''

''ہاں، معتمد خاں کی عرض داشت پہنچی ہے۔''

''یہ نام تو ہم آج سن رہے ہیں۔''

''شاہ عالم جب کابل تشریف لا رہے تھے تو معتمد خاں کو لاہور میں اپنی جاگیر کا دیوان مقرر کردیا تھا۔ یہ اطلاع انہی کی جانب سے آئی ہے اور اب شہزادہ عالی مقام کوچ کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

''اب کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔'' دردانہ نے دوسرا جام ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ یقیناً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کو ان کے ساتھ جانا ہوگا۔''

''تم ہماری صحبت میں بہت ہوشیار ہوگئی ہو۔ اعظم شاہ اور کام بخش نے الگ الگ تخت نشینی کا اعلان کردیا ہے۔ شہزادہ والا تبار بھی امیدوار ہیں لہٰذا تینوں بھائیوں میں ٹکراؤ لازمی ہے۔ جنگ ہو اور شاہ عالم کے ساتھ ہم نہ ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔''

''مشکل تو یہی ہے۔ حکم ہوگیا ہے کہ شہزادے کے حرم کے سوا کوئی خاتون ساتھ نہیں ہوگی۔''

''آپ شہزادے سے اجازت لے لیں۔ ہمیں معلوم ہے وہ آپ کی بات نہیں ٹالیں گے۔'' دردانہ نے ان کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میرا تمہارا تعلق خفیہ ہے۔ میں اسے افشا نہیں کرسکتا۔''

''خدا کی قسم اگر آپ ہمارے بغیر گئے تو ہم ہیرا کھالیں گے۔'' وہ تڑپ کر کھڑی ہوگئی اور یہ ظاہر کیا جیسے انگلی میں پڑی ہیرے کی انگوٹھی منہ میں رکھنے والی ہے۔

فتح اللہ خاں نے اس کی کلائی پکڑی اور ایک جھٹکے سے اپنی آغوش میں گرالیا۔

''جب تم نہیں تو ہم بھی کیوں جانے لگے تھے۔''

دردانہ نے موقع دیکھ کر ان کی طرف ایک جام اور بڑھا دیا اور پھر باتوں باتوں میں کئی جام پلا دیے۔ تیز شراب نے اثر دکھایا اور فتح اللہ خاں نے تکیے پر سر رکھ دیا۔

دردانہ نے سرہانے رکھی شمع پھونک مار کر بجھائی اور کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

شاہ عالم نے پیش خانہ فوری نکالنے کا حکم دیا۔ جتنے امیر ہم رکاب تھے سب نے رفاقت کی لیکن فتح اللہ خاں نے ساتھ چلنے سے انکار کردیا۔ یہ دردانہ کی پلائی ہوئی تیز تر شراب کا اثر تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔

فتح اللہ خاں کا انکار شہزادے کے لیے کسی حادثے سے کم نہیں تھا۔ ان کی جاں نثاری اور بہادری بے مثل تھی اور وہ ہی ساتھ چلنے سے انکاری تھے۔ شہزادہ زبردستی کرسکتا تھا لیکن اس وقت کسی قضیے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے حکم دیا۔

''ہمارے قدیم نمک خوار جاں نثار خاں کو جو بہادری اور وفاداری میں فتح اللہ خاں کا ثانی ہے اور ہمارا تربیت یافتہ اور وفادار ہے خط لکھا جائے کہ وہ ہمارے پہنچنے سے پہلے اکبر آباد کی سرحد پر پہنچ جائے۔ وہ وہاں پانچ چھ ہزار سوار لے کر شہزادہ عظیم الشان کے پاس حاضر ہوجائے۔'' شہزادہ معز الدین ٹھٹھہ کا صوبہ دار تھا اور شہزادہ اعزالدین ملتان میں باپ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

(شاہ عالم) کا نائب تھا۔ ان دونوں کو اور دوسرے امراء کو جلی کے احکام بھی صادر ہو گئے جن سے شاہ عالم کو وفاداری اور جاں نثاری کی توقع تھی۔

یہ خطوط روانہ کرنے کے بعد اس نے لاہور کی طرف کوچ کرنے کا فرمان جاری کر دیا۔

☆☆☆

جاں نثار خاں عرصہ دراز سے گوالیار کا فوج دار اور قلعہ دار تھا۔ شاہ عالم کی خدمت میں حاضر رہا تھا۔ شاہ عالم کو امید تھی کہ جاں نثار خاں تیرہ چودہ سال سے ایک سرسبز اور سیر حاصل جاگیر میں فوج داری اور قلعہ داری پر مامور ہے یقیناً وہ بڑی عمدہ اور منظم فوج لے کر آئے گا۔

شاہ عالم کی امیدیں اپنی جگہ لیکن جب جاں نثار خاں کے پاس شاہ عالم کا خط پہنچا تو وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اعظم شاہ نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے جبکہ شاہ عالم طویل فاصلے پر ہے۔ نامعلوم وہ یہاں تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ اسے کامیابی نصیب ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ فوری فائدہ اسی میں ہے کہ اعظم شاہ کا ساتھ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی شاہ عالم سے قدیم وابستگی کا خیال بھی تھا۔ وہ بہ یک وقت دو کشتیوں پر سوار تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سلطنت کے دو امیدواروں میں سے کس کا ساتھ دے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر ایک عرضی تیار کی اور اعظم شاہ کی خدمت میں ارسال کر دی۔

''اگرچہ میں بظاہر شاہ عالم کے قدیم خدمت گزاروں میں سمجھا جاتا ہوں مگر میں دل و جان سے آپ کی بارگاہ کا عقیدت مند ہوں اور حاضر ہونے کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ نکلنے کی تیاری کر رہا ہوں مگر یہاں بار برداری اور زنانہ سواریوں کا انتظام نہیں۔ شاہ عالم کا بیٹا محمد عظیم قریب آ رہا ہے۔ اس نے میری گرفتاری کے لیے ایک فوج مقرر کر دی ہے۔ اب براہ کرم آپ اس بلائے عظیم کے پہنچنے سے قبل ہی ایک منظم فوج کے ہمراہ بار برداری اور سواری بھیج دیجیے تاکہ میں آپ کے حضور میں پہنچ جاؤں۔''

اس نے ایک تیر سے دو شکار کھیلے۔ اس نے ایسی ہی ایک عرضی محمد عظیم کے نام بھی لکھ کر اسے روانہ کی۔

''مجھے میرے قدیم محسن یعنی آپ کے والد ماجد شہزادہ شاہ عالم کی جانب سے نامہ موصول ہوا ہے کہ میں اکبر آباد پہنچ کر آپ کے حضور حاضر ہو جاؤں۔ میں حق نمک ادا کرنے کا خواہاں ہوں لیکن اعظم شاہ نے میری گرفتاری کے لیے ایک فوج روانہ کر دی ہے۔ میرے پاس بار برداری اور زنانہ سواریوں کی کمی ہے۔ اگر آپ ایک فوج اور بار برداری بھیج دیں تو میں مع اہل و عیال آپ کے حضور حاضر ہو جاؤں۔''

ایک ہی مضمون کے دو خطوط دو مختلف لوگوں کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ جہاں سے بھی پہلے فوج آ جائے، وہ اسی کے ساتھ روانہ ہو جائے اور دوسرے فریق سے معذرت کی گنجائش رہ جائے کہ فوج آئی تھی مجھے گرفتار کر کے لے گئی۔ اگر آپ فوج بھیج دیتے تو میں آپ کے ساتھ ہوتا۔ میں تو آپ ہی کے پاس آنے کا خواہش مند تھا، آپ نے میری مدد کے لیے فوج ہی نہیں بھیجی۔

اس کی یہ چالاکی اس وقت دھری رہ گئی کہ دونوں میں سے کسی کے پاس سے بھی کوئی جواب نہیں آیا اور شاہ عالم کابل سے چل کر لاہور کے نواح میں پہنچ گیا۔ منعم خاں اپنی فوج کے ساتھ باہر نکلا۔ توپ خانے کا معائنہ کرایا اور شاہ عالم کے حضور چالیس لاکھ روپے کی فراہمی کی دستاویز پیش کی۔

اسی ویرانے میں اس نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا اور حکم دیا کہ اس کے نام کا خطبہ پڑھا جائے اور سکہ جاری کرنے کا حکم دیا۔

ہم رکاب امیروں نے تسلیمات اور مبارک باد پیش کی۔ اسی ویرانے میں خیمہ شاہی کو ''گلال بار'' (احاطہ شاہی) کا خطاب دیا گیا۔ یہیں پہلا دربار ہوا۔ شہزادوں کو حاضری کا حکم ہوا۔

شہزادہ معز الدین اپنے بڑے بیٹے اعز الدین کے ساتھ حاضر ہوا اور باپ کی قدم بوسی کی۔ شاہ نے اسے پچیس ہزاری پندرہ ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔ اس کے بیٹے اعز الدین کو تین ہزار سوار کا منصب عطا کیا۔

شہزادہ محمد عظیم وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے غائبانہ اٹھارہ ہزاری پندرہ ہزار سوار کا منصب دیا اور اکبر آباد جلد پہنچنے کے احکام صادر کیے۔

اسی طرح دوسرے شہزادوں کو بھی مناصب اور امراء کو خطابات سے نوازا گیا اور سب کو آئندہ ترقی کی امید اور توقع دلا کر راضی کیا گیا۔ لاہور کے خزانے سے چالیس لاکھ روپے لیے اور دہلی کے ارادے سے کوچ کر گیا۔ اکبر آباد کی اسے فکر نہیں تھی کیونکہ محمد عظیم کو وہ پہلے ہی اکبر آباد پہنچنے کا حکم دے چکا تھا۔

محمد عظیم نے باپ کا حکم ملتے ہی بیس ہزار کا لشکر جمع کیا اور برق رفتاری سے اکبر آباد پہنچ گیا۔ کسی جنگ کے بغیر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اکبرآباد میں داخل ہوگیا۔ صوبہ دار مختار خاں کو محصور کر کے بے دخل کردیا۔ قلعہ دار باقی خاں پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ جو وارث پہلے پہنچ جائے گا، وہ خزانے کی چابیاں اس کے حوالے کردے گا۔ بیدار بخت ابھی مالوہ کی سرحد ہی پر رکا ہوا تھا کہ محمد عظیم وہاں پہنچ گیا۔ ایک بھائی کی اولاد نے موقع گنوادیا، دوسرے بھائی کی اولاد نے ہاتھ بڑھایا اور ساغر اٹھالیا۔

اعظم شاہ کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوا ہوگا۔ اگر وہ بیدار بخت کو اکبرآباد پہنچنے کا حکم دے دیتا تو منظر ہی دوسرا ہوتا۔

شاہ عالم دہلی پہنچا ہی تھا کہ محمد عظیم کی طرف سے تسخیر اکبرآباد کی خبر اس تک پہنچ گئی۔ اس نے اس فتح کی خوشی میں شادیانے بجانے کا حکم دیا۔

شادیانوں کی آواز سے قریہ دہلی گونجا تو قلعہ دار کو ہوش آیا۔ کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس قدر جلد کابل سے دہلی پہنچ جائے گا۔ اب جو اس نے دہلی کو کابل بنادیا تو سب کو یقین ہوگیا کہ بادشاہت کی جنگ میں اسی کا پلہ بھاری رہے گا۔ بادشاہت کے دو دعویدار دکن اور بیجاپور میں تھے اور وہ دہلی تک پہنچ گیا۔ اکبرآباد بھی اس کی مٹھی میں تھا۔ اس وقت جو اس کا ساتھ دیتا وہی فائدے میں رہتا۔ قلعہ دار نے چابیاں اس کے حوالے کردیں۔ بادشاہی ملازموں اور عدالت کے عہدے داروں اور دوسرے کارگزاروں نے آکر مبارک بادیں دیں اور عنایات و اعزازات سے نوازے گئے۔

شاہ عالم نے دہلی کے بزرگان دین کے مزاروں کی زیارت کی اور درگاہوں کے خدام کو نذر نذرانے پیش کیے اور دہلی کا نظم و نسق درست کرنے کے بعد اس نے وہاں کے خزانے سے تیس لاکھ روپے لیے اور اکبرآباد کی طرف کوچ کرگیا۔ تمام راستے اشرفیاں لٹاتا ہوا اکبرآباد کے قریب ''دھرہ'' نامی باغ میں قیام کے لیے رک گیا۔

اس کے آنے کی شہرت ہوئی تو محمد عظیم، قلعہ دار باقی خاں کے ہمراہ باریاب ہوا۔ باقی خاں نے آگے بڑھ کر خزانے کی چابیاں شہزادے کے قدموں میں رکھ دیں اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

''باقی خاں! ہماری عنایات ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی۔''

''حضور کی طبع فیاضی سے یہی امید ہے۔ میری نسلیں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہیں گی۔'' باقی خاں نے کہا اور خزانے کی فہرست ملاحظے کے لیے پیش کی۔ اس فہرست کے مطابق خزانے میں اس وقت نو کروڑ مالیت کی اشرفیاں تھیں اور چوبیس کروڑ کے طلائی آلات تھے۔ اس کے علاوہ ''غریب نواز'' نامی روپیہ بھی تھا جو شاہ جہاں نے پانچ سو تولہ وزن میں خاص طور سے انعام میں دینے کے لیے تیار کرایا تھا۔

اعظم شاہ نے اپنی غلطی سے اس عظیم خزانے کو ہاتھ سے نکال دیا تھا۔ اس نے بیدار بخت کو اکبرآباد نہ بھیج کر سخت غلطی کی تھی اور اب اس کا موقع نہیں رہا تھا۔ بیدار بخت اگر پہلے آگیا ہوتا تو یہ خزانہ اس کے ہاتھ لگتا۔ لوگ تو اس کے ساتھ ہوتے ہیں جس کے پاس دولت ہوتی ہے۔ شاہ عالم کے پاس اتنی دولت آگئی تھی کہ وہ اپنے ہمراہیوں کو دولت سے خرید سکتا تھا۔ اس نے یہی کیا۔ امراء اور شہزادوں کو مالا مال کردیا۔ فوج کے تمام ملازموں اور سرکاری کارگزاروں کی رکی ہوئی تنخواہیں ادا کردی گئیں۔ تنخواہوں کے علاوہ بھی انہیں اتنا نوازا کہ سب اس کا دم بھرنے لگے۔ لشکر میں ایک نئی جان پڑگئی۔ مزید کی آرزو میں ہر شخص اس پر جان دینے کے لیے تیار ہوگیا۔

دولت کی اس برسی بارش میں بھیگنے کے لیے بہت سے لوگ شاہ عالم کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ ان میں سب سے اہم سادات بارہہ کے تین بھائی نور الدین علی، حسن علی اور حسین علی اپنے اپنے لشکر لے کر شاہ عالم سے مل گئے۔

جاں نثار خاں ابھی تک ہوا میں معلق تھا۔ وہ بلا کا مدبر تھا لیکن اس مرتبہ اسے بری طرح شکست ہوئی۔ اس نے دو کشتیوں پر سوار ہونا چاہا تھا اور بالآخر ڈوب گیا۔ اعظم شاہ نے بھی اس کی عرضی کا جواب نہیں دیا اور محمد عظیم نے بھی خاموشی اختیار کی۔ وہ مجبور ہوکر اکبرآباد پہنچ گیا لیکن گنتی کے چند سواروں کے ساتھ۔

جب وہ حاضرِ خدمت ہوا تو شاہ عالم نے بڑی توقع کے ساتھ دریافت کیا۔

''تم کتنی فوج ساتھ لائے ہو؟''

''تین چار ہاتھی اور پندرہ بیس سوار لے کر آیا ہوں۔''

یہ بات شاہ عالم کو نہایت ناگوار گزری اور اس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ جاں نثار خاں اتنا بھولا نہیں تھا کہ اس رویے کو سمجھ نہ سکتا لیکن اب وہ بے چھتری کے کبوتر کی طرح تھا۔ جاتا بھی تو کہاں جاتا۔ اس امید پر شاہ عالم کے ساتھ لگا رہا کہ شاید کوئی راہ نکل آئے۔

دوسری جانب اعظم شاہ اکبرآباد کے خزانے کے چھن جانے پر کفِ افسوس مل رہا تھا لیکن ایسا کم ہمت نہیں تھا کہ مالی پریشانیوں کو سامنے دیکھ کر چلنا بھول جاتا۔ اس نے بڑے بھائی شاہ عالم کے اقتدار کو پاؤں تلے روندنے کے لیے کوچ کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

ارادہ کر ڈالا۔ تخت نشینی میں بھی اس نے پہل کی تھی اور اب جنگ میں بھی اولیت کا سہرا اپنے سر باندھنا چاہتا تھا۔ کام بخش ابھی تک خاموش بیٹھا تھا لیکن اس نے بھی جنبش کی۔ اپنی فوج اور توپ خانہ لے کر احمد نگر سے نکلا۔ بڑے بڑے امیر اس کے ہم رکاب تھے۔

اس کوچ کے دوران سرمائے کی کمی نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ فوج کے مطالبات کے ادا کرنے، نقد روپیہ اور انعام دینے میں اس نے ہاتھ روک رکھا تھا کیونکہ فیاضی دکھانے کے لیے اس کے پاس خزانہ بہت کم تھا۔ وہ فوج کو دم دلاسے دیتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تقاضے بڑھے تو اس کے مزاج کی درشتی غالب آ گئی۔ امراء کچھ عرض کرتے تو وہ انہیں بے مروتی سے ڈانٹ دیتا۔ یہاں تک کہہ دیتا کہ مجھے تمہارے لشکر کی ضرورت نہیں۔ جو مجھے چھوڑ کر جانا چاہتا ہے شوق سے چلا جائے۔

وعدوں پر جنگ نہیں لڑی جاتی جبکہ وہ ان وعدوں کے سہارے آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ شاہ عالم پر غلبہ پانے کے بعد وہ ان کے قدموں میں دولت کے ڈھیر لگا دے گا۔

فوج میں ناراضگی بڑھتی جا رہی تھی۔ انعامات تو درکنار تنخواہیں تک ادا کرنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

وہ برہان پور سے گزر رہا تھا کہ چین قلیچ خاں بہادر جسے ''خانِ دوراں'' کا خطاب ملا ہوا تھا، اعظم شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے لشکر کی تنخواہوں کا مطالبہ پیش کیا۔

''میرے لشکر میں تنخواہوں کا مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے۔''

''تم جانتے ہو ابھی میرے پاس خزانہ نہیں۔ شاہ عالم پر غلبہ حاصل کرتے ہی سب کی تنخواہیں ادا کر دوں گا۔''

''حضور! میں نے یہ بھی کہہ کر دیکھ لیا لیکن وہ کہتے ہیں اگر شکست ہو گئی تو ہماری تنخواہوں کا کیا ہو گا۔''

''کچھ بھی ہو انہیں سمجھاؤ۔ جو نہیں مانتا اس سے کہو لشکر چھوڑ کر چلا جائے۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔''

''آپ سمجھتے ہیں ہم کسی لشکر کے بغیر یہ جنگ جیت لیں گے؟''

''میں بزدل نہیں ہوں جو بزدلوں کی باتوں پر توجہ دوں۔'' اعظم شاہ نے کہا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ قلیچ خاں بھی جھنجلا کر اٹھا اور اپنے لشکر کی طرف روانہ ہو گیا۔

صبح ہوئی تو شور مچ گیا۔ چین قلیچ خاں اپنے آدمیوں کو لے کر لشکر سے نکل گیا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ اورنگ آباد کی طرف گیا ہے۔

جب اس فرار کی خبر اعظم شاہ کو ہوئی تو اس نے اس خبر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ بعض نے مشورہ بھی دیا کہ سوار دوڑا کر اسے واپس بلا لیا جائے لیکن اس نے سنی ان سنی کر دی۔

اسے اپنی بہادری پر اتنا ناز تھا کہ کسی اور کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔

چین قلیچ خاں کے چلے جانے کے بعد دوسرے امراء میں مایوسی پھیل گئی۔ اپنی ناقدری کا احساس بھی ہوا۔ ان میں سے ہر ایک یہ سوچنے لگا کہ ہم اس کے لیے جنگ کر رہے ہیں جسے ہماری اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ ایک امیر محمد امین خاں بھی تھے جنہوں نے سب سے زیادہ اپنی ذلت محسوس کی اور مغلوں کی ایک بڑی تعداد لے کر لشکر سے نکل گئے۔

اس نے اس خبر کو بھی دامن پر پڑی دھول کی طرح جھاڑ دیا۔

اس کے دو عظیم سردار اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے اور بہت سے چلے جائیں گے۔ یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا جا رہا تھا لیکن اعظم شاہ ذرا بھی پریشان نہیں تھا۔ اس نے کوچ کا حکم دیا اور برہان پور سے نکل گیا، اسے جلد از جلد گوالیار پہنچنا تھا۔

مرہٹوں کے پیشوا سیواجی کا پوتا راجا ساہو بھی لشکر کے ہمراہ تھا۔ مرہٹوں کا پیشہ راہزنی اور لوٹ مار ہوا کرتا تھا۔ راجا ساہو کا رجحان بھی اسی طرف تھا لیکن کسی مہربان نے اسے اعظم شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ اعظم شاہ کے ساتھ تھا۔ اب جو حالات بدلے نظر آئے تو پرانی روش پر لوٹ جانے کا خیال آیا اور لشکر سے نکل بھاگنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ اس نے ایک خاص منصوبے کے تحت اپنے ساتھیوں کو اعظم شاہ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔

''وہ دن دور نہیں جب فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔ اعظم شاہ کے پاس ہمیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اس سے زیادہ دولت تو ہم لوٹ مار کر کے حاصل کر لیں گے۔ اس وقت مغلوں میں انتشار ہے۔ ہندوستان کا کوئی بادشاہ نہیں ہے جو بندوبست کرے۔ طوائف الملوکی کا دور ہے۔ لوٹ مار کا اچھا موقع ہے۔ اگر تم لوگ میرے ساتھ چلو تو ہم اچھا خاصا بڑا گروہ بنا لیں گے۔''

جب اچھے خاصے مرہٹے اس کے ہم نوا ہو گئے تو وہ لشکر سے نکل بھاگا۔ تقریباً پچاس رفیق اس کے ساتھ تھے۔ ایک مقام پر دشوار گزار پہاڑوں سے گزرتے ہوئے اسے موہن سنگھ زمیندار کا خیال آیا۔ یہ مشہور فتنہ پرداز تھا۔ ساہو جی اس کے پاس چلا گیا۔ یہاں سے وہ ایک مشہور مرہٹے لٹیرے آنبو نامی کے پاس چلا گیا۔ یہ لٹیرا بندرگاہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سورت سے برہان پور تک لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ اس لٹیرے نے ایک فوج ساہو کے حوالے کردی اور وہ بہ حفاظت اپنے موروثی قلعوں تک پہنچ گیا۔

عرصہ دراز تک اس کے دم سے فساد کی آندھی چلتی رہی اور وہ مغلوں کے لیے دردِ سر بنا رہا۔

اعظم شاہ ایک ندی نربدا کو عبور کر کے گوالیار پہنچا۔ یہاں سے آگے بڑھ کر اسے اکبر آباد پہنچنا تھا جہاں شاہ عالم کا لشکر اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

وہ فوج کی تنظیم نو کرنے اور ضروری تیاریوں کے لیے قلعہ گوالیار میں اترا۔

اب حالات یہ تھے کہ اعظم شاہ، کام بخش اور شاہ عالم ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے تیار تھے۔ اعظم شاہ چونکہ دلیر بھی تھا اور جلد باز بھی اس لیے تیز رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ شاہ عالم صلح پسند تھا لیکن اعظم شاہ کو آزاد بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ اعظم شاہ قلعہ گوالیار میں ٹھہرا ہوا ہے اور کسی وقت بھی اکبر آباد کی جانب کوچ کرسکتا ہے تو اس نے ایک نصیحت آمیز خط بھائی کی خدمت میں تحریر کیا۔

''کیا ضرور ہے کہ حصولِ تخت کے لیے مخلوقِ خدا کا خون بہایا جائے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فیصلہ جنگ کے میدان ہی میں ہو۔ ہم تینوں بھائی جنگ کے بغیر بھی تو کسی فیصلے پر پہنچ سکتے ہیں بلکہ یہی راستہ مناسب ہوگا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ والد محترم نے وفات سے قبل ملک کی تقسیم کے سلسلے میں وصیت نامہ لکھ دیا تھا۔ دکن کے چھ صوبوں میں سے چار صوبے بشمول صوبہ احمد آباد تم کو دے دیا تھا۔ ان کے علاوہ میں تمہیں ایک دو صوبے اور بھی دیتا ہوں تاکہ خونریزی سے بچا جاسکے۔ اسلام پر ایمان رکھنے والوں کا اعتقاد یہی ہے کہ ایک مسلمان کے خون کے کفارے میں جو ناحق بہایا گیا ہو اگر ایک ملک کا خراج بھی دے دیا جائے تو بھی اس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ تم کو چاہیے کہ والد محترم نے جو کچھ عطا کردیا ہے، اس پر راضی ہوجاؤ اور فساد کو رفع کرنے کی کوشش کرو۔''

خط کے آخر میں شاہ عالم نے استدعا کی تھی کہ وہ اس خط کا جواب ضرور دے۔ اگر یہ عبارت موجود نہ ہوتی تو شاید اعظم شاہ اس کاغذ کے پرزے کرکے ہوا میں اڑا دیتا، کوئی اہمیت نہ دیتا لیکن اس نے سوچا جب اسے تاکید کی گئی ہے تو وہ اپنے جذبات بھائی تک پہنچا دے۔ وہ اتنے غصے میں تھا کہ کاتب کو طلب کرنا بھی بھول گیا، دوات اور قلم طلب کیا اور اپنے ہاتھ سے جواب تحریر کرکے شاہ عالم کی طرف سے خط لانے والوں کے حوالے کردیا۔

''مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سفر کے مصائب نے تمہاری عقل تم سے چھین لی ہے یا لالچ نے بے حواس کردیا ہے کہ سلطنت کو حصوں میں تقسیم کرنے کی بات کرتے ہو۔ تم نے تو شیخ سوری کی گلستان بھی نہیں پڑھی۔ اگر پڑھی ہوتی تو یہ جملہ ضرور نظر سے گزرا ہوتا۔

''دو بادشاہ ایک ملک میں نہیں سما سکتے اور دس درویش ایک کمبل میں سما جاتے ہیں۔'' بھلا ایک نیام میں دو تلواریں کیسے رہ سکتی ہیں۔

''چو فردا برآید بلند آفتاب
من و گرز و میدان و افراسیاب''

(جب کل آفتاب طلوع ہوگا تو میں ہوں گا، گرز ہوگا، میدان ہوگا اور افراسیاب ہوگا)

یہ جواب جیسے ہی شاہ عالم کے روبرو پہنچا، اس کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔

''اے اللہ! میں تجھے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے رفع شر کے لیے بہت کوشش کی لیکن اعظم شاہ ضدی بھی ہے اور اس کی بربادی اس کو آواز بھی دے رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ خود کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے لیکن میں کیا کرسکتا ہوں۔ اگر وہ تلوار سے فیصلہ چاہتا ہے تو یوں ہی سہی لیکن پہل میں نہیں کروں گا۔ جب وہ پہل کرے گا تو میں آگے بڑھوں گا۔''

سادات بارہہ کے تین بھائی نورالدین علی، حسن علی اور حسین علی کچھ دنوں سے شاہ عالم کے دست راست بنے ہوئے تھے۔ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھے۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔

''اگر اعظم شاہ میرے ہاتھوں مارا جائے تو تم گواہ رہنا کہ یہ خون میری گردن پر نہیں۔ اپنی ہلاکت کا سبب خود اعظم شاہ ہوگا۔''

''ہم گواہی دیں گے۔ جو آپ کا دشمن وہ ہمارا دشمن۔ آپ زحمت نہ کیجیے گا۔ میدان جنگ میں فیصلہ ہماری تلوار کرے گی۔''

حسین علی اور حسن علی رخصت ہوئے ہی تھے کہ جاسوسوں نے آکر اطلاع دی۔ ''اعظم شاہ نے کوچ کردیا ہے۔ وہ دریائے چنبل کو جو اکبر آباد سے اٹھارہ کوس کے فاصلے پر ہے عبور کریں گے۔''

اعظم شاہ نے تمام غیر ضروری سامان، خزانہ جواہرات وغیرہ قلعے میں چھوڑ دیے تھے۔ ہمراہی امیروں کے خاندان بھی قلعے میں رہ گئے تھے۔ حرم کی چند عورتوں کو ساتھ رکھا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اشرفیوں کی ایک مقدار بھی رکھ لی تھی اور چند امیروں کو گوالیار کی حفاظت پر مامور کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

اس کی روانگی کی اطلاع ملتے ہی شاہ عالم نے داروغہ توپ خانہ کو حکم دیا کہ وہ چند بہادروں کے ساتھ جائے اور گھاٹ پر قبضہ کر کے اعظم شاہ کی فوج کو دریا عبور نہ کرنے دے۔

ابھی شاہ عالم کا توپ خانہ گھاٹ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ نہیں ہوا تھا کہ جاسوسوں نے دوسری اطلاع پہنچادی۔ اعظم شاہ نے ارادہ بدل دیا ہے۔ اب وہ خشکی کا راستہ اختیار کرے گا۔ اب وہ چاہتا ہے سوگڑھ سے گزر کر اکبر آباد کو پشت پر چھوڑے اور مقابلے پر آئے۔

فیصلے کی اس تبدیلی نے شاہ عالم کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعظم شاہ بوکھلایا ہوا ہے۔ وہ کسی منصوبہ بندی کے بغیر نکلا ہے جو بار بار فیصلے تبدیل کر رہا ہے۔ وہ محض اپنی بہادری پر بھروسا کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ جنگ میں فتح کی نوید صرف بہادری سے نہیں، تدبر کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جملے اس نے اتنی زور سے ادا کیے تھے کہ قریب کھڑے ہوئے تمام امراء نے سنے۔

شاہ عالم خاموش تھا اور تمام امراء منتظر تھے کہ حکم شاہی سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔ کچھ دیر کے سکوت کے بعد شاہ عالم کی آواز نے ساعتوں کو دہلایا۔

''ہمارا پیش خانہ سرائے جاجو پر لگا دیا جائے۔''

اس کے بعد تینوں شہزادوں کو امراء کے ساتھ مستعد رہنے کے احکام دیے۔ اپنے ساتھ سادات بارہہ کے تینوں بھائیوں کو رکھا۔ ان کے جلو میں ایران اور توران کے بہادر پٹھان اور راجپوت جمعیت تھی۔

اعظم شاہ نے بھی پوری تیاری کر رکھی تھی۔ بیدار بخت ہراول میں تھا۔ بادشاہ قلی خاں توپ خانہ لے کر چلا۔ بائیں طرف شہزادہ والا جاہ، دوسری طرف شہزادہ والا تبار امراء کی حفاظت میں تھا۔ پٹھانوں اور راجپوتوں کی جمعیت شاہ عالم کی طرح اس کے ساتھ بھی تھی۔

وہ جدھر سے گزر رہا تھا، زمین دہل رہی تھی۔ قریب کی آبادیاں آبادی سے خالی ہوگئی تھیں۔ پچیس ہزار کا لشکر گرد و غبار اڑاتا چلا جا رہا تھا۔

گرد و غبار کی دیوار ہٹی تو اعظم شاہ کے لشکر نے اپنے سامنے شاہ عالم کا پیش خانہ دیکھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ پیش خانے کے سامنے آ گئے تھے۔ انہوں نے یہ موقع ضائع نہیں کیا اور حملہ کر دیا۔ اس وقت شاہ عالم کی فوج بے خبر اور غافل تھی۔ رستم علی خاں جیسا دلاور یہاں متعین تھا۔ اس کی جمعیت نے کچھ دیر تو اعظم شاہ کے ہراول کا مقابلہ کیا مگر چند آدمیوں کے گرتے ہی رستم علی خاں اور اس کے ساتھی پسپا ہو گئے۔ اعظم شاہ کے ہراول نے خیمے کو آگ لگا دی۔ سامان لوٹ لیا اور داروغہ توپ خانہ کو گرفتار کر لیا گیا۔

شاہ عالم کو پہلے مرحلے پر ہی شکست کا منہ دیکھنا پڑ جاتا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ شہزادہ محمد عظیم طلایہ گردی کے لیے سوار ہو کر نکلا تھا کہ اس نے تلواریں چلتی ہوئی دیکھیں۔ یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ بے خبری میں حملہ ہو گیا ہے۔ اعظم شاہ کی فوجیں چڑھ دوڑی ہیں۔ اس نے اپنے گھوڑے کو موڑا اور ہوا کو چیرتا ہوا اپنے لشکر میں آ گیا۔ وقت ابھی اپنی باگیں تھامنے نہیں پایا تھا کہ وہ اپنی بھاری فوجیں لے کر پہنچ گیا۔ اس کے پہنچتے ہی شاہ عالم کی فوجیں موج در موج پہنچنے لگیں۔

جلے ہوئے خیمے تباہی کی داستان سنا رہے تھے۔

اعظم شاہ کے چند مقربین ڈرتے ڈرتے اس کے پاس پہنچے اور کچھ عرض کرنے کی اجازت طلب کی۔

''اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ان فوجوں کو دیکھ کر میں پیچھے ہٹ جاؤں تو بزدلی کا یہ فیصلہ مجھے قبول نہیں۔''

''ہماری کیا مجال ہے کہ ہم پیچھے ہٹنے کا مشورہ دیں اور فتح کو شکست میں بدل دیں۔ ہماری گزارش تو صرف یہ ہے کہ حضور اسی جگہ خیمہ لگا دیں اور مقابلے کو کل تک ملتوی کر دیں۔ آج کی فتح اور غلبے کی شہرت اور اس ہیبت سے کہ اصل مقابلہ تو کل ہونے والا ہے دشمن کے لشکر میں بڑی افراتفری مچے گی اور ادھر کے بہت سے نامور سردار ہماری فوج سے آ کر مل جائیں گے۔''

اعظم شاہ نے اس مشورے کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور اپنی فوج کو عظیم الشان کے لشکر سے ٹکرانے کا مشورہ دے ڈالا۔ امیروں کو اس کا حکم بہ حالت مجبوری ماننا پڑا۔

دونوں طرف سے توپیں داغی جانے لگیں۔ آتشیں بان چھوڑے جا رہے تھے۔ نقاروں اور بگل کی آوازوں سے میدان دہل رہا تھا۔ دونوں طرف کے جنگجو دلاور دلیرانہ بڑھ کر ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ مست جنگلی ہاتھی اپنی سونڈوں میں منوں وزنی زنجیریں لٹکائے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان زنجیروں کی زد میں جو بھی آتا، ہمیشہ کے لیے زمین پر گر جاتا۔ ان پاگل ہاتھیوں نے صفوں کی صفیں الٹ ڈالیں۔ جو ان ہاتھیوں کی زد سے بچا، گولہ باری اور تیر اندازی کی زد میں آ کر ختم ہو گیا۔

شاہ عالم کے کئی نامور سردار لہو میں نہا گئے تھے۔ ایسے میں ایک نیزہ کسی طرف سے آیا اور محمد عظیم کے قریب سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہو کر گزر گیا۔ محمد عظیم ہاتھی پر جما بیٹھا تھا لیکن خطرے میں تھا۔ بہادروں کی ایک جمعیت آگے بڑھی اور محمد عظیم کی مدد کو پہنچ گئی۔

شہزادہ بیدار بخت نے بھی اپنا ہاتھی دشمن کی صفوں میں گھسا دیا۔ اس کی اس دیوانگی نے محمد عظیم کی فوجوں کو بے حواس کر دیا۔ صفیں منتشر ہو گئیں۔ اس وقت حسن علی خاں اور حسین علی خاں ہاتھی سے کود پڑے اور پاپیادہ لڑنے لگے۔ ان کی بہادری کو دیکھ کر بھاگتے ہوئے سپاہیوں کے قدم رک گئے۔ صفیں پھر سے مرتب ہو گئیں۔ بیدار بخت بری طرح دشمنوں میں گھر گیا۔ اس کا ہاتھی اسے گولیوں کی باڑھ سے بچاتا پھر رہا تھا۔ اس کے جاں نثار ایک ایک کر کے ڈھیر ہو گئے تھے پھر کسی اندھی گولی نے اسے بھی پہچان لیا۔ ایک گولی کا تعاقب کرتے ہوئے کئی گولیاں اس کی طرف بڑھیں اور اس کا کام تمام کر گئیں۔

اس کی ہلاکت کی خبر اعظم شاہ کے لیے ناقابلِ برداشت صدمہ تھا۔ مثال کیا دی جائے مست ہاتھی تھا یا بپھرا ہوا بھوکا شیر۔ اٹھا اور صفوں پر ٹوٹ پڑا۔ جدھر نکل جاتا، صفوں کی صفیں الٹ جاتیں۔ اسے دیکھتے ہی سوار بھاگ نکلتے۔ بغیر سوار کے گھوڑے ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ ہاتھیوں کے ہودج خالی ہو گئے۔ جو بھی اس کے سامنے آیا، اس کی موت نے مارا یا خوف نے بھگا دیا۔ اس کی بہادری ضرب المثل تھی لیکن آج تو اس نے سورج زمین پر اتار دیا جس کی تپش سے سرتن سے جدا ہو رہے تھے۔ ایسا بہادر کس نے دیکھا ہوگا جو پورے ہراول سے اکیلا لڑتا پھر رہا تھا۔ دوسری طرف بیدار بخت کا چھوٹا بھائی والاجاہ اپنے ہاتھی پر بیٹھا رستم و سہراب کے کارنامے یاد دلا رہا تھا۔ قتل بان زخموں سے چور ہو چکا تھا لیکن جما بیٹھا تھا۔ پھر ایک سنسناتے ہوئے تیر نے اسے ہاتھی سے نیچے گرا دیا۔ شہزادہ والاجاہ کی بیوی بھی اس کی عماری میں موجود تھی۔ اس نے بیوی کو وہیں چھوڑا اور خود قتل بان کی جگہ سنبھال لی۔ اب وہ جنگ بھی کر رہا تھا اور ہاتھی کو راستہ بھی دکھا رہا تھا۔ اسی وقت بندوق کی ایک گولی نے اس کی پیشانی میں بھی سوراخ کر دیا۔ بیوی نے گھبرا کر عماری سے باہر سر نکالا۔ ایک گولی اس کی بھی تلاش میں تھی۔ وہ عماری میں ہی ڈھیر ہو گئی۔

بے مہابت کا ہاتھی ایسا سراسیمہ ہوا کہ لشکر سے نکلا اور اکبر آباد جانے والی سڑک پر دوڑ پڑا۔ اعظم شاہ نے ہاتھی کی خبر لینے کے لیے آدمی دوڑائے مگر اس ہنگامے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی۔

دو جوان بیٹوں کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھا تھا لیکن اعظم شاہ کی ثابت قدمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جنگ کا فیصلہ اسی وقت ہو سکتا تھا جب اعظم شاہ مارا جاتا یا گرفتار ہوتا لہٰذا ایک منصوبے کے تحت شاہ عالم کے ہم رکاب امیروں اور افسروں نے جن میں سادات بارہہ کے نوجوان پیش پیش تھے، پیش قدمی کی اور اعظم شاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اعظم شاہ اس افتاد کا بڑی پامردی سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کے جاں نثار بڑی جاں بازی سے اس کا دفاع کر رہے تھے۔ اس کی طرف بڑھنے والے ہر حملے کو ناکام کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ دشمن کی یہ چال ناکام ہو جاتی مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اس کی قسمت اس کے آڑے آ گئی۔ قبلے کی سمت سے تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ ان ہواؤں نے دیکھتے ہی دیکھتے آندھی کی صورت اختیار کر لی۔ جس طرف سے آندھی اٹھی، اس طرف شاہ عالم کے لشکر کی پشت تھی جبکہ اعظم شاہ کی فوج کو اس آندھی کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ آندھی کے ساتھ اڑنے والی ریت کے ذرات ان کی آنکھوں کو اندھا کیے دے رہے تھے۔ شاہ عالم کی طرف سے چھوڑے جانے والے تیر، تیز ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اتنی تیزی سے آتے کہ زرہ بکتر کو توڑتے ہوئے نکل جاتے۔ اعظم شاہ کی فوج کی طرف سے مسلسل گولے چھوڑے جا رہے تھے لیکن ہوا کا دباؤ انہیں مخالف کے لشکر تک نہیں پہنچنے دے رہا تھا۔

ذوالفقار خاں تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ ہمراہیوں کی ایک بڑی تعداد ختم ہو گئی تو سمجھ گیا کہ اب میدان ہاتھ سے نکلا ہی نکلا۔ تلواریں انسانوں کے سر کاٹتی ہیں، ہوا کا زور نہیں..... تو اسے اپنے آقا اعظم شاہ کی فکر ہو گئی۔ وہ آندھی میں راستہ بناتا ہوا اعظم شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

''حضور! تلوار نیام کیجیے، میدان ہاتھ سے نکل گیا۔''

''تو کیا میں شکست تسلیم کر لوں؟''

''وقتی شکست بھی تو جنگ کا حصہ ہوتی ہے۔''

''اسے بزدلی کہتے ہیں۔''

''آپ اسے دانائی کہیے۔''

''میں کسی لفظ کو بہادری کا نعم البدل نہیں سمجھتا۔''

''مصلحت اسی میں ہے کہ ہم اس وقت پیچھے ہٹ جائیں اور پھر کسی وقت مکمل تیاری کے ساتھ شاہ عالم کے مقابل پر آ جائیں۔''

''میں تاریخ میں اپنا نام بھاگنے والوں میں لکھوانا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں چاہتا۔"

"ہمارا بہت سا لشکر کٹ گیا ہے۔"

"میں لشکر کے بغیر بھی لڑوں گا۔"

"یہ خودکشی ہوگی۔"

"میں یہ بھی کر گزروں گا۔"

"حضور! ضد رہنے دیجیے۔ آپ کے اجداد نے بھی اکثر یہ کیا ہے کہ جب کوئی صورت نظر نہیں آئی تو وہ تنہا لشکر سے نکل گئے۔ آپ بھی اس وقت نکل چلیے۔ پھر کسی وقت قسمت ساتھ دے تو اس کی تلافی کا بندوبست کیجیے۔"

"بہادر جی! تم اپنی جان بچا کر جہاں جانا چاہو چلے جاؤ، ہمارے قدم اس جگہ سے نہیں ہٹیں گے۔" اعظم شاہ نے نہایت حقارت سے کہا۔

ذوالفقار خاں نے پُرنم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے لشکر سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور امیر حمید الدین خاں نے بھی میدان چھوڑ دیا۔

ان دونوں کے فرار ہوتے ہی ان کے لشکر بھی جنگ سے نکل گئے۔

شاہ عالم کی فوجیں مسلسل یلغار کر رہی تھیں لیکن اعظم شاہ کا حال یہ تھا کہ اس کے اطراف دو تین سو سوار سے زیادہ فوج نہیں رہی تھی۔ دشمن کے ہزار دو ہزار سپاہی یک لخت اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اس کا ہاتھی گولہ باری اور تیروں کی زد میں تھا۔ وہ عماری میں تن کر کھڑا ہو گیا اور چیخ کر کہا۔ "شاہ عالم مجھ سے جنگ نہیں کر رہا ہے بلکہ میرا خدا اور میرا نصیب مجھ سے برگشتہ ہو گیا ہے۔"

اسے دیکھ کر کم عمر شہزادہ والا تبار بھی تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا جو اس کے ساتھ عماری میں سفر کر رہا تھا اور بار بار مقابلے پر آنے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہاتھی سے نیچے اترنا چاہتا تھا۔ اعظم شاہ نے اسے نیچے بٹھا دیا۔

"تیرا باپ ابھی زندہ ہے۔ میرے بعد ان فوجوں کا مقابلہ تجھی کو کرنا ہے۔"

ہاتھی کے دو تین فیل بان گولہ باری میں کام آ چکے تھے۔ ہاتھی بھی بری طرح زخمی تھا۔ وہ جنگ بھی کر رہا تھا اور ہاتھی کو بھی سنبھال رہا تھا۔ کسی کو جرأت نہیں تھی کہ اس کے ہاتھی کے قریب آتا۔ گولے اور تیر اس کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن وہ خود کو بچا رہا تھا۔ کم سن شہزادے کی حفاظت بھی کرتا جاتا تھا۔ ہاتھی اتنا زخمی ہو چکا تھا کہ اب مزید چلنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ اعظم شاہ نے یہی مناسب سمجھا کہ ہاتھی سے نیچے اتر جائے۔ اس نے جیسے ہی عماری سے نیچے پاؤں ڈالا، ایک تیر اس کی پیشانی پر آ کر لگا۔ ایک امیر رستم علی خاں عماری پر چڑھ گیا اور اعظم شاہ کا سر کاٹ کر دامن میں چھپا لیا تاکہ اعظم شاہ کی موت کو اپنا کارنامہ بتا کر بھاری انعام وصول کرے۔

فتح کے شادیانے بجائے جا رہے تھے۔ بیدار بخت کے دو بیٹے اور شہزادہ والا تبار گرفتار کر کے شاہ عالم کے پاس پہنچا دیے گئے۔ شاہ عالم نے پدرانہ شفقت سے ان کے سروں پر ہاتھ رکھا۔ حرم کی جو عورتیں اعظم شاہ کے ساتھ تھیں، انہیں تعزیت کا پیغام پہنچایا۔

رستم علی خاں، اعظم شاہ کا سر دامن میں چھپائے شاہ عالم کے پاس پہنچا اور دامن سے سر نکال کر شاہ عالم کے قدموں میں ڈال دیا۔

"اے سگ وحشی یہ کیا کیا۔" شاہ عالم بے اختیار چیخ اٹھا۔

"حضور! آپ کے دشمن کا سر میں نے آپ کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔"

"وحشی درندے! اعظم شاہ میرا مخالف سہی لیکن تھا تو میرا بھائی۔ تم نے انعام کے لالچ میں خانوادۂ تیموری کی توہین کی ہے۔"

"جان کی امان کا طلب گار ہوں۔"

"میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور کبھی میرے سامنے نہ آنا۔"

☆☆☆

قلعہ گوالیار میں نالہ و شیون بپا تھا۔ اعظم شاہ کے مارے جانے کی خبر پہنچ چکی تھی۔ کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس وقت اعظم شاہ کی بہن نواب زیب النسا کے پاس جاتا اور اس سے تعزیت کرتا بالآخر امیر الامراء اسد خاں اور عنایت خاں داروغہ خزانہ اس کی خدمت میں حاضر ہوئے لیکن الفاظ تھے کہ منہ سے نکلنے کو تیار نہیں تھے۔ زیب النسا نے جو ماتمی لباس زیب تن کیے بیٹھی تھی، خود ہی ان کی تعزیت کو الفاظ دیے۔

"ہم تمہیں اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھتے ہیں۔"

"خدا کی مرضی یہی تھی۔"

"اور یہ بھی مرضی تھی کہ میرے اعظم شاہ کا قاتل بادشاہ بن جائے۔"

"جو بادشاہ بنا ہے وہ بھی تو آپ کا بھائی ہے۔"

"لیکن وہ اعظم شاہ نہیں ہے جو مجھے سب سے زیادہ عزیز تھا۔"

"شاہ عالم نے جواب بادشاہ ہوئے ہیں، جان کی امان

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے ساتھ آپ کو اپنے حضور طلب فرمایا ہے۔"

"اس لیے کہ میں اپنے بھائی کے قاتل کو مبارک باد دوں۔"

"بے شک آپ مبارک باد نہ دیں لیکن طلبی کا جو فرمان جاری ہوا ہے اس کی تکمیل ضرور فرمائیں۔"

"اگر ہم انکار کر دیں تو؟"

"اسے بغاوت سمجھا جائے گا۔"

"اگر یوں ہے تو ہم بغاوت کرتے ہیں۔"

"حضور! میرا مشورہ ہے اس وقت آپ ضد نہ فرمائیں۔"

"میں تو ایک لاش بن گئی ہوں۔ جہاں چاہو اٹھا کر لے جاؤ۔ میں چلنے کو تیار ہوں۔"

اس نیم رضامندی کے بعد امیر الامراء اسد خاں اور عنایت خاں، نواب زیب النسا بیگم کی رکاب میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ زیب النسا بیگم نے اس وقت بھی تعزیتی لباس پہنا ہوا تھا۔ ان کا یہ انداز گستاخی کے مترادف تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اعظم شاہ کی موت کا صدمہ تو ہے لیکن شاہ عالم کے تخت نشیں ہونے کی خوشی نہیں۔ وہ شاہ عالم کے حضور پہنچی تو اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر مبارکباد کے الفاظ نہیں تھے۔

بادشاہ نے اس کے تعزیتی لباس کی طرف دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ گفتگو کے دوران اس نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا ہے لیکن اس وقت وہ نئے جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تعزیت کے الفاظ کو نہایت اطمینان سے سنا اور یہ ظاہر کرتا رہا جیسے اعظم شاہ کی موت کا اسے بھی صدمہ ہوا ہے۔

اس نے زیب النسا سے کوئی باز پرس کرنے کے بجائے اس کا سالانہ وظیفہ دوگنا کر دیا اور "بادشاہ بیگم" کے خطاب سے نوازا۔

بادشاہ بیگم دوسری عورتوں کے ہمراہ دہلی روانہ ہوگئی جہاں اسے ضعیف العمری کے دن چین سے گزارنے تھے۔

☆☆☆

شاہ عالم جس نے اب خلد مکاں کا لقب اختیار کیا تھا، دائرۂ شاہی کے بندوبست سے پوری طرح فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ راجپوتوں کی طرف سے فتنہ انگیز خبروں نے اسے چونکا دیا۔

وہ اپنے چھوٹے بھائی کام بخش کی طرف متوجہ ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ راجپوتوں کی بے ادبیوں نے شور مچایا۔ اجمیر اور جودھپور میں راجا اجیت سنگھ نے سر اٹھایا۔ یہ شخص اورنگزیب کی زندگی ہی میں سرکشی پر آمادہ ہوگیا تھا۔ بھائیوں کی آپس کی جنگ نے اسے بالکل ہی بے قابو کر دیا۔ مسلمانوں کو ستانے لگا، گاؤکشی کی ممانعت کر دی۔ اذان بند کرا دی۔ بعض مسجدوں کو تباہ کرا دیا اور ان کی جگہ مندر تعمیر کرا دیے۔

یہ زیادتیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو شاہ عالم کی توجہ اس طرف مبذول کرائی گئی۔

"اجیت سنگھ کی کارروائیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اگر اس کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تو ہندوستان میں موجود دوسری طاقتیں بھی سر اٹھائیں گی۔"

"ابھی آپ نے ایک جنگ جیتی ہے۔ آپ کا رعب قائم ہوگیا ہے۔ اگر اس وقت آپ نے راجپوتوں کو ڈھیل دے دی تو آپ کا رعب ختم ہوجائے گا۔"

"آپ کو ثابت کرنا ہوگا کہ آپ راجپوتوں کو سر نہیں اٹھانے دیں گے۔"

"تم لوگ دیکھ رہے ہو کہ کام بخش نے بیجاپور میں اپنی بادشاہت قائم کر دی ہے۔ ہمیں اس کو سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانا ہوگا تاکہ ہمارے مخالف اس کے ساتھ جا کر نہ مل جائیں۔"

"گستاخی معاف! کام بخش آپ کے بھائی ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ فی الوقت وہ آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ آپ اجیت سنگھ کا قلع قمع کر دیں، کام بخش کا معاملہ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔"

ان امیروں نے مختلف دلائل سے اسے قائل کیا تو وہ لشکر کشی کے لیے تیار ہوگیا۔ اس معرکے کے لیے اس نے شہزادہ عظیم الشان کو سپہ سالار مقرر کیا۔ نامور سردارانِ فوج اس کی نیابت میں تھے۔ بادشاہ خود بھی ان کے ساتھ روانہ ہوا۔

شاہ عالم نے اجمیر اور چتوڑ کے درمیان اپنا خیمہ لگایا اور فوج کو آگے روانہ کر دیا۔

اعظم شاہ کو شکست دینے کے بعد شاہی فوج کے حوصلے اتنے بلند ہوگئے تھے کہ ہاتھی کو چیونٹی سمجھ کر مسل دیں۔ انعامات کی ایسی بارش ہوئی تھی کہ مزید کی آرزو میں اس جذبے سے لڑے کہ چند حملوں میں اس کفرستان کو روند کر رکھ دیا۔ یہ کثرت راجپوت مارے گئے، ہزاروں کو اسیر بنا لیا۔ بستیوں کی بستیاں بے چراغ ہوگئیں۔

اجیت سنگھ اور اس کے مددگار کئی راجا مقابلے کی تاب نہ لا کر لاشوں کے ڈھیر پھلانگتے ہوئے پہاڑوں میں چھپ گئے۔

فرار کے تمام راستے بند تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ چھپ کر نکلنے کی کوشش کی لیکن بادشاہی فوج ہر طرف بکھری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوئی تھی۔ باہر موت کھڑی تھی، اندر بھوک اور فاقے تھے۔

جب اس خود ساختہ قید نے طول پکڑا تو اجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو ہوش آیا۔ معافی کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اجیت سنگھ نے اپنے ایک ساتھی جے سنگھ درگاداس کو اپنے ساتھ لیا اور پہاڑ سے نیچے اتر آیا۔ پہاڑ سے اترتے ہی دونوں گرفتار کر لیے گئے اور خانِ خاناں کے حضور پیش کر دیا گیا۔

اجیت سنگھ کے سارے کس بل نکل گئے تھے۔ وہ خانِ خاناں سے معافی کا طلب گار ہوا۔

''مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ بادشاہ سے کہہ کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو معافی دلا دو۔''

''بادشاہ نہایت مہربان اور درگزر کرنے والا ہے لیکن تمہارے قصور اتنے بڑے ہیں کہ میری سفارش کے باوجود بھی تمہیں معافی ملنے والی نہیں۔''

''میں ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہوں۔ بادشاہ سے کہو جودھپور آ کر بت خانوں کو گرا دیں اور مسجدیں تعمیر کر دیں۔ شرعی احکام نافذ کر کے اذان، نماز اور گاؤکشی کا اجرا فرمائیں اور عدالتی عملہ قائم کر کے جزیہ کی وصولی کے لیے حکام کا تقرر کر دیں۔''

''یہ سب باتیں تم بادشاہ کے حضور کہہ سکتے ہو؟''

''اگر وہ جان کی امان دے تو ہم حاضر ہونے کو تیار ہیں۔''

خانِ خاناں نے اسے شاہ عالم کے روبرو پیش کر دیا۔ وہاں بھی اس نے معافی طلب کی اور یہی باتیں دہرائیں۔ بادشاہ نے کمال مہربانی سے ان کا معافی نامہ قبول کیا اور ان دونوں کو خلعت، ہاتھی، تلوار اور دوسری شاہانہ عنایت سے نوازا اور جودھپور اور اس کے اطراف کی بستیوں میں عدالتی حاکم، قاضی، مفتی، امام اور موذن مقرر کرا دیے۔

راجپوت سرداروں نے اطاعت کر لی تھی۔ ان کے علاقوں پر شاہ عالم کا پورا اختیار ہو چکا تھا۔ اس بندوبست سے نمٹنے کے بعد وہ اپنے چھوٹے بھائی کام بخش کی طرف متوجہ ہوا۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اس نے کام بخش کے نام ایک مصالحانہ خط لکھنا مناسب سمجھا۔ اس خط میں اس نے نصیحت کے طور پر بہت سی باتیں لکھیں۔

''والد بزرگوار نے صوبہ بیجاپور کی حکومت تم کو عطا کر دی تھی۔ ہم بیجاپور اور حیدرآباد دونوں صوبوں کی حکمرانی اس عالی قدر بھائی کو تفویض کرتے ہیں بشرطیکہ وہ دکن کے سابق فرماں رواؤں کے طریقے پر ہمارے نام کا سکہ و خطبہ جاری کر دے۔ جو پیشکش اس زمانۂ قدیم سے ان دونوں صوبوں کے حکام، بادشاہی سرکار میں جمع کراتے رہے ہیں ہم اس کی معافی عطا کرتے ہیں۔ تم دل و جان سے شکر بجالاؤ اور اپنے بزرگوں کی طرح عدل پروری اور رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک کو اختیار کرو اور اس علاقے کے سرکشوں، ظالموں اور راہزنوں کی سرکوبی سے غفلت نہ برتو۔''

شاہ عالم نے اس رقعے کو لے جانے کے لیے اور دکن کی دیکھ بھال کے لیے حافظ احمد مفتی کا تقرر کیا۔ یہ ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ کام بخش کی شکایتیں شاہ عالم تک تواتر سے پہنچ رہی تھیں۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ کام بخش کے مزاج میں دیوانگی کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ شک کا مرض ہو گیا ہے، کانوں کا ایسا کچا ہو گیا ہے کہ ہر ایک کے بھڑکانے میں آ جاتا ہے۔ خون بہا کر خوش ہوتا ہے۔ اس نے اسی مزاج سے مجبور ہو کر بہت سے قدیم نمک خواروں کو اذیت ناک سزائیں دے کر مروا ڈالا ہے۔ ضروری تھا کہ اس کی نگرانی کے لیے بادشاہ کا کوئی نمائندہ وہاں ہو۔ حافظ احمد مفتی کو اسی غرض سے مصالحانہ خط لے کر بھیجا گیا۔ زبانی بھی کہہ دیا کہ شاہ عالم کو اس کے علاقوں سے غرض نہیں، وہ شوق سے حکومت کرے لیکن خلقِ خدا کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگے۔

محمد کام بخش کے لیے خلعت، ہاتھی گھوڑے، جواہرات اور دیگر تحائف بھی ساتھ کیے۔

جب حافظ احمد مفتی بیجاپور پہنچے اور کام بخش کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس کا نہایت عمدہ استقبال کیا۔ بھائی کے بھیجے ہوئے خط کو آنکھوں سے لگایا، خیریت دریافت کی۔

حافظ صاحب کے ساتھ آئی ہوئی جمعیت کو شاہی مہمان کا درجہ دیا اور حافظ صاحب کو شاندار محل میں ٹھہرایا۔ حافظ صاحب بھی سوچتے ہوں گے کہ کیسا نصیب جاگا ہے۔

کام بخش کے بعض امیر جو اسے غلط مشورے دے کر اپنا الو سیدھا کرتے رہے تھے، انہیں یہ پذیرائی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر شاہی نمائندہ یہاں رہا تو انہیں من مانی کا موقع نہیں ملے گا۔ کسی طرح سے کام بخش کو اس سفارت سے بدظن کر دینا چاہیے۔

یہ امیر پہلے بھی امیروں کو امیروں سے لڑانے کا کام کر چکے تھے۔ ان کے بہکاوے میں آ کر کام بخش نے کئی نامور امراء کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس مرتبہ بھی وہ ان کے بہکاوے میں آ گیا۔ ان امراء نے کام بخش کو باور کرا دیا کہ حافظ احمد کسی نیک نیت سے نہیں آیا۔ وہ اپنے ساتھ سپاہیوں کی جماعت لایا ہی اس لیے ہے کہ موقع دیکھ کر آپ کو ضرر پہنچائے۔ شاہ عالم نے آپ کے ساتھ بھلائی نہیں کی ہے بلکہ نقصان پہنچایا ہے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میرا برادر بزرگ مجھے نقصان پہنچانے کے لیے مجھ سے جنگ بھی تو کرسکتا تھا۔''

''وہ آپ کی بہادری اور طاقت سے خوفزدہ ہے۔ اس لیے سامنے آنے سے کتراتا ہے۔ آپ خود سوچیں یہ اس کی تخت نشینی کا دوسرا جلوس ہے۔ وہ اب تک آپ کے مقابلے پر کیوں نہیں آسکا۔ اب اس نے آپ کے خلاف سازشوں کا جال بچھایا ہے۔ آپ اس کا تدارک فرمائیں ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔''

کام بخش وہم اور وسوسے کا مریض تھا۔ امیروں کی باتیں سن کر اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ اس نے تحقیق کیے بغیر ہی حکم جاری کردیا کہ حافظ احمد کے ساتھ جتنے لوگ آئے ہیں، ان سب کو کھانے کی دعوت دے کر ایک جگہ جمع کیا جائے۔

جب تمام لوگ جن کی تعداد پچھتر تھی، جمع ہوگئے تو حکم ہوا ان سب کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی ویرانے میں لے جاؤ اور سب کو قتل کردو۔

حکم پر عمل ہوا اور سب کے سب قتل کردیے گئے۔

حافظ احمد کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے آدمیوں کے ساتھ کیا ہوگیا۔ معلوم ہوا تو اس وقت جب دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو بادشاہ کے سپاہی دروازے پر کھڑے تھے۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ شاہی مہمان تھا۔ اس کے پاس شاہی سپاہی آسکتے تھے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کام بخش نے پیغام ملاقات بھیجا ہے اور سپاہی اسے لینے آئے ہیں تو اس کے کان کھڑے ہوئے۔ شاہی مہمانوں کو سپاہی تو لینے نہیں آتے۔ چوب دار آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے۔ اس نے سوچا حفاظت کی غرض سے سپاہی بھیج دیے ہوں گے۔ وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔

راستے ہی میں اسے ایک سپاہی نے بتادیا کہ اس کے آدمیوں پر کیا بیت گئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ سپاہیوں کو بھیجنے کا مقصد سمجھ میں آگیا۔ اسے بھی قتل کردیا جائے گا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بھاگنا ممکن نہیں تھا۔ خود کو تقدیر پر چھوڑا اور کام بخش کے حضور پہنچ گیا۔

''حافظ صاحب! تمہاری ہوشیاری تمہارے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔'' کام بخش نے کہا۔ ''تم ہمیں قتل کرنے کے لیے جس جمعیت کو لے کر آئے تھے، ہم نے ان سب کو قتل کرادیا ہے۔''

''میری کیا مجال کہ میں آپ کو قتل کرنے کا ارادہ بھی کرتا۔''

''قتل نہیں تو گرفتار تو ضرور کرلیتے۔''

''یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ معمولی سی ایک جمعیت ایک بادشاہ کو کیسے گرفتار کرسکتی ہے۔''

''مگر ہم آپ کو گرفتار کرسکتے ہیں۔''

''آپ بااختیار ہیں۔''

''مگر ہم تمہیں گرفتار نہیں کریں گے۔ ہم تمہیں یہاں سے روانہ کریں گے تاکہ شاہ عالم کو اپنی داستان سناسکو اور اسے بتاسکو کہ کام بخش کو گرفتار کرنا آسان نہیں۔''

اس نے شاہ عالم کے لطف آمیز خط کے جواب میں مخاصمانہ باتیں لکھ کر قرآن کی ایک آیت کا ترجمہ لکھ دیا۔

''کتنی ہی قلیل جماعتیں، کثیر جماعتوں پر غالب آگئی ہیں۔''

''یہ خط ہمارے بھائی شاہ عالم تک پہنچادینا۔''

حافظ احمد اس کے رویے کی تبدیلی کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ آئے تھے تو کام بخش کی آنکھوں میں مہربانی کے رنگ نمایاں تھے لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں خون اتر ہوا تھا۔

اس وقت کچھ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ رخصتی کا پروانہ ملتے ہی حافظ احمد اس کے سامنے سے ہٹ گئے۔ کیا خبر کب وہ اپنا فیصلہ ایک مرتبہ پھر بدل دے۔

حافظ احمد نے سن تو رکھا تھا کہ کام بخش کے مزاج میں پاگل پن کے آثار ظاہر ہونے لگے ہیں، اب وہ اس افواہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا تھا۔

حافظ احمد کو اپنی موت کا یقین ہوچکا تھا، اب جو رہائی ملی تو سرپٹ دوڑے اور جان کی خیر مناتے ہوئے شاہ عالم کے حضور پہنچ گئے۔ حالت یہ تھی کہ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اپنی ذلت کا احساس تھا جو رلا رہا تھا۔ انہوں نے کچھ باتیں زبانی عرض کیں اور پھر کام بخش کا لکھا ہوا جواب سامنے رکھ دیا۔

''کتنی ہی قلیل جماعتیں، کثیر جماعتوں پر غالب آگئی ہیں۔''

یہ عبارت نہیں تھی، یہ دھمکی تھا کہ اس کی قلیل جماعت شاہ عالم کی کثیر جماعت پر غالب آجائے گی۔ قلعے کی فصیلوں سے جنگ پر روانگی کے بگل بجانے کا حکم جاری کیا گیا۔ امراء نے لشکر تیار کیے۔ راجا جے سنگھ، اجیت سنگھ اور دوسرے راجپوت سردار اطاعت قبول کرچکے تھے لہٰذا انہیں بھی طلب کیا گیا۔

عظیم الشان لشکر بڑی تیاری کے بعد کام بخش سے مقابلے کے لیے دکن کی طرف روانہ ہوا۔ راجپوت سردار بھی اس لشکر کے ساتھ تھے۔ اطاعت کے بعد یہ پہلی جنگ تھی جو وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لڑنے جارہے تھے لیکن وقت پر دغا دینا ان کی ہمیشہ سے عادت رہی تھی۔ وہ وفاداری ظاہر ضرور کرتے تھے لیکن مغلوں کے ساتھ کبھی دل سے نہیں رہے۔

شاہ عالم کا لشکر اجین پہنچا اور وہاں پڑاؤ ڈالا تو یہ راجپوت سردار شکار کے بہانے سوار ہوکر نکل گئے۔ ان کے چھٹے پرانے خالی خیمے یہ بتانے کے لیے بہت تھے کہ وہ شکار کے لیے نہیں گئے بلکہ فرار ہوئے ہیں۔ بعض امراء نے ان کا پیچھا کرنا چاہا لیکن شاہ عالم نے اغماض برتا۔ اس نے ان سرداروں کا خیال چھوڑا اور آگے بڑھ گیا۔

شاہ عالم کی اگلی منزل برہان پور تھی۔ یہاں دو تین دن قیام کے بعد حیدرآباد کی طرف روانہ ہونا تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس نے چھاؤنی قائم کی۔ بارش بھی اس کے ساتھ ہی لگی چلی آئی تھی۔ یہاں پہنچتے ہی آسمان میں ایسے سوراخ ہوئے کہ خیمے چھلنی ہوگئے۔ قریب ہی ''تاپتی'' دریا تھا جو قلعہ برہان پور کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ آگے بڑھنے کے لیے اسے عبور کرنا تھا لیکن اس میں ایسی زبردست طغیانی آئی کہ پندرہ بیس دن تک اسے عبور کرنا دشوار ہوگیا۔ بہرحال جب طغیانی کا زور ٹوٹ گیا تو بادشاہ نے کوچ کردیا اور کہیں قیام کیے بغیر تیزی سے سفر کرتے ہوئے حیدرآباد کے قریب پہنچ گیا۔

کام بخش کے لشکر والے اس کے جنون اور سفاکی سے ڈر کر منتشر ہوگئے تھے۔ اس کے ساتھ پانچ چھ سو سواروں سے زیادہ نہیں رہے تھے اور وہ بھی مجبوراً پڑے ہوئے تھے ورنہ خوش نہیں تھے۔

☆☆☆

شاہ عالم کا ایک امیر سیف خاں ہمیشہ کا خبطی اور جنون زدہ تھا۔ راستے بھر ذوالفقار خاں اور آصف الدولہ امیر الامراء سے لڑتا چلا آیا تھا۔ حیدرآباد کے قریب پہنچ کر اس بگاڑ میں اتنا اضافہ ہوگیا کہ وہ لشکر سے بھاگ گیا اور ایک خاص منصوبہ ذہن میں ترتیب دے کر راجا جے سنگھ اور راجا اجیت سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ یہ وہی دونوں تھے جو اجین میں قیام کے دوران شاہ عالم کے لشکر سے بھاگ گئے تھے۔ سیف خاں نے اپنے منصوبے کی دیوار کی پہلی اینٹ رکھتے ہوئے اور انہیں خوش کرنے کے لیے ایک فرضی داستان گھڑ کر سنائی۔

''آپ کے اس طرح بھاگ آنے سے شاہ عالم راجپوتوں کا جانی دشمن بن گیا ہے۔ میں نے خود اس کی زبان سے یہ باتیں سنی ہیں کہ کام بخش کے قضیے سے نمٹنے کے بعد وہ آپ کے علاقوں کا رخ کرے گا۔ میں یہی بتانے تمہارے پاس آگیا ہوں۔''

''وہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن تم ہمیں یہ بتانے کیوں آگئے؟''

''اس لیے کہ میں نے اس کے ارادے کی مخالفت کی تھی اور اس کے زیرِ عتاب آگیا تھا۔ کچھ دن اور وہاں ٹھہرتا تو قتل کردیا جاتا۔''

''ہم بھی راجپوت ہیں۔ وہ ہمارے علاقوں میں آکر تو دیکھے۔ ہم اس کے دانت کھٹے کردیں گے۔''

''اس کے پاس اسّی ہزار کا لشکر ہے۔ اس سے مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے مخالف کام بخش کے ہاتھ مضبوط کریں۔''

''آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کام بخش کی طرف سے شاہ عالم سے جنگ کریں؟''

''نہیں، ہمیں تلوار سے نہیں ذہن سے فیصلہ کرنا ہوگا۔''

''خان صاحب! ہم لوگ تلوار کے دھنی ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کچھ ہے تو آپ ہمیں سمجھادیں۔''

''میں بہت کچھ سوچ کر یہاں آیا ہوں۔ سوچا یہ ہے کہ میں کام بخش کو ہرار کے راستے آپ کی سرحدوں پر لے آتا ہوں۔ آپ کم از کم پچاس ہزار راجپوت سواروں کے ساتھ اس کی مدد کو تیار رہیں۔ جب تک شاہ عالم دکن سے لوٹ کر آئے، ہم کام بخش کو دہلی لے جاکر تخت نشیں کردیں۔ کام بخش بھی ہمارا احسان مند رہے گا اور شاہ عالم کے ہاتھ سے شاہی بھی نکل جائے گی۔ آپ لوگ خود سوچیں کہ جب آپ لوگوں کے ذریعے کام بخش کو تختِ شاہی ملے گا تو ہندوستان میں راجپوتوں کی کیسی قدر و منزلت ہوگی۔''

اجیت سنگھ اور جے سنگھ کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ شاہ عالم جب تک زندہ ہے انہیں چین سے نہیں رہنے دے گا لہٰذا اگر کام بخش کو سامنے لاکر شاہ عالم کو منظر سے ہٹادیا جائے تو راجپوتوں کی زندگی سنور سکتی ہے۔ کام بخش ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا رہے گا۔ وہ فوراً تیار ہوگئے۔ معاہدہ تیار ہوا اور ان سب نے مہریں لگادیں۔

راجپوتوں سے قول و قسم لینے کے بعد وہ منزلیں مارتا ہوا حیدرآباد پہنچ گیا اور کام بخش کے پاس پیغام پہنچایا۔

''آپ کی مدد کے لیے آپ کے اس خادم نے راجپوتوں سے معاہدہ کرلیا ہے۔ میں آپ کو نہایت حفاظت کے ساتھ راجپوتوں کے لشکر میں پہنچادوں گا جہاں پچاس ہزار راجپوت آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے جو آپ کو دہلی پہنچادیں گے۔ جب تک شاہ عالم کو خبر ہوگی اور وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھاری لشکر کو لے کر دہلی پہنچے گا، آپ تخت نشیں ہو چکے ہوں گے۔ اگر شاہ عالم مقابلے پر آیا بھی تو راجپوت آپ کے ساتھ ہوں گے۔ دہلی میں موجود امیروں کی حمایت بھی آپ کو حاصل ہوگی۔"

منصوبہ ایسا شاندار تھا کہ اگر اس پر عمل ہوجاتا تو کامیابی یقینی تھی لیکن کام بخش وہم اور شک کا مریض تھا۔ اسے شک گزرا کہ ہو نہ ہو، یہ شاہ عالم کی کوئی چال ہے۔ وہ مجھے لالچ میں مبتلا کر کے زیدا کے گھاٹ پر بلا کر قتل کرادینا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے اپنے ایک امیر کو یہاں بھیجا ہے ورنہ سیف خاں کو مجھ سے کیا ہمدردی کہ اتنی دوڑ دھوپ کے بعد مجھ تک پہنچا ہے۔

کام بخش نے اس خیال انگیز منصوبے پر کوئی توجہ نہیں دی اور نہ سیف خاں کو باریابی کی اجازت دی بلکہ ایسا درشت جواب لکھ بھیجا کہ سیف خاں گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔

"تو نے جو یہ دوڑ دھوپ کی ہے، اس کا انعام ہمارے پاس یہی مل سکتا ہے کہ تیری زبان کھینچ دی جائے اور تجھے عذاب دے دے کر مار دیا جائے۔"

اسی دوران کام بخش کو معلوم ہوا کہ شاہ عالم کا لشکر حیدر آباد سے کچھ فاصلے پر آ کر ٹھہر گیا ہے۔ کام بخش کے پاس اس وقت پانچ چھ سو سواروں سے زیادہ نہیں تھے۔ چند امیروں کے سوا کوئی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ ہاتھی پر سوار ہوا اور اپنی مختصر سی فوج لے کر مقابلے پر نکلا۔ یہ بھی اس کی دیوانگی کا ہی ایک روپ تھا۔ شاہ عالم کے عظیم الشان لشکر کے سامنے چھ سو سواروں کی کیا حیثیت لیکن نجومیوں نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ فتح اس کی ہوگی۔

کام بخش کی آمد کے بعد شاہ عالم نے شہزادہ جہاں شاہ کے زیر کمان لشکر کو رخصت کیا۔ یہ ہدایت بھی کی کہ جہاں تک ہو سکے حملہ کرنے میں سبقت نہ کریں بلکہ کام بخش کو اطراف سے محاصرے میں لیں۔ کوشش کریں کہ زندہ ہاتھ آ جائے، مارا نہ جاسکے۔

شاہ عالم سے رخصت ہو کر لشکر آگے بڑھا۔ ذوالفقار خاں، شہزادہ رفیع الشان کے ہمراہ سوار ہوا اور فوج کام بخش کے مقابل ایک گولے کی مار کے فاصلے پر پہنچ گئی۔

کام بخش کی قلتِ افواج کو دیکھ کر شاہی لشکر پر لرزہ طاری ہو گیا۔ لشکر میں یہ افواہیں گردش کرتی رہی تھیں کہ کام بخش کو کوئی جادو آتا ہے ورنہ وہ اب تک ہتھیار ڈال چکا ہوتا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ کام بخش مختصر سی فوج کے ساتھ کھڑا ہے اور حملے کا انتظار کر رہا ہے۔ نہ اس کے عزم میں کوئی کمی آئی ہے نہ کوئی گھبراہٹ طاری ہے۔

ذوالفقار خاں میسرہ پر متعین تھا۔ چودہ پندرہ ہزار کی فوج اس کے ساتھ تھی۔ وہ حملہ کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن بادشاہ کی طرف سے ہدایت تھی کہ حملے میں پہل نہ کی جائے اس لیے وہ مجبور تھا۔ کام بخش کو بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ بھی خاموش کھڑا تھا۔

وقت رینگتا رہا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ ضعیف الاعتقاد لشکری اسے بھی جادو ٹونا ہی سمجھ رہے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم نہیں تھا کہ تاخیر بادشاہ کی ہدایت کے مطابق کی جارہی ہے۔ آپس میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کام بخش نے امیروں کے گرد حصار کھینچ دیا ہے۔

ذوالفقار خاں کی کام بخش سے پرانی عداوت تھی۔ وہ حملہ کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا کہ جلد مقابلہ شروع ہو اور وہ کام بخش کا کام تمام کرے۔ اس نے کئی مرتبہ آدمی دوڑائے کہ بادشاہ سے حملہ کرنے کی اجازت لے کر آئیں لیکن ہر مرتبہ یہی جواب ملا کہ بادشاہ سلامت عالم خواب میں ہیں۔ اس دوران وہ خانِ خاناں کو بھی تیار کرتا رہا تھا کہ حملہ کر دیا جائے لیکن خانِ خاناں بضد تھا کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر وہ اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ بالآخر ذوالفقار خاں کو تاب انتظار نہ رہی۔ اس نے خان خاناں کی رفاقت کے بغیر ہی جنگ کا نقارہ بجوا دیا۔ یہ دیکھ کر خان خاناں کو بھی مجبوراً نکلنا پڑا۔ دونوں فوجیں طوفانی موجوں کی طرح حرکت میں آئیں۔ تیس ہزار کا مجموعی لشکر کام بخش پر جھپٹ پڑا۔ ان کا نشانہ کام بخش تھا۔ دونوں فوجوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

کام بخش کے پاس بس چار پانچ سو سوار تھے۔ سامان جنگ بھی موجود نہیں تھا البتہ "بان" کافی تعداد میں موجود تھے۔ اس نے ان بانوں کو آگ لگانے کا حکم دیا۔ ذوالفقار خاں نے یہ دیکھ کر توپ خانے پر حملہ کر دیا۔ یہ ایسا موقع تھا کہ کام بخش پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی لیکن اس کے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔

اس کی ناقابلِ یقین بہادری کو دیکھ کر شاہی لشکر میں بے چینی پھیل گئی جو کچھ ہی دیر میں بھگدڑ میں تبدیل ہوگئی۔ اس کے تیروں سے اس کثرت سے لوگ زخمی ہو رہے تھے کہ یہ افواہ سچ نظر آنے لگی کہ اس کے ہاتھ کوئی جادو آ گیا ہے۔

قریب تھا کہ اس کی مسلسل تیر اندازی سے سردارانِ شاہی پسپا ہو جاتے مگر اس کا ترکش خالی ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ عماری سے نیچے اتر کر تلوار کے جوہر دکھائے لیکن وہ خود اتنا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زخمی تھا کہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ضعف طاری ہوگیا۔ شاہی فوج کے سردار اس کی اس کیفیت کو بھانپ کر آگے بڑھے اور اسے گرفتار کرلیا۔ اس کا چھوٹا بیٹا عماری میں اس کے ساتھ تھا، اسے بھی گرفتار کرلیا گیا۔

جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کام بخش کا بڑا بیٹا ابھی تک مقابلے پر ڈٹا ہوا تھا لیکن وہ اکیلا کتنی دیر لڑتا۔ اس کا فیل بان زخم پر زخم کھا کر گر پڑا۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ شہزادے کو بھی گولی لگی اور وہ بھی بے ہوش ہوکر اپنی عماری میں گر گیا۔

دونوں زندہ گرفتار کرلیے گئے لیکن شدید زخمی تھے۔

شاہی لشکر فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے اپنے کیمپ کی طرف لوٹ گیا۔

شاہ عالم ان شادیانوں کی آوازیں سن رہا تھا۔ یہ خوشی کے شادیانے تھے لیکن آوازیں سنتے ہی وہ افسردہ ہوگیا۔ اپنے خیمے میں بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے ہدایت کی تھی کہ کام بخش کو زندہ گرفتار کیا جائے۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ اس کی ہدایت پر عمل کیا گیا ہے یا نہیں۔

جب خانِ خاناں اور ذوالفقار خاں کام بخش کے ہاتھی کو لے کر خیمہ شاہی پر آئے تو شاہ عالم نے پہلا سوال یہی کیا۔

''میرے بھائی کو زندہ لائے ہو یا مردہ؟''

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ کام بخش زخمی حالت میں زندہ ہے تو فتح کی نوید نے دہری خوشی کی شکل اختیار کرلی۔

''کام بخش کو ہمارے خیمے کے قریب ٹھہرایا جائے اور جراحوں کو فوراً اس کے خیمے میں بھیجو تاکہ وہ اس کے زخموں کا علاج کریں۔''

شاہ عالم نے فرنگی اور یونانی جراحوں کو اس کے پاس بھیجا لیکن اس نے علاج کرانے سے انکار کردیا۔ اس کے لیے یخنی بھیجی گئی، اس نے یخنی پینے سے بھی انکار کردیا۔ اب شاہ عالم خود اس کے پاس گیا۔ کام بخش بستر پر بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے آہٹ سن کر آنکھیں کھولیں، شاہ عالم کو دیکھا اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ شاہ عالم اس کے پاس بیٹھ گیا اور کچھ کہنے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے لگا۔ بالآخر اس نے الفاظ جمع کیے۔

''کام بخش میرے بھائی..... میں نے یہ نہیں چاہا تھا جو ہوگیا۔''

''تم نے تو یہ چاہا ہوگا کہ میں جنگ میں مارا جاؤں لیکن میں زندہ رہ گیا۔''

''تمہاری یہ بدگمانی کب دور ہوگی؟ میں نے تو خود ہدایت کی تھی کہ تمہیں زندہ گرفتار کرلیا جائے۔''

''شاید اس لیے کہ اپنی فتح کا تماشا مجھے دکھا سکو۔''

''میں نے تو مصالحت کا خط تمہیں لکھا تھا۔ میں جنگ نہیں چاہتا تھا۔''

''مجھے گرفتار کرنے کے لیے آدمی بھی تو بھیجے تھے۔''

''ہرگز نہیں۔ یہ بھی تمہارا وہم ہے۔ تم نے مصالحت کے بجائے مجھے جنگ پر آمادہ کردیا۔''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ بے غیرتی کے ساتھ گرفتار ہوکر تیمور کی اولاد پر رسوائی کا داغ لگاؤں۔''

''خیر جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ یہ یخنی رکھی ہے۔ میرے ہاتھ سے پی لو۔ کمزوری دور ہوگی تو زخم جلدی ٹھیک ہوجائیں گے۔''

''اس یخنی میں ضرور زہر ملا ہوگا کہ کام بخش تلوار سے نہیں تو زہر سے مرجائے۔'' اس کا وہم عروج پر تھا۔

''تم کہو تو اس یخنی کے چند گھونٹ پہلے میں پی لوں تاکہ تمہیں یقین آجائے کہ اس میں زہر نہیں ہے۔''

''اگر تم زہر دے کر ہی مارنا چاہتے ہو تو میں یہ یخنی پی لیتا ہوں۔'' اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ ''میرے بھائی! مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔ مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو اپنے ہاتھ سے پلا دو۔''

شاہ عالم نے یخنی کے دو تین چمچ پلائے تھے کہ کام بخش پر غشی طاری ہوگئی۔ شاہ عالم نے پیالہ اس کے سرہانے رکھ دیا اور آنسو پونچھتے ہوئے وہاں سے اٹھ گیا۔

وہ کام بخش کے خیمے سے اٹھا اور دوسرے خیمے میں چلا گیا جہاں کام بخش کے بیٹے فیروز کو رکھا گیا تھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ اس سے تو بات بھی نہ ہوسکی۔ کچھ دیر اس کی طرف غور سے دیکھا اور لوٹ آیا۔

''کام بخش! تمہاری ضد نے سب کچھ برباد کردیا۔ میں نے اعظم شاہ کو کھو دیا تھا لیکن تمہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔''

اس کے یہ الفاظ کس نے سنے ہوں گے۔ کوئی اس کے ساتھ تھا ہی نہیں۔

اپنے خیمے میں آنے کے بعد کسی اطلاع کے انتظار میں اس کی آنکھیں جاگتی رہیں۔ تین چار گھڑی بعد یہ اطلاع مل گئی کہ کام بخش اور اس کا بیٹا اللہ کو پیارے ہوگئے۔

بادشاہ نے دونوں کی لاشوں کو ہمایوں بادشاہ کے روضے میں دفن کرانے کے لیے شاہجہاں آباد روانہ کردیا۔ تین دن تک تعزیت کے مراسم ادا کیے اور نوبت نہیں بجائی گئی۔

شاہ عالم رسوم تعزیت سے فراغت کے بعد چاہتا تو یہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا کہ دہلی کی طرف لوٹ جائے لیکن کام بخش کی کمزور حکمرانی نے اتنے بگاڑ پیدا کردیے تھے کہ ان کا سدباب ضروری تھا۔ اس کی راہ میں اب کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی اس لیے دہلی پہنچنے کی جلدی بھی نہیں تھی۔ دکن کے بندوبست کے لیے کچھ دن اور قیام کا فیصلہ کرلیا۔

ذوالفقار خاں کو دکن کا صوبہ دار مقرر کردیا گیا تھا۔ خانِ خاناں کے القاب میں معظم خاں کا خطاب بڑھایا گیا۔ بیجاپور میں بھی شاہ عالم نے اپنا صوبہ دار مقرر کیا۔

امراء کی تقرریوں کے فیصلے ہو ہی رہے تھے کہ خانِ خاناں اور ذوالفقار خاں میں اختلافات پیدا ہوگئے بلکہ یوں کہا جائے کہ اختلافات پہلے سے موجود تھے، ان میں اضافہ ہوگیا۔ دونوں امیر اپنے اپنے من پسند افراد کی تقرری چاہتے تھے، بس یہی وجہ تنازع تھی۔ یہ اختلاف ختم ہوسکتے تھے لیکن شاہ عالم میں قوتِ فیصلہ کی کمی تھی۔ صبح میں کسی فریق کو حکم دیتا، کوئی سفارش آجاتی تو شام تک دوسرے فریق کے حق میں حکم جاری کردیتا۔ ذوالفقار خاں ایک امیر کو کسی جگہ تعینات کرتا، خانِ خاناں بادشاہ سے مل کر اسی کی جگہ کسی اور کو تعینات کرا دیتا۔ یہی عمل ذوالفقار خاں بھی دہراتا۔ بادشاہ پر تو کسی کا بس چلتا نہیں تھا، آپس میں الجھتے رہتے تھے۔

یہ اختلافات اتنے بڑھے کہ امرأ میں گروہ بندی شروع ہوگئی۔ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال ہونے لگے۔

شاہ عالم ان خرافات سے بے خبر خزانہ لٹا کر ان امراء کو خوش رکھے ہوئے تھا۔ ہر امیر اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ خانِ خاناں اپنے گرد ایسے لوگوں کو جمع کررہا تھا جو آڑے وقت میں اس کا ساتھ دے سکیں۔

ذوالفقار خاں اور خانِ خاناں کے اختلافات کا چرچا دربار سے باہر بھی سنائی دے رہا تھا۔ سیف اللہ خاں اپنے مکان میں چھپا بیٹھا تھا لیکن سن سب رہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو شاہ عالم کے لشکر سے نکل کر راجپوت سرداروں کے پاس پہنچا تھا اور کام بخش کو تخت نشیں کرنے کی سازش تیار کی تھی۔ یہ سازش کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ اس وقت سے اب تک وہ چھپا بیٹھا تھا۔ ذوالفقار خاں صوبہ دار ہوگیا تھا لہٰذا اس کے لیے خطرہ اور بڑھ گیا تھا۔ وہ دکن چھوڑ کر کہیں اور جانے ہی والا تھا کہ اسے خانِ خاناں اور ذوالفقار خاں کی آویزش کا علم ہوا۔ اس کے شیطانی ذہن نے ایک سازش اور تیار کرلی۔ اس کے لیے خانِ خاناں سے ملنا ضروری تھا۔ اس نے کسی ذریعے سے خانِ خاناں تک رسائی حاصل کرلی۔ خانِ خاناں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ کام بخش نے اسے قتل کرادیا ہوگا کیونکہ اس کی کوئی خیر خبر تھی ہی نہیں۔

''سیف اللہ خاں! یہ تم ہی ہو یا مرنے کے بعد چلے آئے ہو۔''

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں مرچکا۔''

''کام بخش تمہاری باتوں میں نہیں آیا اور اس کے باوجود تمہیں زندہ چھوڑ دیا..... یہ کیسے ہوا؟''

''بس یہ سمجھ لو کہ میری زندگی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے حیدرآباد میں رہنے کی اجازت طلب کی اور یہ اجازت اس نے دے دی۔ اس کی وہمی طبیعت سے بعید نہیں تھا کہ اپنا فیصلہ بدل دیتا لیکن وہ شاہ عالم سے جنگ میں الجھ گیا اور مجھے بھول گیا۔''

''جانتے بھی ہو کہ اب دکن کا صوبہ دار ذوالفقار خاں سے جو تمہارا سخت دشمن ہے۔ اسی کی وجہ سے تم لشکر چھوڑ کر گئے تھے۔''

''اسی لیے تو تمہارے پاس حاضر ہوا ہوں۔ تم بادشاہ سے مجھے معافی دلا دو۔ ذوالفقار خاں کو میں دیکھ لوں گا۔''

''ذوالفقار خاں ان دنوں بادشاہ کے بہت سر چڑھا ہوا ہے۔''

''دیکھو معظم خاں! اگر میں تمہارے توسط سے دربار میں چلا گیا تو سوچو ذوالفقار خاں پر کیا بیت جائے گی۔ یہ میری نہیں تمہاری جیت ہوگی۔''

خانِ خاناں یہ سن کر بھڑک ہی تو گیا۔ ذوالفقار خاں اب تک اسے نیچا دکھاتا رہا تھا، اب موقع آیا تھا کہ ذوالفقار خاں کو شرمندہ کرے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یہ کام ناممکن نظر آنے لگا۔

''سیف اللہ خاں! تمہارا جرم اتنا بڑا ہے کہ بادشاہ شاید ہی تمہیں معاف کرے۔ تم نے تو شاہ عالم کا تخت اس سے چھین ہی لیا تھا اگر کام بخش کی آنکھوں پر پردے نہ پڑ جاتے۔ بادشاہ تمہاری اتنی بڑی جسارت کیسے معاف کردے گا۔ تم کہیں معافی کے بجائے اس کے عتاب کا شکار نہ ہوجاؤ۔''

''میں نے تو ذوالفقار خاں کو نیچا دکھانے کے لیے ایک ترکیب تمہیں بتادی ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ بادشاہ کے روبرو میرا معاملہ کب اور کیسے اٹھاتے ہو۔''

''میں موقع دیکھ کر بادشاہ کے سامنے تمہارا ذکر چھیڑ کر دیکھتا ہوں۔''

''ذرا سوچیے، جب میں آپ کے توسط سے دربار میں آجاؤں گا تو ذوالفقار خاں پر کیا گزرے گی۔ یہ آپ کی ایسی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فتح ہوگی جسے ذوالفقار خاں مدتوں یاد رکھے گا۔"

"بس یہ دعا کرو کہ تمہاری قسمت یاوری کرے اور بادشاہ کسی ضرورت سے مجھے طلب فرمالیں۔"

سیف اللہ خاں کی قسمت واقعی زوروں پر تھی، بہ مشکل ایک یا دو دن گزرے تھے کہ بادشاہ نے خانِ خاناں کو طلب کیا۔ حیدر آباد سے واپسی کے لیے کچھ مشورے تھے جس کے لیے خانِ خاناں کو بلایا گیا تھا۔

جب وہ بادشاہ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا تو سیف اللہ کا معاملہ اس کے ذہن میں تھا۔ وہ بادشاہ کا مزاج داں تھا۔ جانتا تھا کہ کون سی بات کس وقت کی جائے اور بادشاہ کو کس طرح شیشے میں اتارا جائے۔

اس نے بادشاہ سے ملاقات کی۔ جب سب باتیں ہوچکیں اور خانِ خاناں انتظامِ حیدر آباد کے حوالے سے بادشاہ کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر چکا تو اس نے سیف اللہ خاں کا ذکر چھیڑ دیا۔ سیف اللہ خاں کا نام سنتے ہی شاہ عالم بھڑک اٹھا اور وہ سب باتیں دہرا دیں جو اس کے اجیت سنگھ کے پاس جانے اور کام بخش کو دہلی لے جانے سے متعلق تھیں۔ خانِ خاناں سر جھکائے سنتا رہا۔ جب بادشاہ اپنا دل ہلکا کر چکا تو وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا۔

"میری جان آپ پر فدا ہو۔ سیف اللہ خاں کا راجپوتوں کے پاس جانا محض داستان ہے جو ذوالفقار خاں کی طرف سے پھیلائی گئی تھی۔"

"ذوالفقار خاں ایسی بے سروپا باتیں کیوں کہیں گے۔"

"ذوالفقار خاں اور سیف اللہ خاں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ سیف اللہ خاں لشکر چھوڑ کر چلے گئے بس ذوالفقار خاں کو موقع مل گیا۔ وہ چلے گئے تھے، یہ حقیقت ہے باقی سب من گھڑت۔"

"کیا یہ بھی من گھڑت ہے کہ اس نے کام بخش سے ملنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اسے دہلی لے جاکر تخت نشیں کرادے؟ سوچو اگر ایسا ہوجاتا تو کتنا بڑا فتنہ کھڑا ہوجاتا۔ ہمیں حیرت ہے کہ اتنے بڑے جرم کے بعد بھی تم سیف اللہ خاں کی حمایت پر کمربستہ ہو۔"

"اس میں بھی آپ تک بات پہنچانے میں کسی نے رنگ آمیزی کی ہے۔ وہ کام بخش مرحوم کے پاس آئے ضرور تھے لیکن صرف اس لیے کہ انہیں حیدر آباد میں رہنے کی اجازت مل جائے۔ وہ اجازت انہیں مل گئی۔ کچھ یومیہ بھی مقرر ہوگیا تھا۔ اب وہ بھی بند ہوگیا، بے چارے بڑی عسرت میں زندگی کاٹ رہے ہیں۔ نام تو یہی آتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے ملازم اور اس حال میں۔ یہ ہمارے لیے بھی شرمندگی کا مقام ہے۔ وہ اب بھی خود کو آپ کا ملازم کہتے ہیں لیکن آپ کی ناراضی کے خوف سے چھپے ہوئے ہیں۔"

"انہوں نے جب کام بخش کی ملازمت نہیں کی تھی تو ہمارے پاس لوٹ کر آسکتے تھے۔"

"وہی ذوالفقار خاں کا خوف اور پھر انہوں نے یہ بھی سوچا تھا کہ جب آپ فاتح بن کر حیدر آباد میں داخل ہوں گے تو آپ سے معافی کے خواستگار ہوں گے۔"

"پھر اب تک معافی کے لیے حاضر کیوں نہیں ہوئے؟" بادشاہ کا لہجہ نرم ہوگیا تھا۔

"آپ کی اجازت کے منتظر ہیں۔"

"ہم نے معاف کیا، ہمارے خدا نے معاف کیا۔ بتایئے تو غلط فہمیاں بھی کیا کیا رنگ دکھاتی ہیں۔"

خانِ خاناں نے بادشاہ کا رویہ نرم دیکھتے ہی دوسرے دن سیف اللہ خاں کو بادشاہ کے سامنے پیش کردیا۔ اتفاق یہ ہوا کہ ذوالفقار خاں بھی اس وقت دربار میں موجود تھا۔ بادشاہ نے چند باتیں بطور نصیحت کیں اور سیف اللہ خاں کے تمام مناصب بحال کردیے۔ ذوالفقار خاں نے پیچ و تاب تو بہت کھائے لیکن بادشاہ کے سامنے کیا کہہ سکتا تھا۔ خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ خانِ خاناں اور ذوالفقار خاں کی آویزش میں ایک اور اضافہ ہوگیا۔ اب وہ اس فکر میں تھا کہ اس شکست کا بدلہ کیسے لیا جائے۔

شاہ عالم ابھی حیدر آباد کے بندوبست سے پوری طرح فارغ نہیں ہوا تھا لیکن اسے دہلی پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس نے اپنی حکومت کے تیسرے سال کا جشن تزک و احتشام سے منایا اور اپنا آدھا خزانہ حیدر آباد میں لٹا کر سفر کا آغاز کیا۔ بادشاہ نے شہزادوں کو ہدایت کی کہ وہ ناکیوں پر جن کو تختِ رواں کی صورت میں ترتیب دیا تھا، سوار ہوکر نکلیں۔ اعظم شاہ، بیدار بخت اور کام بخش کے بیٹوں کو خلعتیں عطا ہوئیں۔ ان کو دربار میں بیٹھنے اور سواری کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہونے کے اعزاز ملے۔ اسی وقت خانِ خاناں اور ذوالفقار خاں کو حضور میں نوبت بجوانے اور ناکی پر سوار ہونے کا اعزاز دیا گیا۔ ذوالفقار خاں کو خانِ خاناں سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ تسلیمات بجالانے کے بعد عرض کیا۔

"ہم بندگانِ نعمت کی تمام آرزوئیں پوری ہوگئیں۔ ہمارے اور شہزادوں کے درمیان بس ایک ہی فرق رہ گیا ہے کہ ان کو حضورِ والا کی رکاب میں نقارہ بجانے کی اجازت ہے۔ ادب و احترام کے لحاظ سے اس فرق کو قائم رہنا چاہیے۔"

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس نے یہ کہہ کر نوبت بجانے کی عنایت کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں آگئی اور اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ خانِ خاناں حضور شاہ میں نقارہ بجانے کا آرزومند تھا۔ اس کی یہ خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ ذوالفقار خاں بادشاہ کی نظروں میں سرخرو بھی ہوگیا اور اس نے خانِ خاناں سے سیف اللہ خاں کو بادشاہ کے حضور پیش کرنے کا بدلہ بھی لے لیا۔

شاہ عالم کی سواری باد بہاری نہایت کروفر کے ساتھ اورنگ آباد کے قریب پہنچی۔ بارش کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے یہیں چھاؤنی ڈال دی۔ سیر وشکار کے لیے یہیں رک گیا۔ یہیں اس سے وہ غلطی سرزد ہوئی جو آئندہ مغلوں کی تاریخ میں نہایت خطرناک نتائج بننے والی تھی۔ عالمگیر نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی تھی کہ سادات بارہہ سے صرف عسکری خدمات لینا، انہیں انتظامی معاملات میں شریک مت کرنا ورنہ وہ حکومت میں انتہائی بااثر شریک بن جائیں گے۔

اس وقت اس وصیت یا نصیحت پر عمل کرنے کے لیے صرف شاہ عالم زندہ رہ گیا تھا اور اسی کو یہ نصیحت یاد نہیں رہی۔ جس شہر میں (اورنگ آباد) عالمگیر دفن تھا، اسی شہر میں شاہ عالم نے اسی وصیت کو پرزے کرکے ہوا میں اڑا دیا۔ وہ ان کی عسکری خدمات سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کی خدمات کا صلہ اس طرح دیا کہ بڑے بھائی حسن علی کو الٰہ آباد اور دوسرے بھائی حسین علی کو بہار کا نائب صوبے دار بنا کر پٹنہ بھیج دیا۔

موسمِ باراں رخصت ہوا تو اس نے بھی باپ کی قبر پر رخصتی کی حاضری دی۔ خیمے اکھاڑے اور سفر کرتا ہوا برہان پور پہنچ گیا۔

خیموں سے میدان سج گیا۔ بادشاہ یہاں کچھ دن قیام کرکے سیر وشکار سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا کہ راجپوتوں کے فساد کی خبریں پہنچنے لگیں۔ جب یہ خبریں مکرر پہنچیں تو شاہ عالم نے برہان پور میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا..... وہ اپنے ایک امیر، میر احمد خاں کو برہان پور کا نگہبان مقرر کرکے اجمیر کی طرف بڑھ گیا۔ ابھی وہ اجمین تک پہنچا تھا کہ سکھوں کے فساد کی خبریں آنے لگیں۔ اس قوم نے نواح دہلی اور پنجاب فسادات شروع کردیے تھے۔ بادشاہ نے اس شورش کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور علاقوں کے فوجداروں اور صوبے داروں کو رفع فساد کے احکام جاری کرکے راجپوتوں سے مقابلے کے لیے روانہ ہوگیا۔ اجمیر کے قریب پہنچ کر لشکر گاہ قائم کی۔ یہاں سے اسے بہادر راجپوتوں کے گڑھ پر حملہ کرنا تھا۔ یہ مقابلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ راجپوتوں کی بہادری ضرب المثل تھی اور یہ جنگ ان کے علاقوں میں ہونی تھی۔ بادشاہ نے تجربہ کار سرداروں کے زیرِ کمان راجا جے سنگھ اور رانا چتوڑ کے تعلقے اودے پور اور جودھپور پر حملہ کرنے کے لیے فوجوں کو متعین کردیا۔

جب بادشاہی افواج راجپوتوں کے علاقے میں داخل ہوگئیں تو راجپوت خوفزدہ ہوگئے اور خانِ خاناں کی خدمت میں حاضر ہوکر صلح پر آمادہ ہوئے۔

''ہم سے بڑی غلطی ہوگئی کہ بادشاہ کے باج گزار ہوتے ہوئے ہم نے من مانی کی، فساد برپا کیا اور شاہی فوجوں کو یہاں آنا پڑا۔ ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ شاہی فوج کا مقابلہ کریں۔''

''کھل کر بتاؤ، اب چاہتے کیا ہو؟''

''آپ بادشاہ سے ہماری صلح کرادیں۔ ہمارے قصور معاف کرادیں۔''

''تمہارے قصور ایک مرتبہ پہلے بھی معاف کیے گئے تھے مگر تم شاہی عنایات کو ٹھکرا کر لشکر سے بھاگ نکلے۔''

''ہم اس حرکت پر نادم ہیں اور وچن دیتے ہیں کہ آئندہ یہ موقع نہیں آنے دیں گے۔''

''بادشاہ کچھ شرائط عائد کرنے کے بعد ہی صلح پر آمادہ ہوگا۔''

''ہم درباروں کے آداب سے واقف ہیں۔ ہمیں ہر شرط منظور ہوگی۔''

''پہلے بھی تم لوگوں نے کچھ شرطوں پر دستخط کیے تھے مگر تم نے خلاف ورزی کی۔''

''اس مرتبہ ہم آپ کو اپنا وکیل بناتے ہیں۔ آپ ہماری درخواست بادشاہ تک پہنچادیں۔''

بادشاہ اس وقت اجمیر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ خانِ خاناں نے راجپوتوں کی طرف سے معافی کی درخواست بادشاہ کے حضور پہنچادی۔ شاہ عالم زمانہ شہزادگی سے دیکھتا چلا آیا تھا کہ راجپوت خطرہ سر پر دیکھ کر صلح کی باتیں کرنے لگتے ہیں اور خطرہ ٹلتے ہی سرکشی پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ وہ اس وقت صلح پر آمادہ ہیں لیکن میرے روانہ ہوتے ہی پھر ہاتھ پاؤں نکالیں گے۔ اس نے اس درخواست پر غور کرنے سے انکار کردیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس مرتبہ راجپوتوں کی مکمل بیخ کنی کردی جائے لیکن لاہور اور دہلی کے نواح میں سکھوں کی طرف سے برپا ہونے والے فتنہ وفساد نے خطرناک صورت اختیار کرلی تھی۔ کئی علاقوں پر قبضہ کرلیا گیا تھا۔ دہلی کی دو تین منزلوں سے دارالسلطنت لاہور کے اطراف تک تمام مشہور قصبے اور بستیاں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ان کی تاخت وتاراج سے ویران اور بے چراغ ہوگئی تھیں۔ بہ کثرت آدمی مارے گئے۔ انہوں نے بے شمار مسجدوں اور مزاروں کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ خاص طور سے جب وہ لاہور سے لوٹے تو سادھورہ اور کرنال کے دیہات اور قصبوں میں کہ وہاں کا فوجدار مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہوگیا تھا، بڑی تباہی مچائی۔ جو ہندو، مسلمان ان کے ہاتھ اسیر ہوگئے تھے ان کو سو دو سو کی ٹکڑی میں ایک جگہ بٹھا کر قتل کردیا۔

بادشاہ کے مقربوں نے اسے وقت کی نزاکت کا احساس دلایا کہ اگر وہ راجپوتوں کے خلاف کسی بڑی جنگ میں گھر گیا تو سکھوں کا خروج دہلی تک کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا لہٰذا مناسب یہی ہے کہ راجپوتوں سے اس وقت صلح کرلی جائے اور سکھوں کی شورش دبانے کے لیے بادشاہ خود آگے بڑھے۔

بادشاہ نے اس مناسب مشورے کو قبول کیا اور صلح کی درخواست کو قبول کرلیا۔ یہ طے پایا کہ راجا جے سنگھ، راجا اجیت سنگھ اور رانا کے وکیل اور دوسرے راجپوت سردار بادشاہ کی سواری کے وقت خدمت میں حاضر ہوں اور باریابی ورخصتی کی خلعتیں اسی دن حاصل کرلیں اور بادشاہ کے کوچ کے بعد سفر کا انتظام کرکے بادشاہی رکاب میں حاضر ہوجائیں۔

راجپوتوں نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور بادشاہ کے کوچ کے وقت تمام نامی گرامی راجپوت سرداروں نے تیس چالیس ہزار سواروں کا جائزہ دیا اور معائنہ کرایا اور اپنے ہاتھوں کو رومال سے باندھ کر بادشاہ کی سواری کے سامنے حاضر ہوگئے اور خلعت، ہاتھی، گھوڑے انعام میں لے کر واپس ہوگئے۔

☆☆☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب شاہ عالم کام بخش سے مقابلے کے لیے کوچ کرنے ہی والا تھا۔ سکھ قوم کا آخری گرو گوبند نامی حضور میں پہنچا تھا۔ واپسی میں اسے کسی نے قتل کردیا۔ اس کا ایک چیلا یہ خبر لے کر پنجاب پہنچا اور اس نے یہ خبر اس انداز میں پہنچائی کہ شاہ عالم نے گرو گوبند کو قتل کرادیا۔ گرو کی روح مجھ میں حلول کرگئی یعنی وہ میری شکل میں دوبارہ ظاہر ہورہا ہے تاکہ میں اس کے قتل کا بدلہ لے سکوں۔ اس نے اپنا نام سچا بادشاہ رکھا اور گرو گوبند کے انتقام کے لیے لوگوں کو جمع کرنا شروع کردیا۔ پنجاب اور سرہند کے نواح میں اس نے تاخت وتاراج شروع کردی۔ دو تین ماہ کے عرصے میں اس نے سات آٹھ ہزار پیادے جمع کرلیے اور روز بروز اس کا جتھا بڑھتا گیا۔ لوٹ مار سے اس کے پاس اچھی خاصی دولت جمع ہوگئی یہاں تک کہ اٹھارہ ہزار مسلح سوار اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ اب یہ لوگ ہر طرف قزاقی اور مردم آزاری کرنے لگے۔ دو تین فوجداروں نے ان کی سرکوبی کا ارادہ کیا تو سکھوں نے انہیں لڑ بھڑ کر قتل کردیا اور ہر جگہ اپنے تھانے داروں، مال کے تحصیل داروں کو مقرر کردیا۔

شاہ عالم دکن میں مصروف رہا پھر راجپوتوں کی سرکوبی میں مشغول رہا۔ سکھوں نے اس کا خوب فائدہ اٹھایا اور ''سچا بادشاہ'' کے لشکر کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ بادشاہی حکام اور جاگیرداروں کے کارندوں کو لکھتے رہتے تھے کہ اطاعت کریں اور اپنے تعلقوں سے دست بردار ہوجائیں۔ جس طرف نکل جاتے ''سچا بادشاہ'' اور ''فتح درس'' کے نعرے لگاتے ہوئے لوٹ مار کا بازار گرم کردیتے۔

سرہند کا فوج دار وزیر خاں تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ سکھوں نے اس کے تعلقہ پرگنوں پر دست درازی شروع کردی ہے تو اس نے چار پانچ مشہور فوجداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو اپنے ساتھ لیا اور گولہ وبارود ذخیرہ کرکے مقابلے پر نکلا۔ جب وہ تین چار کوس کے فاصلے پر پہنچا اور سکھوں کو خبر ملی تو سچا بادشاہ اور فتح درس کے نعرے لگاتے ہوئے وزیر خاں کے مقابلے پر آراستہ ہوئے اور بڑی بہادری سے حملہ کیا۔ اس سرفروشانہ حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید ہوگئی۔ وزیر خاں کی فوج نے یہ نقصان اٹھانے کے بعد اس شدت سے حملہ کیا کہ سکھوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن اسی وقت ایک گولی کہیں سے آئی اور وزیر خاں کے سر کے آر پار ہوگئی۔ وہ اسی وقت شہید ہوگیا۔ اس کے مرتے ہی مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے۔ ایسی افراتفری پھیلی کہ بے شمار پیادے اور سوار مارے گئے۔ باقی جان بچا کر بھاگے۔

سکھوں کا پیشوا تعاقب کرتا ہوا سرہند تک آ گیا۔

سرہند میں داخل ہوتے ہی سکھوں نے جی بھر کے لوٹ مار کی۔ شہر میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ عمارتوں کو آگ لگادی گئی۔

لوٹ مار کے بعد تمام پرگنوں میں انہوں نے باج وصول کرنے کے لیے اپنے عمال مقرر کردیے۔

سرہند کے بعد انہوں نے سہارن پور کا بھی یہی حشر کیا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے بعد سہارن پور کا بھی بندوبست سنبھال لیا۔

جلال آباد کا فوج دار مطمئن بیٹھا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سکھوں پر اس کی ایسی دھاک ہے کہ وہ اس طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھیں گے لیکن جب سکھوں کی جانب سے اسے دھمکی آمیز خطوط ملنے لگے تو وہ خواب راحت سے چونکا۔

جلال آباد نہایت خوشحال قصبہ تھا۔ بڑے بڑے مال دار پٹھان وہاں آباد تھے۔ جلال خاں بھی نہایت دلیر آدمی تھا۔

سکھوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے وہ برج و فصیل مستحکم کر کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہزاروں افغان اس کے ساتھ تھے۔

سکھوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ کس سے مقابلہ کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ انہوں نے ستر اسی ہزار فوج جمع کی اور جلال آباد کا محاصرہ کر لیا۔ فیصلہ کچھ بھی ہونے والا تھا لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہو گیا کہ سکھوں کی طاقت کتنی ہو گئی ہے۔ سکھ متحرک مورچے بنا کر لائے تھے۔ لکڑی کے تختوں کو جوڑ رکھا تھا اور نیچے گاڑی کی طرح پہیے لگا دیے تھے۔ وہ ان متحرک مورچوں کو فصیل تک لے گئے اور فصیل کو گرانے کے لیے بڑھے۔ اس وقت انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ پٹھان قلعے کا دروازہ کھول کر ننگی تلواریں لیے اچانک باہر نکل آئے۔ جتنے لوگ فصیل کھودنے میں مصروف تھے، ایک ہی ہلے میں سب مارے گئے۔ جتنی دیر میں ان کی مدد کے لیے کوئی آتا، پٹھان قلعے میں محصور ہو گئے۔

اس کے بعد یہی شیوہ اختیار کیے رکھا۔ راتوں کو قلعے سے باہر نکلتے اور شب خون مار کر دوبارہ قلعے میں آ جاتے۔ یہ سلسلہ بیس دن تک چلتا رہا۔

ان کی اس پامردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی باقاعدہ جنگ سے پہلے ہی سکھ اپنے ہزاروں آدمیوں کو کٹا کر ناکام و نامراد محاصرہ اٹھا کر چلے گئے۔

اس شرمناک شکست نے تھوڑی دیر کے لیے سکھوں کا رعب اٹھا دیا۔ اب تک وہ ناقابل شکست سمجھے جاتے تھے لیکن اب معلوم ہوا انہیں شکست بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کا مظاہرہ سلطان پور میں ہوا جہاں شمس خاں فوج دار تھا۔ سکھوں نے اس کے نام خط لکھا۔

''ہماری اطاعت کرو اور جو خزانہ تمہارے پاس ہے ہمارے حوالے کر دو۔ ہمارے آدمی آ رہے ہیں، ان کے ہاتھ ہمارے لیے بارود بھیجو۔''

شمس خاں دیکھ چکا تھا کہ جلال آباد میں سکھوں کا کیا حال ہوا ہے لہٰذا اس کی بھی ہمت ہوئی۔ اس نے اس خط کا جواب ان الفاظ میں دیا۔

''دیر کس بات کی۔ جلدی آؤ۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔ ایک چنگی بارود بھیج رہا ہوں۔ سواری اور بار برداری کے جانور ہمارے رفقا اور شرفا کے سوار ہونے کے لیے روک لیے گئے ہیں اس لیے بارود اور سیسہ زیادہ مقدار میں بھجوانے کا انتظام نہیں ہو سکا۔ ویسے ہمارے پاس بارود اور سیسے کی کمی نہیں ہے۔ جس قدر بار بردار تم لوگ بھیج دو گے اتنی ہی بارود اور سیسہ لاد کر ہم بھجوا دیں گے۔''

ایسا ذلت آمیز جواب سن کر سکھوں کا خون کھول گیا ہوگا۔ انہوں نے اسی ہزار کا لشکر ساتھ لیا اور لوٹ مار کرتے ہوئے سلطان پور سے سات کوس پر قصبہ راہون میں پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ شمس خاں مقابلے کے لیے نکل کھڑا ہوا ہے لہٰذا وہ وہیں ٹھہر گئے۔

شمس خاں نے سکھوں سے مقابلے کے لیے خوب تیاری کر لی تھی۔ وہ ایک لاکھ کا لشکر لے کر نہایت کروفر کے ساتھ سلطان پور سے نکلا۔ اس کے دائیں بائیں جو لوگ تھے، وہ اس بات کو پوری طرح سمجھ چکے تھے کہ اگر شمس خاں کو شکست ہوئی تو ان کے اہل و عیال بھی برباد ہو جائیں گے لہٰذا وہ اس عزم کے ساتھ چلے تھے کہ مر جائیں گے لیکن سکھوں کو غالب نہیں آنے دیں گے۔

شمس خاں کا لشکر جیسے ہی سکھوں کی مورچہ بندی سے ایک گولے کی مار کے فاصلے پر پہنچا، سکھوں کے مورچوں سے توپوں اور بندوقوں کے دھماکے شروع ہو گئے۔ شمس خاں نے کہہ دیا تھا کہ ادھر سے کوئی گولہ نہ چلے۔ بارود سنبھال کر رکھو اور قدم بہ قدم بڑھتے رہو۔ مسلمان پھونک پھونک کر قدم رکھتے رہے۔ سکھوں نے بے احتیاطی سے سارا بارود پھونک دیا پھر اچانک شمس خاں نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوا تیزی سے حملہ آور ہوا۔ اگلی صفیں کٹ کر رہ گئیں۔ سکھوں نے لا حاصل ہاتھ پاؤں مارے مگر ہزیمت اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور راہون کے قلعے میں جا کر پناہ لی جو اس جنگ سے پہلے ان کے قبضے میں آ گیا تھا۔ قلعے میں کافی سامان جنگ اور غذا کا ذخیرہ موجود تھا لہٰذا کئی ہفتوں تک سکھ یہاں ٹھہرے رہے لیکن قلعے میں موجود غذا کب تک ساتھ دیتی جبکہ مسلمانوں کے پاس مسلسل رسد پہنچ رہی تھی۔ انہوں نے اسی میں عافیت جانی کہ رات کے اندھیرے کا سہارا لے کر قلعہ چھوڑ دیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

سکھ لشکر یہاں سے تو فرار ہو چکا تھا لیکن اب ان کے تاخت و تاراج کی گونج لاہور کے اطراف پرگنوں میں سنائی دے رہی تھی۔ ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی۔ لوگ بادشاہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے نام کی دہائی دے رہے تھے۔

شاہ عالم دکن کے بندوبست اور راجپوتوں سے نمٹ کر دہلی کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں سکھوں نے جو طوفان اٹھایا تھا، شاہ عالم کو اس کی خبریں ملتی رہی تھیں۔

اب سکھوں کو زیادہ دیر تک چھوٹ نہیں دی جاسکتی تھی۔

جب بادشاہ کی سواری دہلی کے قریب پہنچی تو بادشاہی لشکر نے بارہ کوس کے فاصلے پر دہلی کو دائیں ہاتھ پر چھوڑ دیا اور سکھوں کی سرکوبی کے لیے پیش قدمی کی۔ سکھوں کو اس پیش قدمی کی خبریں مل رہی تھیں لیکن وہ اپنی شرارتوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ بستیوں کو غارت کرنے میں مشغول تھے، یہاں تک کہ شاہی سواری شاہدرہ سے چار پانچ کوس پر پہنچی۔ یہ طے ہوا کہ کوئی مناسب جگہ دیکھ کر خیمہ گاہ قائم کی جائے۔

بادشاہ نے اپنے دو امیروں رستم دل خاں اور فیروز خاں میواتی کو آگے روانہ کیا کہ وہ خیمہ گاہ کے لیے مناسب و محفوظ جگہ تلاش کریں۔ دونوں امیر شاہی لشکر کا کچھ حصہ لے کر آگے بڑھے۔ شاہدرہ کے قریب پہنچے تھے کہ سکھوں کا لشکر نعرے لگاتے ہوئے مقابل آ گیا۔ ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان کے فقیرانہ لباس، بڑی بڑی ڈاڑھیاں اور وحشی صورتوں کو دیکھ کر بادشاہی فوج میں ہراس پیدا ہوگیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک ہوا تھا کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جب کافی آدمی مارے گئے اور زخمی ہوچکے تو فیروز خاں میواتی اور سادات بارہہ آگے بڑھے اور گھوڑوں سے اتر کر پیادہ لڑائی شروع کردی۔ انہیں دیکھ کر لشکر کی ہمت بندھی، ایسے کاری وار کیے کہ گمراہوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔

شاہی لشکر نے اب تیزی سے سفر شروع کیا اور شاہدرہ پہنچ گیا۔ رستم دل خاں نے جگہ کا تعین کر کے چھاؤنی لگا دی۔ ویرانے میں شہر آباد ہوگیا لیکن اس شہر کو کسی کی نظر لگ گئی۔ سخت سردیوں کے شب و روز تھے، اس پر مستزاد یہ کہ بارش شروع ہوگئی۔ بارش بھی ایسی کہ چار دن تک کسی وقفے کے بغیر پانی برستا رہا۔ ہوا برف سے زیادہ سرد ہوگئی۔ خیمہ گاہ دلدل اور کیچڑ سے بھر گئی۔ ''پاؤں رکھتے ہیں کہیں، پاؤں کہیں پڑتا ہے'' والا معاملہ تھا۔ سرد ہوا ہڈیوں میں سوراخ کیے دے رہی تھی۔ دکن کے آدمیوں کے لیے تو یہ سردی ناقابلِ برداشت تھی۔ ہزاروں آدمی لقمۂ اجل بن گئے۔ انہیں دفن کرنا مسئلہ ہو رہا تھا کہ سواری اور باربرداری کے گھوڑے اس قدر تلف ہوئے کہ بدبو سے ناک میں دم آ گیا۔ یہ بارشیں چونکہ وقت سے پہلے شروع ہوئی تھیں اور معمول سے زیادہ ہوئی تھیں اس لیے لشکر میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ سکھوں نے جادو کردیا ہے جس کے اثر سے بارش ہوئی ہے اور میدان کیچڑ بن گیا ہے۔ سکھوں کے جتھے بار برداری اور رسد کو لوٹ رہے تھے۔ وہ آتے تھے اور کسی کو دکھائی دیے بغیر بادشاہی لشکر کے اطراف چھاپے مارتے تھے۔ اس کے بارے میں بھی یہ افواہ پھیل گئی کہ کوئی نامعلوم مخلوق ہے جو آتی ہے اور لوٹ مار کر کے چلی جاتی ہے۔ لشکر میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بعض لوگ تو اتنے خوف زدہ ہوئے کہ لشکر چھوڑ کر جانے کی تیاری کرنے لگے۔

یہ باتیں سن سن کر امراء کے طبقے میں فکرمندی کی لہر دوڑ گئی اور یہ غور کیا جانے لگا کہ اس کا کوئی ازالہ کیا جائے۔ کوئی ایسا قدم اٹھایا جائے کہ یہ خوف دور ہو ورنہ لوگ واقعی لشکر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ تمام امراء جمع ہوکر بادشاہ کے حضور پہنچے۔

''حضور! اب ہمیں کوئی نہ کوئی تدبیر کرنی ہوگی۔ لشکر میں بہت بے دلی پھیل رہی ہے۔''

''اس بے دلی کا کوئی سبب بھی تو ہوگا؟''

''ہم قدرت کی طرف سے چند مشکلات میں گھرے ہوئے ہیں اور لوگ اسے سکھوں کی طرف سے جادو کا اثر سمجھ رہے ہیں۔ بعض تو لشکر چھوڑ کر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''کیا ہم مسلمان ہوتے ہوئے ان خرافات پر یقین کرسکتے ہیں؟''

''حضور! آپ سکھوں کی سرکوبی کے لیے احکام جاری فرمائیے ورنہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''حضور! اب بارش تھم گئی ہے۔ رفتہ رفتہ سردی کی شدت میں بھی کمی آجائے گی۔ ہم اس کیچڑ بھرے میدان سے باہر نکلیں گے تو لشکر بھی سکون کا سانس لے گا۔'' ایک دوسرے امیر نے رائے دی۔

شاہ عالم نے ان تجاویز کی روشنی میں سکھوں کی سرکوبی کے لیے فوج ترتیب دے کر شہزادہ رفیع الشان کو کمان دار مقرر کردیا اور اس کے ماتحت چند تجربہ کار امراء کو مقرر کیا۔

یہ خبر جیسے ہی لشکر کے کانوں تک پہنچی، خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک تو کرنے کے لیے کچھ کام نکل آیا، دوسری خوشی یہ تھی کہ اس کیچڑ بھری لشکر گاہ سے نکلنے کا موقع ملے گا۔

طے یہ ہوا کہ لشکر رات کے وقت روانہ ہوتا کہ سکھ اگر شب خون مارنے کے لیے باہر نکلیں تو انہیں راستے ہی میں روک لیا جائے۔ وہ یقیناً تعداد میں تھوڑے ہوں گے لہٰذا بہ آسانی تہ تیغ کردیا جائے گا۔ انہوں نے مشعلیں بھی روشن نہیں کیں۔ اندھیرے کی چادر اوڑھی اور لشکر گاہ سے نکل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گئے۔ اندازہ بالکل درست نکلا۔ سکھوں کا ایک جتھا شب خون مارنے کے لیے باہر نکلا ہی تھا کہ لشکر سے سامنا ہوگیا۔ ان کا گرو سچا بادشاہ بھی قریب ہی کہیں چھپا ہوا تھا۔ وہ بھی مدد کے لیے آ گیا۔ دونوں طرف کی مشعلیں روشن ہوگئیں۔ رات بھر لڑائی ہوتی رہی۔ سکھ فوج بڑی بہادری سے لڑی لیکن بالآخر شاہی فوج غالب آنے لگی۔ صبح کی روشنی بھی نمودار ہونے لگی تھی۔ سکھوں کے لیے اب جمے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ اپنی بہ کثرت لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگے اور ایک دشوار گزار مقام ''بلوگڑھ'' میں پناہ لے لی۔

بلوگڑھ کا قلعہ ایک پہاڑ پر واقع تھا۔ اس کی فصیل اتنی وسیع تھی کہ ساٹھ ستر ہزار سوار اور پیادہ فوج ہی اس کا محاصرہ کرسکتی تھی۔

سچا بادشاہ نے یہاں پہنچتے ہی اپنے آدمیوں کو قریب کے دیہات میں بھیج دیا جو ہزاروں بیل لوٹ مار کرلے آئے اور اناج کے ذخیرے بھر لیے۔

مسلمانوں کو ان کا تعاقب کرکے یہاں تک پہنچنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ سکھوں نے قلعے کی فصیل اور برج مستحکم کرلیے۔ اب محاصرے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ شاہی لشکر نے محاصرہ کرلیا اور مورچہ بندی، نقب اندازی شروع کردی۔

سکھوں کا گرو ''سچا بادشاہ'' اس لقب سے منسوب ہی اس لیے تھا کہ اس کے چیلوں کا کہنا تھا کہ ایک خاص کرسی پر بیٹھ کر جو کچھ کہتا ہے وہ ''سچ'' ہوتا ہے۔ اس وقت بھی وہ اس خاص کرسی پر بیٹھا اپنے عقیدت مندوں سے مخاطب تھا۔

''جو بھی اس لڑائی میں مارا جائے گا، وہ لوٹ کر آئے گا اور پھر کبھی نہیں مرے گا اور بڑے اونچے درجے اسے ملیں گے۔ جو ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے مرنے کے لیے تیار ہوجائے۔ وہ جسے مارے گا، وہ ہمیشہ کے لیے مرجائے گا اور اگر وہ (چیلا) مرگیا تو لوٹ کر میرے پاس آجائے گا اور پھر کبھی نہیں مرے گا جس طرح میں گرو گوبند ایک مسلمان کی گولی سے مارا گیا اور دوبارہ زندہ ہوگیا۔ اب کبھی نہیں مروں گا۔ تم بھی میری طرح امر ہوجاؤ۔ نکلو اور مسلمانوں سے لڑو۔''

اس کی تقریر نے ایسا اثر کیا کہ ہزاروں سکھ ''فتح درس'' کے نعرے لگاتے ہوئے باہر نکلے اور مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی یہ جسارت دیکھ کر مسلمان انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ لوگ اتنی آسانی سے اپنی جانیں دے رہے تھے جیسے کوئی بڑی حقیر شے ہو۔ ان کی اس جسارت نے سیکڑوں مسلمانوں کو بھی قتل کرڈالا۔

کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سکھ باہر نکلتے، پیادہ لڑتے اور دوبارہ قلعے میں چلے جاتے۔ ایک مہینا گزر گیا۔ محاصرہ طول پکڑتا جارہا تھا۔ سکھ گاجر مولی کی طرح کٹ رہے تھے۔ محصوروں پر حالات بہت تنگ ہوگئے۔ غذا کی ایسی قلت ہوئی کہ بادشاہی لشکر کے بقالوں سے غلہ خریدنے پر مجبور ہوگئے۔ یہ خریداری بھی کب تک ہوتی۔ شاہی لشکر نے بقالوں کو بھی روک دیا۔ اب تو فاقوں نے قلعے کا منہ دیکھ لیا۔ بھوک کی شدت سے لوگ مرنے لگے۔ سچا بادشاہ کو اپنی جان کی فکر ہوئی۔ اس نے فرار کی سوچی لیکن اس ترکیب کے ساتھ کہ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچ جائے۔ وہ ایک مرتبہ پھر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھا۔ وہ جب اس کرسی پر بیٹھتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ خطاب کرنے والا ہے۔ اس کے چیلے اس کے گرد جمع ہوجاتے تھے۔ اس وقت بھی سب جمع ہوئے۔ اس نے خطاب شروع کیا۔

''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں۔ آسمان میں جو فیصلے ہونے ہیں، ہم ان پر عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان اندھے ہوجائیں گے اور ہم یہاں سے بہ آسانی نکل جائیں گے۔ تم میں سے صرف ایک آدمی یہاں رہ جائے گا جو میرا روپ دھار کر میری کرسی پر بیٹھے گا۔ اس کی ہیبت اتنی ہوجائے گی کہ مسلمان اسے گرفتار کرنے آئیں گے لیکن اسے دیکھتے ہی محاصرہ ختم کرکے چلے جائیں گے اور وہ میرے پاس چلا آئے گا۔''

اس نے کسی چیلے کے انتخاب کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور اس کی نظریں گلابو نام کے ایک آدمی پر جم گئیں۔ اس نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

''خوش ہوجاؤ۔ یہ اعزاز تمہارے حصے میں آیا ہے۔ میری کرسی پر میرے سوا آج تک کوئی نہیں بیٹھا مگر تم بیٹھو گے۔ یہ کوئی کم اعزاز نہیں۔''

گلابو کو خلعتِ فاخرہ پہنا کر گرو کی جگہ بٹھادیا گیا۔ سچا بادشاہ نے معمولی لباس زیب تن کرلیا تاکہ کوئی اسے شناخت نہ کرسکے اور اپنے لشکر کو لے کر اس سمت سے باہر نکل گیا جہاں بہت کم فوج متعین تھی۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ لڑتے بھڑتے نکل ہی گیا۔ اس کے بدن پر معمولی لباس تھا لہٰذا کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ وہ یہاں سے نکل کر پہاڑوں میں گم ہوگیا اور کوہستانی سلسلے کی طرف چلا گیا۔ یہاں کے راجا کا نام ''برنی'' تھا اور وہ سچا بادشاہ کا ''چیلا'' تھا۔ اسی راجا برنی نے اسے بلوگڑھ کے قلعے میں پناہ دے رکھی تھی۔ اب اس نے سچا بادشاہ کو اپنے علاقے میں پناہ دے دی۔

جب شاہی لشکر میں شور مچا کہ سچا بادشاہ اپنے لشکر سمیت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فرار ہوگیا ہے تو لشکر کے کچھ لوگ قلعے کے اندر گئے۔ دیکھا کہ قلعہ خالی پڑا ہے لیکن ایک شخص خلعت فاخرہ پہنے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر نہ تو خوف ہے نہ گھبراہٹ اور نہ ہی اپنا دفاع کررہا ہے۔ سپاہیوں نے آگے بڑھ کر اسے گرفتار کرلیا۔ سب حیران تھے کہ آخر یہ کیسا سچا بادشاہ ہے کہ لڑے بغیر ہی گرفتاری دے دی۔

''بدبخت! تو کیسا گرو ہے۔ تیرے لشکری ہی تجھے چھوڑ کر بھاگ گئے۔''

''سچا گرو وہی ہے جو اپنے چیلوں کی حفاظت کرے۔ میں اگر اپنے لشکر کے ساتھ نکلتا تو تم لوگ مجھے پہچان کر دور تک میرا تعاقب کرتے۔ میرا لشکر نکل گیا، اب تم مجھے گرفتار کرلو لیکن وہ لوگ مجھے جلد ہی چھڑا کر لے جائیں گے۔''

''ہم تجھے آزاد ہونے دیں گے تب نا۔''

گلابو نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ ''سچا بادشاہ'' نہیں ہے۔ کوئی اس کی شکل سے واقف نہیں تھا البتہ لباس یہ بتا رہا تھا کہ وہ ہی سکھوں کا گرو ہے۔ ظاہر ہے یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ فتح کے شادیانے بجوائے گئے اور اسے پابہ جولاں خانِ خاناں کے پاس لے جایا گیا۔

خانِ خاناں بھی یہی سمجھا کہ ''سچا بادشاہ'' گرفتار کرلیا گیا۔ اس نے لاہور سے لے کر دکن تک ہر صوبے اور تعلقے میں اس کی گرفتاری کو مشتہر کرادیا۔ بادشاہ کو بھی اطلاع کردی گئی۔

بادشاہ نے اس مہم پر جانے والے امراء کے مناصب میں اضافہ کیا۔ فرطِ محبت سے خانِ خاناں کا ہاتھ تھام کر فرمایا۔

''تم نے آج ہمیں ایسی کامیابی سے ہم کنار کیا ہے کہ تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔''

اس کامیابی نے خانِ خاناں کو ایسا سرخرو کیا کہ ذوالفقار علی خاں کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے۔ وہ اس وقت دکن کا صوبے دار تھا۔ وہ خانِ خاناں کو نیچا دکھانے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا لیکن اس کامیابی کے بعد ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکا سکے مگر پھر اچانک یہ موقع اس کے ہاتھ آ گیا۔

فیروز خاں میواتی نے گلابو کو گرو کی حیثیت سے پہچاننے سے انکار کردیا۔ وہ گرو کو دیکھ چکے تھے اور پہچانتے تھے۔ انہوں نے گلابو کو دیکھا تو چلا اٹھے۔ ''یہ تم کس کو اٹھا کر لے آئے ہو۔ یہ سچا بادشاہ نہیں ہے کوئی اور ہے۔'' کشاں کشاں یہ انکشاف بادشاہ کے گوش گزار بھی ہوگیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس معاملے کی تحقیق کرائی جائے۔ یہ تحقیق فیروز خاں میواتی اور خانِ خاناں دونوں کی نگرانی میں ہونی تھی۔ فیروز خاں میواتی کے ذوالفقار خاں سے خصوصی مراسم تھے۔ وہ پل پل کی خبریں اسے پہنچا رہا تھا۔

تحقیق شروع ہوئی۔ پہلے تو گلابو سے نرمی سے پوچھا گیا۔ وہ یہی کہتا رہا کہ وہی گرو ہے اور اس نے روحانی قوت سے اپنی شکل بدل لی ہے۔ ظاہر ہے یہ ایسی بے سروپا بات تھی کہ کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا لہٰذا سختی سے پوچھا گیا۔ جب ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے حقیقت اگل دی۔

''میں سچا بادشاہ نہیں ہوں۔ میں ذات کا کھتری ہوں اور میرا نام گلابو ہے۔ مجھے یہ خوشی ہے کہ میں نے اپنے گرو کو زندہ سلامت بلوگڑھ سے نکلوا دیا۔ وہ عنقریب آئے گا اور بادشاہ سے جنگ کرے گا۔ تم زیادہ دن مجھے قید میں نہیں رکھ سکو گے۔''

''تیرا گرو اس وقت کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم۔''

''اگر تجھے نہیں معلوم تو مرنے کے لیے تیار ہوجا۔''

''میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔''

''نادانی مت کرو۔ تیرے بقول تیرا گرو آئے گا اور بادشاہ سے جنگ کرے گا۔ تو زندہ ہی نہیں ہوگا تو وہ رہا کسے کرائے گا۔ تو اس کا پتا بتادے اور خود ہماری قید میں رہ کر اس کا انتظار کر۔''

وہ اس کے بعد بھی کچھ بتانے سے گریزاں تھا لیکن جب ایک مست ہاتھی اس کے سامنے لاکر کھڑا کردیا گیا اور اسے ہاتھی کے سامنے ڈالنے کی تیاری ہونے لگی تو وہ سب کچھ بتانے کو تیار ہوگیا۔

''گرو راجا برنی کے کوہستانی علاقے کی طرف گئے ہیں۔''

''راجا برنی اسے کیوں پناہ دینے لگا؟''

''وہ بھی ہمارے گرو کا چیلا ہے۔ یہی نہیں بلکہ تمہارے لشکر میں بھی ہمارے دین پر چلنے والے کھتری ہیں جو پوشیدہ طور پر ہماری مدد کرتے ہیں۔''

خانِ خاناں نے حکم دے دیا کہ جتنے کھتری ہیں، ان سب کی ڈاڑھیاں منڈوا دی جائیں۔ یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ سکھوں میں ڈاڑھی کے بال کٹوانا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ خان خاناں سمجھ رہے تھے کہ کچھ لوگ یقیناً ڈاڑھی منڈوانے کو منع کردیں گے لیکن جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ ہزاروں ڈاڑھیاں منڈ گئیں لیکن کوئی بھی نہیں پکڑا گیا۔ یا تو گلابو کی اطلاع غلط تھی یا جان کے خوف سے کسی نے اقرار نہیں کیا۔

گلابو نے بتادیا تھا کہ سچا بادشاہ فرار ہوکر راجا برنی کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کوہستانی علاقے کی طرف گیا ہے۔ اب اس دھوکے کا ازالہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ راجا برنی کے علاقے میں دھاوا بول کر سچا بادشاہ کو گرفتار کرلیا جائے ورنہ بادشاہ کے سامنے ہمیشہ شرمندگی رہے گی۔ اس نے اپنے ماتحت سرداروں کو حکم دیا کہ سب پیادہ ہوکر راجا برنی کے کوہستان میں داخل ہوجائیں اور سچا بادشاہ کو ہر قیمت پر گرفتار کرکے لائیں۔

یہ ایسا دشوار گزار علاقہ تھا کہ اسے پیدل چل کر ہی عبور کیا جاسکتا تھا۔ شاہی فوج ایسے علاقوں کو عبور کرنے کی عادی نہیں تھی لیکن انہیں بھی سچا بادشاہ کو دیکھنے کی ایسی آرزو تھی کہ زخمی پیروں سے آگے بڑھتے جارہے تھے۔

اس محنت کے باوجود گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ راجا برنی نے یہ دیکھ کر کہ شاہی فوج آ گئی ہے، سچا بادشاہ کو فرار کرادیا اور خود مقابلے پر آ گیا لیکن پہلی ہی جھڑپ میں اسے گرفتار کرلیا گیا۔

سچا بادشاہ پھر ہاتھ سے نکل گیا۔

راجا برنی کو گرفتار کرکے خانِ خاناں کے پاس لایا گیا۔ خانِ خاناں نے اسے اور گلابو کو لوہے کے پنجرے میں قید کیا اور دارالخلافہ دہلی کی طرف روانہ کردیا۔

وہ اپنی خفت مٹانے کے لیے سخت محنت کررہا تھا لیکن ذوالفقار خاں کا گروہ جس کا ایک رکن فیروز خاں میواتی بھی تھا، اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ اس نے بادشاہ کو یہ باور کرادیا تھا کہ خانِ خاناں نے خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک غلط آدمی کو جان بوجھ کر سچا بادشاہ بنا کر اس کے سامنے پیش کیا اور انعام وخطابات حاصل کیے۔

شاہ عالم کمزور فطرت شخص تھا۔ بہت جلد کسی کی باتوں میں آجاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ باتوں میں آ گیا اور یہی سمجھا کہ خان خاناں نے اسے دھوکا دیا ہے اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو اس کا غضب اس پر نازل ہوتا مگر وہ خان خاناں تھا۔ اسے وہ سزا نہیں دے سکتا تھا، اسے آنکھوں سے گرا سکتا تھا۔

خانِ خاناں کا خود یہ عالم تھا کہ ندامت اسے بادشاہ کے پاس جانے سے روک رہی تھی۔ ایک آدھ مرتبہ ہمت کرکے گیا بھی تو بادشاہ کا رویہ بدلا ہوا دیکھا۔ تجربہ کار امیر تھا۔ جانتا تھا کہ حاسدوں کو موقع مل گیا ہے۔ اسے افسوس تو تھا ہی اس میں غصہ بھی شامل ہوگیا لیکن یہ ایسا غصہ تھا جسے وہ کسی پر نکال نہیں سکتا تھا۔

اسے اس وقت سخت شرمندگی اٹھانی پڑی جب بادشاہ نے کوچ کا ارادہ کیا اور خانِ خاناں سے مشورہ تک نہیں کیا۔

سکھوں کا قصہ تقریباً پاک ہوچکا تھا۔ بادشاہ نے کوچ کا حکم دے دیا۔

بادشاہ شاہدرہ سے لاہور پہنچ گیا۔

بندرگاہ سورت کے سوانح نگار نے اطلاع دی کہ مرزا ہاشم نامی ایک ایرانی جس کا تعلق شہزادہ رفیع الشان کی ننھیال سے ہے ایران سے سورت آیا ہوا ہے۔

بادشاہ نے صوبے دار احمد آباد کے نام حکم نامہ بھیجا کہ مرزا ہاشم احمد آباد پہنچے تو اس کے لیے ساز وسامان مہیا کرے اور جب مرزا ہاشم بارگاہ شاہی کے لیے روانہ ہو تو صوبے دار اپنے مہمان دار کو اس کے ساتھ کردے۔

سکھوں کی بغاوت پر قابو پالیا گیا تھا لیکن سچا بادشاہ ابھی گرفتار نہیں ہوا تھا لہٰذا لوٹ مار کے قصے اب بھی سامنے آجاتے تھے۔ خانِ خاناں اس کا قصور وار خود کو سمجھ رہا تھا۔ بادشاہ کے رویے نے اسے مزید ناامید کردیا تھا۔ اسی صدمے نے اسے بیمار کردیا تھا۔ لاہور پہنچ کر اس کی بیماری میں اضافہ ہوگیا۔ یونانی اور فرنگی حکیم اس کے علاج پر مامور ہوئے اور بالآخر اس کی وفات اس حال میں ہوگئی کہ بادشاہ اسے دیکھنے تک نہیں آیا۔

خانِ خاناں کی اہمیت کا احساس اس کی وفات کے بعد ہوا۔ اس کے مرتے ہی جیسے سائبان ہٹ گیا۔ وزارت اور دربار کے دوسرے عہدوں سے متعلق مختلف مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔

شاہ عالم کے چار بیٹوں میں شہزادہ عظیم الشان ہی سب سے لائق تھا۔ اس نے مرحوم بادشاہ عالم گیر کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔ شاہ عالم اس پر بھروسا بھی کرتا تھا اور اس سے مشورے بھی کرلیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو اس کی نظر عظیم الشان پر پڑی۔ اس نے مشاورت کے لیے اسی کو طلب کیا۔ معاملہ وزارت کا تھا لہٰذا بادشاہ نے پہلا سوال یہی کیا اور اس کی رائے طلب کی۔

''عظیم الشان! تم اس معاملے میں کیا کہتے ہو؟''

''میری رائے یہ ہے کہ وزارت ذوالفقار خاں بہادر کے حوالے کی جائے کہ وہ اس کے پوری طرح اہل ہیں۔''

''اگر انہیں وزارت دے دی جائے تو دکن کی صوبے داری کا کیا ہوگا؟''

''اس کا حل نہایت آسان ہے۔ دکن کی صوبے داری کے لیے خانِ خاناں کے بیٹے کو روانہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس کا اہل بھی ہے اور خانِ خاناں کی خدمات کا اعتراف بھی ہوگا۔''

''ذوالفقار خاں کے پاس بخشی الممالک کا عہدہ بھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔ اسے وزارت دینے سے یہ عہدہ بھی خالی ہوجائے گا۔"

"یہ عہدہ ہم خانِ خاناں کے دوسرے بیٹے کو دے سکتے ہیں۔"

"کیا ذوالفقار خاں اس تجویز سے اتفاق کرلیں گے؟"

"میری حقیر رائے میں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ دکن کی صوبے داری سے خوش نہیں ہیں اس لیے انہوں نے دکن میں اپنا نائب مقرر کردیا ہے۔"

"اس کے باوجود ہمیں ذوالفقار خاں سے بات کرنی ہوگی۔"

"آپ نے مجھ سے رائے طلب کی تھی، میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ آگے آپ بااختیار ہیں۔ رموزِ مملکت مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔"

"آج ہمیں احساس ہوا کہ خانِ خاناں ہمارے لیے کتنے ضروری تھے۔ سیکڑوں مسائل ایسے ہوتے تھے کہ ہمارے علم میں آئے بغیر حل ہوجایا کرتے تھے۔ بہرحال ہم ذوالفقار خاں سے بات کریں گے۔ وہ بھی ہمارے وفادار ہیں، ہماری رائے سے اتفاق ضرور کریں گے۔"

بادشاہ نے اسی دن شام کے وقت ذوالفقار خاں کو خلوت میں طلب کیا اور یہ تجاویز اس کے سامنے رکھ دیں۔ بادشاہ دیکھ رہا تھا کہ وہ ان تجاویز کو سن کر خوش نہیں ہوا بلکہ اس کے چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں ہوگئے۔ جب بادشاہ ان تجاویز کے حق میں دلائل دے چکا اور اپنی دانست میں ذوالفقار خاں کو سمجھا چکا تو ذوالفقار خاں کو یہ سوچ کر بولنا پڑا کہ کہیں بادشاہ حکم جاری نہ کردے۔

"میں دکن کی صوبے داری سے دست کش ہونا نہیں چاہتا۔"

"وجہ؟"

"بادشاہ سلامت خانِ خاناں سے وزارت کے عہدے کا وعدہ کرچکے تھے اس لیے ہم نے کوئی عذر پیش نہیں کیا اور اس پر راضی ہوگئے مگر اب ان حالات میں بادشاہ سلامت سے گزارش کروں گا کہ یہ عہدہ میرے والد کو عطا کیا جائے۔"

بادشاہ کے حضور اس کی رائے سے اختلاف کرنا معتوب ہونے کے برابر تھا لیکن اختلاف کرنے والا ذوالفقار خاں تھا اور بادشاہ نے بہ اصرار اسے بولنے پر مجبور کیا تھا لہٰذا وہ صرف اتنا کہہ سکا کہ وہ اس کی تجویز پر غور کرے گا۔

بات پھر وہیں رہ گئی جہاں تھی بلکہ مزید الجھ گئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر عظیم الشان کو طلب کیا اور ذوالفقار خاں سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ اس کے سامنے پیش کردیا۔ یہ سنتے ہی عظیم الشان چراغ پا ہوگیا۔

"میں اس کو ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ وزارت اس کے باپ کو مل جائے اور دوسرے تمام عہدے اس کے پاس رہیں۔ آپ اس سازشی کی باتوں میں ہرگز نہ آئیں۔"

بادشاہ نے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر اسے خاموش کردیا۔

"تم اس وقت غصے میں ہو۔ ہمیں کچھ سوچنے دو، انشاء اللہ تمہارے مشورے پر ہی عمل ہوگا۔"

عظیم الشان نے کورنش بجائی اور باپ کے پاس سے اٹھ گیا۔ اسے دہلی جانا تھا لہٰذا دوسرے ہی دن وہ اپنے لشکر سمیت دہلی روانہ ہوگیا۔

ذوالفقار خاں کے کان کھڑے ہوگئے تھے لہٰذا اسے اب سازشوں کی دلدل میں اترنا تھا۔ عظیم الشان کی غیر حاضری نے اسے یہ موقع خودبخود فراہم کردیا۔

شاہ عالم کی کمزور شخصیت کسی فیصلے تک پہنچنے میں آڑے آرہی تھی۔ وہ ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ اسے ایرانی شہزادے مرزا محمد ہاشم کے آنے کی اطلاع ملی۔ یہ شہزادہ کچھ دن پہلے سورت کی بندرگاہ پر اترا تھا اور اب احمد آباد میں تھا اور شاہ عالم سے ملاقات کے لیے لاہور آرہا تھا۔ شاہ عالم نے دو گرز بردار اسے لانے کے لیے بھیج دیے اور اپنے ایک ملازم کوکہ خاں کو اس کا مہمان دار مقرر کردیا کہ جب وہ آئے تو وہ اس کا خیال رکھے۔

یہ شہزادہ عالم کا سسرالی رشتے دار تھا اس لیے اس کی نازبرداری ضروری تھی۔

جب وہ باریاب ہوا تو اس نے پندرہ عربی اور عراقی گھوڑے اور زربفت کے دو تھان پیشکش میں دیے۔ شاہ عالم نے صرف دو گھوڑے قبول کیے اور باقی اس کو بخش دیے۔ حسب دستور بادشاہ نے بھی اسے خلعت، تلوار، سینہ کاری کی مرصع ڈھال اور دوسرے تحائف پیش کیے۔

ایرانی شہزادہ خلعت زیب تن کرکے دوبارہ سلام کے لیے آیا تو سخت پریشان تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور اس کا پورا بدن پسینے میں تربہ تر تھا۔ وہ اس موسم کا عادی نہیں تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ مہمان کو خس خانے میں لے جاکر بٹھائیں، برف کا پانی پلائیں اور پنکھا جھلیں۔

مہماندار کوکہ خاں قریب کھڑا تھا۔ وہ بادشاہ کے حکم پر اسے خس خانے میں لے گیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شام کو اسے شہزادہ رفیع الشان کے پاس جانا تھا۔

سواری لگ چکی تھی۔ مرزا ہاشم کا انتظار تھا کہ وہ باہر آئے اور سوار ہو۔ کوکہ خاں نے اسے یاد دلایا کہ اسے رفیع الشان کے پاس جانا ہے۔ مرزا ہاشم نے نہایت نخوت سے اس کے پاس جانے سے انکار کردیا۔

''میں ایران سے چل کر یہاں تک تو آ گیا ہوں، اب اس سے ملنے بھی جاؤں۔ اگر ایسا ہی شوقِ ملاقات ہے تو وہ خود مجھ سے ملنے کیوں نہیں آ جاتا۔''

یہ جواب رفیع الشان تک پہنچا دیا گیا۔ اس نے اس نخوت کو نظر انداز کیا اور یہ سوچا کہ گرمی کی وجہ سے باہر نکلنا ناگوار ہوگا۔ میں خود اس سے ملنے چلا جاتا ہوں۔ وہ خود سوار ہوا اور شہزادے سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔

اب ایسی بھی کیا گرمی۔ اسے شہزادے کے استقبال کے لیے باہر نکلنا چاہیے تھا لیکن وہ اندر بیٹھا رہا۔ رفیع الشان نے اس رویے کو بھی نظر انداز کیا اور ملاقات کے لیے اندر چلا گیا۔ اب وہ ایرانی شہزادہ اس توقع میں رہا کہ سلام کرنے میں رفیع الشان سبقت کرے گا۔ رفیع الشان نے سبقت کی تو مرزا ہاشم نے صرف سینے پر ہاتھ رکھ کر سلام کا جواب دے دیا جبکہ شاہی قاعدہ یہ تھا کہ شہزادوں میں سے کسی سے ملاقات ہو تو مجرا بجالاؤ۔ اگر شہزادہ سبقت کرے تو جواب میں اپنا ہاتھ سر تک لے جاؤ۔

رفیع الشان نے نووارد سمجھ کر اس کی گستاخی کو معاف کردیا لیکن گفتگو کے دوران بھی اس نے دیکھا کہ مرزا ہاشم کا انداز گفتگو نہایت متکبرانہ ہے۔ اس کے لہجے میں خلوص نہیں بلکہ خود کو برتر مخلوق ظاہر کررہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے تکبر کی کہانی ہر ایک کی زبان پر آ گئی۔ وہ بادشاہ کا مہمان تھا اس لیے اس کی گستاخیوں کو سب نظر انداز کررہے تھے۔ زبان سے کوئی کچھ نہیں کہتا تھا لیکن خوش کوئی بھی نہیں تھا۔

بادشاہ ان باتوں سے بے خبر مرزا ہاشم کو کسی بڑے منصب پر فائز کرنے کا ارادہ کررہا تھا۔ وزارت کا تنازعہ ابھی طے نہیں ہوا تھا لہٰذا اس نے طے کرلیا کہ وہ اسے وزارت کا منصب عطا کرے گا۔

ایک روز شہزادہ عظیم الشان ملاقات کے لیے اس کے پاس آیا تو بادشاہ نے یہ ذکر اس کے سامنے بھی چھیڑ دیا۔

''میں تو روز روز کی بحث سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ مرزا ہاشم کو وزیر مقرر کرکے کسی کو اس کا مستقل نائب کردوں اور اسی نائب سے وزارت کا کام لیتا رہوں۔''

عظیم الشان سر جھکا کر سنتا رہا۔ مخالفت بھی نہیں کی لیکن مرزا ہاشم کا اصل چہرہ بادشاہ کے سامنے ضرور رکھ دیا۔

''آپ کی نیت بے شک نیک ہے لیکن اہل دربار کو اس سے بڑی شکایتیں ہیں۔ اس قدر متنازعہ آدمی کس طرح قبول ہوگا؟''

''اس سے لوگ اس لیے مانوس نہیں ہوں گے کہ وہ نووارد ہے۔''

''بات یہ نہیں ہے بلکہ مرزا ہاشم نہایت متکبر ہے۔ وہ ہر ایک سے سلام کا خواہش مند رہتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ کوئی دوسرا سبقت کرے اور جب کوئی سبقت کرتا ہے تو وہ جواب میں صرف سینے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ مجھ سمیت کسی شہزادے سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ملاقات کے لیے کسی کے گھر نہیں گیا۔ جب ہم بھائیوں سے اس کا رویہ یہ ہے تو امراء کے دلوں میں اس کے لیے کیا جگہ ہوگی۔ اگر آپ نے اسے وزیر بنایا تو پذیرائی نہیں ملے گی۔ اس کے احکامات کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ امورِ سلطنت میں رخنہ پڑے گا۔ یہ الزام الگ آئے گا کہ وہ آپ کا سسرالی ہے اس لیے نااہل کو اہل بنا دیا۔''

''تمہاری نظر میں وہ نااہل ہے؟''

''اس کی انتظامی صلاحیتوں کا تو مجھے علم نہیں، میں نے تو صرف یہ عرض کیا کہ مقربانِ دربار سے اس کا سلوک اچھا نہیں۔''

''ابھی وہ نووارد ہے۔ یہاں کے قوانین سے واقف نہیں۔ اس کی اجنبیت کو لوگ تکبر سمجھتے ہوں گے اور پھر وزارت کے کام اس کا نائب انجام دے گا وہ نہیں۔''

شاہ عالم مرزا ہاشم کی مسلسل حمایت کرتا رہا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے وزیر ضرور بنائے گا لہٰذا شہزادے نے زیادہ دیر وہاں رہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہاں سے نکلا اور سیدھا ذوالفقار خاں کے پاس پہنچا۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف تھے لیکن اس معاملے میں دونوں ایک ہوگئے۔ دونوں نہیں چاہتے تھے کہ مرزا ہاشم کو وزارت ملے۔ ذوالفقار خاں اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس عہدے پر اپنے باپ اسد خاں کو دیکھنا چاہتا تھا اور عظیم الشان کے سامنے شہزادے کا تکبر تھا۔ اس نے اسے عزت کا مسئلہ بنالیا تھا۔ اتفاق سے اس اتحاد میں ایک فریق اور شامل ہوگیا۔ جہاندار شاہ ملتان سے آیا ہوا تھا۔ ذوالفقار خاں نے اس سے ملاقات کی۔

''ولی نعمت کی مرضی مبارک یہ ہے کہ ایرانی شہزادے کو وزارت کا منصب عطا کردیا جائے۔''

''سنا تو میں نے بھی تھا لیکن یقین نہیں آتا تھا۔''

''آپ کو یقین کرنا پڑے گا ورنہ صرف یہ بلکہ اپنی بے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عزتی کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا۔"

"کیسی بے عزتی؟"

"ایرانی شہزادہ اتنا متکبر ہے کہ کسی کو سلام تک کرنے کا روادار نہیں۔ اگر اسے وزیر بنا دیا گیا تو ہماری بے عزتی نہیں کرے گا تو اور کیا کرے گا۔"

"اس سلسلے میں عظیم الشان کیا کہتا ہے۔"

"شہزادہ حضور بھی یہی کہتے ہیں جو باتیں میں نے آپ سے عرض کیا۔"

"آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"میں نے تجویز پیش کی تھی کہ میرے والد کو یہ منصب عطا کیا جائے۔"

"کوئی حرج نہیں۔ میں آپ کا پورا ساتھ دوں گا۔"

اس نے دونوں مہروں کو ایک ہی خانے میں رکھ دیا تھا۔ عظیم الشان اس کا مخالف تھا لیکن اس معاملے میں اس سے متفق تھا۔ جہاندار شاہ کو بھی اپنی مٹھی میں بند کرلیا تھا۔ کسی اور طرف سے مخالفت کا کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ خانِ خاناں جو اس کا سب سے بڑا حریف تھا، دنیا سے جا چکا تھا۔ اسے اب دونوں شہزادوں کے علاوہ بھی چند ایسے مہروں کی تلاش تھی جو مرزا ہاشم کو دربار سے نکالنے میں اس کی مدد کرسکیں کیونکہ جب تک مرزا ہاشم یہاں تھا، ذوالفقار خاں کو اس کی مراد نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے غور کیا تو مرزا شاہ نواز بخشی اس کا معاون ثابت ہوسکتا تھا۔ مرزا ہاشم سے سب سے زیادہ شکایت اس کو تھی جس کا وہ برملا اظہار بھی کر چکا تھا۔ مرزا شاہ نواز خاں بخشی کو خود یہ دعویٰ تھا کہ وہ بھی چار پانچ واسطوں میں شاہ ایران کا پوتا ہے۔

ذوالفقار خاں نے اپنی سازش کے اگلے مرحلے میں شاہ نواز خاں سے ملاقات کا اہتمام کیا۔

"شاہ نواز خاں! آپ بھی تو ایران کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ تو تکبر سے بہت دور ہیں۔ مرزا ہاشم تو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا۔"

"آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔ اس نے تو ایران کے شاہی خاندان ہی کو بدنام کر دیا ہے۔"

"شاہ نواز خاں! یہ آپ کے خاندان کی بدنامی ہے اور آپ ہی خاموش ہیں۔"

"میری طرح سب ہی اس کے خلاف ہیں لیکن سب بادشاہ حضور سے ڈرتے ہیں۔ یہ شاہی خاندان کا مسئلہ ہے کسی نے اگر اس کے خلاف آواز اٹھائی تو یقیناً شہزادے بھی اس کی حمایت کریں گے۔"

"میں شہزادوں سے بات کرکے ہی آپ کے پاس آیا ہوں۔ وہ کبھی اس کی حمایت میں نہیں بولیں گے۔"

"بادشاہ حضور کی سسرال کا معاملہ ہے۔ وہ اپنا فیصلہ کبھی تبدیل نہیں کریں گے۔"

"بادشاہ سلامت کی آپ نے خوب کہی۔ ان کا فیصلہ برقرار کب رہتا ہے۔ اگر طریقے سے ان کے کان بھرے جائیں تو فیصلہ بدلنے میں دیر نہیں کریں گے۔ بس ایک مشکل ہے جب تک وہ ایرانی شہزادہ یہاں ہے بادشاہ سلامت بار بار اپنا فیصلہ تبدیل کرتے رہیں گے۔ کوئی طریقہ ایسا ہو کہ ایرانی شہزادہ خود یہاں سے چلا جائے یا کم از کم بادشاہ کے دل میں اس کی برائی آجائے۔ کوئی ایسی ترکیب ہو کہ اس کے رویے سے بادشاہ کی حکم عدولی ظاہر ہو۔" شاہ نواز خاں جیسے پہلے ہی سے کچھ سوچے بیٹھا تھا۔ اس نے کوکہ خاں مہمان دار کو بھی اپنے ساتھ ملالیا اور شہزادہ ایران کی طرف سے ایک عرضی لکھ کر بادشاہ کے حضور پیش کردی۔ اس عرضی میں اس نے پوچھا تھا کہ اگر شہزادے مجھے راستے میں مل جائیں یا دربار میں ملاقات ہو تو میں کس طرح آداب بجالاؤں۔ امرائے حضور سے ملاقات کے وقت سلام کرنے اور جواب دینے میں کیا حکم ہے۔ اگر حضور والا کے دربار پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں تو کس جگہ بیٹھوں۔

بادشاہ نے اس کا جواب لکھوا دیا۔ "اگر شہزادے راستے میں مل جائیں تو گھوڑے سے اتر کر آداب بجالاؤ۔ اگر دربار میں ملاقات ہو تو مقررہ طریقے پر آداب بجالاؤ۔ تین ہزاری امیروں تک اگر کوئی سلام میں سبقت کرے تو اس کے جواب میں ہاتھ سر تک لے جاؤ۔" یہ لکھوانے کے بعد جب اس سوال پر پہنچے کہ حضرت کے برآمد ہونے تک کہاں بیٹھا جائے تو بادشاہ شاہ نواز خاں کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیا لکھا جائے؟"

"حضرت کے برآمد ہونے تک خانہ زاد (میرے) پیش خانہ میں بیٹھے۔" شاہ نواز خاں نے رائے دی اور بادشاہ نے تحریر کرکے دستخط فرمادیے۔

شاہ نواز خاں نے عرضی کا جواب جیب میں رکھ لیا اور گواہی کے لیے جہاندار شاہ کے پاس ملاقات کے لیے بھیجا۔ شہزادہ ایران اس حکم نامے سے بے خبر تھا۔ اس نے مجرا بجالانے میں دیر کی۔ جہاندار شاہ نے سلام کیا تو بھی وہ صرف سینے تک اپنا ہاتھ لے گیا۔ جہاندار شاہ کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ آیا اور عینی شاہد بن گیا کہ شہزادے نے مجرا نہیں بجایا اور اس طرح بادشاہ کی حکم عدولی کی۔ شاہ نواز خاں نے مزید گواہیاں پیش کیں۔ جن امراء کو شہزادے کے خلاف ہموار کرلیا تھا، انہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باری باری بادشاہ کے پاس بھیجا جاتا رہا جنہوں نے شکایت کی کہ واضح حکم کے باوجود ایرانی شہزادے نے سلام میں سبقت نہیں کی بلکہ ہمارے سلام کرنے پر ہاتھ سر تک نہیں لے گیا بلکہ گردن کے اشارے سے جواب دیا۔

بادشاہ کو ناگوار تو بہت ہوا لیکن معاملہ امرا کا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ ذوالفقار خاں نے اب سب سے بڑا مہرہ استعمال کیا، اس نے جہاندار شاہ کو بادشاہ کے پاس بھیجا۔

''ولی نعمت! کیا آپ نے مرزا ہاشم کو اس لیے اپنی مہربانیوں سے بہرہ ور کیا ہے کہ وہ ہمارا احترام ہی بھول جائے۔''

''خیر تو ہے۔ ایسا کیا ہوگیا کہ تمہیں بھی شکایت ہوئی؟''

''ہم اس سے ملاقات کے لیے گئے تھے۔ اس نے مجرا بجالانے میں غفلت برتی اور ہمارے سلام کرنے پر بھی وہ صرف سینے تک ہاتھ لے گیا، وہ بھی اس بے دلی سے کہ اس کا تکبر صاف نظر آتا تھا۔''

بادشاہ امراء کی شکایتیں تو نظر انداز کرتا رہا تھا لیکن جہاندار شاہ اس کا بیٹا تھا۔ اس کی بے عزتی پر وہ بے چین ہوگیا۔

''ہماری واضح ہدایت کے باوجود اسے یہ جرأت کیسے ہوئی۔ ہم ابھی اسے طلب کر کے سرزنش کریں گے۔''

''میں نے تو ایک بات آپ کی سماعت کے حوالے کردی۔ آخر کو وہ مہمان ہے۔ آج نہیں تو کل چلا جائے گا۔ سرزنش کی جلدی کیا ہے۔ اس کے احترام نہ کرنے سے ہمارے احترام میں کون سی کمی آ گئی۔''

''ابھی سرزنش نہیں کی گئی تو اس کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔''

جہاندار شاہ نہیں چاہتا تھا کہ بادشاہ سرزنش کرے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے بعد بات دب جائے گی جبکہ وہ اس سازش کو آگے تک لے جانا چاہتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شہزادے کو اتنا تزچ کردیا جائے کہ وہ ہندوستان چھوڑ کر چلا جائے۔

جب بادشاہ کا اصرار بہت بڑھا تو اس نے ذوالفقار خاں کا نام پیش کردیا۔

''یہ آپ کے منصب کے خلاف ہے کہ مرزا ہاشم کو طلب کریں اور اس سے بات کریں۔ اس کام کے لیے ذوالفقار خاں نہایت موزوں ہیں۔ میں ان سے بات کرتا ہوں، وہ اسے سمجھا بجھا دیں گے۔''

''ذوالفقار خاں سے تم بات نہیں کرو گے۔ انہیں ہمارے پاس بھجوا دو۔ ہم خود انہیں سمجھائیں گے کہ مرزا ہاشم سے کیا کہنا ہے۔''

شہزادہ جہاندار شاہ اٹھ آیا اور ذوالفقار خاں حاضر ہوگیا۔ بادشاہ نے پورا معاملہ ان کے سامنے رکھا اور ہدایت کہ وہ ان کی طرف سے مرزا ہاشم کو سمجھا دیں۔ ایسی گستاخی پھر نہ ہو۔

''حضور! آپ مجھے اس کے پاس بھیج تو رہے ہیں۔ میں انکار بھی نہیں کرسکتا لیکن اپنی بے عزتی سے ڈرتا ہوں۔ وہ ایسا مغرور ہے کہ میرا لحاظ بھی نہیں کرے گا۔ آپ کی مہربانیوں نے اسے گستاخ بنا دیا ہے۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ آپ بے رخی اختیار فرمائیں، وہ خود مایوس ہوکر چلا جائے گا۔''

''سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کس زعم میں اکڑتا پھرتا ہے۔''

''حضور! منہ سے نکلی بات پرائی ہوتی ہے۔ مجھے معلوم تو سب ہے لیکن کچھ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔''

''ذوالفقار خاں! ہم تمہیں جان کی امان دیتے ہیں، کہو کیا جانتے ہو؟''

''حضور کو افسوس تو ضرور ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شہزادہ عظیم الشان اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ وہ اسی زعم میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ شہزادہ عظیم الشان کے سوا کسی شہزادے کا احترام نہیں کرتا۔''

ذوالفقار خاں اور عظیم الشان کے درمیان سرد جنگ چل رہی تھی۔ ذوالفقار خاں کا جھکاؤ جہاندار شاہ کی طرف تھا۔ وہ اس سے یہ تک کہہ چکا تھا کہ بادشاہ کی وفات کے بعد وہ اسے بادشاہ بننے میں مدد دے گا۔ عظیم الشان بھی اس سے خوش نہیں تھا لیکن ایرانی شہزادے کے معاملے میں دونوں ایک ہوگئے تھے۔ اب جو موقع ملا تو اس نے عظیم الشان کی طرف سے کان بھر دیے۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کررہا تھا۔

''عظیم الشان تو خود میرے پاس مرزا ہاشم کی شکایت لے کر آیا تھا۔''

''شاید اس لیے کہ آپ کو شک نہ ہو۔''

''اب بتایئے جب حال یہ ہو تو اس نو وارد کا کیا قصور۔''

''حضور! اسی لیے میرا مشورہ ہے کہ ایرانی شہزادہ جتنی جلد ممکن ہو یہاں سے چلا جائے اچھا ہے ورنہ بڑا بگاڑ پیدا ہوگا۔ آپ ایرانی شہزادے کو یہ احساس دلا دیں کہ آپ اس سے خوش نہیں۔ ویسے میں خود اس سے مل کر اسے مجبور کروں گا کہ وہ دربار کے آداب ملحوظ رکھے۔''

''نہیں، اب آپ کو اس سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود ایسا رویہ اختیار کریں گے کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔''

ذوالفقار خاں کامیاب و کامران وہاں سے چلا آیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

اب مرزا ہاشم کو بے عزت کرنے اور اسے اس کی حیثیت یاد دلانے کے لیے شاہ نواز خاں کو ایک اور قدم اٹھانا تھا۔

مرزا ہاشم کو دربار میں پیش ہونا تھا۔ شاہ نواز خاں نے سازش کے مطابق کوکہ خاں سے ملاقات کی۔ کوکہ خاں بادشاہ کے برآمد ہونے کی اطلاع سے پہلے ہی ایرانی شہزادے کو لے کر روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بادشاہ کی سواری ابھی نہیں پہنچی۔ کوکہ خاں نے بادشاہ کے حکم کا حوالہ دیا۔

''اگر ہمارے برآمد ہونے سے پہلے آپ دربار پہنچ جائیں تو ہماری آمد تک مرزا شاہ نواز خاں کے پیش خانے میں تشریف رکھیں۔''

شہزادے کو لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ نواز خاں نے اسے بے عزت کرنے کے لیے نہ صرف واجبی سی تعظیم کی بلکہ دوسری رسمیات عطر پانی وغیرہ کا بھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔ شہزادے نے اپنی اس بے عزتی کو بری طرح محسوس کیا۔ اس کی ناگواری اس وقت بھی اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی جب وہ دربار میں پہنچا۔ سخت غصے کی حالت میں منہ پھلائے بیٹھا رہا۔ یہ بھی آدابِ دربار کے خلاف تھا۔ بادشاہ نے بھی اسے اس کا تکبر سمجھا اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ جب دربار میں اس کا یہ حال ہے تو تنہائی میں امراء اور شہزادوں سے کس طرح ملتا ہوگا۔

دربار برخاست ہونے کے بعد وہ گھر پہنچا تو سخت... برافروختہ تھا۔ اسی وقت کوکہ خاں کو بلایا۔

''میری سخت بے عزت ہوئی ہے۔ میں اب زیادہ دیر یہاں نہیں رہ سکتا۔ آپ میری جانب سے درخواست لکھ کر بادشاہ کے حضور پیش کردیں۔ میں اب رخصت ہونا چاہتا ہوں۔''

کوکہ خاں نے اسی وقت عرضی لکھی اور بادشاہ کو پیش کردی۔ شاہ عالم کے دل میں پہلے ہی گرہ پڑ چکی تھی۔ کسی حجت کے بغیر فوراً دستخط کردیے۔

شہزادے نے بادشاہ سے الوداعی ملاقات کی اور رخصت ہوگیا۔

ذوالفقار خاں کی مراد پوری ہوگئی۔ اب وہ بجا طور پر سمجھ رہا تھا کہ اس کے والد اسد خاں کو وزارت کا منصب مل جائے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ دوسرے دن ہی بادشاہ کی طرف سے حکم نامہ صادر ہوا جس کے مطابق ایک امیر عنایت اللہ خاں کا بیٹا سعد اللہ خاں وزیر مقرر کردیا گیا۔ یہ حکم بھی صادر ہوا کہ وہ شہزادہ محمد عظیم کی نیابت میں امورِ سلطنت سنبھالے گا۔ شہزادے کے علم و اطلاع کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دے گا۔

ذوالفقار خاں کو دہری شکست ہوئی تھی۔ وزارت پر کوئی اور متمکن ہوگیا تھا اور عظیم الشان کو نگراں مقرر کردیا گیا تھا جبکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ ایرانی شہزادے کو بھڑکانے کے الزام میں عظیم الشان سے باز پرس ہوگی لیکن معاملہ یہ ہوا کہ اب اسے عظیم الشان کے احکامات پر عمل کرنا ہوگا کیونکہ سعد اللہ کے پردے میں اسی کو وزارت کرنی تھی۔

ذوالفقار خاں کو اب اپنی پگڑی بچانے کے لیے کوئی اور چال چلنا تھی۔ وہ عظیم الشان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا، اس کا بدلہ اس نے عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر سے لیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے فرخ سیر کی طرف سے بادشاہ کے کان بھرنے شروع کردیے۔

فرخ سیر بنگال میں اپنے باپ عظیم الشان کی نیابت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

ذوالفقار خاں نے چرب زبانی سے بادشاہ کا دل فرخ سیر کی طرف سے اتنا برا کردیا کہ شاہ عالم نے اسے دربار میں طلب کرنے کے لیے قاصد دوڑا دیے۔

بنگال کی سرحدوں کے محافظوں نے اطلاع پہنچا دی تھی کہ دو شاہی سوار کوئی خاص پیغام لے کر داخل ہوئے ہیں۔ مرکز سے کچھ اچھی خبریں نہیں آرہی تھیں لہٰذا فرخ سیر کو اندیشوں نے جکڑ لیا کہ جانے کیا پیغام لے کر آئے ہیں۔ وہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

بنگال کے کھیتوں پر ابھی اچھی طرح دھوپ کا قبضہ نہیں ہوا تھا کہ دونوں سوار حویلی کے صدر دروازے تک پہنچ گئے۔ پہرے داروں کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا محافظوں کے نیزوں نے راستہ دے دیا۔ دونوں سوار گھوڑوں سے زمین پر آگئے راہنماؤں نے راہنمائی کی اور دونوں قاصدوں کو اس کمرے تک پہنچا دیا جہاں فرخ سیر ان کا منتظر تھا۔

بنگالی طرز کے دیوان پر بیٹھے بیٹھے اس نے قاصدوں کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیا پیغام لائے ہو..... کس لیے آئے ہو؟''

''حکم شاہی صادر ہوا ہے کہ آپ دربار میں حاضر ہوں۔ بنگال کا خزانہ اور دوسری چیزیں ساتھ لانے کا حکم نہیں۔''

''تمہارے منہ سے اتنی بڑی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔''

''آپ تحریری حکم نامہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔'' قاصد نے آگے بڑھ کر تحریری فرمان سامنے رکھ دیا۔

تحریر میں صرف اتنا درج تھا کہ فوراً دربار میں حاضر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوا جائے لیکن یہ سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ اسے معطل کر دیا گیا ہے۔

اس کا مزاج اچانک تلخ ہو گیا تھا۔

''اب تم جا سکتے ہو۔ آرام کرنا چاہو تو تمہیں مہمان خانے تک پہنچا دیا جائے گا۔''

''حضور! ہم سے جواب طلب کیا جائے گا۔''

''ہماری طرف سے پیغام پہنچا دینا کہ ہم عنقریب دربار میں حاضر ہو جائیں گے۔''

قاصدوں نے تسلیمات کے لیے کمر جھکائی پھر سیدھے ہو کر الٹے قدموں باہر نکل آئے۔ وہ جانے کتنا فاصلہ طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے اور اب فوراً واپس جا رہے تھے۔ انہیں اصولاً آرام کرنا چاہیے تھا لیکن فرخ سیر کے تیور دیکھ کر ان پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد بنگال کی سرحد عبور کر لینا چاہتے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا بھی تھا کہ ہمیں آرام کرنا چاہیے تھا لیکن دوسرا اسے سمجھا رہا تھا۔

''اگر فرخ نے دربار میں حاضری کا ارادہ بدل دیا تو پھر وہ ہمیں بھی نہیں جانے دے گا۔ یہی ظاہر کرے گا کہ قاصد یہاں پہنچے ہی نہیں۔ پیغام ملا ہی نہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے وہ ہمیں بھینٹ چڑھا سکتا ہے۔ کیا خبر قتل ہی کرا دے۔''

''اس کے تیور تو یہی بتا رہے تھے۔ اچھا ہوا ہم نکل آئے۔''

انہوں نے گھوڑوں کی رفتار تیز کر دی۔

☆☆☆

قاصدوں کے روانہ ہوتے ہی فرخ سیر نے مجلس مشاورت طلب کر لی جس کا مقصد طلب نامے پر غور کرنا اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ سب نے اسے باری باری پڑھا اور اسے معزولی کا پروانہ قرار دیا۔

''اب آپ کے سامنے دو راستے ہیں یا تو یہ سمجھ لیں کہ حکم نامہ ملا ہی نہیں یا پھر اس پر عمل کریں اور گرفتاری کے لیے تیار ہو جائیں۔'' ایک امیر نے رائے دی۔

''قاصد روانہ ہو چکے ہیں۔ وہ ضرور جا کر کہیں گے کہ پیغام پہنچا دیا۔ ہم نے انہیں جوابی رسید دے دی ہے۔''

''آپ کو انہیں جانے نہیں دینا چاہیے تھا۔ خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔''

''یہ ضروری تو نہیں کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔''

''مطلب یہی ہے کہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے کیونکہ یہ فرمان کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ کسی نے بادشاہ کے کان بھرے ہیں اور یہ حکم نامہ لکھوا لیا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''میری اطلاع کے مطابق بادشاہ علیل ہیں۔ سازش کرنے والوں کے علم میں ہوگا کہ بادشاہ کی وفات کے ساتھ ہی تخت نشینی کے لیے رسا کشی شروع ہو جائے گی لہٰذا ایک گروہ دوسرے گروہ کو کمزور کرنے کے لیے سازشیں کر رہا ہوگا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے خلاف وہ گروہ سازش کر رہا ہے جو میرے والد کو بادشاہ ہوتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''یقیناً۔ تخت نشینی کا مقابلہ جہاندار شاہ اور آپ کے والد کے درمیان ہوگا۔ اس سازش کے پیچھے کوئی ایسا شخص ہے جو جہاندار شاہ کے حق میں ہے۔''

''پھر تو یہ ذوالفقار خاں کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔'' اس نے مزید کہا۔ ''اب آپ لوگ مجھے کیا مشورہ دیتے ہیں۔ مجھے لاہور جانا چاہیے یا نہیں؟''

تقدیر کا پردہ

ایک بار حضرت سلیمانؑ نے سارے پرندوں کو حکم دیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوں اور سب اپنا اپنا کمال جو وہ رکھتے ہیں، بیان کریں۔ چنانچہ سارے پرندے حاضر ہو گئے اور سب نے اپنا اپنا کمال بیان کرنا شروع کیا۔ ہُدہُد کی باری آئی، وہ کہنے لگا۔ ''حضور! مجھ میں یہ کمال ہے کہ میں آسمان کی بلندیوں پر بہت اونچا اڑتا ہوں تو اتنی دور سے بھی زمین کے اندر کی تمام چیزیں دیکھ لیتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ زمین کے کس حصے میں پانی ہے اور کس حصے میں نہیں۔''

ہُدہُد کا یہ بیان سن کر کوا بولا۔ ''اے اللہ کے پیغمبر! ہُدہُد جھوٹ بولتا ہے۔ اگر اس کی نظر اتنی ہی تیز ہے تو یہ جال میں پڑے ہوئے دانے کو دیکھ کر اس پر لپکتے ہوئے جال میں پھنس جاتا ہے، اس وقت جال اسے کیوں نظر نہیں آتا؟ اگر یہ سچا ہے تو یہ جال میں بھی نہ پھنستا۔''

حضرت سلیمانؑ نے ہدہد سے پوچھا۔ ''کوّے کے اس اعتراض کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟''

ہُدہُد نے عرض کیا۔ ''یا نبی علیہ السلام۔ نظر تو میری واقعی اتنی تیز ہے جتنی میں نے بتائی مگر جال میں پھنستے وقت میری نظر پر قضا اور تقدیر کا پردہ پڑ جاتا ہے۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''آپ دکھاوے کے لیے روانہ تو ہو جائیں لیکن سست روی سے سفر طے کریں۔ جتنی دیر لگا سکتے ہیں لگائیں اور دیکھتے رہیں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے بادشاہ اپنا فرمان بدل دے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے اپنی بیماری کے سبب اس دنیا ہی میں نہ رہے۔''

فرخ سیر کو یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے لشکر کا کچھ حصہ بنگال میں چھوڑا اور باقی لشکر کو لے کر بنگال سے نکل گیا۔ ظاہر یہی کیا کہ وہ مرکز کی طرف جا رہا ہے۔

تخت نشینی کی جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔

اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ ہر منزل پر قیام کرتا ہوا نہایت سست روی سے چلا جا رہا تھا۔

وہ بنگال کی سرحد عبور کر کے بہار میں داخل ہو چکا تھا۔ پٹنہ شہر اس کے سامنے تھا۔ وہ اس نیت سے شہر میں داخل ہوا کہ سادات بارہہ کے دو بھائیوں حسین علی اور حسن علی کو اپنے حق میں ہموار کرے گا۔ ان میں سے ایک پٹنہ کا اور دوسرا لہ آباد کا صوبے دار تھا۔

پٹنہ پہنچ کر فرخ سیر کو معلوم ہوا کہ حسین علی اور اس کا بھائی حسن علی شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اسے بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ پٹنہ ہی میں قیام پذیر ہو گیا۔ اس کا لشکر شہر سے باہر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔

☆☆☆

کابل کا سوانح نگار ایک دردناک اطلاع لے کر آیا تھا۔ دردانہ بیگم نے فتح اللہ خاں کو زہر دے دیا تھا اور ان کی دولت پر قابض ہو گئی تھی۔

''دردانہ بیگم کون تھی؟'' شاہ عالم نے سوانح نگار سے پوچھا۔

''آپ کو شاید یاد ہو۔ دربار کی ایک کنیز تھی جس کا نام دردانہ بیگم تھا۔ فتح اللہ خاں نے اس سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ وہ الگ مکان میں رہنے لگی تھی اور فتح اللہ خاں کی دولت سے عیش کر رہی تھی۔''

''ہمیں سلطنت کے بکھیڑے بہت ہیں۔ ہم ایسی باتیں کب یاد رکھ سکتے ہیں۔ دردانہ بیگم تو ہمیں یاد نہیں لیکن فتح اللہ خاں کو کیسے بھول سکتے ہیں۔''

''آپ کو یہ تو یاد ہوگا کہ جب حضور اعظم شاہ سے جنگ کے لیے کابل سے کوچ فرما رہے تھے تو فتح اللہ خاں نے آپ کے ساتھ آنے سے انکار کر دیا تھا۔''

''یہ ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟''

''یہ وہی کنیز ہے جس کے دامِ فریب میں آ کر انہوں نے حضور کی حکم عدولی کی تھی۔''

اب شاہ عالم کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اس وقت بھی کسی نے توجہ دلائی تھی کہ فتح اللہ خاں کسی کنیز کے عشق میں مبتلا ہیں۔ اس کی قربت کے لیے وہ بادشاہ سے قریب نہیں رہنا چاہتے۔

شاہ عالم نے اس اچانک صدمے کو زبان بتایا۔

''فتح اللہ خاں نے ہماری حکم عدولی کی تھی لیکن ہمارے والد کے عہد میں انہوں نے عظیم الشان کارنامے انجام دیے تھے۔ انہوں نے کئی معرکوں میں اپنی جانِ خطرے میں ڈال کر مغلوں کی آبرو بچائی تھی۔ دردانہ یہ سمجھ رہی ہوگی کہ اب فتح اللہ خاں تنہا رہ گئے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم اپنے محسن کی جان نہیں بچا سکے لیکن ان کے قاتل کو سبق ضرور پڑھا سکتے ہیں۔ اسے گرفتار کر کے ہمارے حضور حاضر کیا جائے۔ اسے ہم خود سزا دیں گے۔''

یہ خبر ابھی حافظوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی کہ سکھوں کے بارے میں ہولناک خبریں آنے لگیں۔ سکھوں کا گروہ ''بیچا بادشاہ'' جو فرار ہو گیا تھا، کچھ دنوں روپوش رہنے کے بعد پھر سرگرم عمل ہو گیا تھا۔ اس نے شاہ جہان آباد (دہلی) سے دس بارہ کوس کی مسافت پر ایک قلعہ بنا لیا تھا۔ اطراف کے کچھ پرگنوں کو بھی قبضے میں لے لیا تھا۔

ان خبروں سے یقینی طور پر یہ تاثر لیا گیا کہ تیاری کے بعد سکھ سرہند اور لاہور کی تاراج کے لیے آگے بڑھ سکتے ہیں لہٰذا ان کی سرکوبی ابھی سے ضروری ہے۔

شاہ عالم ابھی ان کی سرکوبی کے لیے مشوروں کی منزل میں تھا کہ اچانک بیماری نے گھیر لیا۔ سرسام کی کیفیت تھی جس کا علاج کوئی ایسا مشکل بھی نہیں تھا لیکن لگتا تھا یہ بیماری تو محض بہانہ بن کر آئی ہے۔ چند پہر بعد ہی سفر آخرت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ شہزادوں کو اطلاع کر دی گئی۔

سکھوں کی سرکوبی دھری رہ گئی۔ فرخ سیر پٹنہ میں بادشاہ کے مرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ کابل سے اطلاع آ گئی کہ دردانہ گرفتاری سے بچنے کے لیے ایران کی طرف بھاگ گئی ہے۔

بادشاہ ہر اطلاع سے بے خبر معالجین کے نرغے میں تھا۔

شہزادہ عظیم الشان باپ کی عیادت کے لیے آیا۔ اسی وقت تینوں شہزادے بھی اچانک وہاں پہنچ گئے۔

اندیشوں کی چادر میں کئی سوراخ ہو گئے۔ وہ وقت آ گیا جو سب پر آتا ہے۔ شاہ عالم صرف چار سال حکومت کرنے کے بعد اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔

تجہیز و تکفین کے بعد حضرت قطب الدین کے روضے کے قریب دار الخلافہ سے چار پانچ کوس کے فاصلے پر دفن کیا گیا۔

جس تخت کے لیے اس نے دو بھائیوں اعظم شاہ اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کام بخش کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اس تخت پر صرف چار سال بیٹھ سکا۔ وہ بھی اس طرح کہ دارالخلافہ کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہو سکا۔

تاریخ ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو دہرانے کے لیے کھڑی تھی۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس کے سامنے تخت کے دو وارث تھے۔ وہ چار بیٹوں کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔

وراثت کے سلسلے اپنا دائرہ مکمل کرنے والے تھے۔ اس کے چھوڑے ہوئے چار وارثوں کے درمیان پھر ایک جنگ چھڑنے والی تھی۔

فرخ سیر ابھی پٹنہ میں چھاؤنی ڈالے بیٹھا تھا کہ اسے شاہ عالم کی وفات کی خبر پہنچی۔ اس نے پہلے تو یہ سوچا کہ وہ لاہور کی طرف کوچ کر جائے لیکن لشکر کی کمی نے اس کے پاؤں باندھ دیے۔ سید برادران بھی پٹنہ میں نہیں تھے جو ان سے مدد طلب کرتا۔ راستے بند تھے۔ مرکز کی حالت تتر بتر تھی۔ کوئی اطلاع اس تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن وہ یہ اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ اس کا باپ عظیم الشان تخت کے حصول کی کوشش ضرور کر رہا ہوگا۔ اس نے یہی سوچ کر نقارے بجوا دیے اور عظیم الشان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

سید برادران اسی دن پٹنہ میں داخل ہوئے۔ دیکھا تو نقارے بج رہے ہیں۔ معلوم ہوا فرخ سیر نے اپنے باپ عظیم الشان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔

یہ نقارے دونوں کے دلوں پر گھونسا بن کر لگے۔ دونوں سیاست کی بساط کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہیں اپنا انجام صاف نظر آنے لگا۔ دونوں سر جوڑ کر بیٹھے تو بہت سی باتیں صاف نظر آنے لگیں۔

''اگر عظیم الشان بادشاہ بن گیا تو سب سے پہلے ہمیں اپنے عہدوں سے ہٹنا ہوگا۔ اپنے باپ کے بادشاہ بننے کی صورت میں فرخ سیر خود چاہے گا کہ اسے پٹنہ کا حاکم بنایا جائے۔ عظیم الشان ہم دونوں کے خلاف ہے۔ وہ نہ پٹنہ ہمارے پاس رہنے دے گا نہ الٰہ آباد۔'' حسین علی نے ایک طویل تقریر کرتے ہوئے کہا۔

''چاروں بھائیوں کے درمیان تخت کے لیے کشمکش ہو رہی ہوگی۔ ہم دہلی جا کر کسی سازش کا حصہ بنیں اور کوشش کریں کہ عظیم الشان تخت پر قدم نہ رکھ سکے۔'' حسن علی نے مشورہ دیا۔

''بادشاہ کوئی بھی ہو، وہ فرخ سیر کا چچا ہوگا۔ خون جوش مارے گا تو فرخ سیر ہی کو نوازے گا، ہمیں نہیں۔''

''پھر تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ ہم فرخ سیر کو قتل کرا دیں۔''

''اس سے بھی آسان ایک راستہ ہے۔ ہم فرخ سیر کے پاس چلتے ہیں اور اسے اکساتے ہیں کہ وہ اپنے باپ کے بجائے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دے۔ ہم اسے بادشاہ بنانے میں اس کی پوری مدد کریں گے۔ اگر وہ بادشاہ بننے میں کامیاب ہو گیا تو وہ ہمارا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گا اور ہمارا شکر گزار رہے گا۔''

''وہ ہماری اس تجویز کو مان لے گا؟''

''اگر نہیں بھی مانی تو یہ بات تو ہمیشہ مانے گا کہ ہم اس کے ساتھ مخلص ہیں۔ آئندہ وہ بھی جب سوچے گا ہماری بھلائی کی سوچے گا۔''

''ہم شہر میں نہیں تھے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ آپ نے اپنے والد کی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔''

''آپ کو یاد نہیں کہ جب اورنگزیب عالمگیر کا انتقال ہوا تھا تو ان کے تینوں بیٹوں نے بہ یک وقت اپنی اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔ اعظم شاہ نے دکن میں، کام بخش نے بیجاپور میں اور میرے والد نے لاہور کے مقام پر۔ اس وقت بھی یہی ہو رہا ہوگا۔ یہ تو وقت بتائے گا کہ بادشاہت کس کے حصے میں آتی ہے۔ میرے والد کو جب بھی میری ضرورت پڑی، میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا اور آپ حضرات کو میری مدد کرنی ہوگی۔''

''ہم اور ہمارے خاندان کا ہر فرد آپ کی مدد کو تیار ہے لیکن ہمارا مشورہ کچھ اور ہے۔''

''فرمائیے۔''

''آپ اپنی بادشاہت کا اعلان کیوں نہیں کرتے؟'' حسین علی نے بڑی رازداری سے کہا۔

یہ پیشکش ایسی تھی کہ فرخ سیر بوکھلا کر رہ گیا لیکن اس نے اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دی بلکہ مصلحت نے اس کے ارادے کو پیچھے دھکیل دیا۔

''حسین علی خاں! اس طرح تو میرے والد ہی میرے خلاف ہو جائیں گے اور ممکن ہے تینوں چچا بھی میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔ ہاں اگر میرے والد کی سازش کا حصہ بن کر تخت سے دور ہو گئے تو میں اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے میں پیچھے نہیں رہوں گا۔''

''ہم اس وقت بھی آپ کے ساتھ ہوں گے۔''

☆☆☆

شاہ عالم کی وفات کے بعد چاروں بھائیوں کے درمیان ایک ہفتے تک صلح کی شرائط اور ملک و مال کی تقسیم کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سلسلے میں مراسلت ہوتی رہی۔ اس گفتگو کا مرکزی کردار ذوالفقار خاں تھا۔ چاروں بھائیوں کے درمیان وہی دوڑ دھوپ میں مصروف تھا لیکن یہ سب دکھاوے کی حد تک تھا ورنہ وہ فی الحقیقت جہاندارشاہ کا حامی تھا۔ تینوں بھائیوں کے مقررہ جاسوس کئی مرتبہ یہ خبریں لا چکے تھے کہ ذوالفقار خاں جہاندارشاہ سے اکیلے میں کئی ملاقاتیں کر چکا ہے۔

جب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی کہ ذوالفقار خاں دکھانے کو صلح کی بات چیت کر رہا ہے لیکن وہ جہاندارشاہ کا حامی ہے اور اسے بادشاہ بنانے پر متفق ہے تو جہاں شاہ کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ ذوالفقار خاں کو گرفتار کرلیا جائے مگر جہاں شاہ کو جرأت نہیں ہوئی۔

اب ذوالفقار خاں کو بھی شک ہوا کہ اس کی نگرانی کی جارہی ہے۔ وہ جلد سے جلد اس تاثر کو دور کردینا چاہتا تھا۔ اس نے چاروں بھائیوں کو جمع کیا اور تقسیم ملک کی یہ تجویز پیش کی کہ دکن تو جہاں شاہ کو دے دیا جائے۔ ملتان، ٹھٹھہ اور کشمیر رفیع الشان کے حصے میں رہے اور ہندوستان کے بقیہ صوبوں کو عظیم الشان اور جہاندارشاہ باہم تقسیم کرلیں۔

یہ تجویز محض عظیم الشان کو مطمئن کرنے کے لیے تھی وہ جہاندارشاہ کے حق میں تھا، چاہتا یہ تھا کہ کسی طرح عظیم الشان کو راستے سے ہٹادیا جائے۔ باقی شہزادے اس کے لیے ترنوالہ تھے۔ انہیں راستے سے ہٹا کر جہاندارشاہ کو بہ آسانی بادشاہ بنایا جاسکتا تھا۔

اب اس نے سازشوں کا نیا کھیل کھیلا اور تینوں بھائیوں کو عظیم الشان کے خلاف متحد کردیا۔ تینوں بھائی عظیم الشان کے خلاف متحرک ہوگئے اور بالآخر اس کے پڑاؤ کا محاصرہ کرلیا۔ چار پانچ دن تک عظیم الشان کے لشکر پر گولہ باری اور بان اندازی کرتے رہے۔

عظیم الشان کا توپ خانہ بھی آگ برسانے لگا۔

عظیم الشان بھی ہاتھی پر سوار ہوا اور مقابلے پر نکل آیا۔ ایسی سخت لڑائی چھڑی کہ بڑے بڑے نامی گرامی سواروں کے سر خاک و خون میں تیرنے لگے۔

عظیم الشان ہاتھی پر بیٹھا بہادری کے جوہر دکھا رہا تھا کہ اچانک نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ کسی نے اسے بھاگتے بھی نہیں دیکھا مگر میدان میں بھی نہیں تھا۔ مشہور ہوا کہ توپ کا گولہ اس کے لگا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ کوئی یہ کہتا تھا کہ شکست کے آثار دیکھ کر وہ ہاتھی سمیت دریا میں کودا اور ڈوب گیا۔

عظیم الشان کے غائب ہوتے ہی اس کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا۔ مخالف لشکر اس کے خزانے اور مال و اسباب پر ٹوٹ پڑا اور اس نے جو کثیر دولت بنگالہ میں ظلم و ستم کرکے جمع کی تھی، وہ ہاتھوں ہاتھ تباہ ہوگئی۔

تینوں شہزادے فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے اپنی اپنی جگہ لوٹ آئے۔

تخت کے چار وارثوں میں سے ایک کا خاتمہ ہوگیا۔ ذوالفقار خاں کے سامنے سے ایک مضبوط دشمن (عظیم الشان) ہٹ گیا تھا۔ اب اس نے دوسرا مہرہ چلا۔ جہاندارشاہ اور جہاں شاہ کے درمیان ایسی غلط فہمیاں پیدا کیں کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے اور معاملہ خون ریزی تک جا پہنچا۔ معرکہ کارزار گرم ہوگیا۔ سہ پہر تک خوب جم کر لڑائی ہوتی رہی۔ جہاں شاہ کا بیٹا فرخندہ اختر چند مشہور امیروں کے ساتھ مارا گیا۔ جہاندارشاہ کے بھی بہ کثرت آدمی کام آگئے۔ اس موقع پر جہاں شاہ نے جرأت سے کام لے کر اپنا ہاتھی آگے بڑھایا اور ایک بھرپور حملہ کرکے جہاندارشاہ کی فوج کے قدم اکھاڑ دیے۔

جہاں شاہ کی فوج تقریباً فتح پا چکی تھی کہ اچانک ایک سانحے نے جنگ کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ اچانک توپ کا گولہ کہیں سے آیا اور جہاں شاہ کے آ کر لگا۔ اس کے گرتے ہی اس کی فوج میدان سے بھاگنے لگی۔ جیسے ہی ذوالفقار خاں کو یہ خبر ملی، اس کے آدمیوں نے جہاں شاہ کے ہاتھی پر حملہ کردیا۔ ہاتھی پر جہاں شاہ اور فرخندہ اختر کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ ہاتھی اسی طرح جہاندارشاہ کے پاس پہنچادیا گیا۔

جہاندارشاہ کی فتح کے شادیانے بجادیے گئے۔

وراثت کے یہ سلسلے یہاں تک پہنچے کہ چار بھائیوں میں سے دو کا خاتمہ ہوگیا۔ اب تخت و تاج کے دو وارث رہ گئے جہاندارشاہ اور رفیع الشان۔

رفیع الشان نہایت صلح جو تھا۔ اس نے جہاندارشاہ کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ جہاندارشاہ نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا۔ دونوں کے درمیان کئی ملاقاتیں ہوئیں۔

ذوالفقار خاں یہ کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ دونوں کے درمیان صلح کی راہ ہموار ہو۔ اس نے سازشوں کا جال بچھایا اور بڑی ہوشیاری سے جہاندارشاہ کو رفیع الشان کی طرف سے بدظن کردیا۔

رفیع الشان اس سازش سے بے خبر گفت و شنید میں لگا ہوا تھا کہ ایک رات اچانک اس پر حملہ ہوگیا۔ وہ مدافعت کرتا ہوا نہایت پامردی سے لڑا لیکن چند ہمراہیوں سمیت مارا گیا۔ اس کے تین زخمی بیٹے جہاندارشاہ کے پاس پہنچادیے گئے۔

اب صرف ایک وارث رہ گیا تھا اور وہ تھا جہاندارشاہ۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

☆☆☆

لال کنور ابھی ابھی جہاندار سے رخصت ہو کر اپنے محل میں پہنچی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچی تو ایک چنچل سا گیت اس کے ہونٹوں پر خود بخود مچلنے لگا۔ اس کی چھوٹی بہن جو اس وقت کمرے میں موجود تھی، اسے یہ گیت بے محل معلوم ہوا۔ اسے لال کنور کو ٹوک دینا ہی مناسب معلوم ہوا۔

''باجی! یہ کون سا موقع ہے خوش ہونے کا۔''

''یہی تو موقع ہے۔''

''شہزادہ رفیع الشان کس بے دردی سے قتل ہوئے ہیں۔ ابھی ایک دن بھی نہیں گزرا اور آپ ہیں کہ.....''

''یہ قتل ہی تو میرے خوابوں کی تعبیر بنے گا۔''

''آپ بڑی بے درد ہیں۔''

''میں اس قتل پر خوش نہیں ہوں، میں تو خوش اس بات پر ہوں کہ میں نے ذوالفقار خاں کی زبانی جو کچھ سنا تھا حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔ اس سے آگے جو سنا تھا، وہ بھی سچ ثابت ہوگا۔''

''کیا سن لیا تھا تم نے؟''

''میں نے ذوالفقار خاں کی زبانی سنا تھا کہ ملک کو چاروں بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا۔ جہاندار شاہ نے اس سے آگے کی کہانی مجھے خود سنادی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ تقسیم تو دکھاوے کے لیے ہے۔ سازش یہ تیار کی گئی ہے کہ تین بھائی ایک ایک کر کے قتل کر دیے جائیں گے۔ آخر میں صرف میں بچ جاؤں گا اور میں ہی ہندوستان کا بادشاہ بنوں گا۔

''مجھے یقین نہیں تھا لیکن میں نے دیکھا کہ تینوں بھائی قتل ہو گئے۔ اب صرف اکیلا وارث جہاندار شاہ ہے۔ یقیناً وہی بادشاہ بنے گا۔ ایک دو روز میں اعلان بھی ہو جائے گا۔ میری پیاری بہن، ہمارے تو دن پھر گئے۔ اس کے بادشاہ بننے کا مطلب ہے میں بادشاہ بن گئی۔ اری، ہمارے تو دن پھر گئے۔''

''باجی! اتنی خوش مت ہو۔ ابھی ایک اور وارث بھی زندہ ہے جو کسی بھی وقت جہاندار شاہ کے راستے میں کانٹے بچھا سکتا ہے۔''

''تو کس کی بات کر رہی ہے۔ وارث تو چار ہی تھے۔ تین مارے گئے اور ایک باقی ہے۔''

''عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر کو کیوں بھولتی ہو۔''

''اس کی بات چھوڑو۔ پٹنہ میں بیٹھا ہے وہیں بیٹھا رہے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

شاہ عالم دو بھائیوں کی قربانی کے بعد تخت پر بیٹھا تھا، تین بھائیوں کے خون کی قیمت پر جہاندار شاہ ہندوستان کے تاج و تخت کا مالک بن گیا۔

لال کنور نے جو کچھ سنا تھا، وہ سچ ثابت ہو گیا۔

لال کنور مشہور طوائف تھی۔ طوائفیں تو اور بھی تھیں لیکن وہ جہاندار شاہ کی نظروں میں آ گئی تھی اور اس کی محبوبہ کی حیثیت سے دربار میں راج کر رہی تھی۔ جہاندار کے بادشاہ بنتے ہی اس کے اور اس کے خاندان والوں کے دن پھر گئے۔ بادشاہت اس کی تھی۔ اس کے بھائیوں اور دور و نزدیک کے رشتے داروں کو چار ہزاری پانچ ہزاری منصب ملے۔ ہاتھی، نقارہ، قیمتی جواہر اور اعزاز عطا ہوئے۔ ڈوم ڈھاڑی اپنی قوم میں اتراتے پھرتے تھے کہ ہم بھی بادشاہ کے رشتے دار ہیں۔

لال کنور کے بھائی خوش حال خاں کے نام اکبر آباد کی صوبے داری لکھ دی۔ ذوالفقار خاں جو بخشی الممالک کے عہدے پر فائز تھا، اس نے اسناد تیار کرانے میں تاخیر کر دی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لال کنور کا بھائی صوبے دار بنے۔ لال کنور کے بھائی نے ذوالفقار خاں کی شکایت جہاندار شاہ سے کی اور ذوالفقار خاں کو طلب کر لیا گیا۔

''ذوالفقار خاں! یہ ہم کیا سن رہے ہیں۔ ہم نے حکم جاری کیا تھا لیکن ابھی تک اسناد تیار نہیں ہوئیں تاکہ وہ اکبر آباد روانہ ہو۔''

''حضور! ہم خانہ زادوں کو دراصل رشوت لینے کی عادت ہو گئی ہے۔ بغیر رشوت لیے کوئی کام ہوتا نہیں۔'' ذوالفقار خاں نے کہا جو جہاندار شاہ کے سامنے بے خوفی سے بات کر لیا کرتا تھا۔

''لال کنور سے کیا رشوت لینا چاہتے ہو۔'' جہاندار شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''حضور! ایک ہزار عمدہ قسم کے نفیس طنبوروں کی ضرورت ہے۔''

''ہزار طنبوروں کا کیا کرو گے؟''

''جب حضور ہمارے کام اس قوم (میراثی) کے سپرد کر دیں گے تو پھر ہمارے لیے بجز اس کے کیا رہ جاتا ہے کہ ہم اس قوم کا پیشہ اختیار کر لیں۔''

جہاندار شاہ اس طنز کو سمجھ گیا اور صوبے داری کی تجویز واپس لے لی۔ اس وقت یہ تقرری رک گئی لیکن ذوالفقار خاں کس کس بات پر ٹوکتا۔

فرخ سیر پٹنہ میں بیٹھا اس تماشے کو دیکھ رہا تھا۔ باپ کی ہلاکت کے بعد اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اسے سید

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

برادران کا وعدہ یاد تھا کہ اگر وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کردے تو سید برادران اس کا ساتھ دیں گے۔ اس نے حسین علی کو طلب کیا اور اس کے مشورے سے اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔

''میں اگر پٹنہ کی حد تک بادشاہ رہا تو تم بھائیوں کے پاس نہ پٹنہ کی صوبے داری رہے گی نہ الٰہ آباد کی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں دہلی کی طرف کوچ کروں اور یہ کوچ میں تمہارے بغیر نہیں کرسکتا۔ مجھے اپنی بادشاہت بچانی ہے اور تمہیں اپنی صوبہ داری۔ یہ جنگ میری ہی نہیں تمہاری بھی ہے۔''

''آپ ہمیں خود سے جدا نہیں پائیں گے۔ بھوج پور کے راجپوت ہمارے ساتھ ہیں جو ہماری ایک آواز پر دوڑے چلے آئیں گے۔ ہماری برادری کے ہزاروں لوگ ہیں وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوجائیں گے لیکن اس کے لیے رقم کی ضرورت ہوگی۔''

''اس کی تمہیں فکر نہیں کرنی چاہیے۔ بنگال کا خزانہ اب بھی میرے آدمیوں کے پاس محفوظ ہے۔ ایک مسلح دستہ ساتھ لے کر جاؤ اور خزانے میں جو کچھ ہے نکال کرلے آؤ۔''

حسین علی بنگال روانہ ہوگیا اور حسن علی بھوج پور کے راجپوتوں کی طرف لشکر جمع کرنے کے لیے نکل گیا۔

جہاندار شاہ رنگ رلیوں میں مشغول تھا کہ فرخ سیر کی جنگی تیاریوں کی خبریں پہنچنے لگیں۔ طوائفوں اور سازندوں کے ہجوم میں گھرا ہوا جہاندار شاہ فرخ سیر کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اب جو وراثت کے سلسلے پٹنہ تک پہنچے تو اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس وقت بھی آنکھیں کھلیں تو لال کنور پر۔ مشورے کے لیے اسی کو طلب کیا اور مشورہ بھی یہ کہ اگر جنگ ہوئی تو وہ اس کے بغیر کیسے رہے گا۔ اس نے مشورہ دیا تو یہ کہ میدانِ جنگ میں جائیں آپ کے دشمن، اپنی جگہ اپنے بیٹے اعزالدین کو بھیجیں۔ آپ کی حیثیت کے منافی ہے کہ فرخ سیر جیسے معمولی آدمی کا مقابلہ کریں۔

جہاندار شاہ نے اس کا مشورہ مان لیا۔ ذوالفقار خاں نے بادشاہ کے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اس کے خیال میں اعزالدین ناتجربہ کار بھی تھا اور کم ہمت بھی لیکن جہاندار شاہ تو لال کنور کے سحر میں ایسا گرفتار تھا کہ کسی اور کے مشورے کو خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔ اس نے ذوالفقار خاں کی رائے کو پس پشت ڈالا اور اعزالدین کو پچاس ہزار کی فوج دے کر فرخ سیر کے مقابلے پر روانہ کردیا۔ خود لاہور سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

ایک امیر خواجہ حسن خاں کو خانِ دوراں کا خطاب دے کر شہزادے کے ساتھ کیا گیا تھا۔ فوج کے سارے امور و اختیارات اس کے سپرد کیے گئے تھے جو شہزادے کو سخت ناپسندیدہ معلوم ہوئے اور وہ بے دلی سے روانہ ہوا۔ یہ مشکل جمنا دریا تک گیا تھا اور اسے عبور کرکے چھاؤنی لگائی تھی کہ سرداروں کی باہمی مخالفت سے پھوٹ پڑگئی۔ سارے امور خانِ دوراں کے ہاتھ میں تھے اور اعزالدین کی اس سے بنتی نہیں تھی لہٰذا سرداروں کا باہمی اتفاق بڑھتا گیا۔ کوئی نظم ونسق باقی نہ رہا۔ یہاں تک ہوا کہ دو سردار مایوس ہوکر اپنی فوج سمیت لشکر سے نکل گئے۔ بے بسی اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی انہیں روکنے والا تک نہیں تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ فرخ سیر سے جاکر مل گئے۔

شہزادہ اعزالدین ایک مقام ''کھجوہ'' کے قریب پہنچا تو فرخ سیر کے نزدیک آنے کی خبریں آنے لگیں۔ وہ ایسا بدحواس ہوا کہ اسی مقام پر خیمے ڈال دیے اور لشکر کے اطراف خندقیں کھودنے کا حکم دے دیا۔ ابھی خندقیں پوری طرح کھودی بھی نہیں گئی تھیں کہ فرخ سیر کے محافظ دستوں نے صرف دو کوس کے فاصلے پر جھنڈے نصب کردیے۔ حسین علی کا بڑا بھائی حسن علی عرف عبداللہ خاں اس دستے کا نگراں تھا۔

حسن علی نے مورچابندی کرکے گولہ باری شروع کردی۔

گولہ باری کا سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ ابھی باقاعدہ جنگ شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ شہزادے کے لشکر میں افراتفری پھیل گئی۔ شہزادہ پہلے ہی بددل تھا، اس افتاد نے اسے بے دست و پا کردیا۔ اسے لال کنور یاد آگئی جس کی خاطر اس کے باپ نے میدان جنگ میں خود قدم رکھنے کے بجائے اسے بھیج دیا تھا۔ وہ لال کنور کے لیے اپنی جان کیوں ہلاکت میں ڈالے، اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کوئی جواب نہ سوجھا تو اسے اس فوج کا خیال آیا جو اس محافظ دستے کے پیچھے پیچھے چلی آرہی تھی۔ اس نے گھبرا کر خانِ دوراں کو مشورے کے لیے بلایا۔

خانِ دوراں آیا تو اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے شہزادے کی مایوسی کو بہ غور دیکھا۔ جب شہزادہ ہی بیزار تھا تو وہ کیوں اپنی جان ہلاکت میں ڈال کر اسے لڑائی کا مشورہ دیتا۔ آخر دونوں میں یہی مشورہ ہوا کہ فرار ہونے ہی میں عافیت ہے۔

یہ بزدلانہ فیصلہ تھا لیکن لشکر میں ایسی افراتفری مچی ہوئی تھی کہ یہ فیصلہ ہی صائب نظر آیا۔

اتنی جلدی میں تھے کہ جواہرات، خزانہ اور اشرفیاں ہی سنبھال کر رکھ سکے، باقی نقد خزانہ، توشک خانہ اور دوسرا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سازوسامان لوٹ مار کرنے والوں کے لیے چھوڑ کر وفادار سواروں کے ہمراہ نکل بھاگے۔

صبح ہوئی اور لشکر میں ان کے فرار کی خبر پہنچی تو سارے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگ کھڑا ہوا۔ ایسے حواس باختہ ہوئے کہ گھوڑوں پر زین کسنے تک کا ہوش نہیں رہا۔ اتنا ہوش کسے تھا کہ سامان سمیٹتا۔ ہر شخص جان بچا کر سب سے پہلے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

فرخ سیر کے ہرکارے اعزالدین کے لشکر کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے۔ لشکر کے فرار ہوتے ہی ہرکارے اپنے لشکر کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ خبر جونہی پہنچی، لشکری بھوکے ''باز'' کی طرح تعاقب میں پہنچے۔ لوٹ مار کے لیے ٹوٹ پڑے۔ جس کے جو ہاتھ لگا' لے اڑا۔ جن کے پاس ایک دن کی غذا کا اہتمام بھی نہیں تھا، اس قدر مالِ غنیمت ملا کہ سب مالا مال ہوگئے۔

☆☆☆

جہاندار شاہ اعزالدین کو سوار کرتے ہی دہلی پہنچ گیا تھا۔ لال کنور بھی اپنے خاندان سمیت دہلی چلی آئی تھی۔ اس سے قطع نظر کہ جنگ چھڑی ہوئی ہے کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے، قلعے میں راگ رنگ کی محفلیں جمی ہوئی تھیں۔

جہاندار شاہ کی محبوبہ لال کنور بڑے بڑے امراء پر حکم چلا رہی تھی۔ اس کے ہاتھوں روز کسی نہ کسی کی بے عزتی ہوتی تھی۔ یہ لوگ دعائیں مانگتے تھے کہ کسی طرح لال کنور سے چھٹکارا ملے۔ کاش! اعزالدین کی جگہ جہاندار شاہ جنگ کے لیے روانہ ہوجاتا اور وہاں مارا جاتا...... لال کنور سے تو نجات ملتی۔ انہی میں سے شاید کسی کی دعا قبول ہوئی۔ جہاندار شاہ دہلی میں بیٹھا اعزالدین کی فتح کا انتظار کررہا تھا کہ شکست کی خبر آگئی۔ اعزالدین میدانِ جنگ سے فرار ہوکر بہ حفاظت اکبر آباد پہنچ گیا تھا۔ یہ خبر سنتے ہی ہوش اڑ گئے۔ لال کنور قریب ہی بیٹھی تھی۔

''لال کنور! اب کیا ہوگا؟ اب تو اس شکست کا بدلہ لینے یقیناً ہمیں ہی جانا پڑے گا۔''

''جائیں آپ کے دشمن، کسی سردار کو بھیج دیجیے۔''

''ہم نہ گئے تو اکبر آباد ہاتھ سے نکلا ہی نکلا۔''

''ہم آپ کے بغیر کیسے رہیں گے؟''

''اس معرکے میں تم ہمارے ساتھ ہوگی۔ سازندے اور دوسری گانے والیاں بھی ہمارے ساتھ ہوں گی۔''

''ہم آپ کے حکم کے خلاف کیسے ہوسکتے ہیں۔''

''تم ہوگی تو ہمارا حوصلہ بڑھا رہے گا۔''

جہاندار شاہ نے جنگ کی تیاری کی اور تقریباً ایک لاکھ کا لشکر لے کر نکلا۔ ذوالفقار خاں، کوکلتاش خاں اور دوسرے بڑے بڑے سردار اس کے ساتھ تھے۔ ایک ہاتھی پر وہ اور لال کنور ساتھ تھے۔ دوسرے کئی ہاتھیوں پر سازندے اور دوسری طوائفیں تھیں۔

یہ برات نما لشکر اکبر آباد کے قریب سموگڑھ کے میدان میں پہنچ گیا۔

فرخ سیر بھی سادات بارہہ اور دوسرے امراء کے ہمراہ اکبر آباد کے قریب آگیا۔ اس کی فوج جہاندار شاہ کی پاسنگ بھی نہیں تھی۔ صاف نظر آتا تھا جہاندار شاہ کو فتح حاصل ہوگی۔ فرخ سیر پر بھی گھبراہٹ طاری تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جہاندار شاہ کے سازوسامان کی کثرت محض نمائشی ہے۔ اندرونی طور پر حالات بہت خراب تھے۔ ایک بازاری عورت (لال کنور) کا اثر و اقتدار دیکھ کر ایرانی و تورانی امیر سخت نالاں تھے۔ آپس کے اختلاف بھی شکست کے آثار دکھانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ ذوالفقار خاں اور کوکلتاش خاں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔

جب ایسی افراتفری ہو تو فتح کی امید کیسی۔

صف آرائی کے بعد لڑائی شروع ہوئی تو جہاندار شاہ کی فوج کا پلڑا بھاری تھا۔ دور تک تلواروں کی چمک اور خون کی گل افشانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

اس حملے میں سادات بارہہ کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

کئی گھنٹوں کی جنگ کے بعد جہاندار شاہ کی فوج میں فتح کے شادیانے بجا دیے گئے لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سادات بارہہ کا ایک بھائی حسن علی کسی طرح لشکر کی پشت سے نمودار ہوا ہے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں سازندوں اور طوائفوں کے خیمے تھے۔ حسن علی کے تیراندازوں نے ان خیموں کو نشانہ بنایا تو بھگدڑ مچ گئی۔ یہاں کھڑے ہاتھی بے تحاشا ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اب جو جہاندار شاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دشمن کی طرف چلا تو اس کا ہاتھی بھی دوسرے ہاتھیوں کی طرح بھڑک گیا اور فیل بان کے قابو میں نہیں رہا۔

اس اثنا میں فرخ سیر کی باقی ماندہ فوج ہر طرف سے سمٹ سمٹ کر اسی جگہ جمع ہوگئی۔ جہاندار کی فوج اس کی متحمل نہ ہوسکی اور ہزیمت کھا کر پسپا ہونے لگی۔ کوکلتاش خاں مدد کے لیے آگے بڑھا لیکن مارا گیا۔ تھوڑی دیر میں داروغہ توپ خانہ بھی کام آگیا۔ جہاندار شاہ کی محبوبہ لال کنور اس کے ہاتھی پر بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی اور اسے میدان سے فرار ہونے کے مشورے دے رہی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اکبرآباد تو ہاتھ سے چلا گیا۔ اب بھاگ کر دہلی پہنچو اور دہلی کو بچاؤ۔''

''میرا لشکر ابھی ڈٹا ہوا ہے۔ کیا خبر فتح کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''اب کوئی صورت نہیں نکلے گی۔ اس سے پہلے کہ آپ کی جان کو خطرہ ہو یہاں سے نکل چلیے۔''

''ٹھیک ہے میں ذوالفقار خاں سے بات کرتا ہوں۔''

''وہ تو آپ کی جان کو ہلاکت میں ڈالنے کا ہی مشورہ دیں گے۔ مجھے آپ کی زندگی عزیز ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے کہ کسی کو بھی کچھ نہ بتائیے۔ اس قتل گاہ سے نکلنے کی کیجیے۔ جان ہے تو جہان ہے۔''

اس کی بات جہاندار کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ لال کنور کے ہاتھی پر سوار ہوا اور اکبرآباد کی طرف نکل گیا۔

ذوالفقار خاں کو اس صورتِ حال کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس پر بھی بڑا سخت وقت تھا تاہم وہ ایک گھڑی رات تک فرخ سیر کے مقابلے پر جما رہا۔ جہاندار اور شہزادہ اعزالدین کی تلاش میں اس نے لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر دوڑایا کہ جہاندار شاہ کا کوئی بیٹا بھی آ جائے تو اس کو لے کر میں دشمن کو پسپا کر دوں مگر کوئی نہ ملا۔

ذوالفقار خاں بھی مایوس ہو کر دہلی کی طرف نکل گیا۔

جہاندار شاہ ایسا بھاگا کہ اکبرآباد جا کر دم لیا۔ شہر میں داخل ہو کر ڈاڑھی مونچھ صاف کرا کے حلیہ بدل لیا۔ جواہرات سے بھری گٹھری لال کنور کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ یہی وہ سہارا تھا جو انہیں دہلی پہنچا سکتا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی لٹیرا یہ جمع پونجی بھی نہ لے اڑے۔ ایک بیل گاڑی ایک مکان کے سامنے کھڑی دیکھی تو ہمت بندھی۔

''لال کنور! اس مکان پر دستک دو اور منہ مانگا کرایہ دے کر اسے دہلی چلنے پر آمادہ کرو۔''

لال کنور گٹھری بغل میں دبائے اس مکان کے سامنے پہنچ گئی۔ کئی مرتبہ دروازہ بجانے کے بعد ایک شخص باہر نکلا۔

''یہ بیل گاڑی تمہاری ہے؟''

''ہاں مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو۔''

''مجھے اور میرے مرد کو ابھی دہلی پہنچنا ہے۔''

''یہ کوئی وقت ہے سفر کرنے کا۔ رات پڑ گئی ہے۔ جگہ جگہ لٹیرے گھات لگائے بیٹھے ہوں گے۔ صبح آنا تو لے چلوں گا ابھی تو نہیں۔''

''صبح ہونے میں دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔ اکبرآباد سے نکلو گے اور صبح ہو جائے گی۔''

''کچھ بھی ہو۔ اتنی دور کا سفر بے صبح ہی نکلیں گے۔''

''میں تمہیں اتنا کرایہ دوں گی کہ تمہاری نسلیں بیٹھ کر کھائیں گی۔''

''شکل سے تو فقیر لگتی ہو، مجھے کیا دو گی۔''

اتنی دیر میں لال کنور گٹھری میں ہاتھ ڈال کر ہیرے کا ایک ہار نکال چکی تھی۔

''میں یہ ہار تمہیں انعام میں دے دوں گی۔ بس تم اسی وقت بیل گاڑی نکال لو۔''

گاڑی بان لالچ میں آ گیا۔ لال کنور کے کہنے پر اپنا ایک کرتہ اور دھوتی بھی جہاندار شاہ کے لیے دے دی۔ جہاندار شاہ نے یہ دیہاتی کپڑے پہن لیے۔ اتنی دیر میں گاڑی بان نے اپنے بیل گاڑی میں جوت لیے تھے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ ہندوستان کا بادشاہ اور اس کی محبوبہ بیل گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔

''آپ نے سوچا دہلی پہنچ کر آپ کہاں جائیں گے۔ کیا خبر آپ سے پہلے فرخ سیر دہلی پہنچ جائے۔ آپ کو تو فوج جمع کرنے میں بھی دیر لگے گی۔''

''قلعے میں ابھی میرے آدمی متعین ہوں گے۔''

''کسی کو آنکھیں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آپ کے فرار کی خبریں پہنچ چکی ہوں گی۔ آپ کا وفادار سے وفادار ملازم بھی انعام کے لالچ میں آپ کو گرفتار کر کے فرخ سیر کو پیش کر سکتا ہے۔ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے کہ آپ دہلی میں ہیں۔''

''پھر میں کہاں جاؤں؟ کس دروازے کی دہلیز سے سر پھوڑوں؟''

''آپ کو ذوالفقار خاں کے والد اسد خاں کے پاس جانا چاہیے۔ وہ تجربہ کار سپہ سالار ہیں۔ آپ کو بہتر سے بہتر مشورہ و مدد سے نوازیں گے۔''

''کیا وہ ذوالفقار خاں کے بارے میں نہیں پوچھیں گے؟ کیا میں انہیں بتا سکوں گا کہ میں ان کے بیٹے کو میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔''

''جب افراتفری پھیلتی ہے تو کسی کو کسی کا ہوش نہیں رہتا۔ سب اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔ آپ نے بھی اپنا بچاؤ کیا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ذوالفقار کو بتانے کا موقع ہی نہیں ملا اور آپ کو نکلنا پڑا۔''

دہلی قریب آ رہا تھا لہٰذا دونوں اپنے اپنے خیالوں میں گم ہو گئے۔ گاڑی بان بار بار پوچھ رہا تھا کہ اب وہ کدھر جائے۔ جہاندار شاہ اسے راستہ بتا رہا تھا۔

اس نے بیل گاڑی والے کو ایک شاندار حویلی کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سامنے رکنے کا حکم دیا۔ گاڑی بان حیران تو ضرور ہوا ہوگا کہ اتنی بڑی حویلی کے سامنے اترنے کا کیا مقصد ہے۔ کہاں یہ حویلی کہاں یہ عام سا آدمی لیکن اسے تو انعام سے غرض تھی۔ لال کنور نے ہیروں کا ہار اس کے حوالے کیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

جہاندار شاہ اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اپنی قسمت پر افسوس کرتا رہا۔ پلٹ کر دیکھا تو لال کنور وہاں نہیں تھی۔ اس مشکل وقت میں وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ جواہرات سے بھری گٹھری بھی اس کے پاس تھی۔ جہاندار شاہ نے سرگوشیوں میں اسے آوازیں دیں، ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ شاید نظر آجائے۔

''اے، کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو۔'' حویلی کے پہرے داروں نے اسے للکارا اور وہ لال کنور کو بھول کر پہرے داروں کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''اسد خاں سے کہنا جہاندار شاہ تم سے ملنے آیا ہے۔''

''کون جہاندار شاہ۔ یہ تو ہمارے بادشاہ کا نام ہے۔''

''بادشاہ ہی سمجھو اور بھاگ کر خبر کرو۔ ذرا دیر کی تو اسد خاں تمہاری کھال کھنچوا دیں گے۔''

''بے وقوف مت بناؤ۔ اسد خاں غریبوں کی مدد ضرور کرتے ہیں لیکن پاگلوں کی نہیں۔ تم خود کو بادشاہ کہو اور ہم تمہیں اسد خاں کے پاس لے جائیں۔''

''اچھا مت لے جاؤ۔ صرف خبر کر دو۔ بادشاہ مت کہنا صرف جہاندار شاہ کہہ دینا۔''

ایک محافظ اندر گیا اور اسد خاں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اسد خاں تک شکست کی خبریں پہنچ چکی تھیں۔ ذوالفقار خاں کچھ دیر پہلے ہی پہنچے تھے، ان کی زبانی بھی جہاندار شاہ کے فرار کی خبریں پہنچی تھیں۔ انہیں یقین ہوگیا کہ ہو نہ ہو یہ جہاندار شاہ ہی ہوگا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلے۔ حلیہ دیکھ کر کچھ دیر تک تو وہ بھی نہ پہچان پائے۔ ذرا غور کیا تو دیہاتی کے پردے میں جہاندار شاہ کو دیکھا۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اندر لے گئے۔

وہ اندر گیا تو گھر کا نقشہ عجیب دیکھا۔ ذوالفقار خاں اس سے پہلے پہنچ گئے تھے اور اس وقت وہاں موجود تھے۔

ذوالفقار خاں کو دیکھ کر اس کے الفاظ دم توڑ گئے۔ شرمندگی نے ایسا حصار کھینچا کہ بادشاہ ہوتے ہوئے غلاموں کی طرح کھڑا ہونے پر مجبور ہوگیا۔ اسد خاں نے آگے بڑھ کر اسے تسلی دی۔ ذوالفقار خاں نے اپنے برابر بٹھایا۔

''میں اس خیال سے کچھ نہیں کہتا کہ حضور کو ملال ہوگا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ میدانِ جنگ میں موجود رہتے تو میں شکست کو فتح میں بدل سکتا تھا۔''

''ذوالفقار خاں! ہم تم سے واقعی شرمندہ ہیں۔ ہم لال کنور کی باتوں میں آگئے تھے۔ ہمیں تم سے تو مشورہ کرنا تھا۔''

''ارے ہاں یاد آیا۔ لال کنور بھی تو آپ کے ساتھ تھیں۔ انہیں کہاں چھوڑا؟''

''وہ اپنی اوقات دکھا گئیں۔ یہاں تک تو ساتھ تھیں پھر اچانک غائب ہوگئیں۔ اچھا ہی ہوا کہ چلی گئیں۔ ہمارے ساتھ کہاں ٹھوکریں کھاتی پھرتیں۔ جو کچھ مال و متاع تھا وہ بھی انہی کے پاس تھا۔ ان کا ایک احسان ہم پر ضرور ہے کہ یہ مشورہ انہی کا تھا کہ ہم اسد خاں کے پاس چلے جائیں ورنہ ہم جانے کہاں ہوتے۔''

جب جہاندار شاہ آرام کی غرض سے چلا گیا تو اسد خاں اور ذوالفقار خاں کے درمیان گفتگو ہوئی کہ جہاندار شاہ کو اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا دلایا جائے۔

ذوالفقار خاں نے سفارش کی کہ جہاندار شاہ کو کابل یا دکن جا کر دوبارہ لشکر فراہم کیا جائے اور اس شکست کی تلافی کی جائے۔

آصف الدولہ بڑا تجربہ کار اور جہاں دیدہ آدمی تھا۔ وہ صاف دیکھ رہا تھا کہ جہاندار شاہ فرماں روائی کا اہل نہیں اور اب سارا معاملہ ہاتھ سے نکل چکا۔ مزید جنگی تیاریوں سے بجز خلقِ خدا کی تباہی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ پھر اتنا خزانہ بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اس سے فوج کو بھرتی کیا جاتا۔ اس نے یہی مناسب جانا کہ جہاندار شاہ کو قلعے میں بھیج کر نظر بند کر دیا جائے۔ اس نے ذوالفقار خاں سے کہا۔ ''تیموری خاندان میں سے جو بھی فرماں روا ہوا اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے اب اگر جہاندار شاہ کو دوسری جگہ لے جائیں تو ایک نیا فتنہ برپا ہوگا کیونکہ فرخ سیر بھی تو تیموری خاندان ہی کا ایک فرد ہے۔''

ذوالفقار خاں اس تجویز پر متفق نہیں تھا لیکن بالآخر اسے ماننا پڑا۔ اس نے جہاندار شاہ کو مختلف حیلے بہانوں سے قلعے میں بھیج دیا اور کسی نظر بند کی طرح اس کی نگرانی کی جانے لگی۔

فرخ سیر نے تمام معاملات کی درستی کے بعد کوچ کیا اور دہلی کے قریب ایک مقام ''بارہ پلہ'' کے قریب آکر ٹھہر گیا۔ اسی مقام پر امرائے دربار نے اس سے ملاقاتیں کیں۔ گناہ گار حاضر ہونے لگے کہ اپنی خطاؤں کو معاف کرائیں۔ وفاداروں میں خطابات تقسیم ہو رہے تھے۔

اسد خاں نے بیٹے کو مشورہ دیا کہ ''بارہ پلہ'' چل کر فرخ سیر سے ملاقات کی جائے۔ فرخ سیر کا نام سنتے ہی ذوالفقار خاں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کو اپنے جرائم یاد آ گئے۔ وہ تمام سازشیں نظروں کے سامنے گھوم گئیں جو اس کی کوششوں سے پروان چڑھی تھیں۔ اسے فرخ سیر سے قطعی اچھی امید نہیں تھی لیکن اسد خاں پُرامید تھے۔

''میں نے اسی دن کے لیے تجھے جہاندار شاہ کو کابل یا دکن بھیجنے سے گریز کیا تھا۔ فرخ سیر یقیناً میرا احسان مند ہوگا کہ میں نے اس کے دشمن جہاندار شاہ کو اس کے لیے زندہ رکھا ہے۔ اس کے صلے میں وہ ہم پر مہربانی کرے گا۔ اگر ہم اس سے ملنے نہیں گئے تو وہ ہمیں بھی اپنا دشمن سمجھے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم اس سے ملاقات میں سبقت کریں۔''

دونوں باپ بیٹے بارہ پلہ پہنچ گئے۔

فرزند سادات بارہہ حسین علی خاں امیر الامراء کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ اسد خاں نے اس سے ملاقات کی اور دربار میں حاضری کی اجازت چاہی۔ اس نے وعدہ کیا کہ نہ صرف ملاقات کرائے گا بلکہ معافی کے لیے سفارش بھی کرے گا۔ اس نے وعدہ تو یہی کیا تھا لیکن دل میں کچھ اور تھا لہٰذا ان کے ہاتھ بندھوا کر باریاب کرایا۔ اسد خاں آصف الدولہ نے اپنے بیٹے کے قصوروں کی معافی کے لیے چند کلمات عرض کیے۔ جہاندار شاہ کو قید کرنے کو بھی اپنا کارنامہ قرار دیا اور اس کے صلے میں ذوالفقار خاں کی معافی کی درخواست کی۔

فرخ سیر کی آنکھیں ذوالفقار خاں پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے ایک ایک کر کے تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ یہی وہ شخص ہے جس نے بنگال سے میری طلبی کے لیے میرے دادا...... کے کان بھرے تھے۔ یہی میرے باپ کا قاتل ہے کہ اس نے میرے چچاؤں کو بھڑکا کر ہولناک جنگیں کرائیں۔ جہاندار شاہ کو تخت پر بٹھانے والا یہی ذوالفقار خاں ہے۔ اسے میں کیسے معاف کر سکتا ہوں۔ اس نے اپنی زبان سے کوئی اظہار نہیں کیا اور حکم دیا کہ دونوں کے ہاتھ کھول دیے جائیں۔ اسد خاں خوش ہو گئے کہ بس اب معافی کا پروانہ ملنے والا ہے پھر وہ ذوالفقار خاں کو نظر انداز کرتے ہوئے اسد خاں سے مخاطب ہوا۔

''اسد خاں! ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے جہاندار شاہ کی کوئی مدد نہیں کی اور اسے ہمارے لیے محفوظ رکھا۔ تم ہماری مہربانیوں کے ہمیشہ سزاوار ہو گے۔ تم گھر جا سکتے ہو۔ ذوالفقار خاں سے ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔ انہیں یہیں رہنے دو۔''

اسد خاں بھانپ گئے کہ بس اب بیٹے کی موت آ گئی لیکن کیا کر سکتے تھے۔ رنج و غم کے عالم میں اپنے خیمے کو واپس ہو گئے۔

ذوالفقار خاں بھی اپنے جرائم سے واقف تھے، موت کے لیے تیار ہو گئے۔ افسوس ہوگا تو بس یہ کہ باپ کے کہنے سے دربار تک کیوں آ گئے۔ کسی اور طرف نکل جاتے۔ شیر کے منہ میں شکار بن کر رہ گئے۔ بادشاہ کا اشارہ ہوا۔ درباری اور بادشاہی چیلے انہیں گھسیٹتے ہوئے بادشاہ کی نظروں سے دور لے گئے۔ ایک چیلے نے پیچھے سے آ کر اس کی گردن میں تسمہ ڈال کر اسے کھینچا اور اطراف سے تمام چیلے ٹوٹ پڑے۔ لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ کسی نے چھری گھونپی کسی نے خنجر۔ یہاں تک کہ اس کا کام تمام کر دیا۔

اسی دن بادشاہ کے حکم سے بعض لوگ قلعے کے اندر گئے۔ جہاندار شاہ ایک تنگ و تاریک جگہ قید تھا۔ وہ سر جھکائے آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ آہٹ ہوئی، کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ یہی سمجھا کہ اس کی آزادی کا پروانہ آ گیا۔ فرخ سیر اس کا بھتیجا ہی تو ہے' اسے رحم آ گیا ہوگا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''بادشاہ سلامت ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔''

''ہمیں معلوم تھا کہ ہمارا بھتیجا ہمیں ضرور آزاد کرے گا۔'' جہاندار شاہ نے کہا اور ان کے ساتھ قید خانے سے باہر آ گیا لیکن جونہی اسے یہ لوگ ایک بغلی کمرے میں لے جانے لگے تو وہ مزاحمت کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ وہ کمرا ہے جہاں قیدیوں کو قتل کیا جاتا ہے۔ اس کی مزاحمت کام نہ آئی۔ ایک تسمہ کش نے اس کی گردن میں تسمہ ڈال کر کئی جھٹکے ایک ساتھ دیے۔ اس کی گردن ڈھلک گئی۔ پھر جلاد آگے بڑھا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

جہاندار شاہ کے جسم کو ہاتھی کی عماری میں رکھ دیا گیا اور اس کا سر نیزے پر چڑھا کر ہاتھی پر بلند کیا گیا اور ذوالفقار خاں کی لاش کو ہاتھی کی دم پر باندھ دیا گیا اور جلوس کی شکل فرخ سیر کے پاس روانہ کر دیا گیا۔

وراثت کے سلسلے کا ایسا عبرت ناک انجام کس نے دیکھا ہوگا!

ماخذات

منتخب اللباب، خافی خان...وقائع عالم شاہی، کنور پریم کشور...
تاریخ ہند، ذکا اللہ...تاریخ مسلمانان، ہاشمی فرید آبادی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سزا

تنویر ریاض

ایک بد فطرت انسان چاہے اپنی ذات کو کتنے ہی شرافت کے پردوں میں چھپالے، ایک نہ ایک روز کسی نہ کسی کی آنکھ اس کے تمام پردوں کو چاک کرکے تہ میں اتر جاتی ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی منظر کی گواہ تھی جس نے اس کی اپنی زندگی کا منظرنامہ بدل ڈالا تھا... مظلوم چاہے کتنا ہی بے بس ہو مگر قدرت ظالم کے گرد ضرور گھیرا تنگ کردیتی ہے۔

خونی رشتوں کی محبت اور تحفظ کا خوبصورت حصار

جس موسم گرما میں زینڈی جائنز بارہ سال کی ہوئی، اس کا جڑواں بھائی بیس بال کھیلتے ہوئے سر کے اوپر سے گزرتی ہوئی گیند کو پکڑنے کی کوشش میں اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ اگر وہ اپنی جگہ کھڑے رہ کر دستانے سر سے اوپر لے جاتا تو گیند سیدھی پاکٹ میں چلی جاتی۔ اس کا کہنا تھا کہ سورج کی روشنی میں آنکھیں چندھیا گئی تھیں لیکن اس کا امکان بہت کم تھا کیونکہ وہ لوگ ہلکی بارش میں کھیل رہے تھے۔ ہم عمر لڑکوں میں صرف مائیک کو ہی کھیلنے کی اجازت تھی کیونکہ لیگ کے قوانین اس کی اجازت دیتے تھے جس کے تحت کوئی بھی مناسب جسامت رکھنے والا لڑکا ٹرائل میں حصہ لینے کے بعد ٹیم میں شامل ہوسکتا تھا اور ہر کھلاڑی کو کم از کم ایک دفعہ بیٹنگ کرنے اور ایک اننگ کھیلنے کی اجازت تھی۔ اسی لیے مائیک پورے جوش سے کھیل رہا تھا اور جیسے ہی گیند اس کی جانب آتی، اس کے بھی ساتھی چلانے لگتے۔

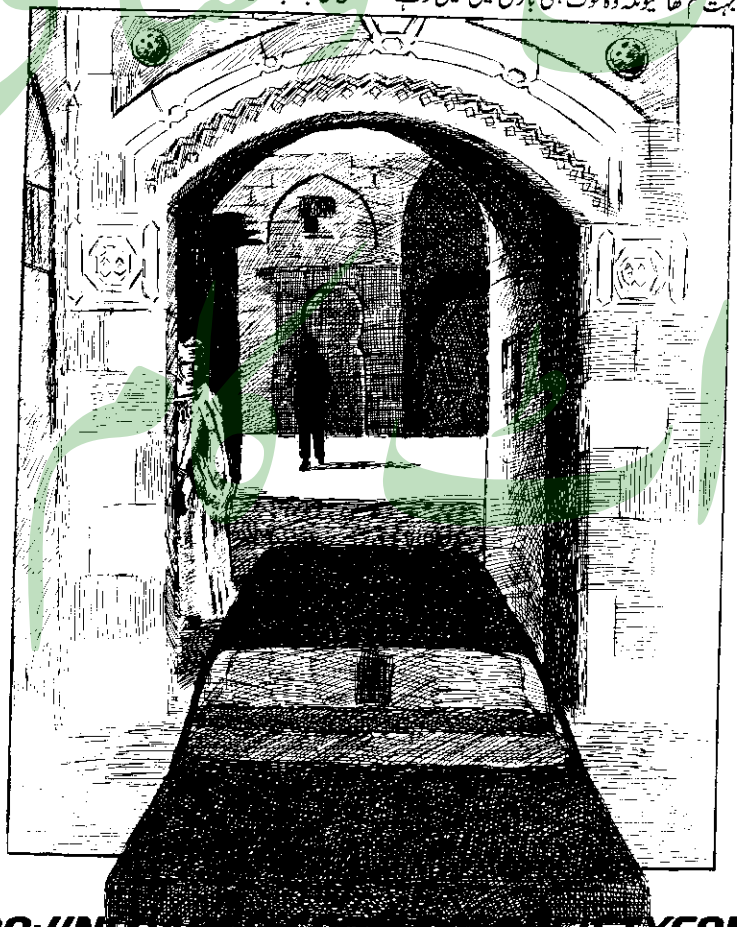

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زینڈی اور مائیک دونوں ہی دعا مانگ رہے تھے کہ کوئی بھی گیند کو صحیح طرح ہٹ نہ لگا سکے۔ دونوں کی خواہش تھی کہ مما اسے کھیلنے دیں لیکن ماں کو دوسری فکریں لاحق تھیں۔ اس نے یہ تو نہیں کہا کہ مائیک کے لیے یونیفارم اور دستانے خریدنے میں اس کی محنت کی کمائی کا کتنا بڑا حصہ خرچ ہوگیا ہے۔ بس اتنا بولی۔

''نہیں میرے بچے! خدا تمہارے باپ کی روح کو ابدی سکون دے۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو کیا کہتا۔''

دوسری طرف زینڈی گیند کو باؤنڈری کے پار پہنچا کر رن بنانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو پورے قصبے میں بہترین بال پھینکنے والی سمجھتی تھی لیکن لڑکی ہونے کی وجہ سے اس پر پابندیاں تھیں اور وہ صرف خالی میدان میں اپنا شوق پورا کرسکتی تھی کیونکہ لیگ کے قوانین اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ ان قوانین سے عاجز آچکی تھی۔ مثلاً یہ کہ اسے اسکول جانے کے لیے جو یونیفارم پہننا پڑتا، اس میں ٹانگیں کھلی رہتی تھیں۔ سرما کے موسم میں اسے ٹھنڈ برداشت کرنا پڑتی اور خشک ہواؤں کی وجہ سے جلد بھی کھردری ہوجاتی۔ ان کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ جلد کو ملائم رکھنے کے لیے کوئی لوشن یا کریم خرید سکتی۔ اسی طرح گرمیوں کے موسم میں اسکول بس میں سفر کرنا دشوار ہوجاتا۔ گرم سیٹ کی تپش سے اس کی ٹانگیں جھلس جاتیں۔ معاشرے نے جو اصول بنا رکھے تھے، ان کی رو سے اس پر لازم تھا کہ وہ کچن اور گھر کے دوسرے کاموں میں ماں کی بلا معاوضہ معاونت کرے جبکہ مائیک اپنی نئی بائیسکل پر پورے قصبے میں گھوما کرتا تھا جو اس نے قسطوں پر خریدی تھی۔ وہ گھر گھر اخبار پہنچایا کرتا اور وہاں سے ملنے والے پیسوں سے ہی اس نے پہلی قسط دی تھی۔ تاہم وہ یہ کام نہیں کرسکتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ یہ کوئی اصول تھا بلکہ نیو جرسی میں اس کے لیے باقاعدہ قانون بنا ہوا تھا جس کے تحت نابالغ لڑکیاں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتی تھیں۔

''اس کی بھی وجہ ہے کہ لڑکیوں کو اکیلے سائیکل نہیں چلانی چاہیے، بالخصوص اندھیرا پھیل جانے کے بعد۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا واقعہ پیش آجائے؟'' ماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''یہ جائز نہیں ہے۔'' زینڈی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''مائیک بھی میری ہی عمر کا ہے۔ اس پر تو ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔''

ماں اس کے ناپختہ ذہن میں کوئی ایسی بات ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اتنا ہی کہہ سکی۔ ''اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔''

''ڈیلی کوریئر'' کو ہمیشہ قابل اعتماد ہاکرز کی ضرورت رہتی تھی جو گھروں پر اخبار پہنچانے کا کام خوش اسلوبی اور ذمے داری سے پورا کرسکیں۔ جب دوسرے لڑکوں نے ایلم اور جیکب کے کونے پر آنا چھوڑ دیا تو مائیک کو ایک دو نہیں بلکہ اکٹھے تین روٹ مل گئے۔ جہاں مقامی سپروائزر مسٹر کوئنسی ہر روز صبح سوا پانچ بجے موسم کی پروا کیے بغیر اخبارات لے کر آتا اور ہاکرز کو ان کے حصے کے بنڈل دے دیتا۔ چھ ماہ کے عرصے میں مائیک نے اتنے گاہک بنا لیے جنہیں وہ... بہ آسانی صبح سات بجے سے پہلے اخبار پہنچا دیا کرتا تھا۔

اس حادثے کے بعد اس کا آپریشن ہوا۔ وہ اسپتال کے بستر پر چت لیٹا ہوا سو رہا تھا اور زینڈی اس کے پاس بیٹھی اپنی پسندیدہ تصویروں کی کتاب دیکھ رہی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ڈیڈی رات کو سونے سے پہلے انہیں یہی کتاب پڑھ کر سنایا کرتے تھے لیکن اب یہ محض ایک یاد ہی رہ گئی تھی۔ اس کے ڈیڈی کوریا کے محاذ پر گئے اور ان کی واپسی قومی پرچم لپٹے ہوئے تابوت میں ہوئی۔

مائیک کی ٹانگ رسیوں میں جھول رہی تھی۔ زینڈی نے اس کے تازہ پلاستر پر انگلی رکھی تو مائیک کی آنکھ کھل گئی۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس طرح مت کرو۔ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

زینڈی نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا۔ اس کا مقصد اسے نقصان پہنچانا نہیں تھا۔ ''سوری، مجھے خیال نہیں رہا۔''

مائیک نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مما کہاں ہیں؟''

زینڈی نے اپنا انگوٹھا کندھے سے اوپر لے جاتے ہوئے نرسوں کے اسٹیشن کی جانب اشارہ کیا جو بستروں کی قطار کے آخری سرے پر بچوں کے وارڈ کے سامنے تھا اور بولی۔ ''وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ بل کہاں بھیجا جائے۔''

مائیک کے چہرے پر فکر و تردد کی پرچھائیاں نمودار ہونے لگیں۔ وہ ماں کی پریشانی کا اندازہ کرسکتا تھا، اس نے آنکھیں بند کرلیں پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''انہیں چاہیے تھا کہ تمہیں گھر بھیج دیتیں۔''

زینڈی نے کوئی جواب نہیں دیا اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولی۔ ''وہ نہیں جانتیں کہ یہ بل کس طرح ادا کیا جائے گا۔'' اس نے مائیک کی ٹانگ کی جانب اشارہ کیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ تمہاری بائیسکل...''

مائیک نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''کیا وقت ہوا ہے؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زینڈی نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولی۔ ''آٹھ بج کر تینتالیس منٹ..... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

مائیک نے وارڈ کی سبز دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''صبح یا رات؟''

''ظاہر ہے کہ ابھی رات ہی ہے لیکن تم اس طرح کے سوالات کیوں کر رہے ہو؟''

''یعنی ابھی ہفتے کا دن ہی ہے؟''

اس نے تائید میں سر ہلایا اور اس بار ذرا اونچی آواز میں بولی۔ ''کیوں؟''

''مجھے چھ بجے سے پہلے مسٹر کوئنسی کو فون کرنا ہے کہ اگر میں اپنے علاقے میں اخبار تقسیم کرنے نہ جا سکا تو وہ میری جگہ کسی کو کام پر لگا سکتا ہے۔ مجھے تو یقینی طور پر نکال دیا جائے گا۔''

''تمہیں تو ہر حال میں چھوڑنا ہوگا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ پلاسٹر کم از کم آٹھ ہفتے چڑھا رہے گا یا شاید اس سے بھی زیادہ۔''

''آٹھ ہفتے۔'' مائیک نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی سائیکل کی قسطیں کس طرح ادا کروں گا۔''

یہ سنتے ہی زینڈی کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا اور وہ بولی۔ ''کیا یہ ممکن ہے؟''

مائیک نے آنکھیں کھول دیں۔

زینڈی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''میں تمہاری جگہ کام کر سکتی ہوں۔''

مائیک نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ''نہیں۔ تم ایک لڑکی ہو۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے وہ کوئی ناقص العقل، نادان اور نااہل ہستی ہو۔ ''یہ غیر قانونی ہوگا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' اس نے لمبی چوڑی تقریر کرنے کے بجائے لہجے کو پُرسکون بناتے ہوئے کہا۔ ''کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ میں تمہاری جگہ اخبار تقسیم کر رہی ہوں۔''

مائیک نے آنکھیں چندھی کر کے اسے دیکھا۔ اب زینڈی اپنے آپ کو تصور کی آنکھ سے قصبے میں سائیکل دوڑاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ وہ کبھی قصبے کے پُرپیچ راستوں پر سفر کرتی تو کبھی اس کا گزر ان مکانات کے سامنے سے ہوتا جو پرانے اٹرپورٹ کے علاقے میں خود رو جھاڑیوں کے مانند اگ آئے تھے۔ وہ کبھی گڈون لان کے سرسبز میدانوں سے گزرتی تو کبھی اپنی سائیکل کو گڈون کی پہاڑیوں پر جاتا دیکھتی جہاں سے امپائر اسٹیٹ بلڈنگ کو دیکھا جا سکتا تھا۔

''میں تمہارا وہی روپ دھاروں گی جو گزشتہ سال ایک موقع پر اختیار کیا تھا۔ تمہیں یاد ہے نا؟''

مائیک نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول دیں اور بولا۔ ''ہاں۔ ہم نے بلڈنگ کے آدھے لوگوں کو بے وقوف بنا دیا تھا۔ انہیں بھی جو ہمیں ہمیشہ سے جانتے ہیں۔''

''میں تمہارے کپڑے پہن سکتی ہوں۔''

''اپنی چوٹی کو میری ٹوپی میں چھپا لینا۔ مسٹر کوئنسی کو کم نظر آتا ہے۔ وہ کبھی اس پر غور نہیں کرے گا۔''

''اپنے گاہکوں کے بارے میں مزید کیا کہو گے؟''

''ان سے مہینے میں صرف ایک بار ہی ملنا ہوتا ہے جب بل لینے جاتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں کہ ان میں سے زیادہ تر کو میری شکل یاد ہوگی۔'' یہ کہتے ہوئے مائیک کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

''کیا ہوا؟'' زینڈی اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھتے ہوئے بولی۔

مائیک اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں ..... بس یونہی.....'' وہ سایہ ٹمٹمایا اور پھر غائب ہو گیا۔ ''تمہیں ان راستوں کا علم نہیں جن پر میں اخبار پہنچانے جاتا ہوں۔''

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میں نے تمہارے کارڈز اور نقشہ دیکھا ہے جنہیں تم اپنے ساتھ لے جاتے ہو۔ میں بھی اسی نقشے سے مدد لے سکتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے وہ کارڈ کسی خاص ترتیب سے رکھے ہوں گے۔''

پہلی بار مائیک کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور وہ بولا۔ ''ہاں۔ میں نے اپنا ایک سسٹم بنا رکھا ہے۔''

پھر وہ اپنے سسٹم کی وضاحت کرنے لگا کہ کس طرح اس نے اخبار پہنچانے کے لیے کارڈز کو ترتیب سے رکھا ہوا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ کون سا گاہک چھٹیوں پر ہے اور کس پر پیسے باقی ہیں۔ کس طرح اخبار کو تہ کر کے رکے بغیر ایک میزائل کی طرح پھینکنا ہے کہ وہ پورچ یا بیرونی دروازے کے قریب جا کر گرے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کے بنڈل کون سے ہیں۔

''اس کے علاوہ اور کچھ؟'' زینڈی نے پوچھا۔

مائیک نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن زینڈی کو پورا یقین تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہا ہے۔

''تمہیں تین ہفتے بعد بل وصول کرنے جانا ہے۔ شاید اس وقت تک میں سائیکل چلانے کے قابل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوجاؤں۔''

''اگر نہ ہوسکے تب بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہارے سارے پیسے وصول کرلوں گی۔ بے شک تم مجھے کچھ نہ دو۔''

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے یہ بات کیوں کہی۔ اگر وہ اس کے لیے کام کررہی ہے تو وہ اسے معاوضہ کیوں نہیں دے گا۔

''تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ کہیں کوئی پولیس والا نہ پکڑ لے۔''

اچھا تو یہ بات مائیک کو پریشان کررہی تھی۔ زینڈی نے سوچا اور بولی۔ ''اگر میں ان لوگوں کو بے وقوف بنا سکتی ہوں جو ہمیں جانتے ہیں تو پولیس کو بھی چکما دے سکتی ہوں۔''

مائیک نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں..... اب وہ قدرے مطمئن نظر آرہا تھا۔

زینڈی نے دو انگلیوں سے فتح کا نشان بنایا اور بولی۔ ''یہ طریقہ ضرور کارآمد ہوگا۔''

''کیا کارآمد ہوگا؟'' ماں نے پوچھا جو مائیک کے بستر کی پائینتی ہاتھ میں بہت سے کاغذات لیے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے سفید یونیفارم پہن رکھا تھا۔ وہ اختتام ہفتہ گڈون ڈائنر میں ویٹرس کے طور پر کام کرتی تھی۔

زینڈی گھونٹ نگل کر رہ گئی۔

''یہ میرے بستر کو تھوڑا سا اوپر اٹھانا چاہتی ہے۔'' مائیک نے کہا اور زینڈی نے اس برمحل جھوٹ پر آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

''تمہیں ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں لڑکی۔ تمہارے بھائی کو آئندہ اڑتالیس گھنٹوں تک سیدھا لیٹنے کی ضرورت ہے۔'' ماں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ملاقات کا وقت نو بجے تک ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ مجھے آج کی غیر حاضری کا ازالہ کرنے کے لیے ڈائنر میں صبح کا ناشتا اور لنچ سرو کرنا ہوگا۔ گو کہ اس میں ٹپ زیادہ نہیں ملتی لیکن ایک دن کی تنخواہ کٹنے سے تو بہتر ہے۔'' اس نے اپنے ہاتھ کو مٹھی کی طرح بھینچ لیا جس میں اس نے اسپتال کے بل پکڑ رکھے تھے۔

پھر اس نے اپنی مٹھی ڈھیلی کی اور مائیک کی طرف ہوائی بوسہ اچھالتے ہوئے کہا۔ ''اب تم آرام کرو... ہنی۔ میں کل آؤں گی۔''

اس نے زینڈی کے کندھے کے گرد بازو ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''جب تک ہم گھر پہنچیں گے تو تمہارا سونے کا وقت ہوجائے گا۔''

گھر جانے سے پہلے وہ دونوں فرنٹ اسٹریٹ پر واقع ڈائنر پر گئیں جہاں سے زینڈی کی ممانے اپنی تنخواہ وصول کرنے کے علاوہ رات کی ڈیوٹی پر موجود ویٹرسز سے ہمدردی بھی وصول کی۔ ڈائنر کے مالک مسٹر بریڈ کی طرف سے مفت میں ملے ہوئے باسی سموسے کھائے پھر بھی زینڈی کو ان کا ذائقہ اچھا لگا تھا۔ جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگیں تو مسٹر بریڈ نے شیشے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''صبح پانچ بجے تک آجانا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ مجھے ساڑھے چار بجے گھر سے نکلنا ہوگا۔'' ماں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا پھر وہ زینڈی کا کندھا پکڑتے ہوئے بولی۔ ''تم مائیک کے کمرے میں سوسکتی ہو، جب تک وہ اسپتال میں ہے؟ اس طرح میری وجہ سے تمہاری نیند خراب نہیں ہوگی۔''

''جب تم رات کی شفٹ کروگی تو مجھے اپنے بستر سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔'' زینڈی نے دل میں سوچا۔ ''پورے ہفتے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ماں صبح پانچ بجے ٹرین پکڑنے کے لیے گھر سے نکلے گی تاکہ شہر میں اپنے دفتر... وقت پر پہنچ سکے۔ البتہ مسئلہ اس وقت ہوگا جب وہ اختتام ہفتہ ڈائنر میں ڈنر پر ڈیوٹی کرنے جائے گی۔ اس وقت زینڈی کو اس بارے میں سوچنا ہوگا۔ مائیک اس کا کوئی حل تلاش کرسکتا ہے۔ اس نے پہلے ہی ماں کو بتانے کے لیے ایک جھوٹ گھڑ لیا تھا کہ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوجاتا، ایک دوست اس کے اخبار لوگوں تک پہنچاتا رہے گا۔ جھوٹ بولنے میں تو اسے مہارت حاصل تھی۔

زینڈی کی آنکھ ساڑھے چار بجے کھل گئی۔ اس نے مائیک کے الارم کلاک میں یہ وقت سیٹ کردیا تھا۔ عین اسی وقت اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ اس کی ماں کام پر جانے کے لیے نکل چکی تھی۔ وہ چھلانگ مار کر بستر سے اتری اور تیار ہونے لگی۔ اسے پیپر بوائے کا کردار ادا کرنے کے لیے روپ بھرنے کی بے چینی ہورہی تھی۔

اس نے مائیک کی ایک ڈانگری پہنی اور سامنے کی زپ بند کردی۔ وہ اس کے جسم پر بالکل فٹ تھی۔ ویسے بھی اسے اس طرح کی جینز اچھی نہیں لگتی تھیں جو کمر اور کولہوں پر سے تنگ ہوں۔ پھر اس نے مائیک کی پسندیدہ نیلی اور سفید دھاریوں والی ٹی شرٹ پہنی اور اپنے بالوں کو اس کی نیوی بلیو بیس بال کیپ میں چھپا لیا جس پر سامنے کی جانب سفید رنگ کا لوگو بنا ہوا تھا پھر اس نے اپنے چھوٹے سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپارٹمنٹ کے دونوں کمروں کے درمیان ہال دے میں لگے ہوئے قد آدم آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور اسے یقین ہوگیا کہ مما کے علاوہ اسے کوئی اور نہیں پہچان سکتا بلکہ شاید وہ بھی نہیں۔ وہ مسکرائی اور اس نے مائیک کے کارڈز اور نقشہ پکڑنے سے پہلے اپنا انگوٹھا فضا میں لہرایا۔ مما نے اس کے لیے ریفریجریٹر کے دروازے پر ایک رقعہ چسپاں کر دیا تھا۔

''گھر میں انڈے اور دودھ نہیں ہیں اور تم اورنج جوس کو پگھلانا بھول گئیں۔ میں نے اس کا ڈبا سنک میں رکھ دیا ہے۔ بیڈ روم کی الماری میں سے ایک ڈالر لے کر اپنے ناشتے کے لیے جو چاہو لے آنا۔ میں تم سے سہ پہر میں ملوں گی۔ اس کے بعد مائیک کو دیکھنے جاؤں گی۔''

زینڈی نے وہ کاغذ مسل کر کچرے میں پھینک دیا۔ پیپر بوائے کا یہ کام نہیں کہ وہ ناشتا بنائے۔ البتہ اس نے اپارٹمنٹ سے نکلنے سے پہلے مما کی دراز میں سے ایک ڈالر ضرور نکال لیا تھا۔ اب اس کا رخ عمارت کے تہ خانے کی طرف تھا جہاں مائیک اپنی سائیکل کھڑی کرتا تھا۔ وہ نیچی چھت والا تہ خانہ تاریک اور مرطوب تھا اور اس میں ایک ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں ستون کے ساتھ ایک پرانی سائیکل بھی بندھی ہوئی تھی۔ جب مائیک نے نئی بائیسکل خریدی تو وہ زینڈی کو مل گئی تھی۔ مائیک کی نئی سائیکل اندھیرے میں بھی چمک رہی تھی۔ وہ اسے سیڑھیوں پر سے اوپر پارکنگ لاٹ میں لے آئی جہاں شفق کی روشنی نے اس کا استقبال کیا۔

اس نے کارڈز ہینڈل میں لٹکائے اور بے ڈھنگے پن سے سائیکل پر سوار ہونے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ اس سے پہلے اس نے کبھی لڑکوں والی سائیکل نہیں چلائی تھی۔ اس نے کچھ دیر پارکنگ لاٹ میں ہی بائیسکل چلانے کی مشق کی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ آرام سے چلا سکتی ہے تو ایلم اینڈ جیکب کے کارنر کے لیے روانہ ہوگئی۔ اسے توقع تھی کہ وہ سب سے پہلے پہنچ جائے گی لیکن اس کے ساتھ ہی تین دوسرے لڑکے بھی اپنی سائیکلوں سے اترے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں سگریٹ دبا ہوا تھا لیکن جیسے ہی ایک پولیس کار وہاں سے گزری اس نے فوراً ہی اسے بجھا دیا۔

زینڈی کو سائیکل سے اترنے اور اپنا پاؤں زمین پر ٹکانے میں بھی مشکل پیش آئی لیکن اس نے سائیکل کو زمین پر گرنے سے بچاتے ہوئے یہ مرحلہ بھی سر کر لیا۔ اگر سائیکل پر ذرا سی بھی خراش آجاتی تو مائیک اسے جان سے مار دیتا۔

سگریٹ پینے والے لڑکے نے اس پر کوئی جملہ کسا۔

پرانی کہانیاں نئے انداز میں

1۔ پیاسا کوّا اڑ رہا تھا۔ اچانک اسے نیچے پانی اور کنکر نظر آئے۔ جیسے ہی وہ پانی میں کنکر لانے کے لیے نیچے اترا تو نامعلوم افراد کی فائرنگ سے ہلاک ہوگیا۔

2۔ کتے نے قصائی کی دکان سے گوشت کا ٹکڑا چرایا۔ وہ پانی میں عکس دیکھ رہا تھا کہ سیلابی ریلا اسے بہالے گیا۔

3۔ کچھوے اور خرگوش نے ریس شروع کی۔ خرگوش کے سوتے ہی کچھوا اس کا موبائل اور قیمتی سامان لے کر فرار۔ پولیس ڈھونڈنے میں ناکام۔

4۔ الٰہ دین نے چراغ رگڑا تو وہ زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ الٰہ دین سمیت چار افراد ہلاک، متعدد زخمی۔

خوشی

ایک آدمی نے پھول سے پوچھا، جب تمہیں توڑا گیا تو تمہیں دکھ نہیں ہوا؟

پھول نے خوشبو جیسا جواب دیا۔ جب میں نے توڑنے والے کی خوشی دیکھی تو اپنا درد بھول گیا۔

شوہر

ایک محفل میں ایک خاتون نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''بہنو.....! میں نے برتن صاف کرنے کے لیے بہت سی چیزیں استعمال کیں لیکن یقین کرو شوہر سے بہتر کسی کو نہ پایا۔''

(مرسلہ: محمد جاوید خان، تحصیل علی پور)

لوہار اور خرگوش

ایک خرگوش روزانہ لوہار کی دکان پر جاتا اور کہتا گاجریں ہیں۔ لوہار جواب دیتا، نہیں یہ سبزی کی دکان نہیں ہے۔

ایک دن لوہار کو بہت غصہ آیا۔ اس نے ہتھوڑا مار کر خرگوش کے دانت توڑ دیے اور کہنے لگا اب گاجریں کھا کر دکھاؤ۔ خرگوش چلا گیا۔ لوہار نے سوچا چلو جان چھوٹی، روزانہ آ کر تنگ کرتا تھا۔

دو دن بعد خرگوش پھر آ گیا اور کہنے لگا۔ ''گاجر کا جوس ہے؟''

مرسلہ: جاوید اختر رانا، پاک پتن شریف

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاید وہ مائیک کا بے تکلف دوست تھا۔ زینڈی اسے کوئی سخت جواب دینے ہی والی تھی کہ عین اسی وقت وہاں ایک اسٹیشن ویگن آ کر رکی جسے مسٹر کونسی چلا رہے تھے۔ انہوں نے کھڑکی سے باہر سر نکالا اور پچھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

''اپنے اپنے بنڈل نکال لو لڑکو! میں وقت سے پہلے آ گیا ہوں کیونکہ لگتا ہے کہ بارش ہونے والی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو گیلے اخبارات دیے جائیں۔ ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے۔''

سب لڑکوں نے ویگن کے عقبی حصے سے ربر میں لپٹے ہوئے اخبارات کے بنڈل نکالے جن پر ان کا روٹ نمبر لکھا ہوا تھا اور فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایک ایک اخبار کو تہ کرنے لگے پھر انہیں کینوس کے تھیلوں میں رکھ کر اپنے گلے میں لٹکا لیا۔ زائد اخبار اس نے کیریئر کے ساتھ لٹکی ہوئی ٹوکری میں رکھ لیے اور گڈون لان کی طرف روانہ ہوگئی۔ دوسرے لڑکے اس کی پھرتی دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

اس علاقے کی خوب صورتی دیکھ کر زینڈی حیران ہوگئی۔ کشادہ سڑکیں، سرسبز لان اور گھنے درخت..... وہ سوچنے لگی کہ کیا وہ بھی اپنے دو بیڈ روم کے اپارٹمنٹ سے نکل کر اس علاقے میں آ سکیں گے۔ ڈیڈی کے انتقال کے بعد وہ مما کے کمرے میں ان کے ساتھ سو رہی تھی لیکن اب وہ بڑی ہوگئی تھی اور اسے ایک الگ کمرا چاہیے تھا۔ حادثے کے بعد فی الحال تو وہ مائیک کے کمرے میں سو رہی تھی لیکن جب وہ اسپتال سے واپس آئے گا تو اسے وہ کمرا خالی کرنا ہوگا۔

اس نے مائیک کا دیا ہوا نقشہ دیکھا اور گلیوں میں لگے ہوئے سائن بورڈز غور سے دیکھنے لگی۔ وہاں سارے مکان تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ البتہ کہیں کہیں اضافی گیراج یا گلابی دروازوں سے ان کی الگ شناخت ظاہر ہو رہی تھی۔ تاہم مکانوں پر لگے نمبر اور سڑکوں کے سائن بورڈ کی وجہ سے راستہ بھولنے کا امکان کم تھا۔ پہلے گھر میں اخبار ڈالتے ہوئے اس نے مکین کے نام پر توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے گاہکوں میں سے کسی کو نہیں جانتی تھی۔ اس نے پتے کی مدد سے مکان تلاش کیا۔ ڈرائیوے میں ایک سبز رنگ کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا پہلا اخبار پھینکا جو سیدھا داخلی دروازے کے پاس جا کر گرا۔

گڈون لانز کے گھروں میں اخبار ڈالتے وقت اسے صرف تین مرتبہ سائیکل سے اتر کر جانا پڑا جبکہ بیس گھروں میں اس نے چلتی ہوئی سائیکل سے ہی اخبار پھینک دیا۔ مائیک کی ہدایت تھی کہ اگر اخبار مقررہ جگہ سے کچھ فاصلے پر یا جھاڑی میں گرے، تب بھی اسے سائیکل سے اترنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے مزید کہا تھا۔

''اگر تمہیں سات بجے سے پہلے کام ختم کرنا ہے تو تم اس طرح وقت ضائع نہیں کر سکتیں۔'' اگر اخبار مکان کی چھت پر یا باغ کے فوارے کے نیچے گرے تو شاید وہ شکایت کریں۔ تاہم یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ سات بجے کے بعد بھی انتظار کرتے رہیں۔''

وہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جن لوگوں نے احمقانہ قوانین بنائے تھے، وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح اخبار تقسیم کر سکتی ہیں بلکہ شاید ان سے بھی بہتر۔ گڈون لانز میں کام کرنا اس کے لیے آسان تھا۔ اس کے باوجود کہ مائیک کے ستر سے اسی فیصد گاہک اسی علاقے میں رہتے تھے۔ تمام مکانات قریب قریب تھے اور زمین کی سطح بھی ہموار تھی جبکہ روٹ کا بقیہ حصہ اندرون شہر سے شروع ہو کر چڑھائی پر رج روڈ کی طرف جاتا تھا جہاں بلندی پر کھڑے ہو کر دور سے نیویارک سٹی کی عمارتیں نظر آتی تھیں۔ اگر مطلع صاف ہو تو جارج واشنگٹن برج اور دس میل کے فاصلے پر ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ کو بھی دیکھا جا سکتا تھا۔

مائیک نے اسے بتایا تھا کہ وہ تھکاوٹ سے بچنے کے لیے پہلے بلندی پر جائے اور وہاں سے فارغ ہو کر اندرونِ شہر آئے جہاں اسے آخری اخبار کیتھولک چرچ کے پادری کے مکان میں پھینکنا تھا، اس نے واقعی ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ سڑک کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اتنا تھک گئی کہ اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں۔

سات بجنے میں دو منٹ باقی تھے جب وہ کیتھولک چرچ کے پارکنگ لاٹ میں پہنچی۔ پہلی دعا ختم ہو چکی تھی اور دوسری شروع ہونے والی تھی۔ عورتوں نے سفید دستانے اور جھالر لگے ہیٹ جبکہ مرد جولائی کے مہینے میں بھی سوٹ اور ٹائی میں ملبوس تھے۔ زینڈی خود بھی پسینے میں نہا چکی تھی۔ اس کا خاندان کیتھولک نہیں تھا بلکہ وہ سب مذہب سے دور تھے۔ ڈیڈی کے مرنے کے بعد مما نے چرچ جانا چھوڑ دیا تھا۔ زینڈی کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس طرح وہ اتوار کا دن اپنی مرضی کے مطابق گزار سکتی تھی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ مکان کا دروازہ کدھر ہے بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ گرجا کے ساتھ ایسا کوئی مکان بھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوتا ہے۔ وہ اس بارے میں مائیک سے پوچھنا بھول گئی تھی۔ وہ ہجوم کے چھٹنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس نے اپنی ہی عمر کے ایک لڑکے سے دروازے کے بارے میں پوچھا۔ اس نے عجیب نظروں سے زینڈی کو دیکھا پھر پتھروں سے بنی ہوئی عمارت کے سیاہ دروازے کی طرف اشارہ کردیا۔

''لیکن مون سیگنور مائیکل تو اس وقت دعا میں مصروف ہے۔'' لڑکے نے کہا اور دوڑ کر ان لڑکوں کے غول میں شامل ہوگیا جو چرچ سے باہر آرہے تھے۔ زینڈی کو اس سے غرض نہیں تھی کہ مائیکل کیا کررہا ہے۔ اسے تو بس وہاں اخبار پھینک کر گھر جانا تھا جہاں وہ شاور لیتی اور..... اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈالر کا مڑا تڑا نوٹ ٹٹولا جس سے اسے دودھ اور انڈے خریدنا تھے تاکہ ناشتا کرسکے۔ اس نے دور سے ہی اخبار پھینکا جو سیدھا پیتل کے ہینڈل پر جاکر لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ سائیکل پر سوار ہوتی، دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک جوان شخص باہر آیا۔ اس نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر بھی سیاہ شیشوں والا چشمہ لگا ہوا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔

''تم یہاں کیا کررہے ہولڑکے؟''

زینڈی نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر اسے احساس ہوا کہ ناراض شخص اسی سے مخاطب ہے۔ اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کون..... میں؟''

''تمہارے علاوہ یہاں مجھے کوئی اور نظر نہیں آرہا جس کے گلے میں اخبار کا تھیلا لٹکا ہوا ہو۔ کیا تم وہ نہیں ہو؟''

''نہیں، جناب۔'' زینڈی کے منہ سے گھبراہٹ میں نکل گیا۔

''پھر تم کون ہولڑکے؟ میرے قریب آؤ۔''

زینڈی اپنی جگہ کھڑی رہی اور تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ ''مائیک۔''

''پورا نام بتاؤ۔''

وہ جھوٹ بولنا چاہ رہی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اس کی زبان سے نکل گیا۔ ''مائیک جینز۔''

اس شخص نے اپنا سر ہلایا اور چشمہ ناک کے سرے پر رکھ لیا۔ زینڈی کو یقین ہوگیا کہ وہ اسے جھوٹا سمجھ رہا ہے یعنی وہ مائیک نہیں ہے۔

''مائیک جینز۔'' اس نے اپنا سر سیدھا کیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم نے کیا سوچ کر مون سیگنور مائیکل کا اخبار اس طرح دروازے سے پھینکا۔ آئندہ تم بائیسکل سے اتر کر یہ تین سیڑھیاں چڑھو گے اور دروازے کی جھری میں ڈال دو گے۔ کیا میری بات سمجھ میں آگئی؟''

زینڈی نے احتیاط سے سر ہلایا کہ کہیں اس کی ٹوپی نہ اتر جائے اور بولی۔ ''جی جناب۔''

''میں فادر اولیری تم سے مخاطب ہوں۔'' اس نے چشمہ دوبارہ اپنی جگہ پر جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ تم کیتھولک نہیں ہو۔ اس لیے چرچ کی بے ادبی کرسکو گے۔''

زینڈی نے دوبارہ سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں جناب..... میرا مطلب ہے فادر اولیری۔''

اسے یقین تھا کہ وہ اس کا راز جان گیا ہے لیکن اس نے اپنا ہاتھ ہلاتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''اب تم جاؤ اور میری بات یاد رکھنا۔''

زینڈی بہت خوش تھی اور بڑی تیزی سے سائیکل چلاتی ہوئی گھر کی طرف مڑگئی۔ فادر اولیری تو کیا کوئی بھی اسے نہیں پہچان سکا۔ اس کا یہ بہروپ کامیاب رہا لیکن مائیک کے گھر آنے کے بعد یہ مسئلہ پھر کھڑا ہوگیا کیونکہ اسے دوبارہ مما کے کمرے میں سونا تھا۔

''تمہیں ہفتے کی صبح سے پہلے اس بارے میں سوچنا ہوگا۔'' زینڈی نے مائیک کے بستر پر کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہا۔ مائیک کی ٹانگ پر اب بھی پلاستر چڑھا ہوا تھا اور اسے ایک ماہ مزید بستر میں رہنا تھا۔ اس طرح کہ پاؤں کے نیچے تکیے رکھ کر اس کی ٹانگ اوپر اٹھی رہے۔ ''وہ مجھ سے ضرور پوچھیں گی کہ سورج نکلنے سے پہلے کہاں جارہی ہوں۔''

مائیک نے ایک چمچے کے ذریعے تلے ہوئے آلو منہ میں رکھے اور انہیں چبانے لگا پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولا۔ ''تم لیونگ روم میں کاؤچ پر سوجانا۔''

''وہ پوچھیں گی نہیں کہ میں لیونگ روم میں کیوں سورہی ہوں؟''

''نہیں۔ آج بدھ ہے۔ اگلی دو راتوں میں مجھے باتھ روم جانے، پانی پینے اور دوسرے بہت سے کاموں کے لیے کسی کی ضرورت ہوگی۔ مما کو اپنی نیند پوری کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے وہ تم سے ہی کہیں گی کہ کاؤچ پر سوجاؤ۔ تم دیکھ لینا۔''

مائیک نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دو راتوں کی جاگی ہوئی ماں کی خواہش تھی کہ زینڈی کاؤچ پر سوجائے اور مائیک کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خیال رکھے۔ انہوں نے مائیک کے کمرے میں پورٹیبل ٹی وی رکھ دیا اور اس پر لیٹ شو اور ملین ڈالر موو دیکھتے رہے۔ زینڈی جاگتی رہی جب تک کہ مائیک کے اخبارات تقسیم کرنے کا وقت نہیں ہوگیا۔ تب تک ماں شہر جانے والی ٹرین پکڑنے کے لیے نکل چکی تھی یا پھر وہ ڈائنر میں رات کی ڈیوٹی کرنے کے بعد گہری نیند سو رہی ہوتی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ زینڈی گھر سے جا چکی ہے۔ نہ ہی اس نے کبھی یہ پوچھا کہ وہ دن میں کیوں سوتی رہتی ہے۔ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں۔ اس لیے ماں کو زینڈی کے سونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ البتہ اسکول کھلنے کے بعد صورتِ حال بدل سکتی تھی لیکن تب تک مائیک اپنے پیروں پر کھڑا ہو چکا ہوگا۔

وہ دن قریب آ رہا تھا جب سہ پہر میں مائیک کو اپنے گاہکوں سے ماہانہ بل وصول کرنے کے لیے جانا تھا۔ زینڈی اس کی پریشانی سمجھ سکتی تھی کیونکہ وہ ابھی گھر سے باہر نکلنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ اس کے کمرے میں راکنگ چیئر پر بیٹھی اس سے بات کرنے کی منتظر تھی۔ وہ اس وقت..... سموسہ کھا رہا تھا جو مما اس کے لیے ڈائنر سے لائی تھی۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو زینڈی نے ہمت کر کے کہا۔

''جس طرح میں اخبار ڈال رہی ہوں اسی طرح لوگوں سے پیسے بھی وصول کرلوں گی۔ کسی کو ابھی تک شبہ نہیں ہوا کہ تمہاری جگہ میں یہ کام کر رہی ہوں۔''

''اگر کسی نے تم سے پیسے چھین لیے تو؟'' مائیک نے خدشہ ظاہر کیا۔

''کیا دن کی روشنی میں یہ ممکن ہے کہ گڈون لانزیا کیتھولک چرچ کے آس پاس کوئی مجھے لوٹ سکے؟'' یہ کہہ کر زینڈی نے ہنسنا شروع کر دیا لیکن فوراً ہی رک گئی۔ اس نے دیکھا کہ مائیک کا چہرہ اس کے پلاستر کی طرح سفید ہو گیا تھا۔

''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔

مائیک نے گھونٹ نگلتے ہوئے کہا۔ ''تم پیسے لینے پادری کے گھر نہیں جاؤ گی۔ میں خود اگلے مہینے وصول کرلوں گا۔''

''مگر کیوں.....؟'' زینڈی نے برا سا منہ بناتے ہوئے پوچھا۔

''بس میں نے کہہ دیا۔ تمہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔

زینڈی نے کرسی پر جھولنا بند کر دیا اور جواب میں وہ بھی اسے گھورنے لگی۔ مائیک نے اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ تم سب لوگوں سے پیسے وصول کر سکتی ہو لیکن پادری سے نہیں، یہ بات طے ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور دل میں سوچنے لگی کہ مائیک اسے پادری کے گھر جانے سے کیوں منع کر رہا ہے۔ بہرحال وہ صرف ضرورت پڑنے پر ہی جائے گی اور ایک دفعہ پادری سے پیسے مل جاتے تو مائیک بھی خوش ہو جائے گا کیونکہ اس نے کارڈ دیکھا تھا۔ پادری پر چار مہینے کے بقایا جات تھے۔ اگر وہ مل گئے تو مائیک کے لیے سائیکل کی اگلی قسط دینا آسان ہو جاتی۔

جولائی کی آخری تاریخ جمعے کو پڑی، مما اپنے دفتر گئی ہوئی تھی اور وہاں سے وہ سیدھی نائٹ شفٹ کرنے ڈائنر چلی جاتی۔ زینڈی کے پاس وصولیابی کے لیے پورا دن تھا۔ یہ اتنا آسان نہیں تھا جیسا کہ وہ سمجھ رہی تھی۔ آدھے لوگ گھروں پر نہیں تھے۔ بہت سی عورتوں نے کہا کہ ان کے پاس نقد رقم نہیں ہے اور ان کے شوہر گھر آنے کے بعد چیک دیں گے۔ شام تک وہ صرف اتنے پیسے وصول... کر سکی تھی کہ ان میں سے مسٹر کونسی کو اخبارات کی ہول سیل قیمت ادا کرنے کے بعد بہت معمولی رقم بچتی۔ اگر وہ پادری کے گھر نہ گئی تو مائیک کی سائیکل کی قسط ادا نہیں ہو سکے گی۔ لہٰذا اسے کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ پیسے مل گئے تو مائیک خوش

شہرت

☆ شہرت کی تمنا وہ لباس ہے جسے عام لوگ بھی سب سے آخر میں اتارتے ہیں۔ (کہاوت)

☆ شہرت بہادری کے کارناموں کی مہک ہے۔ (سقراط)

☆ یہ شہرت ہی کی سزا ہے کہ آدمی کو ہمیشہ ترقی پذیر رہنا پڑتا ہے (چیپین)

☆ مبارک ہیں وہ لوگ جن کی شہرت ان کی صداقت سے زیادہ منور نہیں ہوتی۔ (ٹیگور)

☆ خون کی ندیاں بہانے کے بجائے ایک آنسو پونچھنے کی شہرت زیادہ ممتاز ہے۔ (بائرن)

☆ آبائی شہرت کی ولایت مصیبت سے کم نہیں۔ (ٹیگور)

☆ شہرت کی غیر فانی فہرست میں ایسے نام بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے شہرت شرمندہ و نادم ہے۔ (ہزلٹ)

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوجائے گا اور نہ ملے تو مائیک کبھی نہیں جان پائے گا کہ وہ پادری کے گھر گئی تھی۔

فادر اولیری نے ایک جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھولا اور زینڈی کو پکڑ لیا جو دوسری دستک دیتے ہوئے اپنا توازن کھو رہی تھی۔ اس کا چہرہ پادری کے سینے سے ٹکرایا۔ اسے ایک ناگوار بو محسوس ہوئی جیسے دھلے ہوئے کپڑوں کو دیر تک گیلا چھوڑ دیا جائے۔

پادری نے زینڈی کو کندھوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا اور دروازے کی کنڈی لگانے کے بعد بولا۔

''میرے دوست! تم واپس آ ہی گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید اب کبھی نہ آؤ۔''

پادری کی آنکھیں اس کے لباس کی طرح سیاہ تھیں۔ زینڈی نے محسوس کیا کہ اس کی تیز چبھتی ہوئی نظریں اس کے جسم میں گڑتی جارہی ہیں۔

''میں ہمیشہ تمہارا اخبار جھری میں ڈالتا ہوں فادر۔ ہمیشہ.....'' وہ بہ مشکل تمام اتنا ہی کہہ سکی۔

پادری نے سر ہلایا اور اس سے پہلے کہ وہ اس کی نیت سمجھ سکتی اس کا ہاتھ زینڈی کی ٹوپی تک پہنچ گیا۔ اس نے اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن پادری تیزی دکھا چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے زینڈی کے سرخ بال اس کے کندھوں پر پھیل گئے۔

فادر کا قہقہہ گلے میں گھٹ کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اس کی چوٹی کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

زینڈی نے بے خوف ہو کر جواب دیا۔ ''میں وہ لڑکی ہوں جو اپنے بھائی کے واجبات تم سے وصول کرنے آئی ہے۔''

جب زینڈی گھر پہنچی تو مائیک ٹی وی کے سامنے بیٹھا زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے ٹی وی بند کیا اور پیسوں کا لفافہ اس کے سامنے ڈالتے ہوئے بولی۔ ''تم خود ہی سمجھ جاؤ۔ یہی بہتر ہوگا۔''

''تمہیں کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟'' مائیک نے پوچھا۔

''فادر اولیری۔'' زینڈی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ بہرحال اسے بتانا تو تھا کہ وہ اس سے بھی پیسے لے آئی ہے۔

مائیک کا چہرہ یک دم سفید ہوگیا جیسے کسی نے اس کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے تمہیں وہاں جانے سے منع کیا تھا۔''

''دوسرے لوگوں سے بہت کم وصولیابی ہوئی۔ اگر اس کے پاس نہ ہوتی تو تمہاری سائیکل کی قسط ادا نہیں ہوسکتی تھی۔'' یہ کہہ کر اس نے لفافہ الٹ دیا۔ کچھ چھوٹے نوٹ اور سکے مائیک کے بستر پر گر پڑے۔

''میں اس سے تمہارے سارے پیسے لے آئی ہوں۔ اس نے آئندہ اخبار ڈالنے سے منع کردیا ہے۔''

مائیک نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ''اگر تم نے کسی سے کچھ کہا تو وہ مما کے پیچھے لگ جائے گا۔''

''میں کیا بتاؤں گی؟'' زینڈی نے غصے سے کہا۔

''اسی بارے میں.....'' اس نے سر اٹھائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

''اس نے کہا تھا کہ کوئی بھی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ اگر میں نے اس کے خلاف کچھ کہا۔ وہ ٹھیک ہی کہتا ہے۔'' مائیک کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

زینڈی نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے تمہارے ساتھ کیا کیا تھا؟''

اس رات وہ دیر تک مائیک کا راز جاننے کی کوشش کرتی رہی اور جب اسے پوری بات کا علم ہوا تو وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی مما کے بیڈ روم میں گئی اور الماری سے ڈیڈی کی تلوار نکالی جس کی دھار انتہائی تیز تھی۔ یہ تلوار انہیں جنگ عظیم دوم میں ملی تھی جسے انہوں نے ایک ٹین کے ڈبے میں چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ جب زینڈی نے اسے میان سے نکالا تب بھی وہ پہلے کی طرح چمک رہی تھی۔

اس کھٹر پٹر سے مما کی آنکھ کھل گئی اور وہ زینڈی کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر بولی۔ ''اوہ میرے خدا! یہ تم کیا کررہی ہو؟''

مائیک بیساکھیوں کے سہارے کمرے میں آیا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''یہ پاگل ہوگئی ہے۔''

''دیکھو، یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' زینڈی نے کہا۔

''بہتر ہوگا کہ تم میں سے کوئی ایک مجھ سے بات کرے۔'' مما نے چادر ہٹائی اور بستر سے اترتے ہوئے بولی۔

جب مما کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا علم ہوا تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ پہلے تو وہ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہ تھی لیکن پھر اسے یقین کرنا پڑا کہ مائیک کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اس کے اندر خوف اتر آیا لیکن وہ بے اختیار تھی۔ زینڈی کے دل میں ایک سرد لہر ابھری لیکن اس کے یا مائیک کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ٹھیک ہے۔'' مما نے آستین سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک بات تو طے ہے کہ اب تم اخبار ڈالنے نہیں جاؤ گی۔''

''کیا؟'' زینڈی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

''تم مجھے کیوں منع کر رہی ہو؟ اس نے میرے ساتھ.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ وہ اپنے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کر سکتی تھی۔

''تمہیں اس کی اجازت نہیں ہے۔ یہ غیر قانونی ہے۔'' مما کھڑی ہوگئی اور اس نے زور سے زمین پر اپنا پاؤں مارا جو اس بات کا اشارہ تھا کہ اس نے اپنا ذہن بنالیا ہے اور اس سے پیچھے نہیں ہٹے گی۔ ''تم اب نہیں جاؤ گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

مما کی موجودگی میں مائیک نے کچن کی دیوار میں لگے ہوئے فون سے مسٹر کونسی کو فون کر کے کہا۔

''میرا پلاستر دو ہفتے میں اتر جائے گا۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ جو مما نے سنا نہیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تاکہ مائیک اپنی سائیکل کی قسط دے سکے۔ ''کیا تم اس وقت تک میرے متبادل سے کام چلا لو گے؟''

زینڈی دوسری جانب سے مسٹر کونسی کا جواب نہ سن سکی لیکن جب مائیک نے جواب میں کہا۔ ''میری بہن.....'' تو وہ سمجھ گئی کہ مسٹر کونسی نے کیا کہا ہوگا۔

اس طرح مائیک کی بھی چھٹی ہوگئی۔ زینڈی دوسری جانب سے بولے جانے والے الفاظ تو نہ سن سکی لیکن آواز اور لہجے نے اسے سب بتا دیا۔ مائیک کا جرم یہ تھا کہ اس نے زینڈی کو قانون توڑنے کی اجازت دی تھی جس کی پاداش میں اسے بھی کام سے ہاتھ دھونا پڑ گئے۔

دوسری صبح زینڈی نے ایلم اور جیکب کے نکڑ پر جا کر ہول سیل کی رقم اور مائیک کے کارڈز مسٹر کونسی کے حوالے کر دیے اور بولی ''ان پیسوں کا کیا ہوگا جو ابھی اس کے گاہکوں پر باقی ہیں؟''

مسٹر کونسی کی آنکھوں میں غصے کی جگہ اداسی نے لے لی اور وہ بولے۔ ''اگر دوسرا لڑکا وصولیابی کرنے میں کامیاب ہوگیا تو مائیک کو اس کا حصہ مل جائے گا۔ اس کی فکر نہ کرو اور تم.....'' وہ زینڈی کے چہرے کے سامنے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں نے کبھی سنا کہ تم نے ایک اور قانون توڑا ہے تو میں خود تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''اور میں تمہیں بند کروا دوں گی۔'' اس نے جواب میں چلاتے ہوئے کہا۔

زینڈی غم و غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اپنے باپ کی تلوار سے پادری کی گردن اڑا دیتی۔ اگر اسے کیتھولک چرچ کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات ہوتیں تو وہ کبھی اس نظام کا مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرتی لیکن وہ کچھ نہیں جانتی تھی اس لیے بغیر سوچے سمجھے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ ننگے سر چرچ میں گئی اور دیوار کے ساتھ بنے ہوئے چھوٹے باکس کے برابر میں ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی جہاں پادری اعترافات سنا کرتے تھے۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ اگر تم نے کچھ نہیں کیا تب بھی کسی چھوٹے گناہ کا اعتراف کر لو تاکہ پادری تمہیں معاف کر دے اور تم اتوار کے اجتماعات میں شرکت کر سکو۔ اگر پادری ایک سے زیادہ ہوں تو تم اپنے لیے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتی ہو۔

زینڈی نے چرچ کے پرانے پادری مون سیگنور مائیکل کے اپنی نشست تک پہنچنے کا انتظار کیا۔ وہ خود باکس کے دوسری جانب بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان ایک اسکرین حائل تھی۔ اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ ایک اچھا کیتھولک کس طرح اس شخص کے سامنے اعتراف کرتا ہوگا جو باکس کے سائے میں بیٹھا ہو۔ وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ تبھی پادری نے اس سے پوچھا۔ ''میری بچی! تم کسی گناہ کا اعتراف کرنا چاہتی ہو؟''

''نہیں..... لیکن فادر اولیری کو اعتراف کرنا ہے۔ اس نے میرے بھائی کے ساتھ زیادتی کی اور اگر تم نے اس بارے میں کچھ نہ کیا تو میں اپنے باپ کی تلوار سے اسے قتل کر دوں گی۔''

یہ کہتے ہی وہ باکس سے باہر آئی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چرچ سے چلی گئی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار خدا سے دعا کی کہ پادری کو اس کے کیے کی سزا ملے۔

اس کی دعا قبول ہوگئی کیونکہ اسی رات فادر اولیری قصبے سے غائب ہوگیا۔ جب زینڈی نے اس کے بارے میں لوگوں سے دریافت کیا تو کسی نے اسے بتایا کہ وہ چرچ چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ جبکہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی جس کے نتیجے میں اسے پادری کے منصب سے ہٹا دیا گیا لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کی خطا کیا ہے۔ اس حقیقت سے صرف زینڈی اور مائیک ہی واقف تھے۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شیش محل

آخری قسط

اسماء قادری

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِّ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہولہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com
Downloaded From
paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جولیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور کلاس فیلو عارف بھی اس کا کولیگ ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں ان کی ایک ساتھی شنا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جولیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے کھل کر اظہار نہیں کرتی اور ایک جاگیردار و سیاست داں دلدار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ دلدار آغا کانگریس سے تعلق رکھتا ہے۔ جولیٹ اپنے اخبار کی طرف سے دلدار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ دلدار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہوتا۔ اس کے انٹرویو کے بعد جولیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جولیٹ کو اغوا کرلیا جاتا ہے۔ حالتِ بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جولیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شنا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کروا دیتی ہے۔ لٹی پٹی جولیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جوزفین حرکتِ قلب بند ہونے سے مرگئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جولیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ دار لڑکی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جولیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بدمعاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق ربن دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جولیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جولیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک غنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک ساتھی سے ایک مہلک چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چاقو کی مدد سے وہ دلدار آغا کو قتل کرنے کے لیے ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت مزید خراب ہو جاتی ہے اور مرنے سے قبل وہ جولیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جوزفین نے اس کے لیے ایک صندوقچی میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جولیٹ صندوقچی کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وہائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جوزفین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔ جوزفین کی ڈائری پڑھنے کے بعد اسے علم ہوتا ہے کہ اس کی ماں ماضی میں ایک نواب خاندان کی گورنس کے طور پر ملازمت کرتی تھی۔ دورانِ ملازمت جوزفین اور نواب زادہ اسد اللہ کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔ ادھر فاروق سر میں چوٹ لگنے کے باعث اسپتال میں ایڈمٹ ہو جاتا ہے۔ وہاں ایک نرس کے ساتھ بدسلوکی کرنے پر فاروق ایک شخص کی مرمت کرتا ہے اور وہیں ان کی ملاقات سیٹھ بھابیہ سے ہو جاتی ہے۔ سیٹھ ربن دادا کی خدمات حاصل کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق فاروق کو آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے شملہ بھیج دیا جاتا ہے اور وہ وہاں سیٹھ بھابیہ کی رہائش گاہ پر بطور مہمان قیام کرتے ہیں۔ وہیں اس کی ملاقات بھابیہ کی بیٹی بملا سے ہوتی ہے جو بیوہ تھی۔ بملا اور فاروق میں دوستانہ تعلقات قائم ہو جاتے ہیں۔ طوائف زادی چاند بانو فاروق سے محبت کرتی ہے۔ بملا چاند بانو سے رقابت کے جذبات محسوس کرتی ہے۔ بملا ایک غنڈے کے ذریعے چاند بانو کا ایکسیڈنٹ کرا دیتی ہے جس میں زمرد بائی جان سے جاتی ہے۔ ادھر ربن فاروق کا حساب چکتا کرنے کے لیے ولیم کو شدید تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ خفیہ اطلاع پر پولیس ربن کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ فاروق بمبئی لوٹ آتا ہے۔ ربن اور فاروق ولیم والے معاملے کو نمٹانے کے لیے وکیل اشوک بچن کی خدمات لیتے ہیں۔ ادھر جولیٹ اپنی ماں کی ڈائری پڑھ لیتی ہے اور وہ اپنے دل میں انتقام کی آگ لیے خاموشی سے حیدرآباد جانے کے لیے نکل کھڑی ہوتی ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ نواب سلیم اللہ کی حویلی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ فاروق جولیٹ کی غیر موجودگی سے پریشان ہو کر معلومات حاصل کرتا ہے۔ وہ چاند بانو کے ایکسیڈنٹ کی ذمے دار بملا کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرتا ہے تاہم اپنی اچھی خصلت کے باعث اسے چھوڑ دیتا ہے۔ فاروق کو کچھ لوگ اغوا کر لیتے ہیں۔ جولیٹ حویلی والوں پر انکشاف کرتی ہے کہ وہ جوزفین اور نواب اسد اللہ کی اولاد ہے۔ اسد اللہ اسے بیٹی قبول کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ فاروق کے اغوا میں بھابیہ سیٹھ کی بیٹی بملا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بملا فاروق کو خود کو اپنانے پر زور دیتی ہے۔ انکار پر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتی ہے۔ فاروق پر بملا کو قتل کرنے کا الزام لگ جاتا ہے۔ ربن فاروق کو روپوش کر دیتا ہے...... ربن دلدا کو ڈی ایس پی اور مجو کے گرگے گھیر کر شدید زخمی کر دیتے ہیں۔ فاروق، کیتھی سے ملنے جاتا ہے جہاں ربن کو بسترِ مرگ پر پڑا دیکھتا ہے۔ ربن دم توڑ دیتا ہے۔ نواب سلیم اللہ کی حویلی پر بلوائی حملہ کر دیتے ہیں جس میں حویلی کے تمام افراد مارے جاتے ہیں۔ صرف اسد اللہ، صفی اللہ اور آپا بیگم بچتے ہیں۔ ادھر جولیٹ پہلے ہی حویلی سے نکل چکی ہوتی ہے۔ جولیٹ جانی کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوتی ہے تو ہندو بلوائی ٹرین پر ہلا بول دیتے ہیں۔ جانی بھی اس حملے میں مارا جاتا ہے تاہم جولیٹ اتفاقی طور پر محفوظ رہتی ہے۔ نواب اسد اللہ بھی ہجرت کر کے لاہور آجاتے ہیں۔ ادھر فاروق ربن کے قاتلوں رمیش، بھابیہ، مجو اور فیکے کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ لاہور میں جولیٹ، اسد اللہ کو دیکھتی ہے۔ ادھر فاروق جس گھر میں چھپا ہوتا ہے وہاں پولیس دھاوا بول دیتی ہے جس میں گولو اپنی جان سے جاتا ہے۔ اسد اللہ کراچی جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہوتے ہیں۔ تو انہیں جولیٹ مل جاتی ہے۔ جولیٹ اسد اللہ کے ساتھ کراچی آجاتی ہے اور مہاجرین کے کیمپ میں ان کی خدمت میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہاں اسے چاند بانو ملتی ہے، وہ اسے گھر لے آتی ہے۔ وہیں اس کی ملاقات عارف سے بھی ہو جاتی ہے۔ عارف خودکشی کر لیتا ہے۔ ادھر فاروق راٹھور کا خاتمہ کر کے ربن کے آخری دشمن کو ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ جولیٹ اسلام قبول کر لیتی ہے۔ عارف کی بہن ماجدہ کے بارے میں معلومات کرنے پر کہ وہ کس کے پاس رہ رہی ہے جو نام پتا چلتا ہے اس سے جولیٹ کو شاید کبھی نجات نہیں ملنے والی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

شیش محل

پرانے طرز کی خوبصورت کوٹھی کے سامنے ٹیکسی رکی تو وہ کرایہ ادا کر کے نیچے اتر آیا۔ اس کے پاس بطور سامان بس ایک چھوٹا سا سفری بیگ ہی موجود تھا جسے اپنے شانے پر لٹکائے وہ کوٹھی کا جائزہ لے رہا تھا۔ مرکزی دروازے کے ساتھ ستون پر لگی نام کی تختی پر موجود نواب صفی اللہ اور نواب اسد اللہ کے نام بالکل صحیح مقام پر پہنچنے کی تصدیق کر رہے تھے۔ کوٹھی بے شک شاندار تھی لیکن اس پُرشکوہ حویلی سے کوئی تقابل نہیں تھا جسے نواب سلیم اللہ کا بچا کھچا خانوادہ اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس نے پل بھر کے توقف کے بعد گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا تو اس کی انگلیوں میں کپکپاہٹ تھی۔ وہ برسوں بعد اپنے خونی رشتوں کا سامنا کرنے والا تھا، سو اس کے دل کی کیفیت ہی عجیب تھی۔

''جی صاحب!'' گھنٹی کے جواب میں ایک ملازم دروازے پر نمودار ہوا اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''مجھے نواب اسد اللہ اور نواب صفی اللہ صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔'' خود کو سنبھال کر اس نے ملازم سے کہا۔

''معافی چاہتا ہوں صاحب! نواب اسد اللہ صاحب تو اس وقت کوٹھی پر تشریف نہیں رکھتے اور نواب صفی اللہ صاحب گوشہ نشین ہیں۔ وہ چند مخصوص احباب کے علاوہ کسی سے ملاقات کرنا پسند نہیں فرماتے۔'' حیدر آباد دکن چھوٹا تھا تو ان خاندانی ملازمین کا ساتھ بھی چھوٹ گیا تھا جو نسلوں سے حویلی میں خدمات انجام دے رہے تھے اور جن میں سے بیشتر نے حویلی پر ہونے والے بلوے میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں لیکن یہ ملازم بھی مہذب اور سمجھدار معلوم ہوتا تھا جو بہت ادب سے اس کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔

''آپ نواب صاحب کو میرا نام بتا دیں، شاید وہ مجھے شرفِ ملاقات عطا کرنا پسند فرمائیں۔''

''جی بالکل! آپ اپنا تعارف کروا دیجیے۔'' ملازم گو تذبذب کا شکار نظر آتا تھا لیکن اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کیا۔

''نوابزادہ محب اللہ۔'' اس نے ملازم کو فقط اپنا نام بتایا تھا لیکن وہ نام سن کر ہی چونک گیا۔ نام میں اس خاندان کے ناموں کی مماثلت تھی جن کی خدمت پر وہ مامور تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے کھڑے شخص کا جائزہ لیا۔ وہی روشن دمکتی ہوئی پیشانی اور ذہین آنکھیں تھیں جو اسے اپنے مالکوں کی شخصیت کا خاص جز لگا کرتی تھیں۔ اس بار اس نے نووارد کے وجود سے لپٹی ہلکی سی گرد اور ڈھیروں تھکن کو بھی محسوس کیا اور جان لیا کہ یہ شخص لمبی مسافت طے کر کے آیا ہے اور اسے یوں دروازے کے باہر کھڑے رکھنا کچھ مناسب عمل نہیں ہے، اس لیے ادب سے بولا۔

''آپ اندر آ کر مہمان خانے میں تشریف رکھیں جناب! میں نواب صاحب کو آپ کی آمد کی اطلاع دیتا ہوں۔''

ملازم نے پیچھے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لے کر کوٹھی کے خوبصورت سے ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا۔ ایک دبیز صوفے پر بیٹھ کر اس نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ آرائشی اشیا کی بھرمار نہیں تھی لیکن جو کچھ تھا اس سے سجانے والے کی اعلیٰ ذوقی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ اسے وہاں بیٹھے مشکل سے ایک منٹ گزرا ہوگا کہ ایک ملازم ٹھنڈے مشروب کا گلاس لیے وہاں چلا آیا۔ اس کے دل کی کیفیت بہت اتھل پتھل تھی اور حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے چنانچہ خود کو سنبھالا دینے کے لیے اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا اور دو تین سانسوں میں ہی سارا مشروب پی کر خالی گلاس میز پر رکھ دیا۔ اسی پل ڈرائنگ روم کا دروازہ زور دار آواز کے ساتھ کھلا اور کوئی بہت تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے بھی فوری طور پر اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اندر داخل ہونے والا شخص گو ماضی کے مقابلے میں بہت تبدیل ہو گیا تھا اور وقت سے زیادہ صدمات کے اثر نے اسے بوڑھا کر دیا تھا لیکن وہ کیسے شناخت نہ کرتا کہ یہ اس کے والد نواب صفی اللہ ہیں۔ ابا جان ..... پکار کر وہ تیزی سے ان کی طرف لپکا اور اگلے ہی پل وہ ایک دوسرے کے گلے لگے دھواں دھار آنسو بہا رہے تھے۔ ہچکیوں اور سسکیوں کے بیچ صفی اللہ کچھ بولنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ شاید وہ اس سے اس کی بے رخی پر شکوہ کناں تھے یا پھر خود پر گزری غم والم کی داستان سنانا چاہتے تھے۔ بے پناہ جذباتی کیفیت کے باعث ان کی کوئی بات واضح نہیں تھی لیکن وہ کیسے نہ سمجھتا کہ وہ کیا کہہ رہے تھے، اسے اپنا جرم بھی قبول تھا کہ اس نے انہیں اتنی طویل جدائی کا دکھ دے کر ان کے ساتھ زیادتی کی تھی اور وہ ان کا شریکِ غم بھی تھا کہ جو کچھ انہوں نے کھویا تھا، وہ صرف ان ہی کا نقصان نہیں تھا بلکہ خود اس کے دل و دماغ سے ان قبروں کی تصویریں نہیں نکلتی تھیں جنہیں اس نے حیدر آباد کے ایک قبرستان میں طویل قطار کی صورت میں دیکھا تھا۔ چنانچہ وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ روتا جا رہا تھا اور ان سے معافی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

طلب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے پیاروں کے لیے تڑپ رہا تھا۔

صفی اللہ کے پیچھے ڈرائنگ روم تک آنے والا ملازم اس صورتِ حال پر کچھ دیر تو انگشت بدنداں کھڑا رہا پھر دوڑ کر چاند بانو کو اطلاع دینے اندر زنان خانے کا رخ کیا۔ چاند بانو نے اس کی زبانی محب اللہ کی آمد کی اطلاع سنی تو خود بھی چونک گئی اور تیزی سے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ جولی اور اسد اللہ کی غیر موجودگی میں وہ اس صورتِ حال پر اپنے شانوں پر بھاری ذمے داری محسوس کر رہی تھی اور اسے خدشہ تھا کہ یہ اچانک خوشی نواب صفی اللہ کے لیے خطرناک ثابت نہ ہو۔ وہ ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے پر پہنچی تو اسے اپنا خدشہ حقیقت کا روپ دھارتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ آنے والا نواب صفی اللہ کو سہارا دے کر ایک صوفے پر لٹا رہا ہے۔ اس شخص کی اس کی طرف پشت تھی اس لیے وہ اس کی شکل نہیں دیکھ پائی تھی لیکن پھر بھی جانے کیوں اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی اور اس نے اپنے اطراف کوئی مانوس سی مہک محسوس کی۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو اس کیفیت سے نکالا اور قدرے تیز لہجے میں بولی۔

''نواب صاحب کو کیا ہوا ہے؟''

''کچھ نہیں بس ذرا جذباتی دباؤ کا شکار ہو گئے ہیں۔ ابھی سنبھل جائیں گے، ذرا پانی منگوا دیں۔'' اس نے مڑے بغیر جواب دیا اور اپنے ہاتھوں سے نواب صفی اللہ کے تلوے سہلانے لگا۔ چاند بانو جس کی دھڑکنوں نے پہلے ہی شور مچانا شروع کر دیا تھا، آواز سن کر ساکت رہ گئی۔ وہ جو روئیں روئیں میں بستا تھا، اس کی آواز کیونکر شناخت نہ کر پاتی۔ اس کے دل نے تو پہلے ہی مرحلے پر اس کی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ بس وہی دل کو جھٹلانے لگی تھی لیکن اب تو جھٹلائے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی لیکن مستعد ملازم نے پانی سے بھرا جگ اور گلاس فوراً پیش کر دیا۔

''تھوڑا سا پانی پی لیجیے ابا جان۔'' چاند بانو وہی نرم اور مہربان آواز سن رہی تھی جو اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ کر اسے نغمۂ محبت گنگنانے پر مجبور کرتی تھی۔ اب اسے اس شخص کا ذرا سا بایاں رخ بھی نظر آ رہا تھا۔

''تھوڑا سا پانی پی لیجیے ابا جان!'' وہ نواب صفی اللہ کو سہارا دے کر گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔ انہوں نے ایک گھونٹ پانی پیا اور سر پیچھے ہٹا کر یوں ہانپنے لگے جیسے بہت لمبی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ لمبی مسافت ہی تو تھی جس کے بعد انہوں نے اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کو پایا تھا۔

''کسی ڈاکٹر کو بلوالیں۔ انہیں ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔'' اس نے ایک پل کے لیے بھی صفی اللہ کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اس کے اطراف کچھ لوگ ہیں لیکن اس نے پلٹ کر ان میں سے کسی کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اسے یہی گمان ہوگا کہ اس کے اطراف گھریلو ملازم موجود ہیں اور وہ اس وقت اپنے باپ کے سوا کسی کی صورت دیکھنے کا خواہشمند نہیں تھا۔ درحقیقت اس کی نظریں ان کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں اور وہ اپنے دل میں حیران بھی تھا کہ آخر اتنے برس وہ ان کے دیدار کے بغیر کیسے جی لیا۔

چاند بانو نے اس کی کیفیت کو پوری طرح محسوس کیا اور وہ ایک بار پھر وہی چاند بانو بن گئی جسے اپنی ہر تکلیف، حاجت اور جذبے سے بڑھ کر اپنے محبوب کی خوشی اور رضا پیاری تھی۔ وہ تیزی سے حرکت میں آئی اور ٹیلیفون سیٹ کی طرف دوڑی۔ اس کوٹھی میں اسے افرادِ خانہ کی سی حیثیت حاصل تھی اور اس کے علم میں تھا کہ ٹیلیفون کے ساتھ رکھی سیاہ جلد والی چھوٹی سی ڈائری میں ڈاکٹر سمیت کئی اہم افراد کے ٹیلیفون نمبرز درج ہیں۔ اس نے تیزی سے نواب صفی اللہ کے ذاتی معالج کا نمبر ملا کر ان سے جلد از جلد کوٹھی پہنچنے کی درخواست کی اور پھر اپنے کمرے کی طرف دوڑ گئی۔ ڈاکٹر کی آمد سے قبل وہ شکرانے کے نفل ادا کر لینا چاہتی تھی۔ اس کے رب نے اس کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا کر کے اسے اس کے محبوب، اس کے فاروق کی سلامتی کی خوشی عطا کر دی تھی تو وہ اس کے حضور شکرانہ ادا کرنے میں بھلا تاخیر کیوں کرتی۔ آنسو بہاتی آنکھوں سے اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے اس نے اس کے حضور فاروق کی خوشیوں کو دوام دینے کی بھی درخواست دائر کر دی تھی۔ وہ بہت ذہین اور معاملہ فہم لڑکی تھی اس لیے اسے حساب کتاب لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ فاروق اور محب اللہ ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔ اس کا دل پہلے ہی گواہی دیتا تھا کہ فاروق اڈے کا پروردہ کوئی عام سا شخص نہیں ہے، وہ اسے کسی شہزادے کے مانند دکھائی دیتا تھا اور آج تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ نواب سلیم اللہ کے خاندان کا چشم و چراغ تھا جو حالات کے جبر کے ہاتھوں اڈے تک پہنچ گیا تھا لیکن اڈے پر رہ کر بھی اس کی خاندانی نجابت و شرافت پر کوئی داغ نہیں لگنے پایا تھا اور وہ سب کے درمیان رہ کر بھی سب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے جدا، سب سے منفرد نظر آتا تھا۔

طویل نماز اور دعا سے فارغ ہوکر وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی اور ملازمین سے حالات دریافت کیے تو علم ہوا کہ ڈاکٹر، نواب صاحب کو دیکھ کر جاچکا ہے اور اب وہ سکون آور دوا کے زیر اثر اپنی خواب گاہ میں سو رہے ہیں۔ فاروق کے بارے میں بھی اسے علم ہوا کہ وہ بھی ان ہی کی خواب گاہ میں ہے۔ نماز اور دعا کے مراحل سے گزر کر اس کے اندر ٹھہراؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور وہ خود کو اچھی طرح سنبھال چکی تھی اس لیے بہت وقار سے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی۔ نواب صفی اللہ کی خواب گاہ کا رخ کرنے سے قبل اس نے پہلے ندرت جہاں کی خواب گاہ میں جھانکا۔ وہ پُرسکون نیند میں تھیں اور ان کی خدمت کے لیے مامور نرس ایک کرسی پر بیٹھی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ وہ دبے قدموں وہاں سے پلٹ آئی اور نواب صفی اللہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے دروازے پر مدھم سی دستک دی اور پھر دروازے کو بے آواز کھول کر اندر داخل ہوئی۔ کرسی پر بیٹھا فاروق دستک کی آواز پر دروازے کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ کھلے دروازے سے چاند بانو کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا اور حیرت کی زیادتی کے باعث اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

''چاند بانو! تم یہاں؟''

''آداب۔'' اس کی حیرت کو نظر انداز کرکے چاند بانو نے مسکراتے ہوئے پیشانی تک ہاتھ لے جاکر اپنی مخصوص ادا کے ساتھ کہا۔

''تسلیمات! آپ یہاں کیسے؟'' اس کی حیرت اپنی جگہ قائم تھی۔

''یہ سوال تو ہم بھی آپ سے کرسکتے ہیں؟'' چاند بانو کی آنکھوں میں شوخی چمکی۔

''بالکل! لیکن اس سوال کا جواب ذرا طویل ہے۔ تمہیں پوری داستان سننی پڑے گی۔'' اس کے لبوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہماری طرف بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ ہم اپنی یہاں موجودگی کا سبب بتانے بیٹھے تو صاحب کے آرام میں خلل آنے کا اندیشہ ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم کسی اور کمرے میں بیٹھ کر ایک دوسرے کو اپنی اپنی داستانیں سنائیں۔'' چاند بانو نے تجویز پیش کی۔

''چلیے۔'' اس نے فقط ایک لفظ میں چاند بانو کی تائید کی اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے نواب صفی اللہ کی خواب گاہ سے باہر نکلے۔ باہر نکل کر چاند بانو نے ایک ملازم کو نواب صاحب کا خیال رکھنے کی تاکید کی اور اسے لیے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ چاند بانو کا انداز اور اعتماد دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایک ایک ادا سے ظاہر تھا کہ وہ اس کوٹھی میں کسی خاص حیثیت سے رہ رہی ہے اور اسے یہاں کے معاملات میں خاصا دخل ہے لیکن وہ چاند بانو کی یہاں حیثیت کا تعین نہیں کرپا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ طوائفوں کی نوابین تک رسائی کوئی ایسی انہونی بات نہیں اور جب کوئی طوائف کسی نواب کے دل پر راج کرنے لگے تو گھر پر راج کرنے کا موقع بھی نکال لیتی ہے لیکن وہ اپنے خاندان سے بھی واقف تھا۔ دولت مندوں کی کچھ خامیاں ضرور ان لوگوں میں پائی جاتی تھیں لیکن کردار کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں تھا۔ کم از کم کسی نوابزادے کا کوئی شوق حویلی کی دہلیز پار کرکے اندر داخل نہیں ہوسکا تھا اور اب اس خاندان میں ایسا کوئی شوق پالنے والا باقی ہی کہاں رہ گیا تھا پھر وہ چاند بانو سے بھی واقف تھا۔ اس نے طوائف کی کوکھ سے جنم ضرور لیا تھا اور اس کی گود میں پروان ضرور چڑھی تھی لیکن اس کی روایت پاکیزہ تھی۔ وہ اپنے ماحول سے بیزار رہنے والی لڑکی تھی اور اب تو اس کی شخصیت میں اور بھی زیادہ تہذیبی محسوس ہورہی تھی۔ سادگی میں وہ اسے پہلے بھی بہت بار دیکھ چکا تھا لیکن اب جو اس کے چہرے کے گرد نور کا ہالہ سا تھا، وہ اسے الگ ہی انفرادیت عطا کررہا تھا اور اس نور کے ہالے میں اس کے چہرے کا بدنما داغ بھی جیسے کہیں چھپ گیا تھا۔ ایک مقناطیسی سی کشش تھی جو کسی بدصورتی کو محسوس ہی نہیں ہونے دیتی تھی۔

''یہاں تشریف لے آیئے۔'' چاند بانو کی سریلی آواز نے اسے اپنے خیالات سے باہر نکالا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''آپ کی حالت سے ظاہر ہے کہ آپ طویل مسافت طے کرکے آئے ہیں اور بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ پہلے آپ غسل فرما کر تازہ دم ہوجائیں۔ ہم ملازم سے آپ کا سامان یہیں بھجوا دیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' چاند بانو کی بات معقول تھی اس لیے تجسس کے باوجود اس نے مان لی۔ غسل کرنے سے اس کی طبیعت پر واقعی اچھا اثر پڑا اور اسے لگا کہ راستے کے گرد و غبار کے ساتھ ہی پچھلی زندگی کی بہت سی کثافتیں بھی اس کے وجود سے دھل گئی ہوں۔ جو کچھ گزر گیا، وہ ماضی تھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور اب اسے اس ماضی کی طرف لوٹ کر نہیں جانا تھا۔ ربن کے بعد، اس کے بغیر وہ اڈے کی دنیا میں ہرگز نہیں رہ سکتا تھا۔ وہاں کے ساتھی اور دوست بس اب ایک یاد کی طرح اس کے دل میں رہتے۔ کبک تھی تو صرف جولیٹ کی۔ وہ کہاں تھی اور کس حال میں تھی، اسے کوئی اطلاع نہیں تھی لیکن جانے کیوں اب وہ اس کے لیے اپنے دل میں ویسی پریشانی محسوس نہیں کرتا تھا جیسی اپنے سر کی چوٹ کے بعد اسپتال اور پھر شملہ میں قیام کے عرصے میں محسوس کرتا رہا تھا۔ ان دنوں اسے خواب بھی بہت عجیب اور ڈراؤنے آتے تھے اور اس کا وجدان اسے بتاتا تھا کہ جولیٹ کسی بڑی پریشانی اور تکلیف میں مبتلا ہے۔ بعد میں ربن کی زبانی جولیٹ پر گزری جان کر تصدیق ہوگئی تھی کہ اس کی بے قراری و بے چینی بے وجہ نہیں تھی۔ وہ محبت کے اس رمز کو پہچان گیا تھا کہ محبوب تکلیف میں ہو تو اس کے دل کو خود خبر ہوجاتی ہے۔ اب بھی اس کا دل اسے خبر دے رہا تھا کہ جولیٹ جہاں بھی ہے خیریت سے ہے اور اسے اس کے حوالے سے اپنے شانوں پر بس یہ ذمے داری محسوس ہو رہی تھی کہ وہ اس کے مجرم دلدار آغا کو انجام تک پہنچا دے۔ باقی ملنا بچھڑنا تو نصیب کے کھیل تھے۔ اس کے نصیب میں ہوتا تو جولیٹ کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی موڑ پر اسے مل ہی جاتی۔ اس کی سلامتی اور خوشی کے لیے وہ بہرحال ہر دم دعا گو رہتا تھا۔

''کھانا لگ چکا ہے۔ ڈائننگ روم میں تشریف لے آئیں۔'' سوچوں میں غلطاں وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے بال سنوار رہا تھا کہ چاند بانو کی کھنکتی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ کمال کی بات تھی کہ وہ اس کوٹھی کے مالکوں میں سے ایک تھا اور چاند بانو یہاں میزبان بنی بیٹھی تھی۔ اس بار بھی وہ اس کی بات ماننے سے انکار نہیں کرسکا اور اس کے ساتھ کھانے کے کمرے میں پہنچ گیا۔ کھانا سلیقے سے میز پر چنا ہوا تھا اور ایک ملازم خدمت کے لیے مستعد کھڑا تھا۔ چاند بانو نے اشارہ کرکے اسے باہر بھیج دیا۔

''چچا جان سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ وہ کب تک گھر تشریف لاتے ہیں؟'' چاند بانو نے اچھی میزبان کی طرح کھانے کی ڈشیں اس کی طرف بڑھانا شروع کیں تو اس نے سوال کیا۔

''وہ شام تک ہی تشریف لائیں گے۔ آج انہیں ایک کاروباری ملاقات کے لیے کسی سے ملنے جانا تھا اس لیے وہ اپنے دفتر میں موجود نہیں ہوں گے ورنہ ہم ان کے دفتر فون کرکے انہیں آپ کی آمد کی اطلاع دے دیتے۔'' چاند بانو کے تفصیلی جواب نے ایک بار پھر اس کی کوٹھی میں حیثیت کے بارے میں فاروق کے دل میں تجسس پیدا کیا۔ اس کا انداز مالکانہ تھا اور معلومات بھی ایسی جو گھر کے افراد کو ہی ایک دوسرے کے متعلق حاصل ہوتی ہیں۔

''تم نے اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔'' آہستہ روی سے کھانا کھاتے ہوئے وہ خود کو سوال کرنے سے باز نہ رکھ پایا۔

''ہم آپ کی عم زاد جمیلہ اسد اللہ کی مہربانی سے یہاں ہیں۔''

''میری عم زاد جمیلہ اسد اللہ.....!'' وہ حیرت میں مبتلا ہوا۔

''جی ہاں۔ ہمیں جمیلہ باجی کی نرم دلی ہی یہاں لے آئی ہے ورنہ ہم کہاں اس لائق تھے کہ ایک عزت دار خاندان ہمیں اپنے گھر میں پناہ دیتا۔'' چاند بانو نے یاسیت سے کہا اور پھر اپنی یہاں تک پہنچنے کی داستان سنانی چلی گئی۔ اس کی داستان دلچسپ تھی لیکن وہ اپنی جگہ متجسس تھا کہ اس کی یہ عم زاد جمیلہ کون ہے؟ خود چاند بانو نے کچھ نہیں بتایا تھا کہ جمیلہ اصل میں پہلے جولیٹ تھی اور اس کا اسد اللہ کے ماضی سے کیا تعلق تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ایک خاندانی معاملہ ہے جو خاندان کے کسی فرد کو ہی فاروق یعنی محب اللہ کے گوش گزار کرنا چاہیے۔

''بہت خوب! تمہاری یہ جمیلہ باجی تو واقعی بہت ہمدرد اور انسان دوست خاتون معلوم ہوتی ہیں۔ ویسے محترمہ ہیں کہاں؟'' چاند بانو خاموش ہوئی تو اس نے تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ سوال بھی کر ڈالا۔

''وہیں مہاجرین کے کیمپ میں۔ وہ روزانہ پابندی سے وہاں جاتی ہیں۔ بہت دردمند دل کی مالک ہیں ورنہ کون اپنے اتنے شاندار گھر کا آرام چھوڑ کر خود کو خوار کرتا ہے۔'' چاند بانو نے اس کے سوال کا جواب تعریفی تبصرے کے ساتھ دیا پھر بولی۔

''آپ اپنی سنائیے، آپ پر کیا گزری اور یہاں تک کیسے پہنچے؟ آپ کے ماضی کے بارے میں تو ہم کچھ اندازے لگا ہی چکے ہیں۔ باقی تفصیل سے آپ چاہیں تو آگاہ کردیں۔'' جواب میں فاروق نے اسے ماضی بعید و قریب کی ہر بات پوری سچائی سے بتا ڈالی۔ یہ چاند بانو وہ نہیں تھی جو اس کے دل کی دھڑکنوں میں بستی تھی لیکن چاند بانو بہرحال وہ ضرور تھی جس کی محبت کا وہ قدرداں تھا۔ جس کے جذبے کی سچائی اس کی روح پر اثر انداز ہوتی تھی اور جو اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لائق تھی کہ اس کے ساتھ اپنے سارے بوجھ بانٹ لیے جاتے، سو اس نے چاند بانو کو اپنے بارے میں سب کچھ بتاڈالا۔ وہ پوری توجہ سے سنتی رہی۔ کھانا دونوں میں سے کسی نے بھی زیادہ رغبت سے نہیں کھایا۔ ایک دوسرے کی داستان سننے میں اس طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ چاند بانو نے ضرور ایک آدھ بار اس سے مزید کچھ لینے پر اصرار کیا تھا لیکن وہ بھی بس پلیٹ میں پہلی بار نکالا گیا کھانا ہی بہ دقت ختم کرسکا تھا۔

''دادا اور گولو کی جدائی کا دکھ ہمارے لیے بھی بہت اذیت ناک ہے۔ آپ کی ان سے دلی وابستگی کے علاوہ بھی وہ دونوں ہمیں بہت عزیز تھے۔ گولو کی معصومیت اور دادا کی شفقت ہمیں ہمیشہ یاد رہے گی۔ خصوصاً دادا جیسے کردار کو تو ہم فراموش ہی نہیں کرسکتے۔ ان سے ہماری چند ہی ملاقاتیں ہوئیں لیکن ان کی شخصیت نے ہمیں بہت متاثر کیا۔ حقیقتاً وہ ایسے لوگوں میں سے تھے جو بہت منفرد اور خاص ہوتے ہیں اور ان جیسا دوسرا ڈھونڈے سے نہیں ملتا لیکن قدرت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے۔ جلد یا بدیر جانا تو ہم میں سے ہر ایک کو ہے۔ اس فانی دنیا میں کوئی کب تک رہ سکتا ہے۔ ہاں دادا کا لافانی کردار ہمیشہ سب کو یاد رہے گا۔'' چاند بانو کے الفاظ میں اس کے دلی جذبات کا عکس تھا۔

''تم نے ٹھیک کہا، دادا واقعی بے مثال آدمی تھا۔ کم از کم میں مرتے دم تک اسے فراموش نہیں کرسکتا۔ وہ میرے لیے کیا تھا، میں الفاظ میں بیان بھی نہیں کرسکتا۔ اس کے نہ ہونے سے میری زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا۔ میں جب تک جیوں گا، وہ میرے دل میں درد بن کر زندہ رہے گا۔'' بولتے بولتے اس کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔

''صبر کیجیے۔ آپ نے خود کو نہ سنبھالا تو دادا کی روح کو تکلیف ہوگی۔ اس دنیا میں آدمی کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ آپ نے بھی اپنے اختیار کی حد تک بہت کچھ کیا ہے۔ دادا کے قاتل اپنے انجام تک پہنچ گئے، یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ بس اب آپ ان کے لیے دعائے مغفرت کیا کریں۔ اس سے آپ کے دل کو بھی سکون ملے گا اور دادا کے لیے بھی آخرت کی منزلیں آسان ہوجائیں گی۔'' اس نے بہت خلوص سے اس کی دلجوئی کی کوشش کی۔ جواب میں وہ اپنا سر اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔

''باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ شام میں آپ کے چچا حضور اور جمیلہ باجی تشریف لائیں گی تو ان کے ساتھ بھی آپ کا خاصا وقت صرف ہوگا۔ بڑے نواب صاحب بھی دواؤں کے زیر اثر ابھی نیند میں ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ عارضی مہلت کا فائدہ اٹھا کر تھوڑی دیر آرام کرلیں تاکہ شام کو سب کے ساتھ اچھا وقت گزار سکیں۔ اتنے برسوں کی جدائی کے بعد ملیں گے تو آپس میں کہنے سننے کے لیے ڈھیروں باتیں ہوں گی۔ لمبی نشست جمانے کے لیے تازہ دم ہونا مناسب رہے گا۔'' چاند بانو نے اسے نا صرف مشورہ دیا بلکہ بہ اصرار اپنے ساتھ اس کمرے تک بھی لے گئی جہاں اس کا سامان رکھوایا تھا۔ کمرے کے پُرسکون ماحول میں وہ آرام دہ بستر پر آنکھیں بند کرکے لیٹا تو جو لیٹ کا سرا پا چھم سے آنکھوں میں اتر آیا۔

''یہ دنیا اتنی بڑی تو نہیں..... یہاں لوگ بچھڑ کر کسی نہ کسی موڑ پر دوبارہ مل ہی جاتے ہیں پھر تم کہاں چھپی ہوئی ہو کہ میرے سامنے ہی نہیں آتیں۔'' اس کے تصور سے شکوہ کرتے ہوئے وہ اس کی تصویر آنکھوں میں بسائے کب نیند کی وادی میں اتر گیا خود اسے بھی خبر نہیں ہوسکی۔

☆☆☆

اس کے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے اور غم و غصے کا ایک طوفان سا دل میں برپا تھا۔ ماجدہ کے سلسلے میں قادر شاہ کے کیے گئے انکشاف نے اس کی ہستی کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس نے خود پر ضبط کے جو بند باندھ رکھے تھے، وہ سب ٹوٹنے لگے تھے۔ شدید غصے میں بھری وہ اسی وقت کیمپ سے روانہ ہوگئی تھی اور اب اس شخص کے گھر کی طرف جارہی تھی جہاں جانے کا ارادہ اس نے ترک کردیا تھا لیکن اب سوچ رہی تھی کہ ہر شخص قابلِ معافی نہیں ہوتا۔ معاف انسانوں کو کیا جاتا ہے، موذی جانوروں کا تو سر کچل دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔ وہ اس بدکردار آدمی کو ٹھکانے لگا دیتی تو یقیناً اسے اور اس کے خاندان کو نقصان اٹھانا پڑتا لیکن دنیا کو تو ایک موذی سے نجات مل جاتی۔ ٹیکسی جتنی رفتار سے اس کے مطلوبہ مقام کی طرف دوڑتی جارہی تھی، اس کا دماغ بھی اتنی ہی تیزی سے سوچنے میں مصروف تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج وہ کسی صورت نہیں چُوکے گی اور اپنے پرس میں موجود تیز دھار چھری اس رذیل آدمی کے سینے میں گھونپ کر رہے گی جس نے اس کے لیے زندگی کو ایک ڈراؤنا خواب بنا کر رکھ دیا تھا۔

یہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی کہ وہ جس کی دنیا کاغذ و قلم کی نزاکتوں تک محدود تھی، اب اپنے پرس میں ایک تیز دھار چھری لیے پھرتی تھی۔ بہت پہلے جانی سے حاصل کردہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چاقو تو دہلی سے لاہور آتے ہوئے اس کے دوسرے سامان کے ساتھ ہی گم ہو گیا تھا اور یہ تیز دھار چھری اس نے بیگم آصفہ علی کے باورچی خانے سے حاصل کی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ خوفزدہ بھی رہتی تھی کہ جو اس پر ایک بار بیتی ہے، کہیں اس سے دوبارہ واسطہ نہ پڑ جائے اس لیے خود حفاظتی کے پیش نظر اس نے یہ تیز دھار والی پتلی سی چھری اپنے پرس میں رکھ لی تھی جو اسد اللہ کے مل جانے اور ایک گھر کا تحفظ حاصل ہو جانے کے باوجود بھی مستقل اس کے پرس میں ہی رہتی تھی۔ لاشعور میں بیٹھا خوف اتنا قوی تھا کہ زندگی میں بہت کچھ اچھا مل جانے کے باوجود اسے کسی آسیب کی طرح ڈراتا رہتا تھا اور اس آسیب کے پنجوں میں جکڑی وہ اپنے پرس میں ایک تیز دھار چھری لیے پھرتی تھی۔

ٹیکسی نے اسے اس کے مطلوبہ پتے پر پہنچایا تو وہ ٹیکسی ڈرائیور کو اس کا مطلوبہ کرایہ ادا کر کے نیچے اتری اور بڑے سے گیٹ کے ساتھ ستون پر لگی سنہری نیم پلیٹ کو دانت بھینچے گھورنے لگی۔ سنہری نیم پلیٹ پر سیاہ رنگ کے ہندسوں سے صاحب خانہ کا نام لکھا تھا ''دلدار آغا۔'' یہ وہ نام تھا جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی اور آج اسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کا عزم صمیم لیے یہاں پہنچی تھی۔ وہ اس شخص کو بتانا چاہتی تھی کہ عورت اتنی کمزور ہستی نہیں ہے کہ وہ جب چاہے اسے کسی کھلونے کی طرح بازار سے خرید لے یا اپنی طاقت کے بل پر زبردستی حاصل کر کے توڑ پھوڑ ڈالے۔

''جی بیگم صاحبہ؟'' اس کے گھنٹی کا بٹن دبانے پر اندر سے چوکیدار نمودار ہوا اور اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''مجھے دلدار آغا سے ملنا ہے۔'' اس نے بہ مشکل اپنے لہجے کو قابو میں رکھ کر چوکیدار کو اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

''آپ کون؟ ہم صاحب کو کیا بولے؟'' چوکیدار نے سوال داغا۔

''میرا نام جولیٹ ہے اور میں ان کی بیگم کی دوست ہوں۔'' اس نے دانت کچکچا کر اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ اس کے انداز کو حیرت سے دیکھتا ہوا واپس پلٹ گیا۔ ایک منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے لیے دروازہ کھول دیا اور اسے ادب سے اندر آنے کو کہا۔ کوٹھی خاصی وسیع و عریض تھی اور سامنے ہی دو چہچہاتی ہوئی گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ چوکیدار اسے کوٹھی کی رہائشی عمارت کے مرکزی دروازے تک لے گیا اور خود وہیں رک کر اس سے بولا۔

''برآمدے میں سیدھا جا کر آخر میں دائیں ہاتھ پر سیڑھیاں اوپر جا رہی ہیں۔ اوپر الٹے ہاتھ پر جو تیسرا دروازہ نظر آئے، آپ کو اس میں جانا ہے۔ ہم نے انٹر کام پر اطلاع کر دی ہے۔'' وہ تنبیہی انداز میں سر کو جنبش دے کر اس کی ہدایت کے مطابق آگے بڑھنے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ آغا نے اسے اوپری منزل پر کیوں بلوایا ہے۔ اصولاً تو ڈرائنگ روم نچلی منزل پر ہی ہوتا ہے اور مہمانوں کو وہیں بٹھایا جاتا ہے۔ آغا اسے ڈرائنگ روم سے ہٹ کر کسی دوسرے کمرے میں بلا کر کیا جتانا چاہتا تھا؟ بہرحال اس کا جو بھی مقصد تھا، وہ تو اپنے دل میں صرف اور صرف ایک مقصد لے کر یہاں آئی تھی اور وہ مقصد تھا آغا کی موت.....

مطلوبہ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی ہستی کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گئی۔

''ثنا تم؟ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' وہاں توقع کے برخلاف دلدار آغا کے بجائے اس کی بیوی موجود تھی اور ماضی کی اس ثنا سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی جو اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی رہی تھی بلکہ یہ تو وہ ثنا بھی نہیں تھی جس سے وہ بمبئی میں دلدار آغا کے فیملی انٹرویو کے سلسلے میں ملی تھی۔ کل اور آج کی ثنا میں بہت فرق تھا۔ کل کی ثنا صحت مند اور خوش حال عورت تھی اور آج اس کے سامنے جو ثنا کھڑی تھی، وہ تو جیسے گھل کر رہ گئی تھی۔ ہڈیوں کے ڈھانچے پر صرف کھال منڈھی ہوئی تھی اور یہ کھال بھی جیسے جھلس سی گئی تھی۔

''اندر آ جاؤ جولیٹ! میں خود بڑی شدت سے تم سے ملاقات کی خواہش مند تھی لیکن تم سے کوئی رابطہ ہی نہیں رہا تھا۔ تمہارے نیوز پیپر کے آفس فون کیا تھا لیکن وہاں سے بھی تمہارا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ میں بہت پریشان تھی کہ تم سے ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں۔ اچھا ہوا کہ تم خود چلی آئیں۔ چوکیدار نے انٹر کام پر تمہارا نام لے کر بتایا کہ تم آغا سے ملنا چاہتی ہو لیکن میں نے سوچا کہ پہلے میں تم سے ملاقات کر لوں تو شاید آغا سے ملاقات کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ ویسے بھی وہ اس وقت سو رہا ہے۔ اس جیسے آدمی سے ملاقات کے لیے یہ وقت مناسب نہیں ہے۔ وہ تو رات کا بادشاہ ہے جو دن میں کسی خاص کام کی صورت میں ہی جاگتا ہے۔ پاکستان آ کر تو اس کی قسمت اور بھی کھل گئی ہے اور اپنے جیسے مفاد پرستوں کے ساتھ مل کر وہ خوب مزے کر رہا ہے۔''

ثنا اسے اپنے ساتھ اندر کمرے میں لے آئی تھی اور اب مسلسل بولتی جا رہی تھی۔ جولی محسوس کر رہی تھی کہ بولتے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوئے ثنا کی سانس پھول رہی ہے۔ وہ جتنی کمزور اور نحیف ہوگئی تھی اس کے لیے بولنا بھی یقیناً ایک پُر مشقت کام تھا لیکن وہ یوں بولتی جارہی تھی جیسے پتا نہیں کب سے یہ سب کہنے کا انتظار کررہی ہو۔ اسے ثنا کی حالت اور رویے دونوں پر حیرت ہورہی تھی۔ ثنا کے الفاظ اس کے لیے ایک پہیلی کے مانند تھے اور وہ سمجھ نہیں پارہی تھی کہ ثنا اس سے اتنی شدت سے ملاقات کی خواہاں کیوں تھی حالانکہ وہ تو خود اسے منع کرچکی تھی کہ وہ اس سے رابطے میں نہیں رہنا چاہتی۔ اس نے اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ آغا کو اگر ان کے آپس کے روابط کا علم ہوگیا تو وہ یہ بھی جان لے گا کہ جولیٹ کو اس کی قید سے فرار کروانے میں ثنا کا ہاتھ ہے لیکن آج وہ ایسے ہر خوف سے آزاد نظر آرہی تھی اور آغا کے گھر میں موجود ہونے کے باوجود اس کے خلاف کھل کر بول رہی تھی۔

''تمہارے لیے کوئی جوس یا چائے وغیرہ منگواؤں؟'' اپنی رو میں باتیں کرتے ہوئے ثنا کو خیال آیا تو اس سے پوچھنے لگی۔

''نہیں۔'' اس کے انکار میں بہت سختی تھی۔ ثنا نے اصرار نہیں کیا اور غور سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ اسے خود ہی احساس ہوا کہ اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ وہ جس کیفیت میں یہاں تک آئی تھی اس کے لیے کیسے ممکن تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر کسی مشروب سے لطف اندوز ہوپاتی لیکن ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ ثنا کے ساتھ یہ انداز اختیار کرنا اس کے ساتھ زیادتی تھی۔ وہ تو روایت کے مطابق آدابِ میزبانی ہی نبھارہی تھی۔ چنانچہ لہجے کو ذرا نرم کرتے ہوئے بولی۔

''اس وقت مجھے کچھ کھانے پینے کی خواہش نہیں ہے۔ تم مجھے بتاؤ کہ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں بلکہ اس سے بھی پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ حال کیسے ہوگیا..... کیا تم بیمار ہو؟''

''مجھے رحم کا کینسر ہے اور شاید میں زیادہ دن زندہ نہ رہ سکوں اسی لیے تو میں تم سے ملنا چاہتی تھی۔'' ثنا نے انکشاف کیا۔

''تم نے علاج نہیں کروایا؟ تمہارے پاس تو وسائل ہیں۔ تم بیرونِ ملک بھی علاج کے لیے جاسکتی ہو۔'' ثنا کی بیماری کا سن کر اسے دکھ ہوا تھا اور اس کی حالت کی وجہ بھی سمجھ آگئی تھی۔ کینسر نام ہی ایسی بیماری کا تھا کہ جس کے آگے ہر امید دم توڑتی محسوس ہوتی تھی۔

''ہندوستان سے آنے کے فوراً بعد میں اور آغا کچھ دن کے لیے لندن گئے تھے۔ وہیں کے ایک اسپتال میں بیماری کی تشخیص ہوئی تھی۔ آغا نے مجھ سے کہا کہ میں لندن میں رک جاؤں اور اپنا علاج کروالوں لیکن میں راضی نہیں ہوئی۔ میرے لیے زندگی اتنی اہم چیز کا نام نہیں ہے کہ میں اس کی چاہ میں دیارِ غیر میں تنہائی کا عذاب اور علاج کی اذیتیں اٹھاتی۔ میں آغا کے سمجھانے کے باوجود بھی واپس لوٹ آئی۔ تم ہی بتاؤ کہ آغا جیسے شخص کے ساتھ رہنے کے لیے کون زندگی کی چاہ کرسکتا ہے۔ زندگی کو تو اپنے من پسند ساتھی کے ساتھ جینا ہی اچھا لگتا ہے۔'' ثنا جیسے کسی خیال میں کھوگئی اور اسے حیرت ہوئی کہ وہ اب بھی عارف کو اپنے دل میں بسائے ہوئے ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ثنا کی عارف کے لیے پسندیدگی کوئی ڈھکی چھپی..... بات نہیں تھی لیکن وہ اپنے اور عارف کے اسٹیٹس میں واضح فرق کی وجہ سے اسے اپنانے کی ہمت نہیں کرسکی تھی پھر درمیان میں جولیٹ کا معاملہ بھی تھا۔ ان دنوں عارف اس کی محبت میں مبتلا تھا اور ثنا جیسی امیر زادی بھی اس کے دل کو نہیں بھاتی تھی۔

''تمہیں پتا ہے جولیٹ جب ہم ساتھ پڑھتے تھے تو مجھے تم سے کتنا حسد محسوس ہوتا تھا۔ حسد بھی شاید چھوٹا لفظ ہے، میں تو دل ہی دل میں تم سے شدید نفرت کرتی تھی کیونکہ میرے سامنے تمہاری کوئی حیثیت ہی نہیں تھی پھر بھی عارف تمہیں مجھ پر ترجیح دیتا تھا۔ میرے لیے وہ دن کیسے اذیت ناک تھے، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ میں ہر پل جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ ایک تو مجھے عارف جیسے آدمی سے محبت ہوگئی تھی جو میرے اسٹیٹس سے میچ نہیں کرتا تھا، دوسرے تم بھی میری راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ اگر میں گھر والوں سے ضد کرکے کسی طرح انہیں مکمل میں ٹاٹ کا پیوند لگانے پر راضی بھی کرلیتی تو عارف کے دل کا کیا کرتی جہاں..... صرف تمہاری تصویر سجی ہوئی تھی۔ میں اسے پا بھی لیتی تو ہر وقت اسی وہم میں مبتلا رہتی کہ اس کے دل میں تو تم ہی ہو۔ اس لیے میں نے اسے پانے کا خیال دل سے نکال دیا اور آغا کا پروپوزل قبول کرکے اس سے شادی کرلی۔ تم شاید کبھی نہ سمجھ سکو کہ اپنے من پسند شخص کو چھوڑ کر کسی دوسرے شخص کی سیج سجانا کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اور اگر وہ شخص آغا جیسا ہو تو زندگی کتنی عذاب ناک ہوجاتی ہے۔ آغا ایک انا پرست، ہٹ دھرم اور عیاش آدمی ہے جس کے لیے بیوی کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی۔ مجھ سے شادی اس نے میرے اسٹیٹس کی وجہ سے کی تھی۔ اس جیسے شخص کے لیے شادی صرف ایک معاشرتی تقاضے کا نام ہے جو اپنے اسٹیٹس کی عورت سے بندھن باندھ کر اس نے پورا کردیا۔ میرے جذبات و احساسات کے بارے میں جاننے کی اس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ اس گھٹن میں بھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں شاید جینے کی کوئی راہ نکال لیتی اگر..... مجھے اولاد کی نعمت مل گئی ہوتی مگر بدقسمتی ہے میں اس سے بھی محروم رہی اور ایسے میں تم آغا کے انٹرویو کی فرمائش لیے مجھ سے آملیں۔ نفرت و حسد سے جھلستا میرا دل تمہیں سامنے پاکر آگ بگولا ہوگیا اور میرے اندر پکتے لاوے کو بہنے کی راہ مل گئی۔ کاش تم دوبارہ مجھے نہ ملی ہوتیں جولیٹ!''

ثنا حسرت سے بولتی ہوئی سانس لینے کے لیے رکی اور سامنے میز پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر پینے لگی تو اس نے بے چینی سے اپنی جگہ پر پہلو بدلا۔ یہ بات تو وہ بھی سمجھتی تھی کہ عارف کے حوالے سے ثنا کے دل میں اس کے لیے کچھ رقیبانہ جذبات ہوسکتے ہیں لیکن وہ جذبات اتنے توانا تھے کہ ثنا یا قاعدہ اس سے شدید نفرت میں مبتلا تھی، اس بات کا اسے قطعی اندازہ نہیں تھا اور اب اسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی انکشاف ہونے جارہا ہے۔ کچھ ایسا تھا جو اب تک پردے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اور اب وہ پردہ ہٹنے والا تھا۔

''تمہارا دوبارہ میرے سامنے آنا بارود کے ڈھیر کو تیلی دکھانے کے مترادف ہوا۔ اپنے غصے اور پاگل پن میں، میں نے تمہاری زندگی برباد کرنے کا فیصلہ کرلیا اور سوچا کہ اگر عارف میرا نہیں ہوسکا تو اسے تمہارا بھی نہیں ہونے دوں گی۔ آغا کی خراب شہرت کا فائدہ اٹھا کر میں نے ایک سازش تیار کی اور دولت کے بل بوتے پر اس کے پی اے کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیا۔ تمہیں آغا کے حوالے سے جتنے بھی تحائف بھجوائے گئے اور جتنی بھی فون کالز کی گئیں، وہ سب صرف ایک دھوکا تھا۔ ہم صرف تمہیں باور کروا رہے تھے کہ آغا جیسی عیاش طبیعت کا آدمی تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ پھر میرے حکم پر تمہیں اغوا کرکے بے ہوشی کی حالت میں تمہارے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ ہوش میں آنے کے بعد ایک بیوٹیشن کی مدد سے تمہیں فرار کروانا بھی میرے منصوبے ہی کا ایک حصہ تھا۔ میں ہندوستانی مرد کی روایتی سوچ سے واقف ہوں اس لیے جانتی تھی کہ ایک اغوا شدہ، عصمت سے محروم ہوجانے والی بدنام لڑکی کو عارف کبھی نہیں اپنائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ اس وقت اپنے اس عمل سے مجھے بہت سکون ملا تھا اور میں سوچتی تھی کہ عارف کو تمہارا نہ ہونے دے کر میں نے سب کچھ پالیا ہے لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے دل کی تسکین کم ہوتی چلی گئی اور قدرت کی طرف سے سزا کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مجھے پتا چلا کہ میری بے اولادی کی وجہ میرا بانجھ پن ہے۔ اس انکشاف کے بعد

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ

(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شعبہ سرکولیشن (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میرے دل کا سکون لٹ گیا لیکن اس وقت مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنے جرم کا اعتراف کرسکتی۔ مجھ سے یہ اعتراف کروانے کے لیے قدرت نے مجھ پر ایک اور وار کیا اور میں نے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوکر جانا کہ اس فانی وجود کے جذبات کی تسکین کے لیے کسی کی زندگی برباد کردینا کتنی بڑی حماقت اور ظلم ہے۔ خود پر ہونے والے اس ادراک کے بعد ہی میں نے تمہیں تلاش کرنا چاہا اور ناکام ہونے کے بعد دعا کرتی رہی کہ خدا ایک بار تمہیں مجھ سے ملوادے تو میں تم سے اپنے جرم کی معافی مانگ سکوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے معاف نہیں کروگی لیکن میرے دل سے یہ بوجھ ہٹ گیا ہے کہ تم اب تک دھوکے کا شکار تھیں اور اپنے اصل مجرم کو نہیں جانتی تھیں۔ اب چاہو تو تم مجھ سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کا بدلہ لے سکتی ہو لیکن یقین جانو کہ تمہارا کوئی بھی انتقام اتنا شدید نہیں ہوسکتا جتنی شدید سزا مجھے قدرت دے رہی ہے۔ موت قطرہ قطرہ کرکے میرے وجود میں اترتے ہوئے ہر پل مجھے احساس دلاتی ہے کہ اذیت کسے کہتے ہیں اور کسی بے گناہ کے ساتھ زیادتی کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔ میرے ساتھ شریکِ جرم تمہارا دوسرا مجرم بھی قدرت کے انصاف کا شکار ہوچکا ہے۔ آغا کاوہ پی اے جس نے دولت کے لالچ میں میرا ساتھ دیا تھا، ہمارے پاکستان مائیگریٹ کرنے سے پہلے چھٹی لے کر اپنے گھر گیا تھا کہ اپنے خاندان والوں کو ساتھ لے کر خود بھی پاکستان آجائے گا لیکن اسے ایسا کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ جب اپنے گھر پہنچا تو وہ شب برات کا دن تھا اور دوسرے لوگوں کی طرح اس کے بیوی بچوں نے بھی چراغاں کرنے اور پٹاخے پھاڑنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ماں نے بڑے لڑکے کے ہاتھ میں اچھی خاصی رقم دے دی تھی اور وہ ڈھیروں پٹاخے، پھلجھڑیاں اور پتا نہیں کیا کچھ اٹھالایا تھا۔ اس بچے کی ہی کسی غلطی سے اس بارودی سامان میں آگ لگی اور لوگوں نے ہلکا سا دھماکا سنا۔ آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ کوئی کچھ نہیں کرسکا۔ سنا ہے گھر میں جگہ جگہ جلتے گھی کے چراغوں نے بھی آگ کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ آغا کا پی اے بیوی بچوں کو آگ سے بچا کر نکالنے کے چکر میں خود بری طرح جھلس گیا لیکن کسی کو بھی نہیں بچاسکا۔ ماں اور دونوں بچے اسی دن مرگئے اور وہ خود تین اذیت ناک دن اسپتال میں گزار کر اپنی جان کی بازی ہار گیا۔ اب تم خود ہی اندازہ کرو کہ وہ کیسی تکلیف دہ موت سے دوچار ہوا ہوگا۔ اگر تم چاہتیں بھی تو اسے ایسی موت نہیں دے سکتی تھیں۔ تمہارے لیے تو آسمان سے انصاف اترا ہے جولیٹ! تمہیں برباد کرنے والوں میں سے کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آیا اور میں تمہارے آسودہ چہرے کو دیکھ کر پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم بہت سکون میں ہو۔''

ثنا بولتے بولتے ہانپنے لگی تھی لیکن وہ اس کی حالت پر توجہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ ثنا کی سنائی ہوئی اس طویل داستان میں ہونے والے پے در پے انکشافات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ بظاہر وہ اپنی جگہ بالکل ساکت بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس کی ہستی کسی طوفان کی زد میں تھی۔ ماضی کا ایک ایک منظر کسی فلم کی طرح برق رفتاری سے اس کے ذہن سے گزر رہا تھا۔ اسے یاد آرہا تھا کہ وہ کیسے دیوانہ وار آغا سے انتقام لینے کے لیے بے قرار پھرتی تھی لیکن ہر بار غیب سے آغا کی جان بچانے کا انتظام ہوجاتا تھا۔ وہ جرم جو آغا نے کیا ہی نہیں تھا، اسے اس کی سزا ملتی بھی تو کیونکر..... اس موقع پر اسے اپنے بمبئی کے رہائشی محلے کے نکڑ پر بیٹھنے والا فقیر بھی شدت سے یاد آیا جو اس کے دیے سکوں کو کھوٹا قرار دے کر پھینک دیا کرتا تھا اور اسے جتاتا تھا کہ اس کے پاس سارے کھوٹے سکے ہیں اور اسے کھرے کی پہچان نہیں ہے۔ اسے واقعی پہچان نہیں تھی اور وہ عارف جیسے کھوٹے سکے کو دل سے لگائے محب اللہ عرف فاروق جیسے کھرے سکے کو ٹھکراتی چلی جاتی تھی اور ان دونوں جب وہ آغا سے انتقام لینے کے لیے دیوانی ہوئی جارہی تھی تب بھی اس فقیر نے اسے جتایا تھا کہ وہ غلط سمت دوڑ رہی ہے لیکن وہ نہیں سمجھی تھی۔ وہ راہ سجھانے والوں کی باتیں نظر انداز کرکے اسی راستے پر بھاگتی جارہی تھی جس راستے پر اسے بھٹکا کر ڈالا گیا تھا لیکن اس کی تمام تر حماقتوں کے باوجود اللہ نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ ہر بار اپنے ارادوں میں ناکام کردی گئی تھی اور اللہ کی بے آواز لاٹھی نے اس کے اصل مجرموں کو بہت خاموشی سے ان کے انجام سے دوچار کردیا تھا۔ اب وہ اپنی زبان سے کہتی تو کیا۔ اس کے لیے سامنے بیٹھ کر اپنے جرم کا اعتراف کرتی ثنا اور دردناک موت سے دوچار ہوجانے والا آغا کا پی اے، سب بے معنی ہوگئے تھے۔ اس کے لیے تو صرف اللہ رہ گیا تھا جس پر وہ ابھی کچھ روز پہلے ہی ایمان لائی تھی اور جس نے آج اسے خود ایمان کی پختگی عطا کردی تھی۔ وہ نہیں سن رہی تھی کہ اس کے سامنے بیٹھی ثنا اس سے کیا کہہ رہی ہے۔ وہ اپنے دل کی آواز سن رہی تھی جو اپنی ہر دھڑکن کے ساتھ بس اللہ اللہ پکار رہا تھا۔ اللہ جو سب سے بڑا ہے، جو سب سے زیادہ مہربان و

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رحیم ہے اور جس سے بڑھ کر کوئی اختیار نہیں رکھتا۔

''تم آغا سے کیوں ملنا چاہتی تھیں جولیٹ! تمہیں اس سے کوئی کام تھا یا پھر.....'' ثنا کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہی ہے اس لیے اس نے قریب آ کر اس کا شانہ ہلایا اور اس سے پوچھنے لگی۔ ثنا کے پوچھنے پر اسے ہوش آیا کہ وہ یہاں ماجدہ کی وجہ سے آئی ہے۔ قادر شاہ نے اسے بتایا تھا کہ ماجدہ کو اس نے دلدار آغا کے حوالے کیا ہے اور اس نے سوچا تھا کہ آج دلدار آغا کا قصہ ہی تمام کر دے گی تاکہ ماجدہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں کو اس جیسے شخص سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے لیکن یہاں آ کر اسے جو کچھ سننے کو ملا تھا، اس نے اس کے حواس ہی گم کر دیے تھے۔ اب خیال آیا تو ثنا سے بولی۔

''تمہارے شوہر نے مہاجرین کے کیمپ سے اغوا شدہ ایک لڑکی کو اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ اس لڑکی کا نام ماجدہ ہے اور وہ عارف کی چھوٹی بہن ہے۔ عارف اتنا غیرت مند تھا کہ میرے دامن پر داغ دیکھ کر اپنے سارے قول و قرار بھلا دیے تھے۔ اب اپنی بہن کے دھندا کرنے پر اس کی روح تڑپتی ہوگی۔ تم عارف سے محبت کا دعویٰ کرتی ہو، اس محبت کا ثبوت دینے کے لیے ماجدہ کے لیے کچھ کر سکو تو شاید گناہوں کا کفارہ ادا ہو جائے۔''

''عارف ..... عارف مر گیا ..... کیسے؟'' اس کے انکشاف نے ثنا کو وحشت زدہ کر دیا۔

''ہندوستان سے پاکستان آتے ہوئے وہ بلوائیوں کے حملے میں شدید زخمی ہو گیا تھا۔ جان تو بچ گئی لیکن وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو گیا۔ معذوری اور بے بسی کی زندگی سے تنگ آ کر ایک دن اس نے خود ہی اپنی جان لے لی۔ اس کے خاندان میں سے صرف اس کی سب سے چھوٹی بہن ماجدہ ہی باقی بچی ہے جو مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق آغا کے قبضے میں ہے اور میں چاہتی ہوں کہ تم اس لڑکی کے لیے کچھ کرو۔'' عارف کی موت کا قصہ نہایت اختصار سے بیان کر کے اس نے ایک بار پھر ماجدہ کے سلسلے میں ثنا پر زور ڈالا۔

''میں ماجدہ کو بچاؤں گی۔ میں عارف کی روح کو تڑپتا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کی روح کے سکون کے لیے مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں ضرور کروں گی۔ شاید اسی میں میری بھی نجات ہو جائے۔''

ثنا صدمے کی حالت میں تھی۔ اس نے نڈھال سی کیفیت میں اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لی تھیں اور سرگوشی میں جانے خود سے یا اس سے عہد کر رہی تھی۔ اس کے لیے ثنا کا یہ عہد کافی تھا۔ اس نے خاموشی سے اپنا وزیٹنگ کارڈ وہاں چھوڑا اور خود باہر نکل گئی۔ جو کچھ آج اسے معلوم ہوا تھا، اس نے اس کی کیفیت اتنی عجیب کر دی تھی کہ فی الحال وہ خود کو کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں پا رہی تھی اس لیے دوبارہ کیمپ جانے کے بجائے گھر واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ گھر پہنچ کر اس کا سب سے پہلے چاند بانو سے سامنا ہوا۔ چاند بانو کے چہرے پر غیر معمولی خوشی کے تاثرات تھے اور لگتا تھا کہ وہ کسی سے اپنی خوشی بانٹنے کے لیے بے چین ہو۔ اس کے بے وقت گھر واپس لوٹنے پر تعجب کا اظہار کرنے کے بجائے خوشی سے چہکتی آواز میں بولی۔

''اچھا ہوا جمیلہ باجی! آج آپ جلدی گھر واپس آ گئیں۔ ہم ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے کے لیے بڑی شدت سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔''

''اچھا تو کیا تمہارے وہ شہزادے صاحب آ گئے ہیں؟'' اس کا کسی سے بات کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی چاند بانو کی بے تحاشا خوشی کو دیکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

''بالکل درست اندازہ لگایا آپ نے۔ اللہ نے ہماری دعائیں سن لیں اور انہیں صحیح سلامت یہاں تک پہنچا دیا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ ہماری دعاؤں کی قبولیت میں ہمارے محسنوں کی خوشی بھی پوشیدہ ہے۔ آج کا دن تو ہمارے ساتھ ساتھ آپ کے خاندان کے لیے بھی بہت خوشی لے کر آیا ہے۔'' خوشی سے نہال چاند بانو جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی اور کون سی پہیلیاں بجھوا رہی تھی، اس کے دماغ میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ فی الحال وہ ان پہیلیوں کو بوجھ سکے۔ ابھی تو وہ ثنا کے کیے گئے انکشافات کے بوجھ سے ہی لرزیدہ تھی، مزید کوئی بوجھ کیسے اٹھاتی چنانچہ چاند بانو کی خوشی سے دمکتی آنکھوں کو نظر انداز کر کے نرمی سے بولی۔

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے چاند بانو! میں کچھ دیر اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔ تم برا مت ماننا، میں شام کو تفصیل سے تمہاری پوری بات سنوں گی۔''

''آپ کہیں تو ڈاکٹر صاحب کو فون کر کے بلوا لوں؟ آپ کے لیے کوئی دوا تجویز کر دیں گے۔'' چاند بانو اپنی خوشی فراموش کر کے فوراً اس کے لیے تشویش میں مبتلا ہوئی۔

''نہیں، ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ بس میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے اپنا پرس ایک طرف ڈالا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور سیدھی ملحقہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں سے وضو کر کے نکلنے کے بعد اس نے جائے نماز بچھائی اور ظہر کی نماز کی ادائیگی کے بعد نوافل ادا کیے۔ نوافل کی ادائیگی کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں لیکن آج ان آنسوؤں کا سبب دکھ، غصہ یا بے بسی کے جذبات نہیں تھے۔ آج وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے لیے آنسو بہا رہی تھی جو ہر سانس کے ساتھ اس پر مہربان رہا تھا۔ اس رب کی مہربانیوں کا سلسلہ تو اس کی دنیا میں آمد سے بھی پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ہاں، یہ اس کے رب کی مہربانی ہی تو تھی کہ جوزف نے مشکل حالات میں جوزفین کا ہاتھ تھاما اور اس کی کوکھ میں پلتی بچی کو اپنا نام دے کر اسے دنیا والوں کے سامنے رسوا ہونے سے بچا لیا۔ ایک جوزف کا نام مل جانے سے وہ پورے اعتماد سے سر اٹھا کر اس دنیا میں جیتی رہی پھر اس کی زندگی میں ایک حادثہ ہوا اور اسے لگا کہ اس کا سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور وہ انتقام کی راہ پر چل نکلی لیکن اس ذہنی حالت میں بھی اس کا رب اس پر مہربان رہا اور اس کے ہاتھوں کو انسانی خون سے رنگنے نہیں دیا۔ وہ اپنے اصل مجرموں سے ناواقف اور انجان تھی۔ اس کے رب نے اسے کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے روکے رکھا اور انصاف اپنے بااختیار ہاتھوں میں لے لیا۔ اس وقت اسے عارف کا خود کو چھوڑ دینا بھی ایک حادثہ لگا تھا لیکن بعد میں وقت نے اسے سمجھایا کہ اس نے اپنے لیے عارف کا انتخاب غلط کیا تھا۔ وہ شخص ایسا تھا ہی نہیں کہ زندگی کی دھوپ میں اسے سایہ دے پاتا چنانچہ اللہ نے اسے اس کی زندگی میں ہی نہیں آنے دیا اور اسے اس کے اصل تک پہنچا دیا۔ یہ انکشاف کہ وہ اونچی شان والے اسد اللہ کی بیٹی ہے، شروع میں دھچکا دینے کے بعد قابل فخر محسوس ہونے لگا، وہیں اسے معلوم ہوا کہ فاروق جسے وہ گلی کا غنڈا گردان کر ہمیشہ نظر انداز کرتی آئی ہے، اسی خاندان کا چشم و چراغ ہے جس خاندان کا وہ خود حصہ ہے۔

اسد اللہ کی حویلی میں اللہ نے جہاں اسے اختر جیسے بدفطرت شخص سے محفوظ رکھا، وہیں آصف خان جیسا ہمدرد دوست بھی عطا کیا۔ پھر یہ بھی اللہ کا احسان تھا کہ وہ عین اس رات حویلی سے نکل گئی جس رات بلوائیوں نے حویلی پر حملہ کر کے سب کچھ تہس نہس کر دیا تھا اور حویلی کی جملہ خواتین کو اپنی عصمتیں بچانے کے لیے کنوئیں میں چھلانگ لگانی پڑی تھی۔ اس کا رب اسے مہاجرین کی اس ٹرین میں بھی... بہ حفاظت پاکستان لے آیا تھا جس میں موجود اس کے ہمسفروں کے خون سے بلوائیوں نے ہولی کھیلی تھی۔ اسی مہربان رب نے بیگم آصفہ علی جیسی ہمدرد خاتون کے گھر میں اسے پناہ دلوائی تھی اور ایک بار پھر اسے اس کے مہربان باپ تک پہنچا دیا تھا ورنہ وہ تو اس اندیشے سے کہ محب اللہ عرف فاروق حویلی آئے گا تو اس کی ذات کا بھرم ٹوٹ جائے گا، اپنے اتنے محبت کرنے والے باپ کو بھی چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ آج جب وہ ان کے سائے میں رہ رہی تھی اور جولیٹ سے جمیلہ اسد اللہ بن چکی تھی تو اسے احساس ہوتا تھا کہ زندگی نے بے شک اس سے اپنا خراج وصول کیا تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ وہ اس پر مہربان بھی رہی تھی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ کہ ایک عورت کے لیے اپنی عصمت سے بڑھ کر کچھ قیمتی نہیں ہوتا لیکن مہاجر کیمپ میں خدمت انجام دیتے ہوئے وہ جتنی تلخ داستانوں سے آگاہ ہوئی تھی، ان کی روشنی میں اسے اپنی تکلیف دوسروں سے بہت کم محسوس ہوئی تھی۔ وہ دنیا کی پہلی یا آخری عورت نہیں تھی جسے ایک بہت برے تجربے سے گزرنا پڑا تھا لیکن وہ ان گنی چنی خواتین میں سے ایک تھی جنہیں اس برے تجربے کے بعد بھی دوبارہ باوقار طریقے سے زندگی گزارنے کا موقع مل گیا تھا اور اس زندگی کے مل جانے کے باوجود بھی ہر وقت جلتے کڑھتے رہنا کفرانِ نعمت کے سوا اور کیا کہلاتا۔ ہونے کو تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ ماجدہ جیسی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی جو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جسم فروشی پر بھی آمادہ ہو گئی تھی، وہ اس مظلوم لڑکی کی طرح بھی ہو سکتی تھی جو نس کے غلاموں کا شکار بننے کے بعد مسخ شدہ لاش کی صورت بے نام و نشان کہیں کسی ویرانے میں پڑی ملتی ہے۔ وہ اس اغوا شدہ لڑکی کی جگہ بھی ہو سکتی تھی جو کسی جابر کے قید خانے میں مسلسل اذیت کے عمل سے گزرتی رہتی ہے اور اپنے لیے کوئی جائے فرار نہیں پاتی۔ اللہ کی مہربانی تھی کہ وہ ان ساری مظلوم عورتوں کے کسی بھی گروہ میں شامل نہیں تھی۔ اسے ایک زخم ضرور لگا تھا لیکن مرہم بھی عطا کیا گیا تھا۔ غمگساری کرنے والے اور آنسو پونچھنے والے بھی میسر تھے۔ یہ سب ہر کسی کو نہیں ملا کرتا تو جسے ملا تھا، کیا اس پر شکر واجب نہیں تھا؟

وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی رہی اور ساتھ ہی پہلی بار اس نے دعا مانگی کہ محب اللہ واپس لوٹ آئے۔ وہ محب اللہ جو اس خاندان کی نسل جاری رکھنے کے لیے واحد وارث رہ گیا تھا اور وہ محب اللہ جو بمبئی کا فاروق تھا۔ جو اس کی راہوں میں اپنی پلکیں بچھائے رکھتا تھا۔ جو اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا لیکن جس کی آنکھیں بولتی تھیں کہ وہ اس سے بے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تحاشا محبت کرتا ہے۔ آج وہ محبت سے لبریز آنکھیں اس کے خیال میں اتریں تو ادراک ہوا کہ وہ خوامخواہ ہی اس سے خوفزدہ تھی۔ وہ جو اس پر دیوانہ وار نثار ہوتا تھا، اس کی بے عزتی کا سامان کیونکر کرسکتا تھا۔ وہ کیسے کسی کو اس کی زندگی کا تاریک گوشہ دکھا سکتا تھا۔ نہیں، وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ وہ عارف جیسا کم ظرف بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کے دامن پر لگے داغ کو اس کی مظلومیت کے بجائے عیب جانتا اور اسے چھوڑ جاتا۔ آج اس کے اندر سے ہی یہ ساری آوازیں آرہی تھیں اور وہ بہت دل سے دعا مانگ رہی تھی کہ محب اللہ واپس لوٹ آئے۔ وہ واپس آجاتا تو اس کی زندگی کو کنارہ ملتا یا نہیں، اس خاندان کو اپنی نسل جاری رکھنے کے لیے اپنا آخری وارث تو ضرور مل جاتا۔ چنانچہ وہ بہت شدت سے دعا مانگ رہی تھی کہ محب اللہ اپنے خاندان میں واپس آجائے۔

☆☆☆

وہ جانے کب سے نہیں سویا تھا۔ فطرت کے تقاضوں کے آگے ہار مان کر کچھ دیر کے لیے آنکھوں کا بند ہوجانا نیند میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ نیند وہ ہوتی ہے جو انسان کے ذہن کو سکون عطا کرے اور تھکے ہوئے جسم کے ہر عضو سے تھکن کو سمیٹ کر انسان کو یوں تر و تازہ کردے کہ جب وہ جاگے تو خود میں معمولاتِ زندگی ادا کرنے کے لیے نئی توانائی اور جوش محسوس کرے۔ عرصہ ہوا وہ ایسی نیند نہیں سو سکا تھا اور رہن کے قتل کے بعد تو اس کے لیے بستر پر کانٹے اگ آئے تھے لیکن آج یہاں اس گھر میں جو اس کے لیے بالکل نیا اور غیر آشنا تھا، اسے دن کے وقت بھی ایسی ٹوٹ کر نیند آئی تھی کہ وہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا اور اٹھا تھا تو دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز پر۔ اتنی گہری نیند سے جاگنے کے بعد لمحہ بھر کے لیے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی تھی کہ وہ کہاں موجود ہے۔

''محب اللہ.....'' دستک دوبارہ ہوئی اور ساتھ ہی پکارا گیا تو وہ چونک گیا۔ اس نے چاند بانو کی آواز شناخت کرلی تھی۔ وہ اسے محب اللہ کہہ کر پکار رہی تھی اور وہ جو برسوں گزرے خود کو اس نام سے پکارے جانے کا عادی نہیں رہا تھا، اسے کیسے ادراک نہ ہوتا کہ وہ کن لوگوں کے درمیان موجود ہے جو اسے محب اللہ کہہ کر بلایا جارہا ہے۔ وہ یکدم ہی نیند کے خمار سے نکل آیا اور صاف اور قدرے بلند آواز میں بولا۔

''اندر آجاؤ چاند بانو۔'' اس کا جواب سنتے ہی دروازہ کھلا اور چاند بانو کمرے میں آگئی۔ سورج ڈھل چکا تھا اور شام نے ہر طرف اپنے پَر پھیلا لیے تھے اس لیے کمرے میں نیم تاریکی سی تھی۔ چاند بانو نے بٹن دبا کر بتی روشن کی اور اس کی طرف رخ کرکے بولی۔

''ہم معذرت چاہتے ہیں کہ آپ کے آرام میں مخل ہوئے لیکن آپ کے والد اور چچا جان کی بے چینی کے خیال سے آپ کو زحمت دینی پڑی۔ آپ کے والد صاحب جاگ چکے ہیں اور بے تاب ہیں کہ ایک بار پھر آپ کو اپنے روبرو دیکھیں۔ آپ کا آجانا ان کے لیے اتنی بڑی خوشی ہے کہ وہ بے یقینی کا شکار ہورہے ہیں اور انہیں وہم سا ہورہا ہے کہ انہوں نے سچ مچ آپ سے ملاقات کی ہے یا کوئی خواب دیکھا ہے۔ آپ کے چچا جان بھی آپ کی آمد کی اطلاع سن کر بہت خوش ہوئے ہیں اور بار بار ہم سے دریافت کررہے ہیں کہ آپ نیند سے جاگ گئے ہیں یا نہیں۔ آپ کے بزرگوں کی بے چینی و بے قراری دیکھ کر ہی ہم مجبور ہوئے ہیں کہ آپ کی نیند میں مخل ہوں۔'' چاند بانو نے بہت معذرت خواہانہ انداز میں اسے جگانے کی وجہ بیان کی۔

''تم نے بہت اچھا کیا جو مجھے جگا دیا بلکہ تمہیں پہلے ہی یہ کام کرلینا چاہیے تھا۔ خوامخواہ ابا جان اور چچا جان کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی۔''

''ہم شاید یہ گستاخی کر جاتے لیکن دونوں بزرگوں کو آپ کے آرام کا خیال تھا اور انہوں نے خود ہمیں آپ کو جگانے سے منع فرما دیا تھا۔ اب بھی ہم نے خود اپنی صوابدید پر آپ کو جگایا ہے کہ ہم اتنے تو آپ کے مزاج آشنا ہیں کہ سمجھ سکیں، آپ کیا پسند فرمائیں گے۔'' چاند بانو نے مسکراتے ہوئے اسے جواب دیا اور مزید بولی۔ ''باتیں اور وضاحتیں بہت ہوچکیں۔ اب آپ جلدی سے تیار ہوکر گول کمرے میں آجائیں، ہم وہاں چائے گلوار ہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، بس پانچ منٹ میں پہنچتا ہوں۔'' اس نے چاند بانو کو تسلی دی تو وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے بھی اسد اللہ سے ملنے کی بے چینی تھی اور اتنے عرصے سے خود کے لیے ترسے ہوئے باپ کی پیاس کا احساس بھی تھا اس لیے پانچ منٹ سے بھی کم عرصے میں تیار ہوکر گول کمرے میں پہنچ گیا۔ دونوں بھائی وہاں اس کے منتظر تھے۔ اسد اللہ اسے دیکھ کر خود اپنی جگہ سے کھڑے ہوگئے اور اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ وہ بھی بے قراری اور گرم جوشی سے ان کھلی بانہوں میں سما گیا۔

''آپ تو بہت انا پرست نکلے محب اللہ! اتنا انتظار کروایا اپنا کہ آنکھیں پتھرانے لگیں۔ آپ کو روبرو پا کر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہمارے دلوں میں خوشی کا جو عالم ہے اگر آپ اسے جان پاتے تو بہت پہلے ہم سے آملتے۔'' ایک بار پھر آنسوؤں میں بھیگی مسکراہٹیں تھیں، لبوں پر مچلتے شکوے تھے اور دلوں میں دھڑکتی محبتوں کے سُر تھے۔ دونوں چچا بھتیجا ایک دوسرے سے اپنے اپنے دل کی کہتے رہے۔ وہ بولا۔

''غلطی تو ہوئی ہے چچا جان! اس عمر کا جوش ہی ایسا تھا کہ اپنے حق اور اصول پر ہونے کے احساس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اجازت ہی نہیں دی لیکن اب اتنا کچھ کھونے کے بعد دل بہت غمگین ہے کہ میں نے اتنے برس اپنے پیاروں سے دور گزار دیے اور واپس لوٹا بھی تو ایسے وقت جب......''

شدتِ جذبات کے باعث وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔ ماں، بھائی، بہن اور دیگر قریبی اعزہ کی شکلیں یکدم ہی آنکھوں کے آگے آگئی تھیں اور دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی کہ اب وہ ان میں سے کسی کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔

''جو ہوا اسے بھول جائیے۔ قسمت میں شاید یہی سب لکھا تھا۔ اب تو ہمیں اپنے غموں کے ساتھ ہی جینے کا ہنر سیکھنا ہے۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کر کے اسد اللہ اسے دلاسا دینے لگے۔

''اسد اللہ ٹھیک کہتے ہیں بیٹا! بیتی ہوئی کو بھلا دینے میں ہی عافیت ہے۔ رب کی مہربانی ہے کہ اس نے دکھوں کے اس اندھیرے میں ہم بھائیوں کو جینے کے لیے خوشی کی ایک ایک کرن عطا کر دی ہے۔ ہم آپ کو پا کر بچھڑوں ہوؤں پر صابر ہو گئے ہیں اور اسد اللہ نے اپنی بیٹی جمیلہ کی صورت میں زندگی بھر کی محرومیوں کا صلہ پا لیا ہے۔ اب ہمارے دلوں میں کوئی شکوہ، کوئی رنج نہیں ہے اور ہم اپنی باقی ماندہ زندگیاں اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھتے ہوئے گزارنا چاہتے ہیں۔''

اس بار صوفے پر خاموشی سے بیٹھ کر بیٹے کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے صفی اللہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور اسے سمجھانے لگے تو وہ ان دونوں کے اطمینان کے لیے آنکھوں سے آنسو پونچھ کر مسکرا دیا۔ ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک بار پھر جمیلہ کے لیے سوالات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اسد اللہ کی بیگم کا اس کے سامنے ہی انتقال ہو گیا تھا اور جب اس نے حویلی چھوڑی تھی، اس وقت تک وہ دوسری شادی پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ اگر انہوں نے اس کے حویلی چھوڑنے کے بعد شادی کی تھی تو ان کی بیٹی کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن اسے یاد تھا کہ چاند بانو اس کے لیے جمیلہ باجی کے الفاظ استعمال کرتی رہی تھی اور اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ جمیلہ ہی اسے مہاجر کیمپ سے یہاں اس کوٹھی میں لے کر آئی تھی تو یہ صاف ظاہر تھا کہ نہ تو کسی چھوٹی بچی کے لیے باجی کا لفظ استعمال کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ کسی مہاجر کیمپ میں رضا کار کے فرائض انجام دے سکتی تھی۔ یہ جمیلہ یقیناً کوئی بالغ لڑکی تھی جو جانے کیسے اسد اللہ کی بیٹی تھی۔ اسد اللہ نے بھی اس کی الجھن کو بھانپ لیا اور اسے اپنے اور صفی اللہ کے درمیان محبت سے بٹھاتے ہوئے بولے۔

''آپ لگ بھگ آٹھ سال کی مدت تک حویلی سے دور رہے ہیں۔ اتنے برسوں میں بہت سی تبدیلیاں اور واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ آپ سب سے ایک دم واقف نہیں ہو سکتے۔ آہستہ آہستہ سب جان لیں گے، فی الحال بس اتنا جان لیجیے کہ جمیلہ ہماری بچھڑی ہوئی بیٹی ہیں جو اللہ کی مہربانی سے ہم تک پہنچ گئیں اور آپ سے ملنے کا بھی وسیلہ بن گئیں۔ انہوں نے ہی تو آپ کے لڑکپن کی تصویر سے شناخت کر کے بتایا تھا کہ آپ فاروق کے نام سے بمبئی میں ربن دادا نامی ایک غنڈے کے اڈے پر رہ رہے ہیں اور اس اطلاع کو پا کر ہم فوراً آپ کو واپس حویلی لے جانے کے لیے بمبئی روانہ ہو گئے تھے لیکن اس وقت آپ سے ملنا نصیب میں نہیں تھا اور بہت سے دوسرے دکھوں کا بھی سامنا کرنا تھا۔ خوشی کے اس موقع پر ہم ان دکھوں کو دہرانا نہیں چاہتے اس لیے ساری داستانیں بعد میں سنانے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ ابھی آپ چائے نوش فرمائیں۔ بیٹی چاند بانو نے آج چائے پر خصوصی اہتمام کیا ہے۔'' ملازم کے ساتھ پُرتکلف چائے کے لوازمات سے سجی ٹرالی لے کر اندر آتی چاند بانو کو دیکھ کر اسد اللہ کو موضوع بدلنے کا موقع مل گیا۔

''چاند بانو کے ہاتھ کے ذائقے کی گواہی تو میں بھی دے سکتا ہوں لیکن کیا جمیلہ چائے پر ہمارا ساتھ نہیں دیں گی؟'' اسے بھی تجسس تھا اپنی چچازاد کو دیکھنے کا۔

''چاند بانو سے ہمارے علم میں آیا ہے کہ آج جمیلہ بیٹی ذرا زیادہ تھک گئی تھیں اس لیے اپنے کمرے میں آرام فرما رہی ہیں۔ انہیں تو ابھی تک آپ کی یہاں موجودگی کے بارے میں بھی علم نہیں ہے۔ علم ہوگا تو بہت خوش ہوں گی۔ آخر انہوں نے ہی تو سب سے پہلے ہمیں آپ کے بارے میں بتایا تھا ورنہ اتنے برسوں میں ہم میں سے کوئی کہاں آپ تک پہنچ پایا تھا۔'' اسد اللہ نے اس کی بات کا جواب دیا تو اس کے تجسس میں مزید اضافہ ہو گیا کہ آخر یہ جمیلہ کون ہے جو بمبئی میں اس کی ربن کے اڈے پر موجودگی سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

واقف تھی۔ اس کا دھیان جولیٹ کی طرف بھی گیا۔ جولیٹ کے بارے میں اس کا قیاس تھا کہ وہ بمبئی سے نکل کر حیدرآباد ان کی حویلی گئی ہے لیکن اس سے آگے اس کے بارے میں کچھ پتا ہی نہیں چل سکا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی تلاش میں جانے والا جانی بھی لوٹ کر اڈے واپس نہیں آیا تھا اور اس کے متعلق بھی اندیشہ محسوس کیا جارہا تھا کہ کہیں وہ فسادات کی زد میں نہ آگیا ہو۔

''انشاء اللہ رات کے کھانے پر آپ کی جمیلہ بیٹی سے ملاقات ہوگی۔ اپنی تعلیم یافتہ اور روشن خیال عم زاد سے مل کر یقیناً آپ خوشی محسوس کریں گے۔'' اس کی الجھن سے بے نیاز اسد اللہ اپنی ہی بول رہے تھے۔ چاند بانو مستعدی سے سب کو چائے کے لوازمات پیش کرتی جارہی تھی اور عموماً خاموش رہنے والے صفی اللہ خاموش بیٹھے تیکھی نظروں سے بیٹے کو تکنے میں مصروف تھے۔ وہ چاہنے کے باوجود کسی سے جولیٹ کے بارے میں سوال نہیں کرسکا اور موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

''اس بھاری بھرکم چائے کے بعد رات کے کھانے کی گنجائش نکالنے کے لیے تو کافی وقت لگے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے باہر جاکر کسی سے ملاقات کرآؤں۔ اصل میں وہ ایک لڑکی کیتھرائن ہے جو میری بیماری کے زمانے میں میری دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ وہ ایک اچھی نرس ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی انسان بھی ہے۔ میں نے خود سے پہلے بہ اصرار اسے پاکستان بھجوایا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں جیسے ہی پاکستان پہنچوں گا، اس سے فوراً رابطہ کروں گا لیکن مجھے آپ لوگوں سے ملنے کی بے چینی زیادہ تھی اس لیے پہلے یہاں چلا آیا۔ دہلی سے ایک دوست کے ذریعے اسے میری یہاں آمد کی اطلاع مل گئی ہوگی اور وہ پریشان ہوگی کہ میں اس کے پاس کیوں نہیں پہنچا اس لیے اس وقت اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔'' وہ بول رہا تھا اور اسد اللہ کے چہرے پر تشویش کے رنگ در آئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کون ہے وہ لڑکی جسے محب اللہ اتنے برسوں بعد اپنے خاندان میں لوٹنے کے باوجود بھی فراموش نہیں کرپایا اور ابھی جبکہ ملاقات تشنہ ہے، وہ اس لڑکی سے ملنے جانا چاہتا ہے۔ بھتیجے کو دیکھتے ہی ان کے دل میں ایک بار پھر اس خواہش نے انگڑائی لی تھی کہ وہ اسے اپنی بیٹی کا جیون ساتھی بنائیں گے لیکن اگر وہ کسی اور کی طرف مائل تھا تو وہ کیسے اسے اپنی جولی کی زندگی میں شامل کرسکتے تھے۔

''کیتھرائن کو ہماری طرف سے بھی پوچھیے گا بلکہ ہو سکے تو اسے یہاں لے کر آجایئے گا۔ وہ بھی سب سے مل کر بہت خوش ہوگی۔'' چاند بانو فاروق کی نرس کی حیثیت سے کیتھی سے مل چکی تھی اس لیے فوراً اس کے لیے پیغام جاری کیا۔ اسد اللہ کی گھر آمد کے بعد جبکہ وہ سو رہا تھا، چاند بانو نے دونوں بھائیوں کو اپنی محب اللہ سے شناسائی کے بارے میں مختصراً آگاہ کردیا تھا، اس لیے وہ ان دونوں کے درمیان بے تکلف روّیوں پر حیران نہیں تھے۔

''جلدی واپس آجایئے گا بیٹا۔ ابھی ہماری نظریں آپ کی دید سے پوری طرح سیراب نہیں ہوئی ہیں۔'' صفی اللہ باپ تھے اور ان کی فکر اور سوچ سب سے مختلف تھی۔ ایک باپ کے لیے اس کی اولاد سے بڑھ کر کیا ہوتا ہے اور وہ تو سب کچھ لٹ جانے کے بعد بس آخری پونجی کی طرح انہیں ملا تھا۔

☆☆☆

''تھینک گاڈ فاروق بھائی آپ پہنچ گئے۔ میں آپ کے لیے بہت وری تھی۔ ڈیلی چرچ جاکر گاڈ سے پرے کرتی تھی کہ آپ سیفلی پاکستان پہنچ جائیں۔ آپ کو آنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی نا؟'' وہ کیتھرائن سے ملنے کے ارادے سے نکلا تو اسد اللہ نے گاڑی مع ڈرائیور اس کے حوالے کردی۔ وہ اپنے پاس موجود ایڈریس کی مدد سے پہلے اس کے رہائشی ہاسٹل پہنچا، وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ ڈیوٹی پر ہے تو اس سے ملنے اسپتال پہنچ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور خواتین کی روایت کے مطابق فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

''یہ تمہاری اور میرے دوسرے خیرخواہوں کی دعائیں ہی تھیں جو میں ڈھیروں مشکلات کے باوجود خیریت سے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگیا اور ہر مشکل خود بخود ہی آسان ہوتی چلی گئی۔ اب میرے سامنے ایک نئی زندگی ہے۔ یہاں مجھے میرے گھر والے مل گئے ہیں اور میرا ارادہ ہے کہ اب میں ان کی خوشیوں کے لیے جیوں گا۔ میں نے بہت سال انہیں اپنی جدائی کے دکھ سے رلایا ہے، اب ان کا حق ہے کہ وہ میری ذات سے خوشیاں حاصل کریں۔'' اس نے کیتھرائن کو جواب دیتے ہوئے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔

''سچ فاروق بھائی! آپ یہاں اپنے گھر والوں کے ساتھ ہیں؟ کون کون ہے آپ کے گھر میں؟ آپ نے تو کبھی اپنے بارے میں کچھ ڈھنگ سے بتایا ہی نہیں۔'' کیتھرائن اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''جہاں تھا وہاں رہ کر اپنے خاندان کا ذکر نہیں کر سکتا تھا۔ بمبئی کا ایک غنڈا بھلا کیسے بتا سکتا تھا کہ وہ نواب سلیم اللہ کا پوتا اور نواب صفی اللہ کا بیٹا محب اللہ ہے۔ بہت عزت دار خاندان تھا میرا جسے میں اپنے اصولوں کی خاطر چھوڑ آیا تھا اور اب اپنے لوگوں میں واپس لوٹا ہوں تو گنتی کے چند لوگ ہی باقی بچے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت اپنی من مانی کر لی، اب میں اپنے پیاروں کی خوشی کے لیے جینا چاہتا ہوں۔'' وہ مختصراً کیتھی کو اپنے خاندان کے بارے میں بتاتا چلا گیا۔

''ویری سیڈ۔ بہت بڑے کرائسس سے گزری ہے آپ کی فیملی۔ آپ کو واقعی ان کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔'' سب سن کر کیتھی نے تبصرہ کیا۔

''میں ایسا ہی کروں گا..... تم ایک مزے کی بات سنو! وہاں مجھے چاند بانو بھی ملی ہے۔ اسے میری کزن جمیلہ ایک مہاجر کیمپ سے لائی ہے اور وہ میری فیملی کے ساتھ بہت ہنسی خوشی رہ رہی ہے۔'' اس نے کیتھرائن کو ایک اور اطلاع دی۔

''دس از آ ویری گڈ نیوز۔ مجھے بھی اس کا خیال آتا تھا کہ وہ نجانے کہاں ہوگی۔ تھینک گاڈ کہ وہ بمبئی کی پولیس کے ہاتھ نہیں لگی۔'' چاند بانو کے بارے میں اطلاع سن کر کیتھرائن بھی خوش ہوگئی۔ بھائیہ سیٹھ سے حساب کتاب کے لیے فاروق نے چاند بانو کی مدد لی تھی اور اس کے بعد سے وہ منظر سے غائب تھی تو دوسروں کے ساتھ ساتھ کیتھرائن بھی اس کے لیے فکرمند تھی۔

''چاند بانو نے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ کوٹھی لے کر آؤں۔'' اس نے کیتھی کو بتایا۔

''وہاں تو مجھے جانا ہی ہے۔ آپ کی فیملی سے ملے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں میں۔ ڈیوٹی پر نہیں ہوتی تو ابھی آپ کے ساتھ چلتی، خیر کل ملوں گی۔ ابھی آپ کو کسی سے ملواتی ہوں۔ آپ کو مل کر خوشی ہوگی۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ حیران ہوا کہ یہاں اسپتال میں ایسا کون ہو سکتا ہے جس سے کیتھی اسے ملوانا چاہتی ہے۔ وہ منتظر نظروں سے انتظار گاہ کے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ تین چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کیتھی سفید کوٹ میں ملبوس خوش شکل نوجوان کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ نوجوان کے گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکا ہوا تھا اور اسے دیکھتے ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے۔

''ہیلو مسٹر فاروق! مجھے بہت شوق تھا آپ سے ملنے کا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں بہت شدت سے آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا کہ یہ میرے فیوچر کا سوال تھا۔'' نوجوان ڈاکٹر نے بڑی گرم جوشی سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور شوخ سے لہجے میں بولا تو اس نے اس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے کے لیے کیتھی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر رنگ بکھرے ہوئے تھے اور یہ رنگ بڑی انوکھی سی کہانی سنا رہے تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ کچھ اور بھی جھینپ گئی اور شرمائی سی آواز میں نوجوان کا تعارف کروانے لگی۔

''یہ ڈاکٹر داؤد ہیں فاروق بھائی۔ کچھ عرصے پہلے ہی ہاؤس جاب کمپلیٹ ہونے پر یہ ہاسپٹل جوائن کیا ہے۔ بہت محنتی اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں۔''

''پورا تعارف کرواؤ کیتھی ڈیئر بلکہ میں بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے مسٹر فاروق کہ میں ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ان صاحبہ کا امیدوار بھی ہوں لیکن ان کی شرط تھی کہ پہلے ان کے بھائی صاحب تشریف لا کر مجھے اوکے کریں گے پھر ہی یہ میرا پروپوزل ایکسیپٹ کریں گی تو میں بھی بڑی پابندی سے ان کے ساتھ چرچ جا کر آپ کی آمد کی پرے کیا کرتا تھا۔ بائے گاڈ بچپن سے ڈیڈی کی مار کھا کر مشکل سے سنڈے کے سنڈے چرچ جانے والا بندہ زندگی میں پہلی بار اتنی پابندی سے چرچ گیا ہے۔'' اس کے بولنے میں بے ساختگی تھی۔ اسے وہ نوجوان ڈاکٹر اچھا لگا۔ سچ تھا کہ وہ کیتھی کے ساتھ کھڑا جچ رہا تھا اور وہ دونوں ایک پرفیکٹ کپل لگ رہے تھے۔

''آپ نے ڈاکٹر بننے کے لیے کئی سال محنت کی ہوگی۔ میری اتنی پیاری بہن کا شوہر بننے کے لیے آپ کو یہ تھوڑی سی زحمت تو اٹھانی ہی چاہیے تھی..... اور ہاں، یہ تم مجھے مسٹر مسٹر کہہ کر کیوں پکار رہے ہو؟ کیتھی کی طرح تمہیں بھی مجھے بھائی کہنا چاہیے۔'' اسے ڈاکٹر داؤد اچھا لگا اس لیے فوراً ہی تکلف کی دیواریں گرا کر اس سے اپنایت کا اظہار کر ڈالا۔

''یا ہو! اس کا مطلب ہے کہ آپ نے مجھے اوکے کر دیا؟ دیکھا کیتھی! میں کہتا تھا نا کہ مجھ جیسے بانکے سجیلے نوجوان کو تمہارے بھائی ریجیکٹ کر ہی نہیں سکتے۔'' ڈاکٹر داؤد کے لہجے کی شوخی اس کا جواب سن کر مزید بڑھ گئی اور وہ چہکنے لگا۔

''زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو برخوردار! پہلے پراپر طریقے سے پروپوزل لے کر آؤ پھر ہی ریجیکشن یا ٹکلیکشن کا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فیصلہ سنایا جائے گا۔ کیتھی سے تمہیں گھر کا ایڈریس مل جائے گا۔'' اس نے خود پر مصنوعی سنجیدگی و بزرگی طاری کرتے ہوئے ڈاکٹر داؤد کو ٹوکا اور پھر کیتھرائن سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تم کل شام میں تیار رہنا کیتھرائن۔ ڈرائیور تمہیں تمہارے ہاسٹل سے پک کر کے میرے پاس کوٹھی لے آئے گا۔ ہم ڈاکٹر داؤد اور ان کی فیملی کو وہیں انوائٹ کریں گے۔''

اس کی ہدایات سن کر کیتھی نے فوراً فرمانبرداری سے سر ہلایا البتہ ڈاکٹر داؤد کی شوخی ذرا بجھ سی گئی تھی۔ اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتی کیتھرائن ہنسی روکنے کی جدوجہد میں خاصی بے حال ہو رہی تھی۔

''میں چلتا ہوں۔ تم لوگ اپنی ڈیوٹی کرو، میرا بھی گھر پر انتظار ہو رہا ہوگا۔'' اس نے اپنے لہجے کی سنجیدگی کو برقرار رکھا اور ڈاکٹر داؤد سے مصافحہ کرنے کے بعد کیتھی کے سر پر ہاتھ رکھ کر باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ربن کے ساتھ رہ کر اس نے انسانوں کو پڑھنے کا اتنا ہنر تو سیکھا تھا کہ ڈاکٹر داؤد کے بارے میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک شریف اور اچھا نوجوان ہے جو کیتھی کے ساتھ مخلص ہے۔ اس نے پہلے مرحلے میں ہی اسے کیتھی کے لیے ''او کے'' کر دیا تھا اور داؤد سے جو کچھ کہا تھا، محض اسے چھیڑنے کے لیے کہا تھا اور اس نے دیکھ لیا تھا کہ اتنی سی بات پر داؤد کیسے بجھ گیا تھا، یعنی وہ کیتھی کے لیے اتنی شدت سے خواہاں تھا کہ اسے پانے میں معمولی سی رکاوٹ کا اندیشہ بھی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اسے کیتھی جیسی پیاری لڑکی کے لیے جس نے ساری عمر محرومیوں میں گزاری تھی، ایسے ہی چاہنے والے ساتھی کی خواہش تھی اور اس کے دل نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ ڈاکٹر داؤد کیتھی کے لیے ایک بہت اچھا جیون ساتھی ثابت ہوگا۔

☆☆☆

جولی عجیب سے احساسات کا شکار تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ اسد اللہ کی پریشانی کے خیال سے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے کمرے سے باہر نکل آئی تھی اور اس وقت اسد اللہ نے خوشی سے چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ اسے اطلاع دی تھی کہ ان کا پیارا اور لاڈلا بھتیجا محب اللہ واپس آ گیا ہے۔ وہ اس اطلاع پر حیران رہ گئی کہ اسے دعا مانگے چند گھنٹے بھی نہیں گزرے اور اس کی دعا قبول بھی ہو گئی۔ اسد اللہ نے اس کی کیفیات سے بے خبر اس سے فرمائش کی کہ محب اللہ کو لوکی کا حلوا بہت پسند ہے، اس لیے وہ اپنے ہاتھوں سے رات کے کھانے میں یہ ڈش تیار کر دے۔ وہ اسد اللہ کو ایک دو دفعہ یہ حلوا بنا کر کھلا چکی تھی اور انہیں بہت پسند آیا تھا، اسی لیے اس وقت انہوں نے بھتیجے کے لیے اس سے فرمائش کی تھی۔ اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی چنانچہ فوراً باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ اسد اللہ نے اسے بتا دیا تھا کہ محب اللہ کسی سے ملاقات کے لیے گئے ہوئے ہیں اس لیے آج رات کا کھانا قدرے تاخیر سے تناول کیا جائے گا لیکن کئی مراحل سے گزر کر بننے والے حلوے کو کچھ وقت درکار ہوتا تھا اس لیے اس نے کھانے میں وقت ہونے کے باوجود فوری طور پر باورچی خانے کا رخ کر لیا۔ وہاں چاند بانو پہلے ہی سے موجود تھی اور خانساماں کو باہر نکال کر خود بڑے جوش و خروش اور لگن سے کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی۔

''کیا پک رہا ہے؟'' اس نے چاند بانو کی بے حد مصروفیت کو دیکھتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

''نرگسی کوفتے، کچے گوشت کی بریانی، مٹھی کباب، بگھارے بیگن، فیرنی اور اس کے علاوہ رائتہ، سلاد اور چٹنیاں وغیرہ۔'' چاند بانو نے مصروف سے انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''اتنا سب کچھ ایک ساتھ کیسے بناؤ گی تم؟ خانساماں کو بھی باہر نکال رکھا ہے۔'' مسینیوسن کراس نے حیرت کا اظہار کیا۔

''سہ پہر سے مصروف ہیں۔ کافی کچھ تیار بھی کر لیا ہے۔ صرف بریانی کو دم لگانے اور کباب تلنے کا کام ہی روک رکھا ہے۔ ابھی یہ سلاد اور چٹنیوں سے فارغ ہو جائیں تو اس کام کو بھی نمٹا لیں گے۔ تھوڑی سی تاخیر اس لیے کی ہے کہ عین کھانے کے وقت ہی تیار ہو اور گرم گرم تناول کیا جا سکے۔'' ہاتھوں سے مسل کر املی کا گودا نکالتے ہوئے چاند بانو نے اسے جواب دیا۔ کھانا پکانے کے کام سے اسے پہلے بھی دلچسپی تھی اور یہاں کوٹھی میں رہ کر اس نے حیدر آبادی خانساماں سے بھی کافی کچھ بنانا سیکھ لیا تھا اور آج اپنی پوری مہارت کا اظہار کرنے کے لیے تیار تھی۔

''ایسی کیا مصیبت آ گئی تھی جو ایک ساتھ ہی اتنا سب کچھ تیار کر ڈالا۔ ایک دو ڈشز سے بھی کام چل جاتا ہے۔'' اس نے اعتراض کیا۔

''ہمارا بس چلتا تو اور بھی نہ جانے کیا کچھ تیار کر لیتے لیکن سوچا اب تو روزانہ ہی موقع ملے گا ان کی خدمت کا۔ آہستہ آہستہ ہر چیز بنا کر انہیں کھلاتے رہیں گے۔ نہ جانے بے چارے کب سے گھر کے کھانے کو ترسے ہوئے ہوں گے۔'' چاند بانو کے لہجے میں کھنک اور ہونٹوں پر حیا آلود

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مسکراہٹ تھی۔ لوکی کش کرتے ہوئے وہ اپنی جگہ ٹھٹکی۔ اپنی اندرونی کیفیات کے باعث وہ بھول گئی تھی کہ دوپہر میں جب وہ گھر واپس آئی تھی تو چاند بانو نے اسے اپنے محبوب کی آمد کی اطلاع دی تھی اور ابھی کچھ دیر قبل اسد اللہ نے اسے محب اللہ کی آمد سے آگاہ کیا تھا۔ تو کیا محب اللہ ہی ..... اپنے ذہن میں آنے والے خیال پر اس نے ایک بار پھر چاند بانو کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اپنے چہرے کے داغ کے باوجود بھی وہ خوبصورت ہی لگا کرتی تھی لیکن آج تو بات ہی کچھ الگ تھی۔ یوں لگتا تھا کہ قوس قزح کے سارے رنگ اس پر برس رہے ہوں یا سورج کی روشنی میں رکھا کوئی شفاف ہیرا ست رنگی روشنیاں منعکس کررہا ہو۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر چاند بانو کے قریب گئی اور اس سے پوچھا۔

''کیا محب اللہ ہی وہ شخص ہیں جو تمہارے دل میں بستے ہیں؟'' سوال سن کر چاند بانو کے چہرے نے مزید رنگ بکھیرے اور ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا کیے بغیر اس نے اپنی گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ اس کا جواب پاکر وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اسے ادراک ہوا کہ وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ محب اللہ اس کی دعاؤں کے نتیجے میں واپس لوٹ آیا ہے تو یہ اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ تو چاند بانو کی دعاؤں کا حاصل تھا اور اس کے دعا مانگنے سے پہلے آ بھی چکا تھا۔

''سن کر حیرت ہوئی نا۔ ہم تو خود اپنی جگہ حیران ہیں کہ وہ رب ملانے پر آئے تو کیسے سلسلے بناتا چلا جاتا ہے۔ پہلے وہ ہمیں آپ کی مدد سے یہاں لے آیا اور پھر وہ آپ کے عم زاد کی حیثیت سے یہاں چلے آئے۔ اگر آپ ہمیں یہاں نہ لائی ہوتیں تو ہماری ان سے ملاقات کیونکر ہوپاتی۔'' اپنی دھن میں مگن چاند بانو بولتی جارہی تھی۔ وہ آہستہ سے پلٹی اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوتے ہوئے بولی۔

''اللہ نے جب تم دونوں کی ملاقات طے کررکھی تھی تو اسے ہر حال میں ہونا ہی تھا۔ میں تمہیں یہاں نہیں بھی لاتی تو اللہ پھر بھی کسی نہ کسی طرح محب اللہ کو تم تک پہنچا ہی دیتا۔''

''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اپنی حقیر ذات پر اللہ کی اس مہربانی کے لیے ہم اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔'' چاند بانو خود میں اتنی مگن تھی کہ اسے اس کی کیفیت محسوس ہی نہیں ہوئی۔ اس نے بھی تیزی سے خود کو سنبھال لیا اور چاند بانو کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اپنا کام کرتی رہی۔ درمیان میں اس نے چاند بانو کی بھی تھوڑی سی مدد کردی۔ جب انہیں محب اللہ کی واپسی کی اطلاع ملی تو وہ اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہوچکی تھیں۔ آج مقررہ وقت کے مقابلے میں رات کے کھانے میں خاصی تاخیر ہوگئی تھی اس لیے محب اللہ کی آمد کی اطلاع کے ساتھ ہی فوراً کھانا لگایا جانے لگا۔ اس عمل میں بھی چاند بانو پیش پیش تھی۔ وہ اپنا حلیہ درست کرکے آنے کا بہانہ بنا کر قصداً اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ممکن ہوتا تو کھانے کے کمرے میں جاتی ہی نہیں لیکن یہ آداب میزبانی کے بھی خلاف ہوتا اور اسد اللہ کو بھی ناگوار گزرتا پھر ایک گھر میں رہ کر کب تک چھپا جاسکتا تھا۔ وہ خود کو مضبوط کرتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکل کر کھانے کے کمرے کی طرف بڑھی۔ راستے میں ہی اسے اچانک چاند بانو مل گئی۔

''بہت دیر لگادی آپ نے جمیلہ باجی! نواب صاحب مسلسل آپ کو پوچھ رہے ہیں۔'' اسے دیکھ کر چاند بانو نے اس سے کہا تو وہ بس مسکرا کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے اسد اللہ نے اسے دیکھا اور بولے۔

''کہاں رہ گئی تھیں جمیلہ بیٹی! کھانے پر بے چینی سے آپ کا انتظار ہورہا ہے۔ محب اللہ سے آپ کی ملاقات بھی کروانی تھی۔'' پھر انہوں نے اپنے پیارے بھتیجے کی طرف رخ موڑا کہ اسے اپنی بیٹی سے متعارف کروا سکیں لیکن اس کی تو حالت ہی عجیب تھی۔ حیرت کی زیادتی کے باعث وہ اردگرد کو فراموش کرکے اپنی جگہ سے کھڑا ہوچکا تھا۔ اسد اللہ اس کی حیرت کی وجہ سمجھ کر مسکرادیے اور دھیرے سے کھنکھارتے ہوئے بولے۔

''اتنے حیران کیوں ہورہے ہیں محب اللہ! آپ نے انہیں صحیح شناخت کیا ہے۔ یقیناً آپ انہیں جولیٹ کی حیثیت سے جانتے ہوں گے لیکن اب یہ ہماری جمیلہ ہیں۔ جمیلہ اسد اللہ.....'' انہوں نے بول کر گویا اس کا سکتہ توڑ دیا۔ اس نے ایک نظر پھر اسے دیکھا جو دل کی راجدھانی پر بلا شرکت غیرے حکومت کرتی تھی۔ جس کا ہر روپ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا اور جو آج ایک بدلے ہوئے روپ میں بھی اس کی دھڑکنوں کو منتشر کررہی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کا کرتہ، چوڑی دار پاجامہ اور سر پر سلیقے سے جما لباس کا ہم رنگ دوپٹا جس کے کناروں پر گہرے سبز رنگ کی قریشیے کی بیل بنی ہوئی تھی، اس پر بہت جچ رہا تھا۔ وہ کم یا زیادہ کا فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ماضی میں زیادہ اچھی لگتی تھی یا آج زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ اسے ہمیشہ ہر روپ میں بہت اچھی لگتی تھی، سو آج بھی بہت اچھی لگ رہی تھی کہ اصل بات تو دل کی تھی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور دل پہلی دید سے لے کر آج تک اسی کا دیوانہ تھا۔

''آداب۔'' اس نے محب اللہ کی خود پر جمی نظروں کو محسوس کیا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر آہستہ سے بولی تو وہ چونک گیا۔

''تسلیمات۔'' بہ مشکل جواب دے کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھا اور نظروں کو زبردستی اس کے چہرے پر سے ہٹنے پر مجبور کیا کہ بزرگوں کی موجودگی میں یوں اسے دیکھنا خلافِ ادب شمار کیا جاتا۔

''آیئے بیٹی! آپ ہمارے ساتھ بیٹھیے۔'' صفی اللہ نے بیٹے کو اپنے دائیں ہاتھ پر بٹھا رکھا تھا۔ بھتیجی کو بائیں جانب کی خالی کرسی پر بٹھالیا۔ انہیں اچھی طرح یاد تھا کہ انہوں نے بھائی سے کہا تھا کہ اگر ان کا محب اللہ موجود ہوتا تو وہ ان کی بیٹی کو اپنی بہو بنا لیتے۔ اللہ نے انہیں ان کا محب اللہ لوٹا دیا تھا تو وہ اپنا قول کیونکر یاد نہ رکھتے۔ انہوں نے آج اسے بھتیجی نہیں، بہو کی نظر سے دیکھا تھا اور اس روپ میں وہ انہیں پہلے سے بھی زیادہ پیاری لگی تھی۔

''ارے بھئی چاند بانو! آپ کیوں اب تک کھڑی ہوئی ہیں۔ تشریف رکھیے، آپ بھی اس گھر کی فرد ہیں اور ہمارے لیے بیٹی جیسی ہی ہیں۔'' محب اللہ کی نظروں میں جو کچھ تھا، وہاں موجود افراد میں سے چاند بانو ہی وہ واحد فرد تھی جسے اس کا مکمل ادراک ہوا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ جمیلہ ہی وہ لڑکی ہے جو محب اللہ کے دل میں بستی ہے اور جس کے ہوتے ہوئے وہ کسی کے لیے اپنے دل کے دروازے نہیں کھول سکتا۔ خود پر ہونے والے اس انکشاف پر وہ ٹھٹکی ضرور تھی لیکن اسے برا نہیں لگا تھا۔ جو اس کے محبوب کو پیاری تھی، وہ بنا جانے بھی اسے عزیز رکھتی تھی اور اب جان گئی تھی تو اس پر اور بھی پیار آرہا تھا۔ اس کی پیاری جمیلہ باجی اگر محب اللہ کے دل کی مکین تھی تو اس کے لیے یہ اور بھی خوشی کی بات تھی۔ دو بہت پیاری ہستیاں اگر ایک ہو جائیں تو اس کا بے غرض دل اس ملاپ پر خوش ہونے کے سوا کوئی اور جذبہ محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ محبت میں بے غرضی کا سبق وہ عرصہ ہوا سیکھ چکی تھی اور جو بے غرض ہو، وہ حسد محسوس نہیں کرتا۔ اسے بھی جمیلہ اسد اللہ سے کسی قسم کا حسد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''ہیلو جولیٹ! میں ثنا بات کر رہی ہوں۔'' ریسیور سے سنائی دیتی کمزوری آواز سے ظاہر تھا کہ بولنے والی کو بات کرنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے ثنا کا حال دیکھ کر آئی تھی اس لیے اس کی اتنی کمزور آواز پر اسے کوئی تعجب نہیں تھا۔

''کیسی ہو ثنا؟'' وہ اب اپنے ملنے جلنے والوں کو جولیٹ پکارنے سے منع کر کے خود کو جمیلہ کہنے پر اصرار کیا کرتی تھی لیکن ثنا کو ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔

''مجھے کیسا ہونا ہے۔'' ریسیور پر ثنا کی نحیف سی ہنسی سنائی دی۔ ایسی ہنسی جس میں خود اپنے لیے استہزا تھا۔ وہ اس کی ہنسی کی معنویت محسوس کر کے چپ سی ہو گئی۔ کینسر کی آخری اسٹیج پر موجود مریضہ سے اس کا حال دریافت کرنا واقعی ایک بے کار سوال تھا۔

''میں نے تمہیں اس لیے فون کیا تھا کہ تمہیں ایک اچھی خبر سنا سکوں۔ تم ماجدہ کے حوالے سے مجھے ایک ذمے داری سونپ کر گئی تھیں اور میں نے اپنے اختیار کی حد تک اس ذمے داری کو نبھانے کی پوری پوری کوشش کی۔ میری اس کوشش کے پیچھے تمہاری خواہش بھی تھی، عارف کی روح کو سکون پہنچانے کا خیال بھی اور خود اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کی ایک کوشش بھی۔ اللہ کا مجھ گناہ گار پر احسان ہے کہ اس نے مجھے میری کوشش میں کامیاب کیا اور آج میں اس لائق ہوں کہ تمہیں فون کر کے ایک اچھی اطلاع دے رہی ہوں۔''

ثنا نے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے خود ہی گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ اس کے الفاظ نے جولی کا تجسس بڑھا دیا اور وہ ثنا سے اچھی خبر سننے کے لیے بے چین ہو گئی لیکن ثنا شاید ایک ساتھ اتنا بول کر تھک گئی تھی اس لیے اس نے ذرا سا توقف کیا اور پانی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد بولی۔

''میں نے آغا کو ماجدہ سے نکاح پر راضی کر لیا ہے۔ اب وہ اس کی رکھیل نہیں نکاحی بیوی ہے۔''

''یہ کیسے ہوا؟'' ثنا کی دی خوش خبری خاصی دھماکا خیز تھی۔ وہ حیرت کی زیادتی کے باعث بے ساختہ سوال کرنے سے خود کو نہیں روک سکی۔

''میں نے آغا کو بتایا کہ میں وراثت اور مہر میں ملنے والی اپنی تمام املاک ماجدہ کے نام کر رہی ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ یہ دولت تمہارے قبضے سے نہ نکلے تو تمہیں ماجدہ سے نکاح کرنا ہوگا۔ میری اس بات کے بعد اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' ثنا نے اپنا کارنامہ بیان کیا۔

''ایسی زبردستی کا ساتھ آغا کیسے نبھائے گا۔ وہ ماجدہ کو کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔'' اس نے سن کر تشویش کا اظہار کیا۔ بیوی کی دولت ہتھیانے کے لیے شوہر کے ہاتھوں بیوی کا قتل کوئی انوکھی بات تو نہیں تھی۔

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں۔ میں نے سب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میری طرف سے یہ شرط عائد کی گئی ہے کہ ماجدہ کی موت کی صورت میں جائداد خلاجی اداروں کو منتقل ہوجائے گی البتہ بچے ہونے کی صورت میں بچے اس جائداد کے وارث ہوں گے اور ان کے بالغ ہونے تک آغا کو اس جائداد کی فروخت کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔''

''یہ تو تم نے واقعی آغا کو پھنسا دیا۔ وہ ماجدہ کو سچ مچ بیوی کا درجہ دینے پر مجبور ہوجائے گا۔'' اس نے ثنا کی کار گزاری کو سراہا۔

''میں ماجدہ کے لیے جو بہترین کرسکتی تھی، وہ میں نے کیا۔ ہوسکتا ہے آغا اسے بہت اچھی زندگی نہ دے سکے لیکن وہ حرام کاری کی ذلت سے تو بچ جائے گی۔'' ثنا کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ ثنا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ماجدہ جن حالات میں گھر چکی تھی اس کے لیے اتنا کچھ ہوجانا بھی بہت تھا۔

''آغا نے تم سے پوچھا نہیں کہ تم ایک اجنبی لڑکی کے لیے یہ سب کیوں کررہی ہو؟''

''بالکل پوچھا تھا۔ میں نے سب کچھ بتادیا۔ عارف سے اپنی قلبی وابستگی، ماجدہ کا اس سے رشتہ اور تم سے کی جانے والی اپنی زیادتی..... ہر ہر بات میں نے آغا کے گوش گزار کردی۔ اسے سمجھایا کہ بُرے کام کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ اسے اپنی اور اس کے پی اے کی مثالیں بھی دیں۔ کتنا ہی برا سہی، آخر وہ بھی انسان ہے۔ کچھ نہ کچھ تو اس پر بھی اثر ہوا ہوگا۔'' ثنا نے خود کو تسلی دی یا جانے اسے اطمینان دلایا۔ جواباً وہ بس ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ ماجدہ کے لیے اب فقط دعا ہی کی جاسکتی تھی۔

''ہوسکے تو مجھے معاف کردینا جولی اور دعا کرنا کہ میرے لیے موت آسان ہوجائے۔ میں بہت تکلیف میں ہوں۔'' ثنا نے اس سے درخواست کی تو اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آگئے۔ انسان زندگی سے کتنا پیار کرتا ہے۔ بُرے سے بُرے حالات میں بھی لوگ زندہ رہنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن وہ اپنے منہ سے اپنے لیے موت کی دعا مانگنے کا کہہ رہی تھی۔

''میں نے تمہیں معاف کردیا ثنا! جو تم نے میرے ساتھ کیا وہ ظلم بہت بڑا تھا لیکن میرے رب نے مجھ پر اتنی مہربانیاں کی ہیں کہ مجھ پر تمہیں معاف کرنا واجب ہوگیا ہے۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔ دعا کرتی ہوں کہ آگے میرا رب بھی تمہیں معاف کرے۔'' گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فون بند کردیا کہ اس سے زیادہ اس میں ثنا سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ نازک احساسات کی مالک لڑکی تھی جو کبھی انتقام کے شعلوں میں گھر کر قتل کرنے کا سوچا کرتی تھی لیکن اب اپنے مجرم کو کوئی بددعا تک دینے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی بلکہ وہ تو الٹا اس کی تکلیف پر دکھ محسوس کررہی تھی۔ یہ دکھ اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہہ رہا تھا اور وہ وہیں ٹیلی فون کی تپائی کے قریب رکھی ایک کرسی پر بیٹھ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی۔ اس کوشش میں مصروف اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کوئی اندر آگیا ہے۔

''جمیلہ.....'' وہ خود کو پکارے جانے پر چونک کر متوجہ ہوئی۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس وہ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ اس کے سامنے تھا جسے کبھی اس نے نظر بھر کر دیکھنے کے لائق بھی نہیں سمجھا تھا۔

''آپ روکیوں رہی ہیں جمیلہ! کوئی مسئلہ ہے تو آپ مجھ سے شیئر کرسکتی ہیں۔ میں ہر ممکن طور پر آپ کی مدد کروں گا۔'' اس کی نظریں اور لہجے کی نرمی آج بھی ویسی ہی تھی جو بمبئی میں ایک بار اس کے مخاطب کرنے پر اسے محسوس ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ دلدار آغا کے نام سے بھیجے جانے والے تحائف اور فون کالز کی وجہ سے خاصی پریشان تھی اور اس نے نہ جانے کیسے اس کی پریشانی کو محسوس کرکے خود ایک دن اس سے دریافت کرلیا تھا کہ اگر وہ کسی مشکل میں ہے تو اسے بتاسکتی ہے لیکن اس نے اس کے خلوص کو حقارت سے ٹھکرادیا تھا کہ اس کے نزدیک وہ گلی کا ایک غنڈا تھا۔ آج پھر وہ اپنے خلوص کے ساتھ اس کے روبرو تھا اور آج وہ اس کے ساتھ ماضی جیسا سلوک نہیں کرسکتی تھی کہ آج وہ رہن دادا کے اڈے کا فاروق نہیں، نواب صفی اللہ کے بیٹے محب اللہ کی حیثیت سے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں کہ میں اس طرح یہاں چلا آیا۔ اصل میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں موجود ہیں۔ میں کیتھی کو فون کرنے کے ارادے سے یہاں آیا تھا۔'' اس نے جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی اپنی یہاں موجودگی پر معذرت کرنے لگا۔

''آپ فون کرلیں۔ میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی۔

''نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ پلیز آپ بیٹھیں۔ مجھے کوئی اتنا ضروری فون نہیں کرنا۔ میں تو صرف کیتھی کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا، وہ بعد میں بھی کرسکتا ہوں۔ آپ بیٹھیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی تھیں،

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اچھا ہوا کہ یہ موقع مل گیا۔'' اس نے جولی کو روکا اور خود بھی ایک نشست سنبھال لی۔ اب وہ وہاں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ جب سے وہ آیا تھا، آج پہلی بار وہ دونوں یوں تنہائی میں ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تھے۔ وہ اپنا پورا دن مہاجر کیمپ میں گزارتی اور صرف صبح ناشتے اور رات کے کھانے پر ہی ان کی ملاقات ہو پاتی تھی۔ اس کے بارے میں اسے چاند بانو کی زبانی علم ہوا تھا کہ دن کا بیشتر حصہ وہ اپنے والد اور اسد اللہ کے گھر میں ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ گزارتا ہے یا پھر کبھی کبھی آجاتی ہے تو اس سے گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ کیتھی کو اس نے کوٹھی میں رہنے کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہاسٹل سے اس کے لیے اپنی جاب پر آنا جانا آسان رہتا ہے۔ یہاں سے اسپتال کا فاصلہ زیادہ تھا۔ عذر مضبوط ہونے کی وجہ سے زیادہ زور بھی نہیں دیا جاسکا تھا البتہ یہ طے ہوگیا تھا کہ جب کیتھی شادی کے لیے چھٹیاں لے گی تو کوٹھی منتقل ہوجائے گی اور یہیں سے ڈاکٹر داؤد کے ساتھ رخصت ہوگی۔

''میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن ابا جان اور چچا جان کی موجودگی میں موقع نہیں مل پاتا۔ میں آپ کے دکھ اور آنسوؤں کی وجہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ اللہ کی قسم آپ کا ہر آنسو میرے دل پر انگاروں کی طرح گرتا ہے اور میں ہر روز خود سے عہد کرتا ہوں کہ آپ کے مجرم کو ایسی دردناک سزا دوں گا کہ اس کی روح تک بلبلاتی رہے گی۔ میں نے اس خبیث آدمی کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کرلی ہیں۔ آپ یوں سمجھیں کہ میرا ہاتھ اس کی گردن پر ہے لیکن میں صرف کیتھرائن کی شادی تک رکا ہوا ہوں۔ اس لڑکی کا بہت حق ہے مجھ پر۔ وہ مجھے اپنی سگی بہن جیسی ہی پیاری ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس کی خوشیوں کے رنگ میں بھنگ پڑے۔ وہ رخصت ہوجائے تو پھر اس کے بعد دلدار آغا اس زمین پر دوسرا سانس نہیں لے سکے گا، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' وہ نظریں جھکائے بولتا جارہا تھا۔ جولی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور رخساروں پر آنسوؤں سے بن جانے والے نشانات کو صاف کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

''انسان بڑا جاہل اور جلد باز ہے محب اللہ صاحب۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے جس علم کی بنیاد پر فیصلے کررہا ہے، وہ علم کتنا ناقص ہے اور وہ جس کی ''علیم'' ہونا صفت ہے اور جو ہر شے پر قادر ہے... وہ زیادہ بہتر اور منصفانہ فیصلے کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ میرے معاملے میں بھی اللہ نے انصاف کردیا ہے۔'' وہ اسے تمام تفصیل سے آگاہ کرتی چلی گئی۔

''اف میرے اللہ! رقابت کا جذبہ انسان کو اس درجے تک لے جاتا ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کون یقین کرسکتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے پیچھے ایک عورت کے رقیبانہ جذبات کارفرما ہوں گے۔'' سن کر وہ متحیر رہ گیا۔

''عورتیں تو اپنی چالوں سے بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ الٹ دیتی ہیں۔ عورت کو کمزور سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔ یہ تو آدمی آدمی کا نصیب ہوتا ہے کہ اسے عورت کی نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا محبت کا اور میرے حساب سے آپ بڑے خوش نصیب ہیں محب اللہ کہ آپ سے چاند بانو جیسی بے لوث محبت کرنے والی لڑکی اس دنیا میں موجود ہے۔ جیسی محبت وہ آپ سے کرتی ہے ایسی محبت تو بہت نایاب اور نادر ہوتی ہے۔ آپ کو اس بے لوث محبت کی قدر کرنی چاہیے۔'' وہ بہت سلیقے سے گفتگو کا رخ بدل گئی تھی۔ جس دن سے اسے یہ علم ہوا تھا کہ محب اللہ ہی چاند بانو کا محبوب ہے اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں محب اللہ سے بات کرے گی۔ وہ چاند بانو جیسی پیاری لڑکی کو اس کے دل کی خوشی دینا چاہتی تھی اور پہلے ہی مرحلے پر اپنی اس خواہش سے دستبردار ہوگئی تھی کہ وہ اپنے عم زاد محب اللہ کے ساتھ ایک پُرسکون اور خوشیوں بھری زندگی کا آغاز کرے۔ اس محب اللہ کے ساتھ جو بمبئی کا فاروق تھا اور جس کی نگاہوں نے ہمیشہ اس سے کہا تھا کہ ہم تم پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔

''مجھے چاند بانو کی بے لوث محبت کا اعتراف ہے۔ میں اس کی محبت کی قدر بھی کرتا ہوں لیکن اس سے آگے اپنے آپ کو بے اختیار پاتا ہوں اور چاند بانو کو میری اس بے اختیاری کا علم ہے ورنہ زندگی میں ایک موقع وہ بھی آیا تھا جب چاند بانو کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے میں نے خود اسے شادی کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے میری اس پیشکش کو رد کردیا تھا کہ اس کی بے لوث محبت کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ محض اسے سہارا دینے کے لیے اپنی زندگی میں شامل کروں۔ وہ بہت سمجھدار اور حساس لڑکی ہے جمیلہ۔ جو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ کسی کے دل کی بے اختیاری خود اس کے بس میں نہیں ہوتی تو دوسرا کیسے اسے قابو کرسکتا ہے۔'' محب اللہ کا جواب اسے نظریں جھکانے پر مجبور کرگیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے دل کی کس بے اختیاری کی بات کررہا ہے۔

''میرا نہیں خیال کہ آپ ہمارے بزرگوں کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہمارے حوالے سے خواہش سے ناواقف ہوں گی۔ میں جس دن سے یہاں آیا ہوں، ابا جان مجھے باور کروا رہے ہیں کہ مجھے ان کی بھتیجی کو اپنی دلہن بنانا ہے۔ چچا جان بھی اس رشتے کی خواہش رکھتے ہیں لیکن میں نے ابھی تک کوئی جواب اس لیے نہیں دیا کہ میں پہلے آپ سے بات کرلینا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے مجھے کبھی پسند نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ مجھے اڈے کے آدمی کی نظر سے دیکھتی رہی ہیں۔ اب گو کہ حالات بدل چکے ہیں پھر بھی آپ کو میرا وہ روپ بھولا نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو فیصلہ کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔ آپ نے ماسٹرز کی ڈگری لے رکھی ہے جبکہ میں نے میٹرک سے آگے کوئی امتحان ہی نہیں دیا۔ کتابیں بے شک بہت پڑھیں لیکن میرا مطالعہ آپ کی ڈگری کا تو مقابلہ نہیں کرسکتا نا۔ اس کے علاوہ بھی میری زندگی کے کچھ تاریک گوشے ہیں۔ میں چاہوں تو انہیں چھپالوں لیکن آپ کو دھوکا دینا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہوگا۔'' وہ اسے ربن کے قتل کے بعد اپنی انتقامی کارروائیوں سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ وہ بنا دخل دیے توجہ سے سنتی رہی۔ کئی مقامات پر اس کی آنکھوں سے آنسو بھی بہہ نکلے۔ وہ اپنی کہہ کر خاموش ہوگیا تو رسان سے بولی۔

''آپ نے جو کچھ کیا وہ ایک فطری ردِعمل تھا لیکن کیا آپ نے غور کیا کہ کسی بھی مرنے والے پر آپ نے فیصلہ کن وار نہیں کیا تھا۔ کم از کم ارادی طور پر تو بالکل بھی نہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور مہیش اپنی ہی مزاحمت کی وجہ سے مارا گیا۔ بھاٹیہ سیٹھ دل کے دورے سے مرا۔ مجو اور فیکے پر فیصلہ کن وار دجے نے کیے اور راٹھور کے نرخرے میں پیوست ہونے والا چاقو خود اس کے اپنے ہاتھ میں تھا تو آپ نے تو اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل ہی نہیں کیا پھر آپ اپنے آپ کو قاتل کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' وہ اس کے تجزیے پر دنگ رہ گیا۔ پوری تفصیل سے اسے ربن کے ہر قاتل سے انتقام کی داستان سناتے ہوئے اس بات پر تو اس نے خود بھی غور نہیں کیا تھا کہ کسی بھی مقتول کی ہلاکت کا سبب بننے والا وار اس نے اپنے ہاتھ سے نہیں کیا تھا۔ جولی نے توجہ دلائی تو وہ کچھ دیر دنگ سا بیٹھا رہا پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''تمہارا بہت شکریہ جمیلہ کہ تم نے مجھے بے قصور قرار دینے کی ایک اچھی کوشش کی لیکن میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتا کہ میں اپنے دل میں ان میں سے ہر ایک کو جان سے مارنے کا ارادہ لے کر ہی نکلا تھا۔ یہ تو بس اتفاقات ہی تھے کہ ان کی اموات ایسے انداز میں ہوئیں۔''

''آپ ان اتفاقات کو قدرت کی مہربانی تو قرار دے سکتے ہیں۔ ایسے اقرار آدمی کے دل کا بوجھ ہلکا کردیتے ہیں۔'' وہ اپنی بات پر مصر رہی۔

''تم کہتی ہو تو میں اس زاویے سے بھی سوچ لوں گا لیکن فی الحال مسئلہ میرا نہیں تمہارا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی زبردستی ہو اور تم نہ چاہتے ہوئے میرا ساتھ قبول کرو۔ بزرگوں کی خواہش کا احترام اپنی جگہ لیکن میرے لیے تمہاری رضا سب سے بڑھ کر مقدم ہے۔ تمہیں میری عیوب سے بھری ہستی کو رد کردینے کا پورا حق ہے اور تم اس بات کے لیے بھی فکرمند نہ ہونا کہ انکار کا بوجھ تمہیں اٹھانا پڑے گا۔ میں خود اپنے آپ پر سارا الزام لے لوں گا۔''

وہ بہت حوصلے سے بول رہا تھا پھر بھی جولی اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کرچیاں محسوس کرسکتی تھی۔ کیسا شخص تھا وہ جس نے ایک عرصہ اس سے خاموش محبت کی تھی اور اب اسے یہ محبت ملنے جارہی تھی تو خود اپنی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ آج بھی جولی کے لیے ناقابل قبول ہے اسی لیے اسے اپنی پسندیدگی کے اظہار کا پورا موقع دے رہا تھا۔ وہ ایسا کیوں کررہا تھا؟ صرف اس لیے نا کہ وہ اس سے سچی محبت کرتا تھا..... ایسی محبت جس میں محبوب کا پانا اتنا اہم نہیں ہوتا جتنا اسے خوش دیکھنا اہم ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی جمیلہ کو خوش دیکھنا چاہتا تھا اور جمیلہ یک ٹک اس کی شکل دیکھ رہی تھی۔

گھور سیاہ آنکھیں، کشادہ روشن پیشانی پر گرے سیاہ سلکی بال، مغرور سی کھڑی ناک، خوبصورت ہونٹوں سے اوپر سجی نفاست سے تراشیدہ مونچھیں، اجلی رنگت، دراز قامت کے ساتھ مضبوط ورزشی جسم..... کہاں کوئی کمی تھی اس شخص میں جو اس وقت اس نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کی خاندانی نجابت و شرافت تو اس کے چہرے پر لکھی نظر آتی تھی لیکن وہ کوتاہ نظر تھی جو اس وقت اس تحریر کو پڑھ نہیں سکی تھی اور اسے صرف اڈے کے حوالے سے دیکھتی رہی تھی حالانکہ وہ اڈا بھی کس کا تھا۔ ربن کا..... جس کی انسانیت، ہمدردی اور اصول پسندی کے مظاہرے خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ مجبور ثریا بانو کی مدد سے لے کر اسے اس کے گھر کا کرنے تک کتنا اہم کردار ادا کیا تھا ربن نے۔ جوزف اور جوزفین کی اموات پر بھی وہ اور اس کے اڈے کے لوگ پیش پیش رہے تھے۔ خود جب وہ اپنی زندگی کے سب سے بڑے حادثے سے گزرنے کے بعد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسپتال میں شکستہ حال پڑی ہوئی تھی تو ربن اس کے لیے کیسی چھاؤں بن گیا تھا اور بعد میں بھی اس کے مجرم کی کھوج لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کتنے لوگوں کو اس نے ربن کی دریا دلی کے گن گاتے سنا تھا لیکن اس وقت اس کی آنکھوں پر جانے کیسی پٹی بندھی تھی کہ وہ کچھ دیکھ ہی نہیں پاتی تھی چنانچہ اس نے اپنے اس عم زاد کی اصلیت کو بھی نہیں پہچانا تھا اور آج اپنی اس کم نظری پر آنسو بہا رہی تھی۔

''آپ رو کیوں رہی ہیں جمیلہ..... کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی؟'' اس کے آنسو دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔

''جی ہاں، بہت غلط بات کی ہے آپ نے۔ اپنے عیب گنوا کر مجھے انکار کی اجازت دیتے ہوئے آپ نے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ بے عیب تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ انسانوں میں تو ظاہر اور پوشیدہ بہت سے عیوب ہوتے ہیں۔ میرا عیب دار ہونا بھی تو آپ سے پوشیدہ نہیں۔ کسی سازش کی وجہ سے ہی سہی، میرا دامن داغ دار تو ہوا ہے نا پھر آپ میرے اس عیب کے سبب مجھے رد کیوں نہیں کر دیتے؟''

''میری بات اور ہے۔ میں کسی صورت آپ کو رد نہیں کر سکتا۔'' دھیرے سے بولتے اس کا چہرہ اندرونی جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

''کیوں رد نہیں کر سکتے..... مجھے وجہ بتائیں؟'' اس نے جرح کی۔

''میں اس لیے آپ کو رد نہیں کر سکتا کہ میں آپ سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں اپنے دل کی بے اختیاری کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ میرے لیے جو آپ ہیں، وہ دنیا میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ صرف آپ ہی ہیں جو میری ذات کی تکمیل کر سکتی ہیں۔ میرے دل کی ہر دھڑکن آپ کے نام کا راگ الاپتی ہے۔ میری آنکھوں کو صرف آپ کے خواب دیکھنے کی عادت ہے۔ میری سانسیں صرف آپ کی خوشبو سے مہکتی ہیں۔'' وہ بولنا شروع ہوا تو بولتا چلا گیا اور وہ کسی سحر زدہ سے انسان کی طرح سنتی چلی گئی۔ اس نے محب اللہ کی آنکھوں میں لکھی تحریر بھی پڑھی تھی، اسے چاند بانو نے بھی بہت بار بتایا تھا کہ وہ اس کے عشق میں کس حد تک ڈوبا ہوا تھا لیکن آج اس کی زبان سے سن کر الگ ہی سرشاری محسوس ہو رہی تھی اور وہ خود اپنے دل کی بدلتی ہوئی تال کو محسوس کر رہی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم کہ صرف آپ کو دیکھ کر میں آپ سے اتنی محبت کیسے کرنے لگا۔ ہو سکتا ہے یہ محبت اللہ نے میرے دل میں ڈالی ہو۔ ہو سکتا ہے یہ خون کی کشش ہو یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ دخل میری اس پہلی ٹیچر کی محبت کا ہو جن کا میں گرویدہ تھا اور جو حسن اتفاق سے آپ کی والدہ تھیں۔'' اتنے دنوں میں وہ ماضی کی بہت سی داستانوں سے واقف ہو چکا تھا اور اسے یہ جان کر افسوس ہوا تھا کہ جوزفین کے سامنے آنے کے باوجود وہ اسے شناخت نہیں کر سکا تھا۔ جس زمانے میں جوزفین نے اسے پڑھایا، وہ بہت چھوٹا تھا اور اس کی یادداشت سے جوزفین کا چہرہ غائب ہو گیا تھا لیکن دل میں اس کی محبت و شفقت کی دھندلی سی یاد بہر حال باقی رہ گئی تھی۔

''میں وجوہات پر غور نہیں کرنا چاہتا کہ مجھے آپ سے اتنی محبت کیوں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ میں آپ سے بے حد و حساب محبت کرتا ہوں..... ایسی محبت جو بے طلب تو نہیں لیکن جس میں سب سے بڑی طلب یہ ہے کہ آپ خوش رہیں اور ہر فیصلہ اپنی خوشی اور رضا سے کریں۔'' اس نے کبھی اس شخص کو اتنا بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ آج سن رہی تھی تو احساس ہو رہا تھا کہ اسے اس کا بولنا بہت اچھا لگ رہا ہے۔

''مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔ آپ چاہیں تو اپنا فیصلہ سنانے کے لیے کچھ وقت لے سکتی ہیں۔ مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ جو مبہوت سی بیٹھی اسے دیکھ اور سن رہی تھی، یک دم ہی چونکی اور تیزی سے بولی۔

''مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے محب اللہ! کیا آپ کچھ دیر مزید بیٹھ کر میری بات سن سکتے ہیں؟''

''بالکل۔'' وہ فوراً ہی اپنی جگہ پر واپس بیٹھ گیا۔ بھلا وہ اس کی بات کیسے رد کر سکتا تھا۔ جولی نے نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں پر مرکوز کر لیں اور بولنا شروع ہوئی۔

''آپ کی یہاں آمد سے قبل چاند بانو آپ کا بہت ذکر کیا کرتی تھی اور آپ کے ساتھ اس لڑکی کا بھی تذکرہ ہوتا تھا جسے آپ بے حد و حساب چاہتے تھے۔ چاند بانو اکثر اس لڑکی پر افسوس کرتی تھی۔ اس کو بدنصیب قرار دیتی تھی جسے کسی کی اتنی چاہت کی قدر نہیں تھی۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ چاند بانو جس شخص کا ذکر کرتی تھی، وہ آپ ہیں اور نہ ہی یہ جانتی تھی کہ وہ بدنصیب لڑکی میں ہوں لیکن آج جبکہ میں نے ہر بات جان لی ہے تو میں اپنی بدنصیبی کو خوش نصیبی سے تبدیل کر لینے کا اہتمام کیوں نہ کروں۔ میں کیوں اپنے در پر دستک دیتی خوش نصیبی کے لیے دروازے نہ کھولوں اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں اس شخص کے لیے ہاں کہنے سے گریز کیوں کروں جس سے بڑھ کر مجھے کوئی چاہ ہی نہیں سکتا۔ جو مجھے ایسے چاہتا ہے کہ مجھے خود اپنے آپ پر فخر محسوس ہونے لگے اور جس کے ساتھ کو میں اپنے رب کی مہربانی کے سوا کچھ تسلیم نہ کرسکوں لیکن .....'' وہ بول رہی تھی اور محب اللہ شادی مرگ کی سی کیفیت میں اس کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا لیکن جہاں اس نے ''لیکن'' کہا، وہیں اسے لگا کہ اس کے دل نے دھڑکنا بند کردیا ہو۔ اس نے بہت بے قراری سے جمیلہ کے چہرے کو ٹٹولا۔ اس کی بے قراری محسوس کرکے وہ ذرا سا مسکرائی اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔

''میں اپنے دل کی پوری آمادگی کے ساتھ آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میری یہ شرط ہے کہ میرے ساتھ ساتھ آپ کو چاند بانو کو بھی اپنانا ہوگا۔ ان چند دنوں میں وہ مجھے بہنوں کی طرح عزیز ہوگئی ہے پھر مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آپ جو یوں صحیح سلامت ہمارے درمیان واپس آگئے ہیں تو اس میں سب سے زیادہ دخل چاند بانو کی شب بیداریوں کا ہے۔ وہ آپ کو نہیں بتائے گی لیکن میں گواہ ہوں اس کے ہر جذبے کی۔ اس نے آپ کو اتنا چاہا ہے کہ مجھے لگتا ہے کہ آپ پر مجھ سے زیادہ اس کا حق ہے اسی لیے میں نے پہلے آپ سے اس کی بات کی تھی۔ آپ نے اپنی مجبوری بیان کردی اور میں نے سمجھ بھی لی لیکن اتنی گنجائش تو آپ نکال ہی سکتے ہیں کہ اپنے دل کی خوشی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا دامن بھی خوشی کے چند پھولوں سے بھر دیں۔ آپ یقین کریں، آپ کی اس عنایت سے ہماری زندگیوں پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا بلکہ ہم اور بھی خوشیوں سے مالا مال ہوجائیں گے۔ شرعاً بھی یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ آپ صاحبِ استطاعت ہیں اور بہ سہولت دو بیویوں کے اخراجات برداشت کرسکتے ہیں۔ حقوق میں کہیں کوئی کمی بیشی رہ گئی تو اس کے لیے میں آپ کو ابھی یقین دہانی کروا سکتی ہوں کہ ہم دونوں میں ہی اتنا ظرف ہے کہ روزِ حشر اس کمی بیشی کے لیے آپ کا دامن نہ تھامیں۔'' وہ اسے قائل کرنے کے لیے اسے دلائل دے رہی تھی اور وہ بے بسی سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا آپ کو میری شرط منظور نہیں ہے؟'' اس نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا گیا اور بولا۔

''بات میری منظوری کی نہیں ہے۔ ابا جان، چچا جان اور چاند بانو سمیت کسی کے لیے یہ صورتِ حال قابلِ قبول نہیں ہوگی۔''

''آپ صرف اپنی بات کریں۔ باقی سب کو قائل کرنا میری اپنی ذمے داری ہوگی۔'' اس کے لہجے کا تیکھا پن کسی صورت کم نہ ہوا۔

''میں آپ کے آگے بے بس ہوں۔'' اس کا جواب مبہم ہوتے ہوئے بھی واضح تھا۔

''تھینک یو سو مچ محب اللہ! آگے میں خود سب سنبھال لوں گی۔'' وہ سن کر خوش ہوگئی اور وہ بے بسی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ زندگی میں اتنی عجیب خواتین سے اسی کا واسطہ پڑنا تھا۔ خواتین جن کے حسد و رقابت کی بے شمار داستانیں سن رکھی تھیں، بالکل الگ ہی روپ میں اس کے سامنے آئی تھیں۔ ایک چاند بانو تھی جو بنا کچھ مانگے اوّل روز سے اسے بے لوث چاہ رہی تھی اور دوسری یہ تھی جس پر وہ اپنے دل و جان نثار کرتا تھا اور اس نے پہلی بار اپنے لیے کچھ مانگا بھی تھا تو وہ ایک عدد ''سوکن'' تھی۔

☆☆☆

نواب خاندان کی کوٹھی آج بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا آسمان سے رنگ و نور کی برسات ہو رہی ہے۔ حیدرآباد دکن سے بہت سے غموں کا داغ سینے پر لے کر آنے والے آج حقیقی مسرتوں کو محسوس کررہے تھے۔ خوشی کا موقع ہو اور اپنوں کی یاد نہ آئے، یہ کیسے ممکن ہے۔ ان سب کی آنکھیں بھی اپنے بچھڑے ہوئے پیاروں کو یاد کرکے وقفے وقفے سے بھیگ جاتی تھیں اور وہ چپکے سے آنکھوں کی اس نمی کو صاف کرلیتے تھے کہ دوسرے کی نظر نہ پڑ جائے۔ خوشی کے موقع پر غم کا اظہار نہ کرنا ہی بہتر تھا کہ خوشی کی چمک ماند نہ پڑ جائے۔ صفی اللہ اور اسد اللہ کے چہروں پر برستی خوشی کو ہر شخص محسوس کرسکتا تھا۔ دونوں بھائی آج اپنے بچوں کو ایک کرنے جارہے تھے اور ان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

جولی اور محب اللہ کی طرف سے سادگی پر زور دیے جانے کے باوجود تقریب کے لیے خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ مہمانوں کی تعداد البتہ بہت زیادہ نہیں تھی۔ یہ حیدرآباد نہیں تھا جہاں ان کی وسیع رشتے داریاں اور قرابت داریاں تھیں اور کسی تقریب کے موقع پر مہمانوں کا ایک جمِ غفیر موجود ہوتا تھا۔ یہاں تو بس بیگم آصفہ علی اور ثروت بیگ کا خاندان تھا۔ پاکستان آجانے والے چند دور کے رشتے دار تھے، کچھ کاروباری احباب تھے اور اردگرد کی کوٹھیوں کے مکین تھے اور اتنے مہمانوں کے لیے کوٹھی کے وسیع لان میں سما جانا کوئی مشکل بات نہیں تھی چنانچہ تقریب کا انتظام کوٹھی کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لان میں ہی کیا گیا تھا۔

مہمانوں کی ضیافت کے لیے بہترین انتظام کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی مساکین وغربا کو بھی فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ عام لنگر کے انتظام کے ساتھ ساتھ مہاجرین کے کیمپ میں بھی عمدہ کھانے کی دیگیں پکوا کر بھجوائی گئی تھیں۔ ساتھ ہی ضروریاتِ زندگی کا دیگر سامان بھی بطور تحائف بھجوادیا گیا تھا۔ نواب صاحبان کے علاوہ آج کے دن جو دو ہستیاں بہت زیادہ مصروف تھیں، ان میں ایک چاند بانو اور دوسری نوبیاہتا کیتھرائن تھی۔ اس کی شادی ڈاکٹر داؤد سے اس کے مذہبی عقائد اور رسوم کے مطابق محب اللہ نے اپنی سرپرستی میں کروائی تھی اور اس نے ڈاکٹر داؤد کے ساتھ ایک خوش گوار .... زندگی کا آغاز کردیا تھا۔

آج کے خاص موقع پر ندرت جہاں بھی اپنے بستر کے بجائے وہیل چیئر پر براجمان مہمان خواتین کے درمیان موجود تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے حرکت نہیں کرسکتی تھیں اور نہ ہی ایک آدھ ٹوٹے پھوٹے لفظ کے علاوہ کچھ بول پاتی تھیں لیکن ان کے چہرے سے ان کی خوشی کا اظہار ہورہا تھا۔ وہ اپنے ان پیاروں کی خوشیوں میں خوش تھیں جنہوں نے ان کی تمام تر برائیوں کے باوجود مشکل حالات میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور ان کے تمام قصور سامنے آجانے کے باوجود ان سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی تھی بلکہ انہیں وہی عزت اور مان دیتے رہے تھے جو خاندان کی ایک بزرگ ہستی کی حیثیت سے ان کا حق تھا۔

صاحبِ حیثیت و اختیار وہ ہمیشہ رہی تھیں لیکن اپنے بچوں کی اندھی محبت اور اقتدار کے غرور میں ناانصافیوں پر ناانصافیاں کرتے چلے جانا انہوں نے اپنی روش بنالی تھی۔ آج ان کی وہ حیثیت بدل گئی تھی تو سوچ میں بھی تبدیلی آگئی تھی اور وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر وہ ماضی میں وہ سب کچھ نہ کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ کم از کم آج وہ اپنے چھوٹوں کے آگے ندامت کے بوجھ سے دبی ہوئی تو نہ ہوتیں۔ یہ تو ان کے بھتیجوں اور ان کی اولادوں کی سعادت مندی تھی کہ کسی نے بھی انہیں کچھ نہیں جتایا تھا اور انہیں عزت و مان دے رہے تھے۔ وہ اس کے برخلاف کرتے تو بھی وہ شکوہ کرنے کا حق نہیں رکھتی تھیں۔ اپنے کیے کی تلافی کے لیے ان کے پاس آج ایک ہی صورت تھی کہ وہ سب کی خوشی میں خوش نظر آئیں چنانچہ وہ یہی کررہی تھیں اور وہ سارا غم جو اپنے بچوں، حویلی اور بھائی سمیت دیگر خاندان کی جدائی کے باعث مستقل دل کا مہمان تھا، انہوں نے اپنے اندر چھپالیا تھا۔ وہ خاندان کی بزرگ سربراہ کی حیثیت سے آنے والی مہمان خواتین سے مبارکبادیں وصول کررہی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال پر مامور نرس مستقل ان کے ساتھ موجود تھی، اس کے باوجود چاند بانو وقتاً فوقتاً آکر ان کی خیریت معلوم کرجاتی تھی۔ درمیان میں کچھ دیر انہیں ان کے کمرے میں آرام کے لیے بھی لے جایا گیا تھا کہ کہیں وہ وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے ضرورت سے زیادہ تھک نہ جائیں۔

محب اللہ نے دُلہا بننے کے بعد سب سے پہلے بطورِ خاص انہیں سلام کیا تھا اور ان کے ہاتھوں کو محبت سے چوما تھا۔ یہ وہی محب اللہ تھا جو ان کی ہٹ دھرمی و بے اصولی کی وجہ سے حویلی چھوڑ گیا تھا اور اس نے زندگی کے کئی ماہ و سال حویلی کے عیش و عشرت کو چھوڑ کر زمانے کی سختیاں سہتے ہوئے گزارے تھے۔ وہ چاہتا تو اپنے اس نقصان پر ان سے ناراضی کا اظہار کرسکتا تھا لیکن اس نے تو الٹا ان سے معافی مانگی تھی کہ اسے ان سے ناراض ہونے کے باوجود ان کی بزرگی کے احترام کو فراموش نہیں کرنا چاہیے تھا اور نہ ہی ہمیشہ کے لیے حویلی چھوڑ کر اپنے پیاروں کو ذہنی و قلبی کرب سے دوچار کرنا چاہیے تھا۔ تو ایسا تھا ان کے بھائی کا خاندان جس نے بھائی ہی کی طرح ان کو بے پناہ عزت اور مان سے نوازا تھا اور آج جبکہ وہ عمر کی بالکل آخری منزل پر تھیں تو انہیں خود سے سارے اعترافات کرنے پڑے تھے اور ان اعترافات کے نتیجے میں وہ ان سب اچھے لوگوں کے لیے خوش اور دعا گو تھیں۔ ان کے پہلو میں ہی دُلہن بنی جمیلہ اسد اللہ بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی لڑکی جسے جوزفین کی بیٹی کی حیثیت سے جاننے کے بعد انہوں نے اس کو کن کن برے القابات سے نہیں پکارا تھا اور اس پر کون کون سے الزامات نہیں لگائے تھے۔ اپنے بیٹے کی آوارگی کو جانتے ہوئے بھی انہوں نے سارا الزام اس لڑکی پر رکھنے کی کوشش کی تھی اور جسے انہیں حویلی میں ایک منٹ کے لیے بھی دیکھنا گوارا نہیں تھا۔ اس لڑکی نے ان کی لاچاری میں انہیں کسی گزری بات کا طعنہ نہیں دیا تھا، انہیں نہیں جتایا تھا کہ ان پر جو کچھ گزری، وہ ان کی اپنی کرنی کا بھگتان تھا۔ الٹا وہ حتی المقدور ان کا خیال رکھتی تھی اور بڑی محبت اور عزت سے انہیں دادی کہہ کر پکارتی تھی۔

اس لڑکی جمیلہ اسد اللہ پر آج ٹوٹ کر روپ آیا تھا۔ سرخ زرتار لباس میں وہ آسمان سے اتری کوئی حور دکھائی دے رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اس قدر سنگھار کیا تھا۔ ٹیکا، جھومر، نتھ، کانوں کے آویزے.....

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

سب ان بچے کھچے خاندانی زیورات میں سے تھے جو اسد اللہ نے حویلی میں قیام کے دنوں میں اس کے حوالے کردیے تھے اور وہ حویلی سے نکلتے وقت انہیں وہیں اسد اللہ کے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ اجڑی ہوئی حویلی کا جائزہ لیتے اسد اللہ کو اپنے کمرے میں اس کے خط کے ساتھ یہ زیورات بھی ملے تھے جن کا کچھ حصہ نئی سرزمین پر اپنے قدم جمانے کے لیے انہیں فروخت کرنا پڑا تھا پھر بھی بہت کچھ تھا جو ان کی بیٹی کے لیے بچ گیا تھا اور آج وہ دُلہن کے روپ میں یہ سب چیزیں اپنے تن پر سجائے بیٹھی تھی۔ گلے میں البتہ اس نے ان زیورات میں سے کچھ نہیں پہنا تھا اور جوزفین کا وہی چین اور لاکٹ پہنے ہوئی تھی جو اسد اللہ اور جوزفین کی محبت کے ایک ثبوت کے ساتھ ساتھ اس کے لیے اس کی ماں کی آخری نشانی بھی تھی۔ اس چین اور لاکٹ کو پہن کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جوزفین اس کے آس پاس ہی موجود ہے اور اس کے ساتھ جوزف بھی ہے اور وہ دونوں اپنی لاڈلی کو خوشیوں کی راہ گزر پر قدم رکھتا دیکھ کر دھیرے دھیرے مسکرا رہے ہیں۔

ان کی خوشی کے احساس نے اس کے دل میں بھی خوشی کے راگ چھیڑ رکھے تھے۔ وہ خوش تھی کہ ایک ایسے شخص کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرنے جارہی ہے جو اسے اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔ جس کے لیے اس کا وجود وجۂ خوشی ہے، جو اسے اس کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ چاہنے اور چاہتے رہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ جس کے لیے اس کی عزت اپنی عزت ہے اور جو زندگی میں کسی بھی موڑ پر اسے چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ایک عورت کو اس سے بڑھ کر کچھ چاہیے بھی نہیں ہوتا۔ وہ بھی یہ سب پا کر خوش اور اپنے رب کی شکر گزار تھی اور اتنی ڈھیر ساری خوشیوں کا شکر ادا کرنے کے لیے ہی اس نے چاند بانو کے ساتھ محب اللہ کی محبت بانٹ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے سے اس نے چاند بانو کو بھی آگاہ کردیا تھا جو پہلے تو سن کر بہت جز بز ہوئی تھی اور دلائل سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی کہ یہ ٹھیک نہیں ہوگا لیکن جب اس نے دیکھا کہ وہ کسی صورت اپنی بات سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہے تو دو شرائط کے ساتھ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے کہا کہ کیونکہ جمیلہ اس سے عمر میں بڑی ہے اس لیے اس کی شادی پہلے ہونی چاہیے۔ دوسری شرط اس نے یہ رکھی کہ فی الحال نواب صاحبان سمیت کسی کو بھی اس بات سے آگاہ نہ کیا جائے تاکہ وہ جمیلہ اور محب اللہ کی شادی پر بغیر کسی بوجھ کے لطف اٹھا سکیں۔ اس کی یہ بات جمیلہ کی سمجھ میں آگئی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں چاند بانو کو بہت اہمیت دیتے ہیں لیکن بہرحال وہ جمیلہ کی جگہ نہیں لے سکتی اور ان کے لیے اسے جمیلہ کی سوکن کی صورت دیکھنا ناگوارِ خاطر ہوگا تو اچھا تھا کہ وہ انہیں ان کی خوشی میں پوری طرح خوش ہولینے دیتی چنانچہ اس نے چاند بانو کی شرط مان لی تھی اور محب اللہ تو اس کی خوشی میں خوش تھا۔

دُلہا بن کر اس پر بھی بہت روپ آیا تھا۔ آف وہائٹ شیروانی اور کلے میں اس کی دراز قامت اور مضبوط جسامت نمایاں تھی۔ گلے میں موجود ہار کے گلابوں سے زیادہ اس کا اپنا چہرہ کھلا ہوا تھا اور اسے دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ اپنی من پسند دلہن کا ساتھ پاتے جارہا ہے۔ خوشی کے اس موقع پر اپنے بچھڑ جانے والے خاندان، ربن اور اڈے کے ساتھیوں سمیت وہ سب لوگ یاد آئے تھے جو زیست کے اس سفر میں اسے ملتے اور اپنا کردار ادا کرتے رہے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والے ان سارے کرداروں کو بھی فراموش نہیں کرسکتا تھا لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اسے اب ان سب کے بغیر ہی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کرنا تھا۔ اس زندگی کا آغاز جو اس کی من پسند ساتھی کے ساتھ گزرنے والی تھی اور جس کے لیے وہ اپنے رب کی مہربانی کا شکر گزار تھا۔

دنیا کے جھمیلے ختم ہوئے اور سارے رسوم و رواج انجام کو پہنچ گئے تو اسے جمیلہ کے ساتھ تخلیہ میسر آیا۔ وہ جمیلہ جو جولیٹ بھی تھی تو اس کے من کے سنگھاسن پر بیٹھی تھی اور جسے جولی کہہ کر پکارنا بھی دل کو اچھا لگتا تھا۔ نام کچھ بھی رکھ لیا جاتا بس وہ، وہ تھی جس کے سوا کوئی اور اس کی ذات کو مکمل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے بے تحاشا چاہنے والی چاند بانو بھی نہیں کہ دل کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور آج شبِ زفاف اس خاموش محبت کرنے والے کو بھرپور موقع ملا تھا کہ وہ اپنی داستانِ دل کھل کر اسے سناتا۔ اس نے ایک ایک پل کی داستان سنائی تھی کہ وہ کیسے کیسے اس کے لیے تڑپتا تھا اور اس کی ایک دید اسے کیسی خوشی عطا کردیتی تھی۔ اپنی بے چینیاں، بے تابیاں اور محرومیاں سب اس نے جولی کے گوش گزار کردی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ ربن نے اسے اس کے حصول کے لیے کس حد تک پیشکش کرڈالی تھی۔ وہ اس پر بھی راضی ہوگیا تھا کہ اس کا لاڈلا، اس کا فاروق ایک لڑکی کے لیے اسے چھوڑ جائے یا پھر وہ اپنے ہی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جولی کو زبردستی اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کی زندگی کا ساتھی بنا دے لیکن اس نے کچھ بھی قبول نہیں کیا تھا کہ وہ اسے اس کی رضا سے حاصل کرنا چاہتا تھا اور آج یہ کرشمہ بھی ہو ہی گیا تھا۔

اس کی محبتوں کی داستان سنتی جمیلہ کو اس پل خود پر ناز محسوس ہوا تھا کہ وہ کسی کو ایسے مطلوب تھی کہ کائنات کے سارے عوامل مل کر انہیں ملانے کے لیے متحرک ہو گئے تھے اور بے شمار رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود وہ دونوں ایک سکتے پر آ کر آخر کار یکجا ہو گئے تھے۔ یہ ملن کی رات تھی، یہ شکرانے کی رات تھی اور انہوں نے اس رات کا ایک ایک پل جاگتے ہوئے، ایک دوسرے کو پانے کی خوشی کو محسوس کرتے ہوئے اور اس کا شکر ادا کرتے ہوئے گزارا تھا۔ صبح نمازِ فجر کی باجماعت ادائیگی کے لیے محب اللہ قریبی مسجد کی طرف روانہ ہوا تھا تو وہ بھی اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گئی تھی۔ نماز کے بعد جب وہ اپنے نم بالوں کو سنگار میز کے سامنے بیٹھی ہوئی سنوار رہی تھی تو ایک ملازمہ نے اس کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ اس سے دریافت کر رہی تھی کہ نئے دُلہا دُلہن ناشتے میں کیا پسند فرمائیں گے۔

''چاند بانو کہاں ہے؟'' ملازمہ کی آمد پر حیران اس نے دریافت کیا۔

''جی مجھے نہیں معلوم۔ انہوں نے رات ہی مجھے ہدایت کر دی تھی کہ صبح فجر کے بعد آپ سے ناشتے کا معلوم کر لیا جائے اور آپ کو یہ خط دے دیا جائے۔'' ملازمہ نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ایک بند لفافہ تھمایا۔ جمیلہ نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور اس کے اندر موجود کاغذ نکال کر اس پر لکھی تحریر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔

''پیاری جمیلہ باجی!

آداب.....

ہم معذرت خواہ ہیں کہ جب آپ کو ہمارا یہ خط ملے گا تو ہم آپ سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔ کہاں؟ یہ نہ ہم آپ کو بتائیں گے اور نہ ہی چاہیں گے کہ آپ کھوجنے کی کوشش کریں۔ آپ ہمیں دھوکے باز اور وعدہ خلاف کہہ کر پکار سکتی ہیں لیکن وہ جھوٹا وعدہ آپ کی جذباتیت پر بند باندھنے کے لیے ہماری مجبوری بن گیا تھا۔ ہمیں آپ کی محبت اور خلوص سے انکار نہیں ہے لیکن عمر میں کم ہونے کے باوجود ہم زندگی کی تلخیوں کو آپ سے کچھ زیادہ جانتے ہیں۔ ہمارا آپ سے بہن کا جو رشتہ بن چکا ہے، ہم اسے سوکن کے رشتے کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔ آپ مانیں نہ مانیں، اس رشتے میں کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی کوئی نازک لمحہ ایسا آ جاتا ہے جو انسان کی ساری خوبیوں کو کھا جاتا ہے۔ اگر ہم ایک دفعہ کو مان بھی لیں کہ ہم دونوں کے ساتھ ایسا کبھی نہ ہوتا تو بھی ہم نوابزادہ محب اللہ کو کسی امتحان میں مبتلا نہیں کر سکتے۔ دو بیویوں کے حقوق ادا کرنے کے چکر میں وہ ساری عمر گھن چکر بنے رہیں، یہ ہمیں کسی طور قبول نہیں۔ انہیں کسی امتحان میں مبتلا کرنا خود ہماری بے لوث محبت کے لیے تکلیف دہ ہے۔ ہم نے تو اس وقت بھی انہیں اس امتحان سے دوچار کرنا قبول نہیں کیا تھا جب آپ ان کی زندگی میں شامل نہیں ہوئی تھیں..... تو اب کیسے اس صورتِ حال کو قبول کر سکتے ہیں۔ آپ کو ہم سے اپنی محبت کا واسطہ، انہیں ان کی خوشی میں کھل کر جی لینے دیں کہ ہماری بے طلب محبت میں صرف یہی ایک طلب ہے کہ وہ خوش رہیں۔ بہت زیادہ خوش، اس دنیا کے ہر انسان سے بڑھ کر خوش۔ اگر آپ کو ہماری اس خوشی کا خیال ہے تو اب کبھی ہمیں ڈھونڈنے کی کوشش مت کیجیے گا۔ ہم آپ کو نہیں ملیں گے اور اگر مل بھی گئے تو پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔

معافی کی خواستگار

آپ کی بہن چاند بانو!''

چاند بانو کا خط اس کے ہاتھوں میں کھلا ہوا تھا اور وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ ملازمہ اسے خط پڑھتا دیکھ کر واپس چلی گئی تھی کہ اسے چاند بانو سے ایسی ہی ہدایات ملی تھیں۔ محب اللہ نماز پڑھ کر واپس آیا تو اسے یوں سکتہ زدہ دیکھ کر چونک گیا پھر اس کے ہاتھ سے خط لے کر اسے پڑھنے لگا۔ پڑھ کر وہ بھی دنگ رہ گیا۔ چاند بانو نے اپنی محبت کے ڈھنگ سے ہمیشہ ہی اسے حیران کیا تھا اور آج بھی حیران چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی تھی لیکن کیا وہ سچ مچ چلی گئی تھی؟ وہ ایسی تو نہ تھی کہ اسے آسانی سے فراموش کر دیا جاتا۔ اپنی اتنی محبتوں کے بدلے میں اس نے بہت چپکے سے محب اللہ کے دل کا ایک گوشہ اپنے نام کر لیا تھا جہاں اس کے سوا کوئی نہیں جھانک سکتا تھا۔ اپنے دل کے اس گوشے سے نظر چراتے ہوئے اس نے بہت نرمی سے جمیلہ کو اپنی بانہوں کے حصار میں لیا اور اس کے ماتھے پر ایک بوسا دیتے ہوئے اسے خاموش تسلی دینے کی کوشش کی۔ جمیلہ کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ نکلا اور محب اللہ کے ہاتھ پر آ گرا۔ محب اللہ نے ایسا ہی ایک قطرہ اپنے دل پر بھی گرتا ہوا محسوس کیا اور پہلے سے بھی زیادہ شدت سے جمیلہ کو اپنی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بانہوں میں بھینچ لیا۔ اس کا غم بانٹنے کے بہانے وہ اپنا دکھ بھی تو ہلکا کرسکتا تھا۔

☆☆☆

اوّل کلمہ طیب، طیب معنی پاک۔ لا الٰہ الا اللہ .....

ایک دل نشین آواز کا سحر ہر طرف چھایا ہوا تھا اور اس آواز کے سحر میں ڈوبی چھوٹی چھوٹی بچیاں خود بھی لہک لہک کر پڑھتی جارہی تھیں۔ اوّل کلمہ طیب، طیب معنی پاک..... وسیع ہال کے دروازے پر کھڑے اسد اللہ مشفقانہ نظروں سے بچیوں میں علم بانٹتی اس پُرنور چہرے والی ہستی کو دیکھ رہے تھے۔ اس ہستی کو جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ ان کے خاندان کو ملنے والی ساری خوشیاں اس کی دعاؤں کا ثمر ہے۔ انہاک سے بچیوں کو کلمہ پڑھاتی ہستی نے نظروں کے ارتکاز کو محسوس کیا تو دروازے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہاں کھڑے اسد اللہ کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے پڑھایا جانے والا کلمہ مکمل کیا اور بچیوں کو اشارہ کیا کہ اب وہ چھٹی کرلیں۔ بچیاں اپنے قاعدے جزدانوں میں لپیٹنے لگیں۔ اسد اللہ نے اشارہ کیا کہ بچیوں کو کچھ دیر کے لیے روک لیا جائے۔ اسی وقت مسجد کا خادم مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے اندر لاکر رکھنے لگا۔ خادم کی آمد پر بچیوں کی استانی نے اپنی چادر کو ماتھے پر کچھ اور آگے کھینچ لیا تھا لیکن چادر کی آڑ میں اس کی خوبصورت آنکھیں جگر جگر چمکنے لگی تھیں۔ ان ٹوکروں کو دیکھ کر اس نے جان لیا تھا کہ اسد اللہ کوئی خوشی کی خبر لے کر آئے ہیں۔

''حلیمہ! اپنی سب ساتھیوں میں یہ مٹھائی اور پھل تقسیم کردو پھر تم لوگ چھٹی کرلینا۔'' اس نے جماعت کی سب سے بڑی بچی کو ہدایت کی اور خود اسد اللہ کے قریب چلی آئی۔

''السلام علیکم چچا جان۔'' اس نے بہت ادب سے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام بیٹی! سدا خوش رہو۔'' اسد اللہ نے نرم لہجے میں بہت شفقت و محبت سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''آیئے بیٹھک میں چلتے ہیں۔'' خوشخبری سننے کی بے چینی کے باوجود اس نے رکھاؤ سے کام لیا اور انہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک متصل کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے کے فرش پر شفاف اور اجلی چاندنی بچھی ہوئی تھی اور سجاوٹ کے نام پر دیوار پر محض ایک طغرا لگا ہوا تھا جس پر سنہری حرفوں میں آیتِ کریمہ لکھی ہوئی تھی۔

''اس بار کافی دن بعد آمد ہوئی آپ کی۔ ہم بہت شدت سے آپ کا انتظار کررہے تھے۔'' اس نے اسد اللہ سے باقاعدہ گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہمیں آپ کے انتظار کا احساس تھا لیکن کچھ مصروفیت تھی اور کچھ یہ خیال کہ اب خوشخبری لے کر ہی آپ کے پاس آئیں گے۔ اس لیے کچھ تاخیر ہوگئی۔'' انہوں نے اپنا جملہ مکمل کیا ہی تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ اسد اللہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھے اور دروازے پر جاکر عنابی رنگ کے کمبل میں لپٹے نومولود کو خادم کے ہاتھوں سے لے لیا۔ وہ جوان کے پیچھے ہی آکھڑی ہوئی تھی، نومولود کو دیکھ کر بے قرار ہوگئی اور بڑی بے تابی سے اسے اسد اللہ کے ہاتھوں سے لے لیا۔ پہلے اس کی وارفتہ نظروں نے بچے کے چہرے کو چھوا پھر نرم گلابی ہونٹ اس کے ایک ایک نقش پر بوسہ دینے لگے۔

''ہمیں آپ کی خوشی کا اندازہ تھا اس لیے خوشخبری کے ساتھ ننھے شہزادے کو بھی دیدار کے لیے آپ کے پاس لے آئے۔ ان کی آیا باہر گاڑی میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ رازداری برقرار رکھنے کے لیے ہم نے انہیں اندر لانا مناسب نہیں سمجھا۔'' اسد اللہ نرم سی نگاہوں سے اس کی محبت کے مظاہرے کو دیکھتے ہوئے اسے بتارہے تھے۔

''بہت شکریہ چچا جان! یہ آپ کا ہم پر ایک اور احسان ہے۔ ہم بتا نہیں سکتے کہ اس وقت ہم کتنے خوش ہیں۔'' وہ کتنی خوش تھی یہ تو اسے کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ خوشی اس کی ایک ایک ادا سے چھلک رہی تھی۔

''احسان کیسا بیٹی! ہم تو خود آپ کی محبتوں کے مقروض ہیں۔'' اسد اللہ نے آہستہ سے کہا اور خود اس دن کی یادوں میں ڈوب گئے جب چاند بانو مدد کی درخواست لیے ان کے روبرو آئی تھی۔ اس روز اس نے انہیں جولی کی ضد سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ محب اللہ (فاروق) سے اپنے تعلق کی نوعیت کھل کر بیان کی تھی اور واضح الفاظ میں انہیں بتایا تھا کہ وہ جمیلہ کی خواہش پوری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی لیکن اکیلے دنیا کی بھیڑ میں قدم رکھتے ہوئے بھی خوفزدہ ہے اور ان سے بس اتنی مدد چاہتی ہے کہ وہ اس کے لیے کسی محفوظ ٹھکانے کا بندوبست کردیں۔ اسد اللہ کے لیے وہ لمحات بہت آزمائش والے تھے۔ ایک طرف وہ خوفزدہ تھے کہ اگر جمیلہ اور محب اللہ کو اس معاملے میں ان کے کردار کا علم ہوگیا تو وہ ان سے خفا ہوجائیں گے، دوسری طرف انہیں چاند بانو کی باتوں میں دم محسوس ہورہا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاید دل میں کہیں ایک باپ کے خود غرضانہ جذبات بھی پنہاں تھے جو اپنی بیٹی پر کسی سوکن کا (چاہے وہ سوکن چاند بانو جیسی لڑکی ہی کیوں نہ ہو) سایہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے چاند بانو کا مطالبہ مان لیا تھا اور جامع مسجد کے امام صاحب کے تعاون سے مسجد سے ملحقہ اس مدرسے میں اس کی سکونت کا انتظام کردیا تھا۔ وہ بہت باقاعدگی سے اس کی خبر گیری کرتے رہتے تھے اور مدرسے کی بھی بھرپور مالی معاونت کرتے رہتے تھے اس لیے چاند بانو یہاں بہت اچھی اور پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ اللہ سے اس نے پہلے ہی لَو لگالی تھی، اب اپنے رب کے کلام کو پھیلانے میں بھی اپنا کردار ادا کررہی تھی اور اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھی۔

''ہمیں شرمندہ نہ کریں چچا جان! آپ کے مقروض ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے ہماری بات سمجھ کر ہمارے لیے جو کچھ کیا، وہ ہمارے لیے ایک مہربانی تھی۔ اگر آپ انکار کردیتے تو ہم اپنے ارادے میں اتنے پختہ تھے کہ اس رات ہر حال میں کوٹھی چھوڑ دیتے لیکن اس صورت ہمیں اتنی محفوظ و پُرسکون پناہ گاہ میسر نہیں آسکتی تھی۔'' اس نے اپنے الفاظ سے اسد اللہ کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کی اور گہری نیند سوئے ہوئے نومولود کی پیشانی پر ایک اور بوسہ ثبت کرتے ہوئے بولی۔

''ماں باپ دونوں کے نقوش چرائے ہیں صاحب زادے نے۔ ہم ان کے چہرے میں محب اللہ اور جمیلہ باجی دونوں کی جھلک دیکھ رہے ہیں۔''

''ٹھیک فرمایا۔ ہر ایک کی بچے کے بارے میں یہی رائے ہے۔'' اسد اللہ نے اس کی تائید کی۔

''نام کیا رکھا گیا ہے ننھے نوابزادے کا؟ موصوف کتنے دن کے ہوگئے ہیں؟'' اس کی پُراشتیاق و پُرمحبت نظریں بچے کے چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

''کل رسم عقیقہ ادا کی جائے گی اور اسی موقع پر نام بھی رکھا جائے گا۔ ہم آپ کے پاس انہیں اسی لیے لے کر آئے ہیں کہ آپ انہیں دیکھ کر ان کے لیے کوئی نام تجویز کردیں۔''

''ہم.....؟'' اسد اللہ کی خواہش جان کر وہ حیران ہوئی اور بولی۔ ''یہ تو خاندان کے بزرگوں اور ماں باپ کا حق ہوتا ہے کہ وہ بچے کا نام رکھیں۔ آپ ہمیں یہ ذمے داری کیوں سونپ رہے ہیں؟''

''کیونکہ ہمارے نزدیک آپ ہی اس کی سب سے زیادہ حق دار ہیں۔ آپ سے بڑھ کر ہمارے خاندان اور اس بچے کا کوئی خیر خواہ اور چاہنے والا نہیں ہوسکتا اسی لیے ہم یہ حق آپ کو تفویض کررہے ہیں کہ آپ اس بچے کا نام تجویز کریں۔ ہم گھر میں یہ کہہ کر بچے کو اپنے ساتھ لائے ہیں کہ بچے کا نام رکھوانے اسے ایک نیک ہستی کے پاس لے جارہے ہیں۔ کسی نے ہمارے اس عمل پر اعتراض نہیں کیا اس لیے آپ کو بھی کوئی اندیشہ نہیں ہونا چاہیے۔ برائے مہربانی اب آپ جلدی سے کوئی نام تجویز کردیں تاکہ موصوف کو ان کی والدہ کے پاس واپس پہنچایا جاسکے۔ یہ نہ ہو کہ بھوک لگ جانے کی صورت میں یہ صاحب زادے ہنگامہ برپا کردیں۔'' اسد اللہ نے اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی نظروں سے بچے کے ایک ایک نقش کو چوما اور دھیمی آواز میں بولی۔

''یہ بچہ ہم سب کے لیے ہمارے رب کی نوازش ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس کا نام رب نواز رکھا جائے۔'' وہ محب اللہ کی ربن سے بے پناہ محبت سے واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر اسے موقع دیا جاتا تو وہ اپنے بچے کے لیے یہی نام تجویز کرتا اس لیے اسے یہی نام دیا۔

''ماشاءاللہ بہت پیارا نام ہے۔'' اسد اللہ نے اس کے رکھے نام کو پسند کیا اور بولے۔

''اب اجازت دیجیے بیٹی! بچے کو ماں کے پاس بھی پہنچانا ہے اور کل کی تقریب کے لیے بھی انتظامات کرنے ہیں۔'' اسد اللہ نے رخصت طلب کی تو اس نے خوشی سے انہیں اجازت دے دی۔ وہ چلے گئے تب بھی وہ دیر تک سرشاری کیفیت میں بیٹھی رہی۔ آج وہ اپنی بے طلب محبت میں مکمل سرخ رو ہوچکی تھی۔ وہ محبت کے اس مقام پر تھی جہاں محبوب کو پانا ثانوی چیز بن جاتی ہے اور دل دیتے چلے جانے پر مسرور رہتا ہے۔ اس نے بھی کچھ نہ پاکر سب کچھ پالیا تھا اور اس کی محبت کا شیش محل پوری آن سے کھڑا جگر جگر کررہا تھا۔ وہ اپنے رب کی شکر گزار تھی کہ اس محل کے کسی آبگینے پر خود غرضی کا معمولی سا داغ بھی موجود نہیں تھا۔ اپنی اس شکر گزاری کے اظہار کے لیے وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جائے نماز پر قبلہ رو ہوکر کھڑی ہوگئی۔ محبت کرنے والے دل سے زیادہ شکر گزار کوئی نہیں ہوتا چنانچہ وہ بھی اپنے رب کا شکر ادا کررہی تھی۔

(ختم شد)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آج فیصلے کا دن تھا۔ ''کمرائے عدالت'' لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں نے جتنی عدالتیں دیکھ رکھی ہیں اس خصوصی عدالت کا ماحول اور انصاف کا طریقہ کار بھی مختلف ہے... اور سب سے مختلف تو وہ ہستی ہے جس نے آج کے دن فیصلہ کرنا ہے۔ فیصلے کی گھڑی جوں جوں قریب آرہی ہے، لوگوں کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ میرا دل خشک پتے کی طرح لرز رہا ہے، مجھے لگتا ہے کہ میں نے اتنا بڑا کوئی قصور نہیں کیا جس کی بنا پر میں سزاوار ٹھہروں مگر اگلے ہی

درپردہ

کبیر عباسی

ملمع کاری چاہے کتنی ہی ہنری مندی سے کی جائے، کبھی نہ کبھی اتر ہی جاتی ہے اب یہ اور بات کہ اس راز سے کوئی واقف ہو تا بھی ہے یا صرف اس کی اپنی ذات تک ہی اصل حقیقت محدود رہ جاتی ہے لیکن... یہ سچ ہے کہ دہرے معیار کی زندگی گزارنے والے ضمیر کی چبھن سے کبھی آزاد نہیں ہوتے... لاشعور میں کہیں چھپا ان کا ایمان انہیں قدم قدم پر ان کی بے ایمانی کا احساس دلاتا ہے جسے وہ بہ حسن و خوبی نظر انداز کرکے زندگی گزارے جاتے ہیں مگر... انجام انہیں خون کے آنسو رلا دیتا ہے۔

گن گن کر نیکیاں کرنے والوں کی اَن گنت

بدی کا احوال

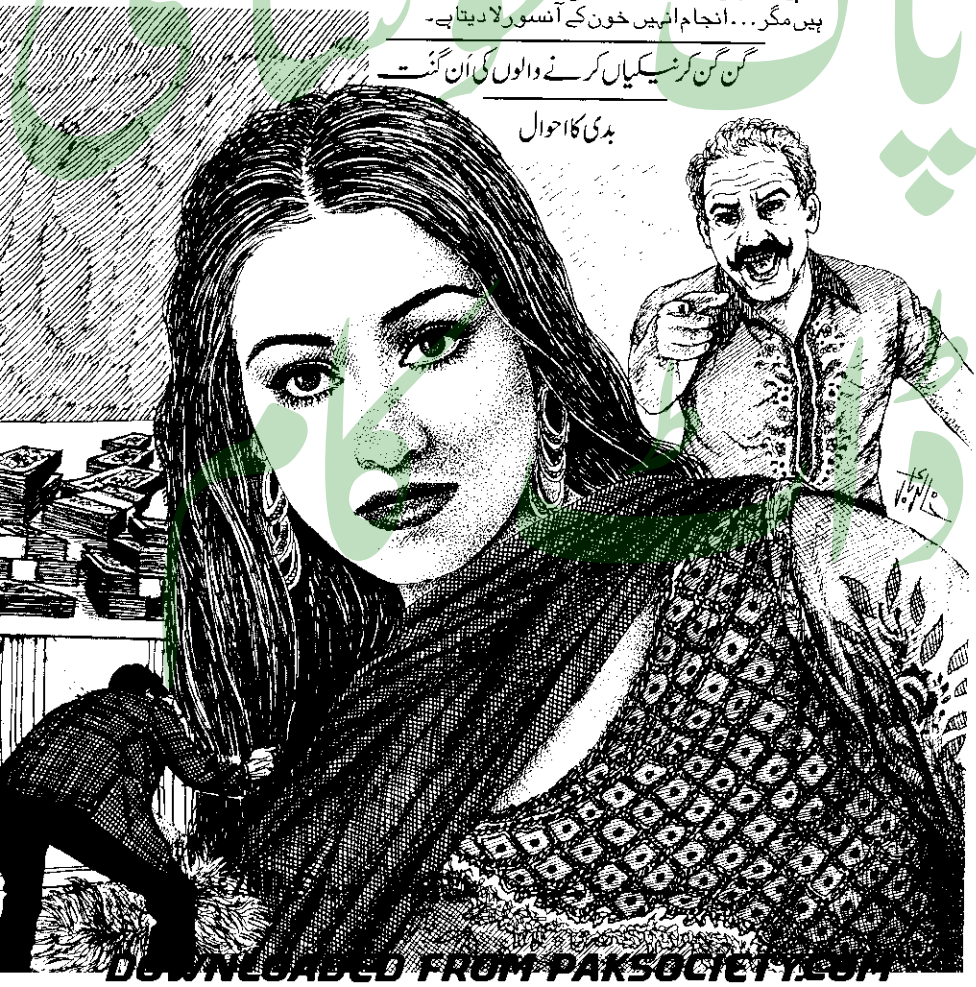

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لمحے میرا اعتماد متزلزل ہونے لگتا ہے۔ میں اپنے متعلق فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے آپ کا حقیقت سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو میرا انداز بے باک لگے مگر میں آپ کی صرف ہمدردی حاصل نہیں کرنا چاہتا..... لہٰذا میں آپ کی رسائی اپنی زندگی کے چند خفیہ گوشوں تک کرتا ہوں۔

☆☆☆

تراویح کی آٹھ رکعتیں پڑھتے ہی میں نے دانش کو اشارہ کیا تو وہ میرے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ آدھی مسجد خالی ہو گئی تھی جبکہ کچھ لوگ بارہ رکعتیں پڑھ کر باہر نکلتے۔ جب نماز تراویح شروع ہوتی تھی تو مسجد کھچا کھچ بھری ہوتی تاہم بیس رکعتوں تک بہ مشکل ایک آدھ صف ہی بچتی تھی۔

ہمارا جس فرقے سے تعلق ہے وہ تو بیس رکعتوں کے حامی تھے مگر ہمیں آٹھ رکعتوں میں اپنی سہولت نظر آتی تھی سو آٹھ ہی پڑھتے تھے۔ فرض نماز کی اور بات تھی۔

باہر گلی میں ایک ہی جنرل اسٹور کھلا ہوا تھا اور اس پر اچھا خاصا رش لگا تھا۔ زیادہ تر لوگ کولڈ ڈرنکس یا سگریٹ کی خریداری میں مشغول تھے۔ ہم نے بھی دکان سے سگریٹ لے کر سلگائے اور گلی میں آوارہ گردی کرنے لگے۔

دانش اور میری عمریں تیس سال کے قریب تھیں۔ ہم ایک ہی ملٹی نیشنل کمپنی کے ایک ہی آفس میں جاب کرتے تھے۔ ہمارا شعبہ اور جاب کی نوعیت بھی ایک ہے، اس کے علاوہ بھی ہم میں کافی قدریں مشترک ہیں۔ جیسا کہ ہم نہ صرف ایک ہی محلے، بلکہ ایک ہی گلی میں بھی رہتے ہیں اور ہم دونوں ہی تا حال غیر شادی شدہ ہیں۔

ہم گلیوں میں آوارہ گردی کے ساتھ ساتھ گپ شپ میں مشغول تھے۔

''یار! تین ہفتے ہو گئے ہیں کسی لڑکی سے ملے۔'' میں نے سگریٹ کے مرغولے چھوڑتے ہوئے کہا، میرے لہجے میں حسرت تھی۔

''کیوں بے، تیری تو ایشا سے سیٹنگ چل رہی تھی اور وہ تو بڑی ''دیالو'' لڑکی ہے۔'' اس نے دیالو پر زور دیتے ہوئے آنکھ کا گوشہ دبایا۔

''دیالو تو ہے مگر کہتی ہے رمضان میں نہیں ملنے آنا۔'' میرے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''اچھا.....'' اس نے اچھا کو لمبا کر کے ادا کیا۔ ''تو چل پھر آج لال بازار چلتے ہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''رمضان میں لال بازار کھلا ہوتا ہے؟'' میرے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہے ایک مہربان! جس کا دروازہ رمضان میں بھی کھلا رہتا ہے۔'' وہ پراسراری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اچھا تو چل نا پھر آج ہمیں بھی اپنے اس مہربان سے ملا۔'' میں بے تابی سے بولا۔ میری بے تابی دیکھ کر وہ مسکرا دیا۔

لال بازار کوئی باقاعدہ ایسا ویسا بازار نہیں تھا۔ ایک محلے میں کچھ گھروں میں یہ کام ہوتا تھا جس کی خبر کچھ خاص خاص لوگوں کو ہی تھی۔ ہم اسی محلے کے لیے لال بازار کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔

ہم پیدل ہی اس محلے تک پہنچ گئے۔ میں پہلے بھی دو تین بار دانش کے ساتھ ہی اس محلے میں آیا تھا۔ تاہم اس وقت اس نے جس گھر کی بیل بجائی تھی، اس گھر میں آنے کا آج میرا پہلا اتفاق تھا۔

مکان کافی پُرشکوہ اور آرٹسٹک سا تھا۔ گھر کے مکین کافی دولتمند لگ رہے تھے۔ مطلب ان کا دھندا اچھا چل رہا تھا۔ ادھر کا تو ریٹ بھی کافی زیادہ ہوگا..... میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

گارڈ دروازہ کھول کر سوالیہ نظروں سے ہمیں گھورنے لگا۔

''دلشاد بیگم سے کہو مہمان آئے ہیں۔'' دانش نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

گارڈ جو ہمیں پیدل پا کر قدرے حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس کے لہجے سے خاصا متاثر ہوا۔

''جی، بی بی جی کو کیا نام بتاؤں آپ کا جی؟'' جی جی شاید اس کا تکیہ کلام تھا۔

''دانش ممتاز۔'' دانش نے صرف اپنا نام بتانے پر اکتفا کیا۔ اس کا مطلب تھا، اس کے اس گھر کے مکینوں سے پرانے تعلقات تھے۔

تھوڑی دیر میں ہم اندر بیٹھے تھے۔ دلشاد بیگم میری توقع کے برخلاف بہت ہی سوبر سی خاتون تھیں۔ اس کی عمر چالیس سے پچاس کے درمیان کچھ بھی ہوسکتی تھی۔ سب سے حیران کن چیز اس کا حلیہ تھا۔ اس حلیے میں کم سے کم آج تک میں نے کسی نائیکا کو نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر اس نے سفید رنگ کا ہی دوپٹا اچھی طرح جمایا ہوا تھا۔ چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے بے نیاز تھا۔ اس کے ہاتھ اور چہرہ گیلا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے ابھی ہاتھ منہ دھویا ہو۔

اس نے ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس منگوائیں۔ میں اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دانش ڈرنک نہیں کرتے تھے۔ اسے شاید اس بات کا پتا تھا یا ادھر مہمانوں کو ڈرنک پیش کرنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ کولڈ ڈرنک پینے کے دوران ہی دانش نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

''اس وقت تو نشاط اور نازش ہی گھر میں ہیں۔'' وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔

''ٹھیک ہے، جو بھی ہوں چلیں گی۔ آپ نے ویسے بھی سارے پیس چن چن کے رکھے ہوئے ہیں۔'' دانش کے ایسے ریمارکس سن کے بھی اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

ایسی نائیکا زندگی میں پہلی بار میں نے دیکھی تھی۔ ورنہ عام ..طور پر تو نائیکا گاہکوں کے آگے بچھ بچھ جاتی تھیں۔ مجھے پچھلی بار والی نائیکا یاد آئی۔ دانش نے اس کے حسن کی جھوٹی تعریف کی تھی تو اس نے بڑا ہی بے ڈھنگا سا قہقہہ لگاتے ہوئے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے ہاتھ پر مارا تھا۔ ''دانش جی! آپ بھی نا...... بڑے مخولی ہو۔'' وہ ایک ادا سے شرما کے بولی تھی۔ دانش جتنے تو شاید اس کے پوتے ہوں گے مگر اس نے دانش جی ایسے کہا تھا جیسے وہ دانش سے بھی چھوٹی ہو۔

اور ایک یہ نائیکا تھی جس کا ہر انداز سپاٹ تھا۔ اگر اس کی طرح اس کی لڑکیاں بھی سپاٹ ہوئیں تو......؟ یہ خیال مایوس کن تھا مگر مجھے دانش پر یقین تھا۔ وہ اگر یہاں آتا تھا تو اس کا مطلب تھا ادھر کچھ ''خاص'' ہے۔ اسے تو ویسے بھی انتہائی گرمجوش قسم کی لڑکیاں پسند تھیں۔ وہ اسی لیے اپنی گرل فرینڈز سے زیادہ بازاری لڑکیوں کو پسند کرتا تھا کہ اس کے بقول گرل فرینڈز تعاون نہیں ....کرتیں جبکہ بازاری لڑکیوں کے ساتھ تعاون کرنا پڑتا ہے۔

''دلشاد جی! وقت کم ہے۔'' اس نے جب میرے لیے نشاط اور اپنے لیے نازش پسند کرنے کے کافی دیر بعد بھی کوئی ہل جل نہیں دیکھی تو گھڑی دیکھتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

''بس تھوڑی دیر آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔ بچیاں تراویح پڑھ رہی تھیں۔ وہ فارغ ہو جائیں تو میں ان کو بھیجتی ہوں۔'' اس کا لہجہ اب بھی بے تاثر تھا مگر میں تو حیرت سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس طرح کا کام کرنے والی لڑکیاں اور نمازیں، وہ بھی نماز تراویح، ہونہہ...... میں نے حقارت سے سوچا۔

خیر کچھ دیر بعد نازش اور نشاط آ گئیں۔ میں نے ابھی دونوں کی تصویریں دیکھی تھیں مگر وہ تصویروں سے کہیں بڑھ کے حسین تھیں۔ ان کے ہلکے ہلکے میک اپ اور جسم کی نمائش کرتے لباس سے بالکل اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ابھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ مجھے ویسے بھی یہ اس نائیکا کی گپ ہی لگی تھی۔ اس طرح اپنی ''بچیوں'' کو پاکیزہ ظاہر کر کے شاید وہ ان کا ریٹ بڑھاتی تھی۔ میں جو کافی دیر سے حیرانی کا شکار تھا، اپنے دماغ کی اس توجیہہ سے مطمئن ہو گیا۔

رات بہت اچھی گزری تھی۔ نشاط اپنے کام میں ماہر تھی، اس نے مجھے بھرپور انجوائے کرایا تھا۔ میری تو روح تک سرشار ہو گئی تھی۔ دانش بھی مطمئن لگ رہا تھا۔

واپسی پر میں نے دانش سے کہا۔ ''یار! کتنے گھٹیا لوگ ہیں یہ جو رمضان کے احترام میں بھی اپنا دھندا بند نہیں کرتے۔'' میرے لہجے میں ان کے لیے نفرت تھی۔ ان کے متعلق یہ بات کرتے ہوئے دیگر بہت سے لوگوں کی طرح اپنا گریبان میری نظر سے اوجھل ہی تھا۔

''ابے، ان کے لیے کیا رمضان اور کیا رمضان کا احترام۔'' وہ حقارت سے بولا۔

''اچھا یہ بحث چھوڑ اور تیز چل، یہ نہ ہو دیر ہو جائے اور بھوکے پیٹ روزہ رکھنا پڑے۔'' اس نے کہا تو میں نے بھی اپنے قدم تیز کر دیے کیونکہ کچھ بھی ہو، ہم نے زندگی میں کبھی روزہ نہیں چھوڑا تھا۔ ہم دونوں کا گھرانا کافی مذہبی تھا۔ نماز روزے کی عادت ہمیں بچپن میں ہی ڈال دی گئی تھی۔ نماز میں تو اب مصروف زندگی کے باعث اکثر اوقات کوتاہی ہو جاتی تھی مگر روزہ چھوڑنے کا ہمارے گھر میں تصور بھی نہیں تھا۔

گھر والے سحری کے لیے اٹھ چکے تھے۔ میں بھی غسل کر کے سحری میں ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ میرے رات بھر غیاب کا کسی نے نوٹس نہیں لیا تھا۔ جس دن صبح چھٹی ہوتی تھی، اس دن ویسے بھی میں رات باہر ہی رہتا تھا۔ عام طور پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ یا انڈور گیمز میں ہی رات گزر جاتی تھی۔ صبح کی نماز کے بعد میں جو سوتا تو ظہر کی نماز کے وقت اٹھتا۔ نماز پڑھ کے فلم دیکھ لیتا یا دوستوں کے ساتھ اسنوکر کلب چلا جاتا۔ اس طرح روزہ بہت اچھا گزر جاتا تھا۔ عام دنوں میں تو جاب کی مصروفیت کے باعث روزہ گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا مگر چھٹی والے دن اگر اس طرح کی مصروفیات نہ ہوتیں تو روزہ بہت مشکل سے گزرتا۔

فجر کی نماز کے بعد باہر نکلا تو دانش نے میری کمر پر دھپ رسید کی۔ ''کیوں بے، مزہ آیا نا رات کو؟''

اس کے سوال سے رات کے مناظر میرے تصور میں ابھرے تو سنسنی کی لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ ''ہاں بہت زیادہ......'' میں بولا تو میری آواز قدرے بہکی بہکی تھی۔

''ابے چل، روزے میں تو ایسی اداکاری نہ کر۔'' اس نے پھر سے میری کمر پر دھپ رسید کی۔ 'ابے' اس کا تکیہ کلام

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا اور کمر پر دھپ مارنا اس کی عادت..... میری کمر اس کے اس مشق ستم کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اب وہ اگر کسی ملاقات میں میری کمر پر دھپ نہ مارتا تو مجھے وہ ملاقات ہی تشنہ لگتی۔

''ایکٹنگ نہیں کر رہا یار! بقول کمار سانو..... رات کا نشہ ابھی آنکھ سے گیا نہیں.....'' میں نے باقاعدہ گانا گنگنایا۔

''ابے، یہ کمار سانو کا گانا نہیں، یہ تو وہ مشکل سے نام والے سنگر نے گایا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر میری کمر پر دھپ رسید کرتے ہوئے کہا۔ آج تو وہ کچھ زیادہ ہی ہتھ چھٹ بنا ہوا تھا۔ میری عافیت اسی میں تھی کہ اس سے اجازت چاہوں اور کمر کو جا کے کہیں ٹکاؤں۔ رات کی ''مشقت'' کی بدولت ویسے بھی میرا جسم درد کر رہا تھا اور اب آرام کا طلبگار تھی۔

''چل چھوڑ، اس بحث کو۔ میں چلتا ہوں، بڑی سخت نیند آ رہی ہے۔'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، پر تین بجے پرنس اسنوکر کلب میں آ جانا وقار نے چیلنج کیا تھا۔''

''ہاں ہاں..... مجھے یاد ہے۔ پچھلی بار میں اس سے دس ہزار جیتا تھا۔ اس کی کوشش ہوگی کہ وہ پورے کرے۔'' میں بے پروائی سے بولا۔

''اس بار وہ شمس کو لا رہا ہے۔ وہ چاہتا ہے ''ڈبل..... کھیلیں۔ وہ اور شمس پارٹنر اور میں اور تو.....''

اس کی بات سن کر میرے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''شمس سے ہمارا گیم بنتا ہے؟ وہ تو صوبائی لیول تک کھیل چکا ہے۔''

''سمجھا کرنا..... ہم اسٹارٹ لیں گے۔ ہم دونوں پارٹنر ہوں تو ہمارا گیم تقریباً برابر ہی بنتا ہے۔ وہ اگر سکس بالز پر دس کیا پانچ کا اسٹارٹ بھی دے دیں تو میرا نہیں خیال کہ ہم سے جیت سکیں گے۔''

''چل ٹھیک ہے..... دیکھ لیں گے انہیں بھی۔'' اس کی وضاحت نے مجھے کافی حد تک مطمئن کر دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے پھر میری کمر کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

شام کو شمس اور وقار کی جوڑی سے ہم پانچ ہزار جیت گئے۔ شروع میں انہوں نے دس کا اسٹارٹ دیا تھا۔ جو لوگ اسنوکر کھیلنا نہیں جانتے، انہیں بتاتا چلوں کہ اسٹارٹ دینے کا مطلب ہوتا ہے کہ گیم شروع ہونے سے پہلے ہی دوسری ٹیم کا اتنا اسکور ہوتا ہے جتنے کا اسے اسٹارٹ ملتا ہے۔ عام طور پر بیٹنگ کھیلتے ہوئے طاقتور ٹیم کمزور ٹیم کو اتنے اسکور کا اسٹارٹ دیتی ہے جتنے پر دونوں کا گیم تقریباً برابر کا ہو جائے۔ بیٹنگ کی اصطلاح اسنوکر میں جوا کھیلنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

بہر حال دس کے اسٹارٹ پر تو پانچ پانچ سو کے لگاتار ہم نے چار گیمز جیت لیے تو انہوں نے کہا اسٹارٹ کم کرو۔ ہمارا گیم چل رہا تھا۔ اسٹارٹ کم کر کے پانچ کا کر دیا گیا۔ پانچ کے اسٹارٹ پر کافی کانٹے کا مقابلہ ہوا۔ ایک گیم میں ایسے مگن ہوئے کہ عصر کی نماز بھی قضا ہو گئی۔ جس کا مجھے کافی افسوس ہوا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ کم از کم رمضان میں نماز قضا نہ ہو۔ مغرب سے کچھ دیر پہلے ہی انہوں نے مزید کھیلنے سے انکار کر دیا۔

ہم جیتے ہوئے تھے، ہمارے کچھ اور دوست ہم سے افطار پارٹی کا تقاضا کرنے لگے۔ ہم انہیں فوڈ اسٹریٹ لے گئے۔ یوں گیم میں ہم نے جو پانچ ہزار جیتے تھے وہ افطاری پر لگ گئے۔ مگر مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں تھا کیونکہ آج کا روزہ بہت اچھا گزرا تھا۔ بھوک پیاس کا تو بالکل پتا ہی نہیں چلا تھا۔

☆☆☆

اسی طرح رمضان کا بابرکت مہینا اپنے اختتام کو پہنچا۔ میں نے پورے روزے رکھے تھے اور نماز بھی بس ایک ہی قضا ہوئی تھی۔ گھر میں تو وقت ملتا نہیں تھا۔ آفس میں ہی میں نے دو قرآن بھی مکمل کر لیے تھے۔ رمضان میں ہر نیکی کا ستر گنا اجر ملتا ہے۔ قرآن کا ایک لفظ پڑھنے سے دس نیکیاں ملتی ہیں۔ رمضان میں ان نیکیوں میں ستر گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ دو قرآن پاک پڑھنے کے بعد تو مجھے اربوں کھربوں کی نیکیاں مل چکی تھیں۔ اس کے علاوہ میں کچھ ایسے اعمال بھی کرتا رہتا تھا جن کے کرنے سے سارے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

مجھے اطمینان تھا کہ اس بار بھی رمضان کافی اچھا گزر گیا، ورنہ کئی لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو نہ روزے رکھتے ہیں اور نہ ہی نماز پڑھتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر مجھے بہت غصہ آتا ہے جو رمضان کے مہینے میں بھی عبادت نہیں کرتے۔

عید بھی بہت اچھی گزر گئی۔ عید کا دوسرا اور تیسرا دن میں نے اپنی گرل فرینڈ ایشا کے ساتھ گزارا۔ ہم خوب گھومے پھرے۔ یہ دو راتیں بھی میں نے چھپ کر اس کے کمرے میں ہی گزاری تھیں۔

رمضان کے بعد زندگی اپنے معمول پر آ گئی تھی۔

کچھ دن بعد میں اور دانش ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک تقریب میں گئے۔ تقریب بے سہارا اور یتیم بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والی ایک این جی او کی طرف سے تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس تقریب میں انٹری فیس ایک ہزار روپے فی کس تھی۔ یہ فیس این جی او کی فنڈ ریزنگ اسکیم کا حصہ تھی۔ تقریب کا چیف گیسٹ ایک صوبائی وزیر تھا۔

تقریب میں ایک مقامی سنگر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی تھی اور یہ سنگر دانش کی دوست تھی۔ اسی کی وجہ سے ہم اس تقریب میں آئے تھے ورنہ ہمیں دو ہزار روپے برباد کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

تقریب کے دوران این جی او کی روح رواں کی کافی مداح سرائی ہوتی رہی۔ عام لوگ بھی بات چیت میں اس کی کافی تعریف کر رہے تھے مگر کوئی بھی اس کا نام نہیں لے رہا تھا۔ سب صرف بیگم صاحبہ ہی کہہ رہے تھے۔ مجھے کافی تجسس ہونے لگا۔ میوزک شو کے بعد اسی کا خطاب تھا۔ دانش میوزک شو کے بعد اٹھنا چاہ رہا تھا مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

''ٹھہر..... بیگم صاحبہ کا خطاب سن کے چلتے ہیں۔'' میں نے اس کے کان میں کہا تو وہ مارے باندھے میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

اناؤنسر اب بیگم صاحبہ کے این جی او کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔ اس کے بیان سے تو لگ رہا تھا کہ اگر یہ این جی او نہ ہوتی تو گویا سارے بے سہارا اور یتیم بچے بھوکے ہی مر جاتے۔ وہ بتا رہا تھا کہ بیگم صاحبہ نہ صرف بچوں کی پرورش اور تربیت کرتی ہیں بلکہ وہ اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے انہیں نوکریاں بھی دلواتی ہیں۔ بیگم صاحبہ بے سہاروں کے لیے فرشتہ ہیں، فرشتہ..... میں..... میں آج جو کچھ بھی ہوں بیگم صاحبہ کی وجہ سے ہوں۔ وہ جذباتی انداز میں بولا تو پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ میں بھی بیگم صاحبہ کے کارناموں سے کافی متاثر ہوا۔

''بیگم صاحبہ نہ صرف بے سہارا بچوں کو سپورٹ کرتی ہیں بلکہ بے سہارا عورتوں کو تحفظ دینا بھی ان کا مشن ہے۔ میں آپ کے سامنے ایک مثال رکھتا ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ہی بیگم صاحبہ کے پاس لڑکیوں کا ایک گروپ پہنچا۔ وہ سب پیشہ ور لڑکیاں تھیں جو مختلف لوگوں کے جبر کا شکار تھیں۔ انہیں جب بیگم صاحبہ کی خدا ترسی کا علم ہوا تو وہ سب کسی نہ کسی طرح ان کے پاس پہنچ گئیں۔ جب سے وہ ان کی سرپرستی میں آئی ہیں، وہ محفوظ ہیں۔ گو کہ ان میں سے کچھ اب بھی پیشہ کرتی ہیں مگر اب انہیں کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔''

اسی طرح کے بیگم صاحبہ کے کچھ کارنامے سنانے کے بعد وہ بولا۔ ''اب میں بلاتا ہوں اس شخصیت کو جو اس شہر میں بے سہاروں کا واحد سہارا ہیں۔ جو ان کے لیے امید کی کرن ہیں۔ جو سب کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ ہم سب کی تالیوں کی گونج میں تشریف لاتی ہیں بیگم صاحبہ.....''

لوگ کھڑے ہو کر تالیاں پیٹنے لگے۔ عوام تو ایک طرف وزیر صاحب بھی کھڑے ہو کر تالیاں بجا رہے تھے۔ باقی لوگوں کی دیکھا دیکھی ہم بھی مجبوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

بیگم صاحبہ بڑے وقار سے چلتی ہوئی اسٹیج پر آئیں۔ ان کا چہرہ روشنی میں آیا تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ میرا دماغ غصے سے کھولنے لگا۔ وہ دلشاد بیگم تھی۔ میں دانش کا ہاتھ پکڑ کے اسے باہر کھینچ لایا۔

''لو یار... اب اس طرح کی عورتیں بھی عزت دار ہو گئی ہیں، ہم جیسے خاندانی اور مذہبی لوگ بھی ان کا کھڑے ہو کر استقبال کرتے ہیں۔ مجھے پتا ہوتا کہ اس این جی او کی روح رواں ایک ایسی نائیکا ہے جو رمضان میں بھی لڑکیوں سے دھندا کراتی ہے... تو میں ہرگز اس تقریب میں نہ آتا۔'' میرا غصہ کنٹرول ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں یار، تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' دانش بولا۔ ''آج کل تو یہ عورتیں بھی فلاحی کاموں کا نعرہ لگا کر نیک نام بن گئی ہیں۔ حالانکہ انہیں کیا پتا کہ نیکی کسے کہتے ہیں۔''

میں حیران تھا کہ آجکل جو لوگ نماز روزے کو چھوڑ کر فلاحی کاموں کو نیکی سمجھنے لگے ہیں، ان کا کیا ہوگا؟

مشورہ

''دیکھیں جناب! پورا ایک ہفتہ ہو گیا ہے میرے شوہر آلو خریدنے گئے تھے۔ ابھی تک نہیں لوٹے۔'' ایک خاتون نے انتہائی پریشانی کے عالم میں پولیس آفیسر سے کہا۔

''تو محترمہ آپ نے ضرور آلو ہی پکانے ہیں، کوئی اور سبزی پکالیں۔'' انسپکٹر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

جواب

شیطان نے فرعون کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازے پر دستک کی آواز سن کر فرعون نے پوچھا ''کون ہے؟''

شیطان اندر آ گیا اور کہنے لگا ''لعنت ہو تم پر اور تمہاری خدائی پر..... تم دعویٰ تو خدائی کا کرتے ہو اور یہ تک نہیں جانتے کہ دروازے پر کون ہے۔''

مرسلہ: وزیر محمد خان، بغل ہزارہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

واپسی پر دانش نے گاڑی میں ریڈیو لگا دیا۔ کسی عالم کا بیان چل رہا تھا۔

حدیث مبارکہ ہے کہ.....

''کچھ روزہ دار ایسے ہیں جن کو روزہ رکھ کے کچھ نہیں ملتا بجز بھوکا پیاسا رہنے کے۔''

دانش نے ہاتھ بڑھا کر چینل تبدیل کر دیا۔ اس چینل پر گانے چل رہے تھے۔ میں گانے کے ساتھ گردن ہلانے لگا۔ چند لمحات کے بعد دانش بولا۔ ''ولید یار! ہم روزے تو رکھ رہے ہیں۔ نماز بھی پڑھ رہے ہیں۔ قرآن کی تلاوت اور ذکر اذکار بھی کرتے رہتے ہیں۔ تیرا کیا خیال ہے، ہماری یہ عبادتیں قبول ہو جائیں گی یا ہمیں بھوکا پیاسا رہنے اور مشقت کے سوا کچھ نہیں ملے گا؟'' اس کا انداز فلسفیانہ تھا۔

''کیوں قبول نہیں ہوں گی۔ رمضان میں تو ہمیں یہ سب کرنے سے ستر گنا زیادہ اجر مل رہا ہے۔'' میں پُریقین لہجے میں بولا۔

''اور وہ گناہ جو ہم کرتے رہتے ہیں؟'' دانش ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے میری طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ عید کی تعطیلات کی وجہ سے روڈ پر تھوڑا رش تھا۔ اس لیے اس نے کن انکھیوں سے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔

''گناہ کا کیا ہے۔ ہم انسان ہیں کوئی فرشتے تو نہیں۔ ویسے بھی مجھے تو مولوی صاحب نے ایسا وظیفہ بتایا تھا جو کرنے سے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ میں وہ وظیفہ روزانہ کرتا ہوں۔'' میں نے فخریہ انداز میں بتایا۔

''کونسا وظیفہ؟'' دانش پُراشتیاق نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ میں جواب دینے ہی لگا تھا کہ اچانک میری نظر سامنے سے آتی گاڑی پر پڑی۔ وہ ایک گاڑی کو اوور ٹیک کر رہی تھی۔ اس کی رفتار کافی زیادہ تھی۔ دانش نے اپنی گاڑی کچے میں اتارنے کی کوشش کی مگر اس کے باوجود اس گاڑی کی سائڈ ہماری گاڑی سے ٹکرا گئی۔ ہماری گاڑی کو جھٹکا لگا اور وہ قلابازیاں کھا کر کھائی میں نیچے جانے لگی۔ میری اور دانش کی چیخیں بلند ہوئیں۔ اسی لمحے میرے سر پر زوردار چوٹ لگی اور میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا۔

☆☆☆

مجھے ہوش تو آ گیا مگر میری ریڑھ کی ہڈی پر لگنے والی چوٹ نے مجھے مستقل طور پر معذور کر دیا۔ دانش کے جسم میں بھی خوب ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔ وہ تین ماہ کے علاج کے بعد کسی حد تک چلنے کے قابل تو ہو گیا ہے مگر اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئی ہیں۔ وہ اب دیکھ نہیں سکتا۔

میں پورا دن ایک ہی کمرے میں پڑا رہتا ہوں۔ مجھے پہلے اپنی عبادات پر فخر ہوتا تھا، شاید اس لیے کبھی اپنے گناہوں پر شرمندگی محسوس ہی نہیں کی تھی مگر معذوری نے مجھے اپنا محاسبہ کرنا سکھا دیا۔ کتابوں کے مطالعے سے مجھے علم ہو چکا ہے کہ عبادات تو روح پر لگے زنگ کو اتارنے کے لیے، اس کی ترقی کے لیے ہوتی ہیں۔ جب ہماری روح گناہوں کی بدولت بنجر ہو چکی ہو تو ندامت کے بادل اور توبہ کی بارش ہی اس کو پھر سے ہرا بھرا کر سکتی ہے ورنہ فقط عبادات اس پر کوئی اثر نہیں ڈالتیں۔ ہمارے اعمال نامے میں لکھی جانے والی نیکیوں کا پلڑا تبھی بھاری ہو سکتا ہے جب عبادات کے علاوہ ہمارے اعمال بھی درست ہوں گے۔

وہ بیگم صاحبہ جن سے میں بے پناہ نفرت محسوس کرتا تھا، آج مجھے خود سے قدرے بہتر نظر آ رہی ہیں۔

جب میں اپنے اردگرد کے دیگر لوگوں کو دیکھتا ہوں تو اکثریت میں اپنا عکس ہی پاتا ہوں۔ میں تو خیر بہت بدبخت تھا جو رمضان جیسے مقدس ماہ میں بھی قبیح افعال کا مرتکب ہوتا رہتا تھا مگر دیگر لوگ بھی کسی نہ کسی درجے پر بہت سے گناہوں کا شکار ہیں اور رمضان جیسے مقدس ماہ میں بھی وہ ان گناہوں سے باز نہیں آتے۔ کاش میری طرح انہیں کسی حادثے کے بغیر اپنے آپ کو درست کرنے کا موقع مل جائے۔

میں رو رو کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں مگر میرے دل کو قرار نہیں مل رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ خدا مجھ سے ناراض ہے اور وہ ناراض ہے بھی تو ٹھیک ناراض ہے۔ میں بھی اپنے گناہوں کی معافی تب مانگ رہا ہوں جب میں گناہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا۔

میرے معاملات کبھی درست رہے ہی نہیں تھے اور معاملات کے بغیر بھلا صرف عبادات کیسے قبول ہو سکتی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اب صرف اسی صورت میں، میں بخشا جا سکتا ہوں جب خدا مجھے معاف کر دے۔ ورنہ میرے اعمال تو میری بخشش کے قابل نہیں اور پتا نہیں وہ مجھے معاف کرے گا بھی یا نہیں۔ اب میں ہر وقت... چشم تصور میں عدالت لگی دیکھتا رہتا ہوں۔ وہ عدالت جس میں ایک دن ہم سب کو پیش ہونا ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا کچھ عکس آپ کے سامنے پیش کیا۔ میرے خیال میں تو دین اور دنیا کو دو الگ الگ خانوں میں رکھنے والے شخص کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں ہی پکڑایا جائے گا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

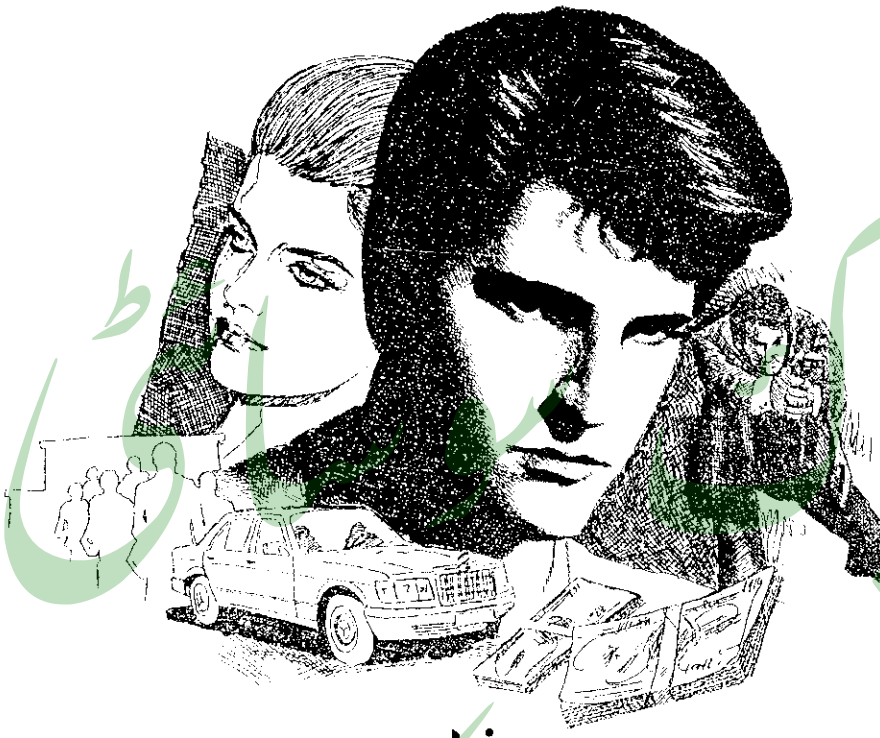

نشانہ

شاکر لطیف

کسی بھی معاشرے کی بنیاد آپس کے تعلقات اور رشتوں کی ساخت پر ہوتی ہے اور ہر دور میں وقت نے ثابت کردیا ہے کہ جرائم کی دلدل میں جو ایک بار اترا اس کے دامن سے یہ داغ لاکھ تدبیروں کے باوجود پھر کبھی نہ مٹ سکا۔ اسی لیے یہ رشتے ناتے اور تعلقات انسانوں کو اپنی محبتوں کی ڈور میں اس طرح باندھ لیتے ہیں کہ ڈگمگاتے قدم بھی سنبھل جاتے ہیں مگر وہ جو خود کو آزاد سمجھ کر کچھ بھی کر گزر جانے کا زعم لیے پھرتا تھا بالآخر جب اس کے پیار کے رشتوں نے اس دلدل سے اسے کھینچنا چاہا تو احساس ہوا کہ واپسی کس قدر ناممکن ہے۔

جرائم کی دنیا میں رشتوں کے بیوپار کا گورکھ دھندا

اس وقت رات کے تقریباً آٹھ بجے کا وقت ہوا تھا تاہم اس علاقے کی سڑکیں ابھی سے ویران اور سنسان دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید اس کی وجہ پڑنے والی شدید سردی تھی۔ اس خراب موسم اور خون منجمد کردینے والی سردی میں سوائے اشد ضرورت کے کوئی بھی اپنے گھر سے باہر نکلنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

اگرچہ راستر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا اور اس نے گاڑی کا ہیٹر بھی آن کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود اسے خاصی سردی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کا احساس ہو رہا تھا۔ راسٹر نے اپنی گاڑی سڑک کے ایک سائڈ پر کھڑی کر رکھی تھی اور اس کی نظریں سامنے موجود پانچ منزلہ عمارت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈین کو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔ اس نے اسے ساتھ چلنے کی آفر بھی کی تھی مگر انا پسند اور ضدی طبیعت کے مالک ڈین کو اس کی یہ آفر پسند نہیں آئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک آدمی کو مارنے کے لیے وہ اکیلا ہی کافی ہے۔

راسٹر جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے، اسے کئی بار اس کا عملی مشاہدہ بھی ہو چکا تھا۔ کسی کو جان سے مارنا اس کے لیے معمولی کام تھا۔ اپنے دشمنوں کے لیے وہ ہمیشہ ایک سفاک اور بے رحم قاتل ثابت ہوتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راسٹر کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ ڈین کی خود اعتمادی اپنی جگہ مگر راسٹر کو اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ کبھی کبھی حد سے زیادہ خود اعتمادی نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اگر ڈین کے شکار کو بروقت اس کی آمد کا علم ہو جاتا تو اس کی اپنی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ اس کا ٹارگٹ رابن بھی کوئی کم خطرناک آدمی نہیں تھا۔ اگر دونوں کا موازنہ کیا جاتا تو ڈین کے حق میں صرف یہی بات جاتی تھی کہ رابن اس کی اس علاقے میں آمد سے بے خبر تھا۔

راسٹر نے سامنے موجود عمارت کا جائزہ لیا۔ انہیں ملنے والی اطلاعات کے مطابق رابن نے چوتھی منزل کے سات نمبر فلیٹ میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ ویسے وہ دل ہی دل میں رابن کو داد بھی دے رہا تھا کہ اس نے چھپنے کے لیے بڑی محفوظ جائے پناہ کا انتخاب کیا تھا۔ عام طور پر اس موسم میں کوئی بھی اس علاقے میں آنا پسند نہیں کرتا تھا، اگرچہ سیاحت کے شوقین اور ایڈونچر پسند افراد بڑی تعداد میں ادھر کا رخ کرتے تھے مگر اس وقت جب یہاں سردی خاصی کم ہو جاتی تھی۔ ایسا سال میں صرف تین مہینے ہی ہوتا تھا۔ یہ جگہ قدرتی حسن سے مالا مال تھی۔ یہاں پہاڑوں کے درمیان ایک خوبصورت جھیل بھی تھی جسے دنیا بھر سے سیاح خاص طور پر دیکھنے کے لیے آتے تھے تاہم اس وقت یہ جھیل بھی سردی کی وجہ سے جم چکی تھی۔

سیزن میں یہاں کے کلب اور ہوٹل اچھا خاصا بزنس کرتے تھے مگر ان دنوں وہ بھی زیادہ تر بند ہی رہتے تھے تاہم اس علاقے کے رہائشی پورا سال یہیں رہتے تھے، انہیں اس سرد موسم میں رہنے کی عادت تھی۔

راسٹر نہیں جانتا تھا کہ تنظیم کے بڑوں نے رابن کا سراغ کیسے لگایا تھا ورنہ عام طور پر کسی کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا تھا۔

وہ رابن کے متعلق سوچنے لگا۔ رابن پچھلے پانچ سالوں سے اس تنظیم کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس تنظیم کو مافیا کے نام سے جانا جاتا تھا جس نے اٹلی میں جنم لیا تھا مگر اب اٹلی میں اس کا صرف نام ہی باقی رہ گیا تھا۔ اٹالین حکومت نے اس جرائم پیشہ تنظیم کے خاتمے کے لیے خاصے موثر اقدامات کیے تھے جس کی وجہ سے اس تنظیم کو وہاں خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ جرائم کی سرکوبی کے لیے سخت حکومتی اقدامات نے مافیا کے بڑوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا اور وہ مجبوراً اٹلی سے فرار ہو کر امریکا آگئے تھے۔ یہاں ان کے کام کرنے کے لیے حالات سازگار تھے اس لیے پچھلے دس برسوں سے تنظیم نے یہاں بھی اپنے قدم جما لیے تھے۔

راسٹر مافیا کے بڑوں سے نہ تو کبھی ملا تھا اور نہ ہی ان کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتا تھا۔ اس کی حیثیت ابھی اپنے ساتھی ڈین کی بہ نسبت خاصی کم تر تھی۔ ڈین نے اپنی وفاداری اور کارکردگی کی بدولت مافیا کے سرکردہ افراد کی نظر میں اپنا ایک الگ اور انفرادی مقام بنا لیا تھا۔ اسے تنظیم کی جانب سے جو بھی ٹاسک دیا جاتا، وہ اسے پوری تندہی سے سرانجام دیتا تھا۔ اس کی کاوشوں کو دیکھتے ہوئے جلد ہی مافیا کے بڑوں کی جانب سے اسے کوئی اعلیٰ تنظیمی عہدہ دیے جانے کا امکان تھا۔

راسٹر کی مختصر معلومات کے مطابق امریکا میں تیزی سے پھلتی پھولتی اس تنظیم کو پانچ افراد کنٹرول کرتے تھے۔ ایک باس جو سب سے اعلیٰ عہدے دار تھا اور پھر اس کے چار معاونین جنہیں اس کے بعد سب سے بلند مقام حاصل تھا۔ یہ تنظیم تقریباً ہر قسم کے جرائم میں ملوث رہتی تھی مگر اس کا اصل ٹارگٹ منشیات کا بزنس ہی تھا جو کہ اس تنظیم کا آبائی پیشہ بھی تھا۔

راسٹر اور ڈین طویل عرصے سے اس تنظیم کے لیے اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ وہ دونوں اس وقت سے تنظیم کے ساتھ تھے جب مافیا کے بڑوں نے اٹلی سے فرار ہونے کے بعد ابھی ابتدائی مراحل میں امریکا میں کام شروع کیا تھا۔ اس وجہ سے مافیا کے بڑے انہیں قدر کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔

راسٹر اور ڈین بہت پرانے اور قریبی دوست تھے اور ڈین ہی کی وجہ سے راسٹر جرائم کی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ وہ دونوں دولت مند بننا چاہتے تھے۔ اس تنظیم میں شامل

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہونے کے بعد ان کی زندگی بہت سہل اور آسان ہوگئی تھی مگر اتنے برسوں بعد راسٹر کی سوچ میں خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ اب مافیا کو خیر آباد کہہ کر ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا، ایسی زندگی جس میں خطرات کا نام و نشان تک نہ ہو مگر اسے اندازہ تھا کہ یہ اتنا آسان نہ ہوگا۔ مافیا کے بڑے اس کے فیصلے کے بارے میں جاننے کے بعد اس کے بارے میں کوئی سخت اور سفاکانہ فیصلہ بھی کرسکتے تھے۔ اسی وجہ سے اس نے ڈین کو درمیان میں ڈال کر باس تک اپنی گزارش پہنچائی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ڈین اس کے بارے میں تنظیم کے بڑوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا کیونکہ وہ ان کے خاصا قریب تھا اور مافیا کے بڑے اس کی خدمات کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ ان سے ایک دفعہ روبرو ملاقات بھی کرچکا تھا تاہم تنظیم کا پرانا رکن ہونے کے باوجود راسٹر کو ڈین جیسی عزت اور مقام حاصل نہ ہوسکا تھا۔ اسے بڑوں کی جانب سے دیے گئے تمام احکامات ڈین ہی کے ذریعے ملتے تھے، حتیٰ کہ وہ مافیا کی جانب سے دیا گیا اپنا حصہ بھی ڈین ہی سے وصول کرتا تھا۔

ڈین نے شادی نہیں کی تھی اس لیے وہ خاصی بے فکری سے زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شادی کے جھنجٹ میں پڑ کر انسان کی شخصی آزادی سلب ہوجاتی ہے اور وہ بیوی بچوں کا پابند ہوجاتا ہے مگر اس کے برعکس راسٹر شادی شدہ ہونے کے ساتھ ساتھ دو بچوں کا باپ بھی بن چکا تھا اور ان ہی کی خاطر وہ اب جرم کی دنیا کو خیر آباد کہنا چاہتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ یا تو مارا جائے گا یا پھر قانون کے مضبوط شکنجے میں پھنس جائے گا اور اسے اپنے بچوں سے بے تحاشا پیار تھا۔ ڈین نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ مافیا کے باس اور بڑوں کو اس بارے میں قائل کرلے گا۔ وہ انہیں بتائے گا کہ راسٹر صرف جرم کی دنیا سے علیحدہ ہو رہا ہے، رابن کی طرح غداری نہیں کر رہا۔

رابن کا خیال آتے ہی راسٹر نے سامنے موجود عمارت کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیا۔ اس کی امید بھری نگاہیں ڈین کی راہ تک رہی تھیں، اسے اب تک رابن کو ختم کرکے واپس آجانا چاہیے تھا۔ رابن بھی مافیا کا ایک اہم آدمی رہا تھا مگر مزید دولت کے لالچ نے اسے بغاوت پر مجبور کردیا۔ اسے ایک خاصے بڑے علاقے میں منشیات کی سپلائی کا کام سونپا گیا تھا مگر وہ انتہائی اعلیٰ کوالٹی کی منشیات میں گھٹیا کوالٹی کی ملاوٹ کرکے کافی عرصے سے مافیا کی آنکھوں میں دھول جھونک رہا تھا۔ اس طرح اسے اپنے حصے سے کہیں زیادہ رقم حاصل ہو رہی تھی مگر یہ بات زیادہ دیر تک مافیا کے اعلیٰ حکام سے پوشیدہ نہ رہ سکی، جیسے ہی ان پر رابن کے فراڈ کا راز آشکار ہوا، انہوں نے فوراً ہی رابن اور اس کی فیملی کے موت کے احکامات جاری کردیے جسے عام اصطلاح میں ڈیتھ آرڈرز کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ کام ڈین ہی کو سونپا گیا تھا۔ ڈین رابن کے تین بیٹوں اور بیوی کو ختم کرچکا تھا مگر رابن ابھی تک بچا ہوا تھا کیونکہ وہ بار بار اپنے ٹھکانے تبدیل کر رہا تھا اور ڈین باوجود کوشش کے اس کا سراغ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ رابن اور ڈین کی یہ آنکھ مچولی کافی مہینوں سے جاری تھی کہ مافیا کے باس نے اچانک اس سے رابطہ کیا اور اسے رابن کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کردیں اور اب ڈین راسٹر کے ہمراہ اسی لیے اس علاقے میں موجود تھا تاکہ رابن کو بھی اس کے بیوی بچوں کے پاس روانہ کیا جاسکے تاہم اپنی عادت کے مطابق وہ کام نمٹانے اکیلا ہی گیا تھا۔

لیکن اب کافی وقت گزر چکا تھا۔ راسٹر کو کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا تھا مگر اسی لمحے اس عمارت کے خارجی راستے سے ڈین آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا اور پھر دروازہ کھول کر راسٹر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گاڑی میں موجود ہیٹر کے آگے کردیے مگر پھر جھلا کر پیچھے ہٹا لیے۔

''لگتا ہے ہیٹر خراب ہے۔ بہرحال اب یہاں سے نکل چلو۔''

''اتنی دیر کیوں کردی، میں تو پریشان ہوگیا تھا۔'' راسٹر نے اس کی بات سن کر گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر لے آیا۔

''اصل میں دیر رابن کے فلیٹ کا دروازہ کھولنے میں ہوئی۔ جدید قسم کا لاک لگا ہوا تھا۔ باقی کام آسانی سے ہوگیا۔ وہ شراب کے نشے میں دھت اپنے بیڈ پر سو رہا تھا۔ اسے اپنے سر پر منڈلانے والی موت کا آخری وقت تک احساس نہ ہوسکا۔ میں نے اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر سائیلنسر لگے ریوالور سے دو فائر کیے اور پھر فلیٹ کا دروازہ بند کرکے باہر آگیا۔ میرا خیال ہے کہ صبح تک اس کی موت کے بارے میں کسی کو بھی معلوم نہیں ہوسکے گا۔ بس اس وقت ہمارا کسی گشتی پولیس سے سامنا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری ذاتی گاڑی پولیس کی نظروں میں آئے ورنہ ہمارے لیے کوئی نئی مصیبت منہ کھڑی ہوسکتی ہے۔'' ڈین نے اسے تفصیل بتانے کے ساتھ اپنی تشویش سے بھی آگاہ کردیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ابھی رابن کی موت کا عقدہ بھی نہیں کھلا اس لیے بظاہر خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔'' راسٹر نے ڈین کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

''خطرے والی بات ہے میرے دوست!'' ڈین تیز لہجے میں بولا۔ ''اگر ہم اس وقت چیک ہو جاتے ہیں تو رابن کی موت کا راز کھلتے ہی پولیس ہماری راہ پر لگ جائے گی۔ انہیں پوسٹ مارٹم سے رابن کی موت کا حتمی وقت معلوم ہو جائے گا۔''

اس کی دلیل سن کر راسٹر نے غیر ارادی طور پر گاڑی کی رفتار بڑھا دی کیونکہ ڈین نے موجودہ صورتِ حال کی جو منظر کشی کی تھی، اس سے صرفِ نظر اس کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔

''چلو اچھا ہوا رابن بھی آخر کار اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا۔ اب دیکھو میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا جاتا ہے۔'' اس نے موضوع بدلتے ہوئے ڈین کو مخاطب کیا۔

''میں نے باس تک تمہاری گزارش پہنچا دی ہے اور ساتھ ہی اپنی طرف سے بھرپور انداز میں سفارش بھی کر دی تھی۔'' ڈین نے تفہیمی لہجے میں اسے جواب دیا۔ ''تم میں اور رابن میں نمایاں فرق ہے۔ تم مافیا کی اجازت سے جرائم کی دنیا سے کنارہ کش ہونا چاہتے ہو جبکہ رابن مافیا کے ساتھ دھوکا دہی کا ارتکاب کر کے غداری کا مرتکب ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے بارے میں کوئی نرم اور مصالحانہ فیصلہ ہی کیا جائے گا مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے بعد ہمارے راستے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں۔''

''مجھے تم سے دوستی ٹوٹنے پر دکھ تو ہوگا۔'' راسٹر کے لہجے میں ڈین کی بات کا جواب دیتے ہوئے افسردگی تھی۔ ''مگر اپنے بچوں کے محفوظ مستقبل کے لیے میں یہ کڑوا گھونٹ بھی بخوشی پی جاؤں گا۔ میں نے اس تنظیم میں رہتے ہوئے اتنا پیسا کمایا ہے کہ اب مزید کی تمنا ہی نہیں رہی۔ میں خطرات کی اس دنیا سے دور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک پرسکون زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ باس تنظیم کے چار بڑے معاونین کے بعد سب سے زیادہ تمہاری رائے کو اہمیت دیتا ہے۔ تم مافیا کے لیے کام کرنے والے واحد امریکی ہو جو باس اور بڑوں سے براہِ راست ملاقات کا شرف حاصل کر چکا ہے۔ تمہیں ان کی نظروں میں ایک نمایاں اور انفرادی مقام حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ تمہاری سفارش کو دیکھتے ہوئے میری استدعا قبول کر لی جائے گی۔ میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

''دوستی میں احسان نہیں ہوتا۔'' ڈین راسٹر کو ٹوکتے ہوئے بولا۔ ''ویسے بھی میں تمہارے بارے میں فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں ہوں۔ میں نے صرف تمہاری گزارش اپنی سفارش کے ہمراہ باس تک پہنچائی ہے۔ باس نے کہا تھا کہ وہ مافیا کے چار بڑوں کی رائے جاننے کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ فیصلہ تمہارے حق میں ہی ہوگا۔''

''میں امید کرتا ہوں کہ ایسا ہی ہو۔'' راسٹر نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھاتے ہوئے کہا۔ اگرچہ اس پھسلن زدہ سڑک پر ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔

تقریباً تین گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ پہاڑی علاقے سے میدانی علاقے میں داخل ہوئے تو ان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے کیونکہ اب وہ خطرے سے باہر آ چکے تھے۔ اس جگہ گاڑیوں کے رش میں ان کی گاڑی بھی گھل مل گئی۔ سردی اگرچہ یہاں بھی موجود تھی پھر بھی قابلِ برداشت تھی اور پھر پہاڑی علاقے کی بہ نسبت یہاں کا درجۂ حرارت کافی زیادہ تھا۔ اس لیے اب ان دونوں کے چہروں پر اطمینان مترشح تھا۔ کچھ دیر مزید سفر کے بعد راسٹر نے ڈین کو اس کے فلیٹ کے سامنے ڈراپ کر دیا۔ ڈین اسے گڈ نائٹ کہتا ہوا اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گیا جبکہ راسٹر نے کار آگے بڑھا دی۔ اس کا گھر بھی زیادہ دور نہ تھا۔

ڈین نے اپنے فلیٹ میں پہنچ کر سب سے پہلے اپنے لیے کافی تیار کی۔ کافی پینے سے اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اپنے کمرے کا سیف کھولا اور اس میں سے ایک چھوٹا مگر جدید ساخت کا ٹرانسمیٹر نکال لیا۔ اسے اب باس کو رابن کے بارے میں رپورٹ پیش کرنا تھی۔

اس نے فریکوئنسی سیٹ کی اور کچھ ہی دیر میں باس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ''ہیلو.....'' دوسری طرف سے باس کی سرد اور سپاٹ آواز سنائی دی۔

''باس! ڈین بول رہا ہوں..... کوڈ ٹرپل زیرو۔ رابن کے بارے میں رپورٹ دینا ہے۔''

''او کے کہو۔'' باس نے اسی لہجے میں کہا۔

''باس! کام ہو گیا ہے۔ رابن کو ختم کر دیا گیا ہے۔ کوئی خاص مشکل بھی پیش نہیں آئی۔'' ڈین نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''گڈ!'' دوسری طرف سے باس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''مافیا سے غداری کرنے والا ہر شخص ایسے ہی عبرتناک انجام کا مستحق ہوتا ہے۔ آئندہ غداری کرنے سے پہلے مافیا کا ہر کارکن سو مرتبہ سوچے گا۔ رابن کے انجام کی کہانی خاص طور پر سب تک پہنچائی جائے گی تاکہ ہمارے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ساتھ دشمنی کا سوچنے والے خوف سے کانپ جائیں اور آئندہ کسی کو بھی ہمارا راستہ کاٹنے کی جرأت نہ ہو۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے باس!'' ڈین نے بدستور مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ یہ انتہائی جدید ٹرانسمیٹر تھا اس لیے درمیان میں اوور کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اسے تنظیم کے بڑوں اور باس سے رابطے کے لیے خاص طور پر فراہم کیا گیا تھا۔ اس کی کال کسی صورت میں بھی کیچ نہیں کی جاسکتی تھی۔ بات چیت کے لیے اسے کوڈ ورڈ بھی بتانا پڑتا تھا۔ فون استعمال کرنے کی ممانعت تھی۔

''تمہیں کل مجھ سے اور تنظیم کے بڑوں سے ملاقات کرنی ہے، جگہ پہلے والی ہی ہوگی۔ کل کی میٹنگ میں انتہائی غیر معمولی اور اہم فیصلے متوقع ہیں۔ تمہاری خدمات اور کارکردگی دیکھتے ہوئے تمہیں خاص طور پر مدعو کیا جارہا ہے اور تمہارے دوست راسٹر کے بارے میں بھی فیصلہ کردیا گیا ہے۔'' باس نے جواب دیا۔

''راسٹر کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے باس!'' ڈین نے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ اس کا سوال سن کر چند لمحوں تک دوسری طرف خاموشی چھائی رہی اور پھر قدرے توقف کے بعد باس کی سرد آواز سنائی دی۔

''سوری ڈین! تنظیم کے تین بڑوں نے راسٹر کے ڈیتھ آرڈرز جاری کردیے ہیں۔''

''اوہ نو باس!'' ڈین زوردار لہجے میں بولا۔ ''راسٹر بہت اچھا انسان ہے۔ اس نے مافیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ یہ بہت سخت فیصلہ ہے اور پھر آپ نے مافیا کے چار کے بجائے تین بڑوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا ایک کو باقی تینوں کے فیصلے سے اختلاف ہے؟''

''بالکل نہیں ......!'' باس نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا فیصلہ ہمیشہ متفقہ ہوتا ہے۔ اصل میں مافیا کا ایک بڑا طبعی موت کا شکار ہوگیا ہے۔ اس کی کرسی خالی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری خدمات حاصل کی جائیں۔ تم ہمارے لیے کئی بار اپنی جان پر کھیلے ہو۔ تم نے عملی طور پر اپنی وفاداری ثابت کردی ہے۔ تمہاری انہی خدمات کے پیشِ نظر مافیا کے بڑوں نے تمہیں اپنے برابر بٹھانے کا اصولی فیصلہ کیا ہے مگر اس کے لیے تمہیں اپنی وفاداری کا ایک آخری ثبوت دینا ہوگا۔''

''مجھے تنظیم کے ایک اعلیٰ عہدے دار کی موت پر افسوس ہے باس!'' ڈین نے اپنے لہجے میں افسردگی طاری کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرے لیے باعثِ اعزاز ہے کہ اس خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے نظرِ انتخاب مجھ پر ٹھہری ہے مگر آپ مجھ سے میری وفاداری کا کون سا ثبوت مانگ رہے ہیں؟'' ڈین نے رسمی طور پر تنظیم کے بڑے کی موت پر افسوس کا اظہار تو کردیا مگر اپنے لہجے کی مسرت نہ چھپا سکا تھا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے کتنا بڑا عہدہ سونپا جارہا ہے۔

''جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا ہے...... راسٹر اور اس کی فیملی کے لیے موت کے احکامات جاری کیے جاچکے ہیں اور ان احکامات پر عمل درآمد تم کرو گے۔ تمہیں مافیا سے اپنی

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وفاداری ثابت کرنے کے لیے اپنے عزیز دوست کو اس کے خاندان سمیت موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا۔ کبھی کبھی بڑے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے قریبی ساتھیوں کی موت ناگزیر ہوجاتی ہے۔''

''مگر باس! راسٹر نے آخر جرم کیا کیا ہے؟'' ڈین نے باس کا جواب سن کر ایک بار پھر اعتراض کیا۔ ''اس نے تنظیم کے بڑوں کے سامنے صرف اپنی التجا پیش کی ہے، کوئی بغاوت تو نہیں کی جو اسے اتنی بڑی سزا دی جارہی ہے۔ بڑوں کے فیصلے سے انحراف میرے لیے ممکن نہیں لیکن پھر بھی میں درخواست کرتا ہوں کہ اس فیصلے پر نظرثانی کی جائے۔''

''تنظیم کے فیصلوں پر نظرثانی کی اپیل کرکے تم اپنی حیثیت اور مقام گنوادو گے۔'' باس کا لہجہ بات کرتے ہوئے سخت ہوگیا۔ ''ایسا نہ ہو کہ ہم تمہارے بارے میں اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور ہوجائیں۔ راسٹر اور اس کی فیملی کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے، وہ قطعی اور آخری ہے۔ مافیا کو چھوڑ کر جانا بھی ایک طرح کی بغاوت ہے۔ اس نے برسوں ہمارے ساتھ کام کیا اور بہت سا مال بھی کمایا اور اب جب تنظیم کو اس کی ضرورت ہے تو وہ تمام مال سمیت کر ہم سے کنارہ کش ہونا چاہتا ہے اور پھر اس کے اندر کیا پنپ رہا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ ابھی تک ایسا کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کے دل کا حال جانچا جاسکے۔ اگر راسٹر کا ضمیر جاگ گیا ہے اور وہ اپنا راستہ الگ کرنا چاہتا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ہمارے بارے میں انفارمیشن لیک کردے۔ پہلے ہی امریکن پولیس ہماری راہ پر لگ چکی ہے اور ہمارے لیے کام کرنے والے بہت سے افراد قانون کی گرفت میں آچکے ہیں۔ راسٹر تمہارے بارے میں جانتا ہے اور تمہارا ہم سے براہِ راست تعلق ہے اس لیے اسے زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لیا جاسکتا۔ ماضی میں بھی ہم نے اپنے نرم رویے کی وجہ سے بہت نقصان اٹھایا ہے اور ماضی سے سبق نہ سیکھنے والے ہمیشہ خسارے میں رہتے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ امریکا میں بھی ہمارا وہی انجام ہو جو اٹلی میں ہوا تھا۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ مافیا کے بڑوں نے اپنے ساتھ بٹھانے کا فیصلہ کرکے تمہیں کتنا بڑا اعزاز بخشا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم اس سونپی گئی ذمے داری کو نبھا پاتے ہو یا نہیں۔ کل چار بجے ہماری میٹنگ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم مقررہ وقت پر پہنچ جاؤ گے۔ جگہ وہی ہے جہاں تم پہلے بھی ہم سے ملاقات کرچکے ہو مگر یاد رکھنا کہ آنے سے پہلے راسٹر اور اس کی فیملی کا بندوبست ہوجانا چاہیے۔''

''یس باس!'' اس بار ڈین کے لہجے میں حقیقی افسردگی تھی۔ ''مگر کل کی میٹنگ کس سلسلے میں کی جارہی ہے؟''

''سب سے پہلے تو تمہارے اس نئے عہدے کا باقاعدہ اعلان کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اہم فیصلے بھی متوقع ہیں۔ جیسا کہ تم جانتے ہو کہ مافیا کی اصل جگہ اٹلی ہے اور تنظیم ابھی تک اپنی جائے پیدائش کو فراموش نہیں کرسکی۔ وہاں کی حکومت تبدیل ہونے کے بعد وہاں مافیا کے پنپنے کے لیے حالات دوبارہ سازگار ہوگئے ہیں۔ اس سلسلے میں تنظیم کے ایک بڑے عہدے دار کو وہاں روانہ کیا جائے گا اور اس معاملے میں تمہارا انتخاب کیا جاچکا ہے۔ راسٹر اور اس کے بیوی بچوں کی موت کے بعد امریکن پولیس اس کے قریبی ساتھیوں کو لازماً تلاش کرے گی اور تم اس کے سب سے قریبی دوست ہو۔ تمہارا اچانک غائب ہوجانا انہیں آسانی سے ہضم نہیں ہوگا۔ ہم نہیں چاہتے کہ امریکی پولیس تمہارا تعاقب کرے، اس لیے تمہیں ایک نیا نام اور شناخت دے کر اٹلی روانہ کیا جائے گا تاکہ تم ان کی دسترس سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاؤ۔ وہاں تم بکھری ہوئی تنظیم کو یکجا کرنے کا کام سرانجام دو گے اور مافیا کے ہر ہمدرد سے رابطہ کرو گے۔ تم چاہو تو مشاورت کے لیے ہم سے بھی رابطہ کرسکو گے مگر تمہیں اپنے فیصلوں میں مکمل آزادی اور خودمختاری حاصل ہوگی۔ کل اپنی مکمل تیاری کے ساتھ آنا۔ اگر تمہارے نئے نام و شناخت کے سفری کاغذات تیار ہوگئے تو تمہیں فوراً ہی روانہ کردیا جائے گا۔ ہمارے پاس آتے ہوئے اپنے ماضی کی ہر اس چیز سے پیچھا چھڑا کر آنا ہوگا جس سے تمہاری سابقہ شناخت ممکن ہوسکے۔ اٹلی کی نئی حکومت میں مافیا کے بہت سے ہمدرد بھی موجود ہیں، وہ وہاں تمہارا فقید المثال استقبال کریں گے اور تمہیں اٹلی میں اپنا کام شروع کرنے کے لیے پس پردہ ان کا تحفظ بھی حاصل ہوگا۔ وہاں ایک شاندار زندگی اور مستقبل تمہارا منتظر ہے۔ کل ٹھیک چار بجے پہنچ جانا۔'' یہ کہتے ہوئے باس نے رابطہ منقطع کردیا۔

ڈین نے ٹرانسمیٹر آف کیا اور اسے دوبارہ سیف میں رکھ دیا۔ مافیا کے بڑوں کا راسٹر کے بارے میں فیصلہ جان کر اس کے ذہن میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ راسٹر اس کا بہت پرانا اور عزیز دوست تھا۔ ان دونوں نے بہت اچھا وقت ساتھ میں گزارا تھا اور پھر ڈین کو راسٹر کے دونوں بیٹوں سے بھی بہت پیار تھا۔ وہ جب اسے معصومانہ لہجے میں انکل کہہ کر پکارتے تو اسے بہت اچھا لگتا۔ راسٹر کا بڑا بیٹا جونی چھ سال کا تھا جبکہ چھوٹا بیٹا رابرٹ چار سال کا ہوچکا تھا۔ ڈین غیر شادی شدہ تھا مگر اس کے باوجود اسے بچوں کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر اوقات جونی اور رابرٹ کو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گھمانے لے جاتا اور انہیں بہت سے تحائف بھی خرید کر دیتا تھا۔ کل جونی کی سالگرہ تھی، ڈین جانتا تھا کہ راسٹر اپنے بیٹوں کی سالگرہ میں سوائے اس کے کسی اور کو مدعو کرنا پسند نہیں کرے گا کیونکہ اب تک ایسا ہی ہوتا آرہا تھا۔ ڈین مہمان کی حیثیت سے اس تقریب میں شرکت کرنے والا واحد فرد ہوتا تھا۔ راسٹر کو زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں تھی۔ اس لیے وہ اپنے بچوں کی سالگرہ بھی سادگی سے منانا پسند کرتا تھا۔ ڈین نے ہر سال کی طرح اس بار بھی اس کے بیٹے کو کوئی قیمتی تحفہ خرید کر دینے کا فیصلہ کر رکھا تھا مگر تنظیم کی طرف سے راسٹر اور اس کی فیملی کے ڈیتھ آرڈرز جاری کیے جا چکے تھے۔

اپنے شاندار اور روشن مستقبل کے لیے ڈین پر لازم تھا کہ وہ مافیا کے حکم پر عمل درآمد کرے۔ باس اسے اٹلی روانگی کا عندیہ دے چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اٹلی میں تنظیم کے قدم جم گئے تو وہ وہاں کا راجا بن جائے گا اور وہاں کے سیاہ و سفید کا مالک ہوگا۔ شاید باس ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ بڑے مقاصد کے حصول کے لیے اپنا بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔

کل راسٹر کے بیٹے کی سالگرہ تھی اور اس نے انہیں ایک یادگار گفٹ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جونی چار بج کر دس منٹ پر اس دنیا میں آیا تھا اور ڈین جانتا تھا کہ وہ ہر سال کی طرح عین چار بج کر دس منٹ پر ہی اپنی سالگرہ کا کیک کاٹے گا مگر شاید یہ اس کی زندگی کی آخری سالگرہ تھی کیونکہ ڈین دوستی پر اپنے مستقبل کو ترجیح دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اگلے دن وہ تقریباً دو بجے کے قریب راسٹر کے گھر پہنچ گیا تھا۔ اگرچہ اس کے پاس اپنی ذاتی گاڑی موجود تھی مگر وہ بذریعہ ٹیکسی یہاں تک آیا تھا کیونکہ باس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کی ہر چیز سے پیچھا چھڑا کر میٹنگ میں شرکت کرے۔ وہ راسٹر کے گھر سے ہی اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہونے والا تھا اس لیے اپنے گھر سے صرف ضروری سامان کا بیگ اور مافیا کا فراہم کردہ ٹرانسمیٹر ہی ساتھ لے کر آیا تھا۔

راسٹر نے پُرتپاک انداز میں اس کا استقبال کیا اور پھر اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا جہاں ایک بڑی سی ٹیبل پر ایک چھوٹا مگر خوبصورت سا کیک رکھا ہوا تھا۔

''مارتھا اور بچے نظر نہیں آرہے؟'' ڈین نے استفسار کیا۔ مارتھا راسٹر کی بیوی کا نام تھا۔

''وہ بچوں کے ساتھ کچن میں جونی کے پسندیدہ کھانے تیار کروا رہی ہے کیونکہ سالگرہ جونی کی ہے اس لیے کھانوں کی تیاری میں پسند بھی اسی کی چلے گی۔ ویسے ہمیشہ کی طرح تمہیں بھی مارتھا کے تیار کیے گئے کھانے پسند آئیں گے۔'' راسٹر نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آئی ایم سوری دوست!'' ڈین نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''میں تمہاری اس خوشی میں شرکت نہیں کر سکوں گا۔ مجھے آج چار بجے باس اور مافیا کے بڑوں کے ساتھ بہت اہم میٹنگ میں شرکت کرنا ہے۔ میں صرف یہاں جونی کو سالگرہ کا گفٹ دینے اور تمہیں یہ خوش خبری سنانے آیا ہوں کہ مافیا نے تمہاری درخواست قبول کر لی ہے۔ آج سے تم مافیا کے رکن نہیں رہے۔ تم مکمل طور پر آزاد ہو، بس خیال رکھنا تمہاری زبان سے کوئی انفارمیشن لیک نہیں ہونی چاہیے۔''

وہ راسٹر کو ایک فرضی کہانی سنا رہا تھا۔ حقیقت میں تو وہ راسٹر اور اس کی فیملی کی موت کا بندوبست کر چکا تھا۔

اس نے جونی کے لیے جو گفٹ پیک تیار کیا تھا، اس میں ایک چھوٹا مگر انتہائی جدید ٹائم بم موجود تھا۔ ڈین نے اس گفٹ پیک کو خاص طور پر اس طرح تیار کیا تھا کہ جیسے ہی کوئی اسے کھولنے کی کوشش کرتا، بم ایک زوردار دھماکے سے پھٹ جاتا۔ بصورت دیگر یہ ٹھیک چار بج کر دس منٹ پر ہی پھٹتا۔ ڈین جانتا تھا کہ سالگرہ کا کیک کٹنے سے پہلے اس گفٹ کو کھولنے کی کوشش نہیں کی جائے گی اور اس وقت تک وہ یہاں سے بہت دور جا چکا ہوگا۔

''تنظیم نے مجھے آزاد کر دیا ہے، یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔'' راسٹر نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ایسا تمہاری وجہ سے ہی ممکن ہو سکا ہے مگر تمہیں جونی کی خوشی میں تو شرکت کرنی چاہیے۔''

''مجھے ہر صورت جانا ہے۔'' ڈین نے جواب دیا۔ ''میں صرف تمہیں خوش خبری سنانے اور جونی کو گفٹ دینے آیا تھا ورنہ مجھے حکم ملا ہے کہ مافیا سے علیحدگی کے بعد میں بھی

تاب

ایک پہلوان غصے میں بھرا ہوا منہ سے جھاگ نکال رہا تھا۔ سامنے سے شیخ سعدیؒ گزرے، پوچھا۔ ''یہ شخص اتنا برہم کیوں ہے؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''پہلوان کو ایک شخص کوئی تلخ بات کہہ کر چلا گیا ہے۔''

شیخ سعدیؒ نے افسوس سے کہا۔ ''پہلوان! تجھ پر افسوس کرنے کو جی چاہتا ہے کہ تو دس من کا پتھر تو آسانی سے اٹھا لیتا ہے لیکن ایک بات اٹھانے کی تاب نہیں رکھتا۔''

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تم سے تمام تعلقات منقطع کردوں۔ تم اب میرے ساتھی نہیں رہے، تمہاری خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے تنظیم کے بڑوں نے تمہاری استدعا قبول کی ہے ورنہ ممکن تھا کہ تمہارے بھی ڈیتھ آرڈرز جاری کردیے جاتے۔''

''تنظیم کے بڑوں اور باس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں۔ تم تو میری مجبوری جانتے ہی ہو، میرے لیے مافیا چھوڑنے کا فیصلہ ناگزیر ہو چکا تھا۔'' راسٹر نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا تو ڈین نے اپنے کندھے سے لٹکا ہوا بیگ اتار کر ساتھ ہی موجود صوفے پر رکھ دیا اور پھر اس میں سے ایک گفٹ پیک نکال کر راسٹر کے حوالے کردیا۔

''یہ جونی کے لیے ہے۔''

''مگر اس میں کیا ہے؟'' راسٹر نے استفسار کیا۔ ''یہ تو خاصا وزنی بھی ہے۔''

''چار بج کر دس منٹ پر جب جونی اسے کھول کر دیکھے گا تو اس وقت دیکھ لینا۔'' ڈین نے جان بوجھ کر وقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں راسٹر فوری طور پر گفٹ کھولنے کی کوشش نہ کرے، ایسی کسی بھی ناگہانی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے اس کے کوٹ کی جیب میں سائیلنسر لگا ریوالور موجود تھا۔ اگر راسٹر گفٹ پیک کو کھولنے کی کوشش کرتا تو اس سے پہلے اسے ختم کرنا ضروری ہوجاتا۔ ڈین کی ذاتی خواہش یہی تھی کہ اس کی نوبت نہ آئے کیونکہ وہ راسٹر اور اس کی فیملی کی خون میں لت پت لاشیں نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور پھر ایسا کرتے ہوئے شاید اس کے ہاتھ بھی کانپ جاتے اسی لیے اس نے ان کی موت کے لیے ٹائم بم کا انتخاب کیا تھا۔

''ٹھیک ہے، جونی کا گفٹ ہے..... وہ اسے خود ہی کھول کر دیکھ لے گا۔'' راسٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر صوفے کے ساتھ موجود ایک چھوٹی ٹیبل کی دراز کھول کر ڈین کا دیا ہوا تحفہ اس میں رکھ دیا۔

''میں اس کے بارے میں کیک کاٹنے کے بعد ہی جونی کو بتاؤں گا۔ اگر اس نے ابھی دیکھ لیا تو اسے فوری کھولنے کی ضد کرے گا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے ڈین سے کہا۔ ''تم چاہو تو ان سے مل سکتے ہو۔ وہ ابھی تک اپنی ماں کے پاس کچن میں ہی ہیں۔ میں اس دوران ذرا کیک پر موم بتیاں لگا لوں۔''

''ٹھیک ہے.....'' یہ کہتے ہوئے ڈین کچن کی جانب بڑھ گیا۔ راسٹر کو گفٹ پیک دراز میں رکھتے دیکھ کر وہ خاصا مطمئن ہوگیا تھا۔ راسٹر کی بیوی مارتھا کچن میں بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ ڈین کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تاہم نہ جانے کیا بات تھی کہ ڈین کو اس کی مسکراہٹ بناوٹی لگی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ڈین کو دیکھ کر جبراً مسکرا رہی ہو۔ دونوں بچے ڈین سے خاصے مانوس تھے اس لیے اسے دیکھتے ہی دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔

''آج بہت مزیدار کھانے تیار کیے جارہے ہیں۔ تم بھی کھاؤ گے تو تعریف کیے بنا نہیں رہ سکو گے۔'' مارتھا نے مسکراتے ہوئے کہا مگر ڈین کو ایک بار پھر اس کے لہجے میں اجنبیت کی جھلک محسوس ہوئی۔

''میں سالگرہ میں شرکت نہیں کرسکوں گا کیونکہ مجھے بہت ضروری کام نمٹانے ہیں اس لیے جانا پڑے گا۔ میں تو صرف جونی کو سالگرہ کی مبارک باد دینے آیا تھا۔'' ڈین نے دونوں بچوں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مگر تم تو ہمیشہ ہماری خوشی میں شریک ہوتے ہو، آج اتنا ضروری کام پڑ گیا ہے کہ تمہیں اپنے عزیز دوست کا خیال بھی نہیں رہا؟'' مارتھا نے شکوہ کیا۔

''ہاں.....'' ڈین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''مجبوری ہے ورنہ میرا خود بھی بچوں کے ساتھ وقت گزارنے کو دل چاہتا ہے۔ اب مجھے اجازت دو، دیر ہو رہی ہے.....'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دونوں بچوں کو پیار کیا اور پھر مارتھا کو گڈ بائی کہہ کر کچن سے باہر آگیا۔

راسٹر کیک پر موم بتیاں لگانے کے بعد وہیں کھڑا ہوا تھا، ڈین نے اپنا بیگ اٹھا لیا۔ ''او کے دوست! اب میں چلتا ہوں۔ اب شاید دوبارہ برسوں تک ملاقات نہ ہوسکے۔''

''میں جانتا ہوں.....'' راسٹر نے تاسف بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''آؤ میں تمہیں باہر تک چھوڑ دوں۔''

گھر سے باہر نکل کر راسٹر کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ بے اختیار ڈین سے لپٹ گیر ہوگیا۔

''مجھے معاف کردینا میرے دوست! میں تمہیں راستے میں تنہا چھوڑ کر تنظیم سے علیحدہ ہو رہا ہوں۔ اصل میں تم نہیں جانتے کہ میری بیوی مارتھا کو بھی علم ہوگیا تھا کہ میرا تعلق جرائم کی دنیا سے ہے۔ اگر میں مافیا کو چھوڑنے کا فیصلہ نہ کرتا تو مارتھا مجھے چھوڑ کر چلی جاتی اور میرا گھرانا بکھر جاتا۔ کل رات مارتھا نے مجھ سے باقاعدہ بائبل پر حلف لیا تھا کہ اب میں لوگوں کے خون اور منشیات میں لتھڑی ہوئی دولت کا مزید استعمال نہیں کروں گا۔ اسی وجہ سے میں نے تم سے اپنا اس ماہ کا حصہ بھی وصول نہیں کیا اور نہ ہی کروں گا کیونکہ مجھے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے حلف کی پاسداری کرنا ہے۔''

اس کی توجیہہ سن کر ڈین کو اندازہ ہوگیا کہ کچن میں مارتھا کا رویہ اس کے ساتھ اتنا روکھا سا کیوں تھا۔ ظاہر ہے وہ ڈین کو ایک بزنس مین کی حیثیت سے جانتی تھی اور اس کے اصل پیشے کے بارے میں جان کر اسے ذہنی صدمہ پہنچا تھا۔ کوئی بات نہیں..... ویسے بھی اب شاید دوبارہ ملاقات نہ ہوسکے۔ اس نے راسٹر کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''اب اجازت دو..... مجھے دیر ہورہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے راسٹر کے ساتھ پُرجوش انداز میں الوداعی مصافحہ کیا اور مین روڈ کی جانب بڑھ گیا۔

راسٹر خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے تاثرات مزید گہرے ہوگئے۔ ڈین کا اور اس کا تعلق بہت گہرا تھا۔ اس نے راسٹر کو مافیا میں شمولیت کی دعوت اس وقت دی تھی جب اس جرائم پیشہ تنظیم نے ابتدائی مراحل میں امریکا میں کام کا آغاز کیا تھا۔ ان دنوں راسٹر مالی معاملات میں خاصے مسائل کا شکار تھا تاہم مافیا میں شامل ہونے کے بعد اس کے تمام مسائل حل ہوگئے اور اس نے مارتھا سے شادی بھی کرلی۔ وہ دو بچوں کا باپ بنا تو اسے اپنے ساتھ ساتھ ان کے مستقبل کی فکر بھی ستانے لگی۔ وہ تنظیم کے لیے منشیات کا دھندا کرتا تھا اور ساتھ ساتھ مافیا کے باغیوں کی سرکوبی کا کام بھی اسے اور ڈین ہی کو سونپا جاتا تھا۔ یہ ایک خطرناک کام تھا جس میں پکڑے جانے یا مارے جانے کا یقینی خطرہ موجود تھا۔ وہ تنظیم کی خودغرض فطرت سے بھی بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس کے علم میں ایسے بہت سے واقعات تھے جب تنظیم نے اپنے کسی آدمی کے پکڑے جانے کے بعد اس سے ہر قسم کا تعلق منقطع کرلیا تھا۔

مافیا کے بہت سے ہرکارے جیلوں میں اس کی عدم توجہی کا شکار ہوکر سڑ رہے تھے تاہم تنظیم کا سیٹ اپ کچھ اس طرح کا تھا کہ وہ پولیس کو کوئی خاص انفارمیشن نہیں دے سکے تھے۔ اپنے اس خفیہ سیٹ اپ کی وجہ سے مافیا امریکا میں تیزی سے پھل پھول رہی تھی۔

ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے راسٹر نے بھی مافیا سے علیحدگی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ شروع میں جب اس نے ڈین کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو وہ کچھ ناراض بھی ہوا مگر آخرکار وہ باس سے اس سلسلے میں بات کرنے پر رضامند ہوہی گیا اور آج اس نے راسٹر کو تنظیم کی طرف سے پروانۂ آزادی بھی سنا دیا تھا۔ ڈین جاچکا تھا، راسٹر بھی اپنے گھر میں داخل ہوگیا جہاں ایک نئی زندگی اس کی منتظر تھی۔

ڈین ایک ٹیکسی پر باس اور اس کے معاونین سے ملنے کے لیے روانہ ہوچکا تھا جہاں اسے تنظیم کے ایک بڑے معاون کا عہدہ سونپا جانے والا تھا۔ اسے اپنے دل پر ہلکا سا بوجھ بھی محسوس ہورہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بم کے پھٹنے کے بعد راسٹر اور اس کی فیملی کی موت یقینی ہے۔ ڈین کیونکہ مافیا کا رکن ہونے کی وجہ سے جرائم پیشہ عناصر سے گہرے روابط رکھتا تھا اس لیے وہ اس جدید ساخت کے ٹائم بم کا بندوبست کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ اس قدر طاقتور بم ہے کہ اس کے پھٹتے ہی راسٹر کا پورا گھر ہی زمین بوس ہوجائے گا اور شاید آس پاس کے گھر بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں۔

اسے راسٹر کے دونوں بیٹوں کا خیال آیا تو تاسف کا احساس مزید گہرا ہوگیا۔ راسٹر کے قصور کی سزا انہیں بھی مل

دو چیزیں

انسان اپنی طرف سے پوری کوشش، پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے درمیان حائل ہوجاتی ہیں۔ ایک ''موت'' اور دوسری ''تقدیر!''

انسان

انسان عجیب مخلوق ہے، خود تماشا ہے اور خود ہی تماشائی۔ انسان خود ہی میلا لگاتا ہے اور خود ہی میلا دیکھنے نکلتا ہے۔ ہجوم میں ہر انسان ہجوم کا حصہ ہے اور ہر انسان اپنے علاوہ انسانوں کو ہجوم کہتا ہے۔ تنہائیاں اکٹھی ہوجائیں تو میلے بن جاتے ہیں۔ ننھے چراغ مل کر چراغاں بن جاتے ہیں۔

ذہانت

''بیٹا! یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟'' اپنے چھوٹے بیٹے کے ہاتھ میں ایک کتاب دیکھ کر مامون الرشید نے پوچھا۔

''ابا جان! یہ ایک چیز ہے جس سے ذہانت میں اضافہ ہوتا ہے اور غفلت کی چادر آنکھوں سے اتر جاتی ہے۔ وحشت سے لگاؤ ہوتا ہے۔''

بیٹے کی بات سن کر ہارون الرشید نے کہا۔ ''میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے مجھے ایسے بچے عطا فرمائے جو جسم کی آنکھ کی بہ نسبت عقل کی آنکھ سے زیادہ دیکھتے ہیں۔''

وزیر محمد خان، بلل ہزارہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رہی تھی۔ یہ مافیا کا اصول تھا کہ غدار کو اس کے پورے خاندان ... سمیت موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

وہ جانتا تھا کہ تنظیم کے بڑے اٹلی میں تلخ تجربات کے بعد اب اپنے سخت اصولوں پر کوئی سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں ہوں گے اس لیے راسٹر اور اس کی فیملی کے بارے میں اپنے دل میں نرم گوشہ رکھنے کے باوجود وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر پایا تھا۔ اس نے اپنی رسٹ واچ کا جائزہ لیا۔ ابھی تین بجے تھے یعنی اگر فلائٹ پیک کھول کر نہ دیکھا جاتا تو بم کے پھٹنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ کا وقت باقی تھا۔ راسٹر کا بیٹا جونی چار بج کر دس منٹ پر اس دنیا میں آیا تھا اور اس کی واپسی کا بھی شاید یہی ٹائم مقرر ہو چکا تھا۔ فرق بس اتنا تھا کہ اسے اپنے ماما پاپا اور بھائی کے ساتھ واپسی کا رختِ سفر باندھنا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔

ٹیکسی پر تقریباً ایک گھنٹے کے مزید سفر کے بعد ڈین جب اپنی منزل پر پہنچا تو اس وقت چار بج چکے تھے۔ اس نے اپنا بیگ کندھے سے لٹکایا اور پھر ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے بعد سامنے موجود عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ اس عمارت میں وہ پہلے بھی مافیا کے سرکردہ افراد سے ایک ملاقات کر چکا تھا۔ یہ خاصی وسیع و عریض اور بلند و بالا عمارت تھی اور اس کے اندر ریکڑوں کی تعداد میں مختلف دفاتر قائم تھے۔ ڈین لفٹ کے ذریعے چھٹے فلور پر پہنچا اور پھر ایک آفس کے سامنے جا کر رک گیا۔ اس نے آفس کے باہر موجود بیل دی تو کچھ ہی دیر میں دروازہ خود کار انداز میں کھلتا چلا گیا۔ ڈین سر ہلاتے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دفتر کے مین انٹرنس پر موجود خفیہ کیمرے میں اسے دیکھنے کے بعد ہی دروازہ کھولا گیا ہے۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی راہ داری تھی۔ اس نے اسے کراس کیا تو سامنے ایک اور کمرا تھا۔ ڈین جانتا تھا کہ یہ دروازہ مقفل نہیں ہے، اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں ایک بڑی سی گول میز موجود تھی اور اس کے اردگرد کرسیوں پر باس اور مافیا کے تین بڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ تاہم ان کے ساتھ ایک خالی کرسی بھی موجود تھی۔ یہ کرسی شاید اس چوتھے بڑے کی تھی جو اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور اس خالی کرسی کو پر کرنے کے لیے مافیا کے کرتا دھرتا کی نظرِ انتخاب ڈین پر آ ٹھہری تھی۔

''ویلکم ڈین ویلکم.....'' باس نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ ڈین نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور پھر آگے بڑھ کر باس اور مافیا کے تینوں معاونین سے باقاعدہ مصافحہ کیا تاہم اس نے کرسی پر بیٹھنے سے گریز کیا۔

''تم اب اس کرسی پر بیٹھ سکتے ہو۔'' باس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں مبارک ہو۔ اب تم تنظیم کے چار بڑوں میں شمار ہو چکے ہو۔ ہم سب اٹالین نژاد ہیں جبکہ تم امریکی ہو۔ تمہاری اس اہم عہدے پر تقرری سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مافیا رتبے اور مقام کا تعین قومیت سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف کارکردگی کی بنیاد پر کرتی ہے۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔'' ڈین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ امریکا کی طرح اٹلی میں بھی آپ کی توقعات پر پورا اتروں۔''

''گڈ.....!'' باس نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''سب سے پہلے راسٹر اور اس کی فیملی کے بارے میں رپورٹ پیش کرو۔ تمہیں ان کی موت کا ٹاسک دیا گیا تھا؟''

''یس باس.....!'' ڈین نے کہا اور پھر اپنا پورا پلان باس کے گوش گزار کر دیا۔ باقی تینوں افراد خاموشی سے ان کی بات سن رہے تھے۔ انہوں نے گفتگو میں مداخلت کی کوشش نہیں کی تھی۔ ویسے بھی ڈین اب رتبے میں ان کے برابر آ چکا تھا۔ اس لیے اس سے سوال کرنے کا اختیار صرف باس کو تھا۔ وہ تینوں جسامت میں خاصے صحت مند اور قد آور شخصیت کے مالک تھے جبکہ باس ان کے برعکس کمزور سی جسامت اور چھوٹے قد کا مالک تھا۔ موٹے شیشوں کی عینک پہنے باس کو دیکھ کر یہ بالکل نہیں لگتا تھا کہ اس کا جرائم پیشہ دنیا سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ بادی النظر میں وہ کسی کالج کا پروفیسر معلوم ہوتا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اگر انہوں نے گفٹ کھول کر نہیں دیکھا تو بم پھٹنے میں چند منٹ ہی باقی ہیں۔'' باس نے ڈین کا پلان سن کر اپنی رسٹ واچ پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال، یہ لو تمہارے نئے کاغذات..... آج سے تمہارا نام رومیو ہے۔ تمہیں آج رات ہی اٹلی روانہ ہونا ہے۔ اس پیکٹ میں تمہارے تمام سفری کاغذات موجود ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے ماضی کی ہر اس چیز سے چھٹکارا پا کر ہی یہاں آئے ہو گے جس کی وجہ سے تمہاری شناخت بطور ڈین ممکن ہو سکے۔''

''یس باس.....!'' ڈین نے پیکٹ تھامتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں صرف اپنے کپڑے اور تنظیم کا ٹرانسمیٹر ہی ساتھ لے کر آیا ہوں۔ یہاں تک کا سفر بھی میں نے ٹیکسی کے ذریعے طے کیا ہے کیونکہ میری ذاتی کار بھی راسٹر اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس کی فیملی کی طرح میرے ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔''

''اور موبائل فون.....؟'' باس کا سوال سن کر وہ بوکھلا گیا۔

''آئی ایم سوری باس! مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ میں آج ہی اس سے نجات حاصل کرلوں گا۔''

''بعض اوقات چھوٹی سی غلطی کے بھی سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں۔'' باس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''راسٹر کے گھر بم بلاسٹ ہونے کے بعد پولیس پوری تندہی سے تمہیں تلاش کرے گی کیونکہ انہیں راسٹر کے قریبی دوست کا اچانک غائب ہوجانا آسانی سے ہضم نہیں ہوگا اور پھر کسی نہ کسی نے تمہیں آج اس کے گھر جاتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا۔ دھماکے سے قبل تم وہاں جانے والے آخری آدمی تھے، یہ بات پولیس کے لیے خاصی معنی خیز ہوگی اور تم مشکوک افراد میں سرفہرست ہوگے اور پھر امریکا جیسے ملک میں بم بلاسٹ کوئی چھوٹا واقعہ تصور نہیں کیا جائے گا۔ انتہائی اعلیٰ پیمانے پر تحقیقات کا آغاز ہوجائے گا اور ہوسکتا ہے کہ کچھ بڑی ایجنسیاں بھی اس معاملے میں کود پڑیں۔ ویسے اب موبائل فون لے ہی آئے ہو تو اس کا آخری بار استعمال بھی کرلو۔ راسٹر کو فون کرو اگر کال اٹینڈ کی گئی تو سمجھو بم ابھی تک نہیں پھٹا.....''

''فرین قیاس یہی ہے باس کہ وہ کیک کاٹنے کے بعد ہی میرے گفٹ کو چیک کریں گے جس کا انہیں موقع بھی نہیں مل پائے گا۔ میں نے بم کی گھڑی اور اپنی رسٹ واچ کا وقت ملا کر سیٹ کیا تھا اس لیے چند سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آئے گا۔ میں نے رسٹ واچ پر پورے چار بج کر دس منٹ کا الارم بھی لگا لیا ہے۔ جیسے ہی الارم بجا، سمجھیں بم پھٹ گیا پھر بھی فون کرنے میں کوئی حرج نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈین نے اپنے کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکالا اور راسٹر کا نمبر ملایا۔

''لاؤڈر کا بٹن بھی پریس کردو۔'' باس نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لاؤڈر کا بٹن بھی پریس کردیا۔ بیل کی آواز سن کر باس نے معنی خیز نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

''ابھی ایک منٹ باقی ہے باس!'' ڈین نے کہا۔ اسی لمحے دوسری طرف سے راسٹر نے کال اٹینڈ کرلی۔ ''ڈین بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نمبر سے معلوم ہوگیا ہے۔ اب کیوں فون کیا؟ شاید تمہیں یاد نہیں کہ تنظیم نے تمہیں حکم دیا تھا کہ مجھ سے تمام تعلقات منقطع کردو۔'' راسٹر کی آواز آئی۔

''میں جانتا ہوں دوست!'' ڈین نے باس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اصل میں، میں نے سوچا کہ آخری بار تم سے پوچھ لوں کہ تم اپنا اس ماہ کا حصہ واقعی میں وصول نہیں کرنا چاہتے یا تم نے ایسا صرف رسمی طور پر کہا تھا۔ اگر تم چاہو تو تمہارا حصہ اب بھی تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا جاسکتا ہے۔''

''میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں نے اپنی بیوی مارتھا کو بائبل کی مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر حلف دیا ہے کہ اب میں خون اور منشیات کی کمائی میں سے مزید ایک پائی بھی وصول نہیں کروں گا۔'' راسٹر کی سنجیدہ آواز سنائی دی۔ ''اسی وجہ سے میں نے تم سے اپنا حصہ نہیں مانگا تھا..... اور ہاں، مجھے معاف کرنا میرے دوست! میں تمہارا جوتی کے لیے دیا گیا گفٹ بھی قبول نہیں کرسکتا کیونکہ اس طرح میرے حلف کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ یہ گفٹ بھی تم نے منشیات اور خون سے حاصل ہونے والی کمائی سے ہی خریدا ہے اس لیے میں نے تمہارا گفٹ تمہیں لوٹا دیا ہے۔''

''مگر تم نے گفٹ مجھ سے وصول کرکے خود ٹیبل کی دراز میں رکھا تھا۔'' ڈین نے اس کا جواب سن کر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ راسٹر کی بات سن کر باس اور باقی افراد کے چہروں پر بھی الجھن کے تاثرات امڈ آئے تھے۔

''نہیں دوست! اگر میں براہِ راست گفٹ تمہیں واپس کرنے کی کوشش کرتا تو شاید تم اسے لینے سے انکار کردیتے اس لیے جب تم مارتھا اور بچوں سے ملنے کچن میں گئے تھے تو میں نے یہ گفٹ صوفے پر پڑے تمہارے بیگ میں رکھ دیا تھا۔ لگتا ہے تم نے ابھی تک اپنا بیگ چیک نہیں کیا ورنہ تمہاری فون کال پر مجھے یہی لگا تھا کہ تم نے اسی سلسلے میں فون کیا ہے۔ جونی مجھے اشارہ کررہا ہے، وہ کیک کاٹنے لگا ہے۔ چار بج کر دس منٹ ہوگئے ہیں۔ اوکے.....'' یہ کہتے ہوئے راسٹر نے رابطہ منقطع کردیا جبکہ مافیا کے تینوں بڑے اور باس گھبرا کر اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''دفتر سے باہر نکلو.....'' باس نے چیختی ہوئی آواز میں کہا تو خوفزدہ اور انگشت بدنداں نگاہوں سے اپنے بیگ کو تکتے ڈین کو بھی ہوش آگیا۔

ڈین کی رسٹ واچ کا الارم بج اٹھا اور ان سب کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیلتی چلی گئیں۔ چار بج کے دس منٹ ہوچکے تھے.....!

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تقاضائے انصاف

مرزا امجد بیگ

تقاضے تو انصاف اور ناانصافی دونوں کے ہی ہوتے ہیں مگر... ناانصافی کے تقاضے جتنی شدومد سے نبھانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کے لیے انسان ذلت کی جس انتہا پر پہنچ جاتا ہے کاش... انصاف دینے میں بھی اتنی مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرتا تو آج اس کی زندگی کا منظر نامہ ہی دوسرا ہوتا... بہرحال وہ جو مسیحا بن کر دکان سجائے بیٹھی تھی... کیا خبر تھی کہ مسیحائی کی آڑ میں لوگوں کی زندگی میں زہر گھولنے کا سبب بن بیٹھے گی۔ جس طرح ہر رات کے بعد سورج پھر سے طلوع ہوکر وقت کے بڑھ جانے کا احساس دلاتا ہے۔ اسی طرح وہ لاکھ زہر گھولتی رہی مگر مضروب کو بھی مرزا امجد کی صورت میں دوا مل ہی گئی۔ معاشرتی ناسوروں کا علاج بھی ایسے ہی اصول پسند اور انصاف کے تقاضوں کو مکمل ایمانداری سے نبھانے والوں کے پاس ہی ہوتا ہے جو انہیں ناکوں چنے چبوانے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

دنیا کو بے وقوف سمجھنے والوں کی مندی عقل کا

دلچسپ مظاہرہ

سیانے کہہ گئے ہیں، لالچ بُری بلا ہے۔ کسی چیز کا بلا ہونا ہی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا کجا یہ کہ وہ بُری بھی ہو تو..... اس صورت اس کی خطرناکی میں کئی گنا اضافہ ہوجاتا ہے۔ کسی بھی شے کا لالچ انسان کے اندر حرص اور ہوس کو جنم دیتا ہے۔ یہ دونوں منفی خصوصیات انسان کی آنکھوں پر عاقبت نااندیشی کی ایسی دبیز پٹی باندھ دیتی ہیں کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود اور منجمد ہوکر رہ جاتی ہے۔ تاریک راہوں کی یہی مسافرت ایک روز اسے تباہی و بربادی کے عمیق گڑھے میں لا پھینکتی ہے۔ جب اچانک اس کی آنکھوں پر سے غفلت کی پٹی ہٹتی ہے تو وہ خود کو لاچار اور بے یارومددگار پاتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر اسے عموماً قانونی تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے۔

اس تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

ایک شام میں اپنے دفتر میں بیٹھا معمول کے کام میں مصروف تھا کہ ایک دوست کا فون آگیا۔ اس وقت میرے چیمبر میں کوئی کلائنٹ موجود نہیں تھا۔ میری سیکریٹری حنا نے انٹرکام پر مجھے اس فون کی اطلاع دی تو میں نے اسے کال ٹرانسفر کرنے کے لیے کہہ دیا۔ اگلے ہی لمحے چوہان صاحب کی مخصوص آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیلو بیگ صاحب! آپ کیسے ہیں؟''

چوہان صاحب کا پورا نام رفیق چوہان تھا اور وہ کراچی کے ایک معروف پامسٹ تھے۔ مجھ سے ان کی پرانی یاداللہ تھی مگر ملاقات کا موقع بہت کم ملتا تھا۔

چوہان صاحب کے استفسار کے جواب میں،

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

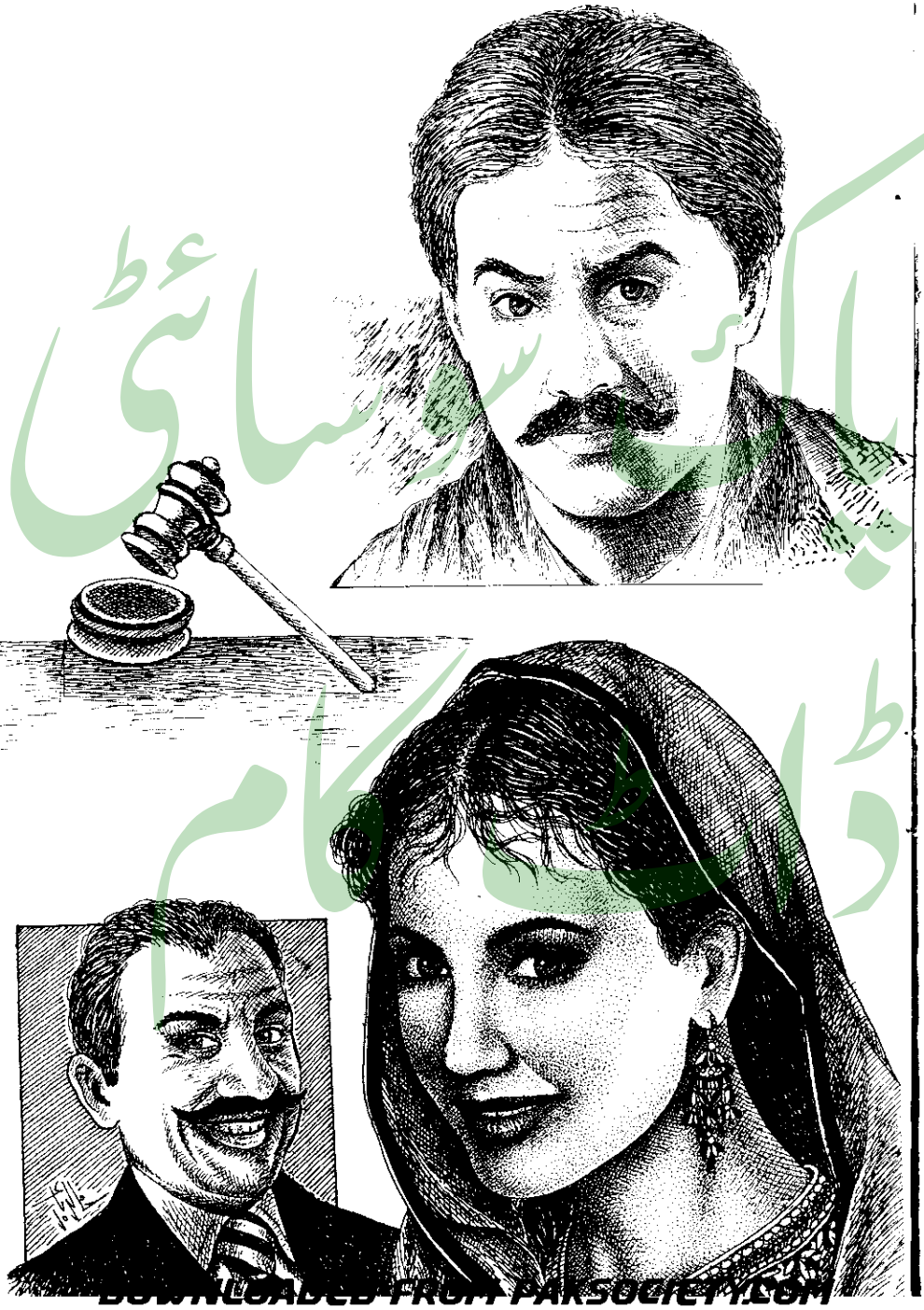

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے کہا۔ ''اللہ کا کرم ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں؟''

''میں بھی خیریت سے ہوں۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آج کل مصروفیت کیسی چل رہی ہے؟''

''مصروفیت تو ہمیشہ گھوڑے کی رفتار سے چلتی رہتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ بتائیں، کیسے یاد فرمایا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔''

''حکم نہیں، عرض ہے بیگ صاحب۔'' وہ دوستانہ انداز میں بولے۔ ''میں ایک کیس آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ میری ایک کلائنٹ ہیں..... عالیہ بیگم۔ انہیں قانونی مدد کی ضرورت ہے اور میری نگاہ میں، اس سلسلے میں مسز عالیہ کے لیے آپ سے زیادہ ممد و مددگار اور کوئی ثابت نہیں ہوسکتا۔''

''یقیناً قانونی معاملات میں، میں مسز عالیہ کے لیے ممد و معاون ثابت ہوں گا۔'' میں نے تصحیح کرتے ہوئے بڑی رسان سے کہا۔ ''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی.....''

''کون سی بات بیگ صاحب؟'' انہوں نے پوچھا۔

''یہی کہ جب مسز عالیہ آپ کی کلائنٹ ہیں تو آپ نے ان کی مدد کیوں نہیں فرمائی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ انہیں میری کلائنٹ کیوں بنانا چاہتے ہیں؟ آپ کا ایک نام ہے۔ آپ اپنے فن کے ماہر ہیں۔ قدرت نے آپ کو بے پناہ علم عطا کر رکھا ہے۔ آپ کی وجدانی صلاحیت کو تو میں بھی مانتا ہوں۔''

چوہان صاحب سے میری ایسی ہی بے تکلفی تھی کہ عمومی گفتگو کے علاوہ کھٹی میٹھی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ میرے اعتراض کے جواب میں وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

''آپ کی تمام باتیں درست ہیں بیگ صاحب۔ میں نے عالیہ بیگم کے دونوں ہاتھوں کی بہت گہری اسٹڈی کی ہے اور ان کی صاحب زادی کے ہاتھ بھی دیکھے ہیں.....''

''ایک منٹ!'' چوہان صاحب کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں بول پڑا۔ ''جو کیس آپ میرے سپرد کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، کیا اس میں مسز عالیہ کے علاوہ ان کی بیٹی کا بھی عمل دخل ہے؟''

''اس کیس میں عالیہ بیگم کی سائڈ سے تین افراد کا عمل دخل ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''یعنی مسز عالیہ، ان کی بیٹی فوزیہ اور فوزیہ کا بھائی توصیف جبکہ دوسری جانب ایک منجھا ہوا گھاگ شخص بدرشاہ ہے۔ بدرشاہ کا نیٹ ورک بڑی ہوشیاری سے کام کر رہا ہے۔ بدرشاہ ایک میرج بیورو کے توسط سے شکار گھیرتا ہے اور پھر انہیں اپنے عیارانہ طور طریقوں سے اس طرح جکڑ لیتا ہے کہ انہیں ملنے کا موقع نہیں دیتا.....'' لمحاتی توقف کر کے چوہان صاحب نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''بدرشاہ، عالیہ بیگم کے پانچ لاکھ روپے ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔ آپ کے تعاون کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔''

''اوہ..... پانچ لاکھ روپے تو اچھی خاصی رقم ہوتی ہے!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

یہ واقعہ کم و بیش چالیس سال پہلے کا ہے۔ اس زمانے میں پانچ لاکھ روپے ایک تگڑی رقم میں شمار ہوتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر چیز کی قدر و قیمت میں نمایاں فرق آجاتا ہے اور یہ معاملہ چیزوں یا اشیا تک ہی محدود نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کے مزاج، طور طریقے اور ارادے بھی تبدیل ہوجاتے ہیں۔ وقت بڑا کاریگر ہے۔

''آپ نے بجا فرمایا بیگ صاحب۔'' وہ تائیدی انداز میں بولے۔ ''پانچ لاکھ روپے واقعی ایک ہینڈسم امائونٹ ہے اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ بدرشاہ جیسے کائیاں شخص کے سامنے یہ تینوں ایک تنکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عالیہ ایک بیوہ دکھی اور جذباتی خاتون ہیں، توصیف ایک لاابالی، آوارہ، عاقبت نااندیش اور گھٹو نوجوان ہے جبکہ فوزیہ اچھی خاصی شکل صورت رکھنے کے باوجود بھی نصیب کی ستم ظریفی کا شکار ہے۔ عالیہ بیگم کافی عرصے سے میرے پاس آرہی ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کے حوالے سے کافی پریشان تھیں اور اب یہ نا وقت بدرشاہ والی نئی افتاد آن پڑی ہے.....'' لمحاتی توقف کے بعد انہوں نے اضافہ کیا۔

''بیگ صاحب! آپ عالیہ بیگم سے ایک ملاقات کرلیں۔ باقی کی تفصیلات وہ آپ کو بتادیں گی اور ہاں..... فیس کی فکر نہیں کیجیے گا۔ وہ آپ کو فیس پوری دیں گی۔''

''ٹھیک ہے چوہان صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''آپ مسز عالیہ کو میرے آفس بھیج دیں۔ میں ان کے مسئلے کو دیکھ لوں گا۔''

''میں کل انہیں بھیجتا ہوں۔'' وہ جلدی سے بولے۔

اختتامی کلمات کے بعد ہمارے درمیان ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہوگیا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

آئندہ روز مسز عالیہ میرے دفتر میں موجود تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق، اس عورت کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ بعد ازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ مسز عالیہ اس وقت اپنی عمرِ عزیز کی اڑتالیس ویں سیڑھی پر استادہ تھیں۔ وہ ایک قد آور اور گریس فل خاتون تھیں تاہم پریشانی ان کے چہرے سے مترشح تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، دنیا جہان کا غم اس عورت نے اپنے جگر میں بسا رکھا ہے۔ اس کی آنکھوں سے بھی فکرمندی جھلکتی تھی۔

مسز عالیہ کے ساتھ لگ بھگ بیس سالہ ایک نوجوان بھی تھا۔ وہ ایک ہٹا کٹا، موٹا تازہ اور ڈھیلا ڈھالا بندہ تھا۔ اس کو دیکھ کر ذہن میں پہلا تاثر یہی ابھرتا تھا کہ اسے دنیا میں کھانے اور آرام کرنے کے سوا اور کوئی کام نہیں ہوگا۔ اس کی حرکات و سکنات سے بیزاری، کسل مندی اور بدتمیزی جھلکتی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ مسز عالیہ کا بیٹا تو صیف تھا۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ جب وہ میرے سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ چکے تو میں نے باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی..... میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

ڈھیلے ڈھالے متذکرہ بالا نوجوان نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ استعجابیہ نظر سے میرے آفس کے در و دیوار کا سروے کرنے میں مصروف رہا۔ مسز عالیہ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔

''مجھے چوہان صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے میرے بارے میں کل آپ سے بات کی تھی۔ میرا نام عالیہ انور ہے۔''

''جی بالکل!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''رفیق چوہان میرے بہت اچھے دوست ہیں اور وہ اتنے ہی اچھے پامسٹ بھی ہیں۔''

''ان کے فن کی تو میں بھی معترف ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اللہ نے انہیں بڑا مفید علم عطا کر رکھا ہے۔ میں کافی عرصے سے ان کے پاس جا رہی ہوں اور ان کی ہدایات پر عمل بھی کرتی ہوں اس لیے میرے حالیہ مسئلے کے حوالے سے جب انہوں نے آپ کا نام لیا تو میں نے آپ سے ملاقات کے لیے فوراً ہامی بھر لی۔''

''چوہان صاحب نے سرسری انداز میں مجھے آپ کی پریشانی کے بارے میں بتایا تھا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا اور کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''آپ مجھے تفصیلات سے آگاہ کریں گی تو اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر پاؤں گا۔ ابھی تو میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ بدرشاہ نامی کوئی شخص آپ کے پانچ لاکھ روپے کھائے بیٹھا ہے۔''

''جی وکیل صاحب! آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''یہ شخص بہت بڑا فراڈ ہے۔ میں ایک بیوہ عورت ہوں۔ یہ شخص ہماری عمر بھر کی جمع پونجی ہڑپ کر گیا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ایک ڈکار تک نہیں لی۔''

''اوہ.....!'' میں نے ہمدردی بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''آپ ٹھنڈا لینا پسند کریں گی یا کچھ گرم منگواؤں؟''

''وکیل صاحب! کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''تکلف تو آپ کر رہی ہیں۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تو میزبانی کے آداب بجا لا رہا ہوں.....''

''اوکے.....'' وہ رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ جو مناسب سمجھیں، منگوا لیں۔''

میں نے موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈرنکس منگوانے کے لیے اپنی سیکریٹری حنا سے انٹرکام پر کہہ دیا پھر ان ماں بیٹے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے سوال کیا۔

''کیا آپ نے بدرشاہ کے خلاف پولیس کے پاس کوئی رپورٹ درج کرائی ہے؟''

''میں پولیس کے پاس گئی تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب ہے، آپ کا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ بتانے لگی۔ ''میں نے متعلقہ تھانے جا کر اپنے ساتھ ہونے والی بے ایمانی کی تفصیل پولیس کے گوش گزار کی تھی۔ انہوں نے نیم دلی سے میری پتا سنی اور وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد کارروائی کر کے مجھے انصاف دلائیں گے لیکن ان کا یہ وعدہ طفل تسلی سے زیادہ کچھ بھی ثابت نہیں ہوا۔ چند روز بعد جب میں دوبارہ تھانے گئی تو مجھے بتایا گیا کہ وہ لوگ بدرشاہ کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ معاملہ سرے سے فراڈ کا کیس بنتا ہی نہیں.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سی سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''مجھے یقین ہے کہ بدرشاہ نے پولیس والوں کی مٹھی گرم کر کے اس معاملے کو دبا دیا ہے۔ یہ کمینہ بہت ہی چال باز اور رسائی والا ہے اور پولیس کی رشوت ستانی کو آپ سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا.....!''

اس دوران میں کولڈ ڈرنکس آ گئی تھیں تاہم توصیف اب بھی ہماری جانب متوجہ نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کمرے میں موجود ہی نہ ہو یا اس کی دانست میں ہم دونوں وہاں نہیں پائے جاتے تھے۔ اس کا انداز قطعی لاتعلقی والا تھا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''مسز عالیہ! کیا آپ کا صاحب زادہ گونگا ہے یا اس نے چپ شاہ کا روزہ رکھا ہوا ہے؟'' پھر میں نے توصیف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''برخوردار..... کولڈ ڈرنک لیں۔''

''یہ گونگا نہیں ہے بلکہ یہ تو عام نوجوانوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی بولتا ہے۔'' مسز عالیہ نے کہا۔

میں نے سوالیہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔

''پھر یہ خاموشی.....؟''

میرے سوالیہ جملے کے جواب میں مسز عالیہ نے بتایا۔ ''دراصل توصیف مجھ سے خفا ہے اس لیے چپ چاپ بیٹھا ہے۔ یہ تو میرے ساتھ یہاں آنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ بس، میں زبردستی ہی لے آئی ہوں۔''

''توصیف! تم اپنی ماں سے کیوں ناراض ہو؟'' میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔

''بات ناراضی کی نہیں ہے وکیل صاحب۔'' وہ کولڈ ڈرنک کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اصول کی بات کر رہا ہوں اور میری بات امی کی سمجھ میں نہیں آ رہی.....''

''مطلب یہ کہ..... تم اس بات کے حق میں نہیں ہو کہ بدرشاہ کے خلاف کسی قسم کی قانونی چارہ جوئی کی جائے.....؟'' میں نے اس کی آنکھوں کے راستے اس کے ذہن تک رسائی حاصل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس کا کوئی خاص سبب ہے؟''

''ہاں.....!'' اس نے کولڈ ڈرنک کا ایک طویل سپ لینے کے بعد سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔ ''میں اصولی بات کر رہا ہوں لیکن پہلے آپ امی کی بات توجہ سے سن لیں۔ اس کے بعد میں اپنا موقف بیان کروں گا۔''

''تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں توصیف۔''

مسز عالیہ نے الجھن زدہ انداز میں بیٹے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ بدمعاش بدرشاہ ہماری کل جمع پونجی کھائے بیٹھا ہے اور دور دور تک اس بات کے امکانات نظر نہیں آتے کہ وہ ہماری رقم کبھی واپس بھی کرے گا اور تم اسے ڈھیل دینے پر اصرار کرتے ہو۔ عجیب منطق ہے تمہاری بھی..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تمہاری ہمدردیاں تو میرے ساتھ ہونا چاہئیں نا.....!''

''امی! میری تمام تر ہمدردی آپ کے ساتھ ہی ہے۔'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''بلکہ ہم سب ایک ہی ہیں۔ آپ، میں اور فوزیہ میں سے کسی ایک کا نقصان ہم تینوں کا نقصان ہے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ہمارے ڈوبے ہوئے پانچ لاکھ روپے ہمیں مل جائیں مگر جلد بازی میں یہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔ ٹھنڈا کر کے کھائیں گے تو منہ نہیں جلے گا۔''

''تمہاری منطق میرے پلے نہیں پڑ رہی بیٹا۔'' مسز عالیہ نے لاچاری سے کہا۔ ''میں چوہان صاحب پر بہت بھروسا کرتی ہوں۔ وہ ہمارے لیے انتہائی مخلص انسان ہیں۔ بدرشاہ سے نمٹنے کے لیے انہوں نے مجھے جو راستہ دکھایا ہے، میں اس راہ پر ضرور چلوں گی۔ تمہیں اچھا لگے یا بُرا، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔''

''امی! یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ کو اپنے سوا اور کسی کی پروا ہی نہیں ہوتی۔'' توصیف نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''گھر میں آپ ڈکٹیٹر بنی ہوئی ہیں۔ اتنی سختی تو ابو بھی نہیں کیا کرتے تھے۔ ابو کے انتقال کے بعد تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم دونوں بھائی بہن ہٹلر کے عہد میں سانس لے رہے ہیں۔''

''بُری بات.....'' میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''توصیف! اپنی ماں سے اس لہجے میں بات کرنا تمہیں زیب نہیں دیتا۔''

''دیکھا آپ نے وکیل صاحب!'' مسز عالیہ امداد طلب نظر سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''انور علی کی وفات کے بعد تو میں رل کر رہ گئی ہوں۔ توصیف کی سرکشی آپ نے ملاحظہ کی ہے نا..... اس کی دیکھا دیکھی فوزیہ بھی بعض اوقات میرے منہ کو آنے لگتی ہے۔''

''امی! آپ اسے میری بدتمیزی کہیں یا سرکشی مگر میں ہمیشہ سچی اور کھری بات کرتا ہوں۔'' وہ قدرے برہمی سے بولا۔ ''اور سچ سب کو کڑوا ہی لگتا ہے۔''

''یہ تم مجھے اتنی باتیں اس لیے سنا رہے ہو کہ میں نے پانچ لاکھ کی رقم تمہارے ہاتھ میں نہیں رکھی!'' مسز عالیہ نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیز نظر سے بیٹے کو گھورا۔ ''تاکہ تم اسے کسی کاروبار میں لگا سکو ..... ہیں نا..... یہی بات ہے نا؟''

''تو اس میں ایسا غلط کیا تھا۔'' وہ چمک کر بولا۔

''آپ نے مجھ پر..... نگی اولاد پر بھروسا نہیں کیا اور ایک فراڈ شخص کے بزنس میں ساری رقم جھونک دی۔ اب بیٹھ کر آگ سینکیں ان نوٹوں کی.....!''

''بات اعتبار اور بے اعتباری کی نہیں ہے بیٹا۔'' مسز عالیہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''میں اتنی بڑی رقم اٹھا کر تمہارے ہاتھ میں کیسے دے دیتی۔ تمہارے پاس نہ تو کوئی ہنر ہے اور نہ ہی تمہیں کسی کام کا تجربہ ہے..... اور تعلیم کے میدان میں بھی تم نے کوئی جھنڈے نہیں گاڑ رکھے۔ میٹرک بھی رو دھو کر کیا ہے تم نے.....!''

''اسی لیے آپ نے ایک تجربہ کار اور ہنرمند کاروباری شخص بدرشاہ پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کر لیا۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''اچھا..... تم اب جلی کٹی بند کرو اور مجھے وکیل صاحب سے بات کرنے دو۔'' مسز عالیہ نے کہا۔ ''یہ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ ہم کس قسم کے انسان ہیں!''

میں سوچ تو بہت کچھ رہا تھا مگر یہ نہیں کہ وہ ماں بیٹا کس قسم کے انسان ہیں۔ میں دراصل ان کی باہمی بحث و تکرار سے بہت کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اس مقصد میں خاطر خواہ کامیاب بھی رہا تھا۔ میں کافی دیر سے خاموش بیٹھا ان کے بیچ جاری تقریری مقابلہ دیکھ اور سن رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے پر خطرناک حملے کرنے لگتے، میں نے مداخلت ضروری جانی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''آپ لوگ میرے پاس کس لیے آئے ہیں؟''

''تاکہ آپ ہمیں بدرشاہ جیسے شیطان کے چنگل سے رہائی دلا سکیں۔'' مسز عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور ہمارے پانچ لاکھ روپے بھی واپس مل جائیں۔''

توصیف نے میرے سوال کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ اپنی نوک جھوک چھوڑ کر مجھے اپنے اپنے موقف سے آگاہ کریں تاکہ میں اس بات کا تعین کر سکوں کہ یہ کیس دراصل کس نوعیت کا ہے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کر پاؤں گا.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے یکے بعد دیگرے ان ماں بیٹے کی جانب دیکھا پھر ماں کو مخاطب کرتے ہوئے اضافہ کیا۔

''مسز عالیہ! پہلے آپ.....''

آئندہ آدھے گھنٹے میں مسز عالیہ نے مجھے بدرشاہ کے فراڈ کی لمبی چوڑی کہانی سنائی۔ اس داستان میں بہت سی چیزیں غیر متعلقہ بھی تھیں لہٰذا میں غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ اس کیس کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔ پیش منظر کی خاطر خواہ جان کاری کے لیے پس منظر سے آگاہی بہت ضروری ہوتی ہے۔ ایک بات ذہن میں رکھیں کہ اس کتھا میں سے بعض باتیں میں دانستہ چرا کر اپنے پاس محفوظ کر رہا ہوں جن کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کروں گا تاکہ کہانی کے اندر تجسس اور ڈراما موجود رہے جو کہ سسپنس ڈائجسٹ کا خاصہ ہے۔

☆☆☆

انور علی ایک سرکاری محکمے میں درمیانے درجے کا افسر ہوا کرتا تھا اور کم و بیش تین سال پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ انور علی کو ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے محکمے سے اچھے خاصے فنڈز ملے تھے۔ کچھ اس نے سیونگ بھی کر رکھی تھی۔ یہ کل ملا کر سات لاکھ کی رقم بن جاتی تھی۔ جب تک انور علی زندہ تھا تو گھر کے ہر معاملے پر اس کی بڑی مضبوط گرفت تھی اسی لیے یہ سیونگ بھی ہو گئی تھی لیکن اس کی وفات کے فوراً بعد عالیہ بیگم مشکلات میں گھر گئی تھی۔

مسز عالیہ کی رہائش نرسری کے علاقے ای۔ مارکیٹ میں تھی۔ انور علی نے اپنی زندگی میں سب سے اہم کام یہ کیا تھا کہ اس نے ذاتی گھر بنا لیا تھا۔ ای۔ مارکیٹ میں واقع یہ گھر بہت ہی صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ چار افراد کی فیملی کے لیے یہ ایک آئیڈیل رہائش گاہ تھی۔ انور علی کے انتقال کے بعد بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔

جب تک وہ زندہ تھا اس نے گھریلو اخراجات کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا تھا اس لیے بجٹ ہمیشہ کنٹرول میں رہتا تھا۔ وہ باقی نہیں رہا تو گھر کا نظام عالیہ بیگم کو چلانا پڑا اور وہ کچھ تو ناتجربہ کاری کے باعث اور کچھ بچوں کی ضد کی وجہ سے مار کھا گئی۔ گھر میں باقاعدہ آمدنی کا کوئی سلسلہ باقی نہیں رہا تھا۔ انور علی کی جو پنشن آتی تھی، وہ گھریلو اخراجات کے لیے ناکافی تھی۔ اس موقع پر توصیف کو چاہیے تھا کہ وہ گھر کے بجٹ کو سہارا دینے کے لیے کسی روزگار پر لگ جاتا لیکن اس نے اس حوالے سے اپنی ذمے داری کا احساس کیا اور نہ ہی کسی کام میں دلچسپی ظاہر کی۔ الٹا ہر گزرتے دن کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ساتھ اس کی فرمائشوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اس مشن میں فوزیہ بھی بھائی کا ساتھ دیتی تھی۔ عالیہ بیگم ان دونوں کے جائز و ناجائز مطالبات کے سامنے اس لیے بھی مجبور ہو جاتی تھی کہ ان کے سر پر سے باپ کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو کسی کمی یا محرومی کا احساس نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔

عالیہ بیگم کی سوچ تو بہت اچھی تھی لیکن کوئی مستقل آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے، فوزیہ اور توصیف کو خوشیاں فراہم کرنے کی مد میں جمع پونجی میں رفتہ رفتہ کمی واقع ہونے لگی پھر دو سال بعد پتا چلا کہ سات لاکھ کی رقم گھٹ کر پانچ لاکھ رہ گئی ہے۔ اس صورتِ حال نے عالیہ بیگم کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ توصیف نے تو رو دھو کر میٹرک کیا تھا لیکن فوزیہ گریجویٹ تھی۔ قریبی لوگوں میں سے ایک عورت نے عالیہ بیگم کو مشورہ دیا۔

''تمہارا لڑکا تو ایک دم نالائق نکلا ہے۔ یہ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا ہے۔ تم ایسا کرو، فوزیہ کو جاب کرا دو۔ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ گھر کی معاشیات کو بڑے اچھے انداز میں سہارا دے سکتی ہے۔''

''نہ جی...... میں تو فوزیہ کو کبھی بھی نوکری کے لیے نہیں کہوں گی۔'' عالیہ نے مشورہ دینے والی عورت کو ٹکا سا جواب دے دیا۔

''آخر اس میں برائی ہی کیا ہے؟'' اس عورت نے پوچھا۔ ''خاندان کی اور بھی کئی لڑکیاں جاب کر رہی ہیں۔''

''میں نے کب کہا کہ اس میں کوئی خرابی ہے......!''

''پھر؟''

''میں نے فوزیہ کے بارے میں کچھ اور سوچ رکھا ہے۔'' عالیہ پُرخیال انداز میں بولی۔

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی بتاؤ، تم نے اپنی بیٹی کے لیے کیا سوچ رکھا ہے؟''

''میری خواہش ہے کہ میں جلد از جلد اس کی شادی کر دوں۔''

''خواہش تو نیک ہے۔'' اس عورت نے گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا صرف یہ خواہش دل میں ہی لیے بیٹھی ہو یا اس سلسلے میں کوئی عملی کوشش بھی کی ہے؟''

''پچھلے دو سال سے اسی کوشش میں لگی ہوئی ہوں۔'' عالیہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن پتا نہیں، میری بچی کا نصیب کیسا ہے کہ کہیں بات بن کر نہیں دے رہی۔''

''اے بہن......'' وہ عورت ایک خاص انداز میں ہاتھ کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ ''خواہ مخواہ بچی کے نصیب کو دوش نہ دو۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔''

''زمانہ بدل چکا ہے......'' عالیہ نے حیرت بھرے انداز میں اس عورت کی طرف دیکھا۔ پھر مزید کہا۔ ''میں سمجھی نہیں، آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟''

''میرا اشارہ میرج بیورو کی طرف ہے۔'' اس عورت نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آج کل لوگ اپنے بچوں کے رشتوں کے لیے ادھر کا رخ کر رہے ہیں اور ماشاء اللہ...... خاصے مثبت نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ تم بھی فوزیہ کے رشتے کے لیے کسی میرج بیورو میں رجسٹریشن کرا دو۔ اللہ کرم کرے گا۔''

''میرج بیوروز کا ذکر تو میں نے بھی سنا ہے۔'' عالیہ بیگم اس کی تجویز میں دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں کسی ایسی جگہ سے واقف نہیں ہوں۔ ہمارے آس پاس تو کوئی بھی میرج بیورو نہیں ہے......!''

اس زمانے میں میرج بیورو کا سلسلہ نیا نیا متعارف ہوا تھا اور یہ بیوروز خال خال ہی ہوا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح ہر گلی میں یا ہر تیسری گلی میں کوئی میرج بیورو کھلا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو یہ کافی منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔

''تم فکر نہ کرو عالیہ۔'' وہ عورت تسلی آمیز انداز میں بولی۔ ''میں کسی میرج بیورو کا پتا کروں گی اور تمہارے ساتھ جا کر وہاں فوزیہ کا رجسٹریشن کرا دوں گی۔ آگے جو اللہ کی مرضی۔''

''تمہارا بہت شکریہ بہن۔'' عالیہ نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو عالیہ۔'' اس عورت نے کہا۔ ''فوزیہ میری بیٹیوں جیسی ہے۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کروں گی۔ اگر تمہاری بیٹی کو کوئی مناسب رشتہ مل گیا تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔''

رفیق چوہان کی زبانی مجھے یہ بات پتا چل چکی تھی کہ عالیہ بیگم اپنی بیٹی فوزیہ کی شادی کے لیے سخت پریشان تھی۔ ایک دو جگہ اس کے رشتے کی بات چلی بھی لیکن معاملہ فائنل نہیں ہو سکا تھا۔ چوہان صاحب نے اپنے علم کی روشنی میں مجھے چند ایسی ٹیکنیکل وجوہات بھی بتائی تھیں جو فوزیہ کی شادی میں رکاوٹ کا باعث تھیں لیکن میں نے چوہان صاحب کی باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال باہر کیا تھا کیونکہ مجھے دست شناسی کے علم سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ہاتھ کی ریکھاؤں سے کوئی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مطلب..... میں ایک عملی انسان تھا اور اس بات پر یقین رکھتا تھا..... عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں، نہ نوری ہے نہ ناری ہے۔

چند روز بعد وہ عورت عالیہ اور فوزیہ کو بہادر آباد کے علاقے میں واقع ایک میرج بیورو میں لے گئی۔ اس میرج بیورو کا نام ''لنکرز'' میرج بیورو تھا۔ ''لنکرز'' نام میں بہت کشش پائی جاتی تھی اور فوری طور پر ذہن میں یہی تصور ابھرتا تھا کہ یہ لوگ رشتوں کو جوڑنے کا کام کرتے ہوں گے یعنی انسانوں کو آپس میں لنک کر کے نئے رشتے استوار کرتے ہوں گے۔

لنکرز میرج بیورو کا آفس بہت صاف ستھرا اور عالی شان تھا۔ وہاں کے ماحول نے عالیہ کو بہت متاثر کیا تھا۔ بیورو کے روح رواں عندلیب نامی ایک پُرکشش خاتون تھی جسے وہاں سب ''عندلیب آپا'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

عندلیب سے ملاقات خاصی حوصلہ افزا رہی۔ عندلیب نے فوزیہ کے مختلف زاویوں سے تین چار فوٹو بھی کھنچوائے۔ اس قسم کی فوٹو گرافی کے لیے عندلیب نے اپنے میرج بیورو کے اندر ہی ایک چھوٹا سا اسٹوڈیو بھی بنا رکھا تھا۔ عندلیب کے آفس میں بیٹھ کر عالیہ نے فوزیہ کا فارم بھی پُر کر دیا جس میں فوزیہ کے حوالے سے تمام اہم کوائف درج کر لیے گئے تھے۔ مثلاً اس کی عمر، تعلیم، ترجیحات، پسند ناپسند، گھر کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ.....!

رجسٹریشن کا عمل مکمل ہونے کے بعد عندلیب آپا نے عالیہ سے کہا۔ ''ہم اپنے ہر کلائنٹ کا پورا ریکارڈ مرتب کرتے ہیں۔ ہمارے پاس لڑکیوں اور لڑکوں کا ریکارڈ الگ الگ محفوظ ہے۔ آپ مجھے چند دن کی مہلت دیں۔ میں ذرا فوزیہ کی میچنگ کے کچھ رشتے نکال لوں پھر آپ کو کال کر کے بلا لوں گی۔ آپ آ کر دیکھ لیجیے گا۔ اگر ان لڑکوں میں سے کوئی آپ کی سمجھ میں آ جائے تو پھر سلسلہ آگے بڑھایا جائے گا اور آپ بالکل بے فکر ہو جائیں.....'' وہ سانس لینے کے لیے تھمی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے اندر آپ کی بیٹی کی شادی ہو جائے گی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے!'' عالیہ نے تہِ دل سے کہا۔

''ابھی آپ نے مجھے رجسٹریشن فیس دی ہے۔'' عندلیب آپا نے ہوشیاری سے کہا۔ ''جب آپ کو لڑکا پسند آ جائے گا اور لڑکے کو آپ کی بیٹی پسند آ جائے گی یعنی دونوں پارٹیاں ڈائریکٹ ہو کر ایک دوسرے کے حوالے سے اطمینان کر لیں گی اور یہ رشتہ طے ہو جائے گا تو اس موقع پر آپ مجھے کچھ اور رقم بھی ادا کریں گی جو میں آپ کو بعد میں بتا دوں گی۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' عالیہ بیگم نے کامل رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بس، یہ کام ہو جائے پھر آپ کی جو بھی خدمت کرنا ہو گی، میں ضرور کروں گی۔''

اس روز عالیہ بیگم لنکرز میرج بیورو سے خوشی خوشی گھر واپس آ گئی۔ اس نے راستے میں اس عورت کا بھی بہت شکریہ ادا کیا جو اسے اپنے ساتھ بہادر آباد والے میرج بیورو لے کر گئی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد لنکرز سے عالیہ بیگم کو کال موصول ہوئی کہ وہ فرصت نکال کر آج کسی وقت میرج بیورو آ جائے۔ عالیہ فوزیہ کو ساتھ لے کر سہ پہر میں مذکورہ میرج بیورو پہنچ گئی۔ عندلیب آپا نے انہیں اپنے اے سی کمرے میں بلایا پھر ان کے سامنے دس مردوں کی پروفائلز اور تصاویر وغیرہ رکھ کر بڑے اعتماد سے کہا۔

''عالیہ جی! ان دس افراد کو آپ کی بیٹی پسند آ گئی ہے۔ ان کے پروفائل میں تمام کوائف موجود ہیں۔ آپ سب کو باری باری چیک کر لیں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی مناسب ہو تو مجھے بتا دیں پھر میں بات کو آگے بڑھاؤں گی۔ ابھی تو صرف کوائف اور فوٹو گرافس کا تبادلہ ہوا ہے۔ اگر آپ کی طرف سے کوئی مثبت ردعمل آیا تو پھر میں آپ لوگوں کی روبرو ملاقات بھی کرا دوں گی۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ عالیہ نے پوچھا۔ ''آپ کہیں جا رہی ہیں؟''

''میں پندرہ بیس منٹ کے لیے طارق روڈ جاؤں گی۔'' عندلیب آپا نے جواب دیا۔ ''اس دوران میں آپ ماں بیٹی ان دس امیدواروں کا جائزہ لے لیں۔ باقی باتیں اس کے بعد کریں گے۔''

عندلیب کے جانے کے بعد عالیہ اور فوزیہ ان دس افراد کے پروفائلز کو کھنگالنے میں مصروف ہو گئیں۔ عندلیب پندرہ بیس منٹ بعد واپسی کا بتا کر گئی تھی لیکن وہ آدھے گھنٹے کے بعد لوٹی۔ ان تیس منٹ میں فوزیہ اور عالیہ کی تفتیش کا نتیجہ صفر کے برابر برآمد ہوا۔ انہوں نے اپنے خیالات سے عندلیب کو آگاہ کر دیا۔

''آپا.....'' عالیہ نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ شکل..صورت اللہ کی دین ہے لیکن ان دس افراد میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک بھی ایسا نہیں جس کی فوزیہ کے ساتھ جوڑی کو معقول کہا جاسکے۔ ایک آدھ اگر ایسا ہے بھی تو وہ عمر میں فوزیہ سے دوگنا ہے۔ آپ کو اگر میری بات بری لگے تو میں معذرت چاہتی ہوں مگر جو میرے دل میں تھا وہ بے ساختہ میری زبان پر آ گیا.....''

''نیور مائنڈ عالیہ جی!'' عندلیب نے زیر لب مسکراتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''صاف گو لوگ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور آپ بھی ایک ایسی ہی انسان ہیں۔ آپ کی بات مجھے بری نہیں لگی لیکن شاید آپ کو ایک خاص بات کا علم نہیں ہے.....''

''کون سی خاص بات؟'' عالیہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی میں نے آپ کو ان دس افراد کی تفصیلات سے آگاہ کیا ہے جنہوں نے آپ کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔'' عندلیب آپا وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اب میں آپ کو ان مردوں کے پروفائلز دکھاؤں گی جنہوں نے شادی کی خواہش کے لیے ہمارے پاس رجسٹریشن کرا رکھی ہے۔ ان میں سے یقیناً آپ کو کوئی نہ کوئی ضرور پسند آ جائے گا۔''

اس کے بعد عندلیب نے ان ماں بیٹی کو پندرہ سے بیس ایسے افراد کے فوٹو گراف اور پروفائلز دکھائے جنہوں نے مناسب رشتے کی تلاش کے لیے لنکرز میرج بیورو میں رجسٹریشن کرا رکھا تھا۔ ان میں سے عالیہ کو تین چار لوگ پسند آ گئے۔ اس نے عندلیب سے پوچھا۔

''کیا آپ نے ان لوگوں کو فوزیہ کا پروفائل دکھایا تھا؟''

''نہیں.....اور اس کی ایک وجہ ہے۔'' عندلیب نے جواب دیا۔

''کیسی وجہ؟''

''یہ تمام افراد بہت پیسے والے ہیں۔'' عندلیب نے بتایا۔ ''میں رشتوں کو میچنگ کرتے ہوئے سوشل اسٹیٹس کا بھی خیال رکھتی ہوں کہ بعد میں کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔''

''یہ سب اگر پیسے والے ہیں تو ہم بھی کوئی گئے گزرے نہیں ہیں۔'' عالیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں فوزیہ کی شادی پر دل کھول کر خرچ کروں گی۔ لڑکے والوں کی ڈیمانڈ کے مطابق جہیز دوں گی، چاہے اس کے لیے مجھے اپنا گھر بھی کیوں نہ فروخت کرنا پڑے۔''

''عالیہ بہن! میں آپ کے جذبات کو سمجھ سکتی ہوں۔'' عندلیب نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ فوزیہ کی شادی ان شاء اللہ بہت اچھی جگہ پر ہوگی۔''

''میں نے جو تین چار رشتے پسند کیے ہیں.....'' عالیہ نے حسرت بھرے انداز میں کہا۔ ''اگر ان میں سے کسی کے ساتھ ہو جائے تب مزہ ہے نا.....!''

''میں نے تمہیں بہن بولا ہے نا.....!'' عندلیب نے عالیہ کو کندھے سے تھام لیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''فوزیہ میری بیٹیوں جیسی ہے۔ تم اطمینان سے گھر جاؤ۔ میں کوئی سیاست لگاتی ہوں۔''

فوزیہ اور عالیہ مطمئن ہو کر ''لنکرز میرج بیورو'' سے گھر آ گئیں۔ تین روز کے بعد عندلیب نے فون کیا اور مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''عالیہ بہن! مبارک ہو.....!''

''کس بات کی مبارک عندلیب آپا؟'' عالیہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''تم نے جن تین چار افراد کو پسند کیا تھا، ان میں سے ایک کو میں نے راضی کر لیا ہے۔'' عندلیب نے عالیہ کو تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''تم ابھی میرے پاس آ جاؤ تاکہ تم سے ضروری باتیں کر لی جائیں۔''

''ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔'' عالیہ نے کہا۔

''فوزیہ کو ساتھ لانے کی ضرورت نہیں۔'' عندلیب نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ''ہمارے بیچ جو باتیں ہوں گی، ان میں فوزیہ کی موجودگی ضروری نہیں۔''

''میں سمجھ گئی آپا۔'' عالیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں۔''

ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد عالیہ ''لنکرز میرج بیورو'' میں عندلیب آپا کے سامنے بیٹھی تھی۔ عندلیب نے فون پر جس رشتے کی نوید سنائی تھی، اس شخص کا نام تھا کاشف علی اور پیشے کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھا۔ کاشف علی کے دیگر کوائف سے آگاہ کرنے کے بعد عندلیب نے عالیہ سے کہا۔

''کاشف کے گھر والوں کو فوزیہ پسند آ گئی ہے۔''

''اور کاشف کو.....؟'' عالیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''زندگی تو کاشف نے فوزیہ کے ساتھ گزارنی ہے؟''

''کاشف نے اپنی پسند کے تمام معاملات کو گھر والوں کے سپرد کر رکھا ہے۔'' عندلیب وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے کاشف کو فوزیہ کے بارے میں تفصیل سے بتا دیا گیا ہے۔ وہ بھی اس رشتے کے لیے راضی ہے لیکن بیچ میں ایک مسئلہ آ رہا ہے.....''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کیسا مسئلہ؟'' عالیہ نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کاشف کے گھر والے ایک سال کے بعد اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' عندلیب نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، ہم ایک سال تک انتظار کرلیں گے۔'' عالیہ نے کہا۔ ''اس بیچ میں اگر منگنی کی رسم ادا کردی جائے تو مجھے اطمینان رہے گا۔''

''یہ بات میں نے لڑکے کے گھر والوں سے کہی تھی لیکن وہ مانے نہیں۔'' عندلیب نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ ان کی جینوئن مجبوری ہے۔''

''جینوئن مجبوری.....'' عالیہ نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپا! میں کچھ سمجھی نہیں؟''

''بات دراصل یہ ہے کہ کاشف کے خاندان میں منگنی وغیرہ کا رواج نہیں ہے۔'' عندلیب نے بتایا۔ ''یہ لوگ ڈائریکٹ شادی کرتے ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ منگنی کی رسم انہیں راس نہیں آتی۔''

''آپا! یہ آپ نے بڑی عجیب بات بتائی ہے؟'' عندلیب کی بات پر عالیہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''بات اگرچہ عجیب ہی ہے لیکن یہ تجربے کی کسوٹی پر آزمائی ہوئی حقیقت ہے۔'' عندلیب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کے خاندان میں جتنی بھی شادیاں منگنی کے بعد کی گئیں، وہ ایک سال سے زیادہ نہیں چل سکیں۔ یا تو دلہن بیوہ ہوگئی یا دُلہا رنڈوا ہوگیا اور یا پھر میاں بیوی کے بیچ طلاق ہوگئی۔ پے در پے ایسے واقعات نے خاندان کے بزرگوں کو سر جوڑ کر سوچنے پر مجبور کردیا اور اس سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ آئندہ خاندان میں کسی بھی لڑکے یا لڑکی کی منگنی وغیرہ نہیں کی جائے گی بلکہ تاریخ طے کرکے ڈائریکٹ شادی ہی کی جائے گی۔ پچھلے پندرہ بیس سال سے کاشف کا خاندان اسی روش پر چل رہا ہے۔'' بات کے اختتام پر عندلیب آپا نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''اور جو شادیاں ڈائریکٹ کی گئیں ان کے نتائج کیسے رہے؟'' عالیہ نے ایک اہم سوال کیا۔ ''اس بارے میں آپ نے کاشف کے گھر والوں سے کچھ پوچھا؟''

''ماشاءاللہ..... وہ تمام لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں امن و سلامتی کی زندگی گزار رہے ہیں۔'' عندلیب نے بتایا۔

دراصل کاشف علی کا رشتہ عالیہ کو بے حد پسند آیا تھا۔ پچھلی مرتبہ فوزیہ بھی عالیہ کے ساتھ تھی اور اس نے بھی اس رشتے کو اوکے کردیا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا..... کاشف میں وہ تمام خوبیاں اور اوصاف موجود تھے جس کے خواب اکثر لڑکیاں دیکھتی ہیں۔ خوبصورت، ہینڈسم، اسمارٹ، ڈاکٹر، ڈیفنس سوسائٹی میں ایک ہزار گز کا ذاتی بنگلا ..... وغیرہ وغیرہ۔ عندلیب کی بیان کردہ تفصیل کے جواب میں عالیہ نے کہا۔

''آپا! اگر آپ اس رشتے کے لیے مطمئن ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں منگنی کے خیال کو ذہن سے نکال کر ایک سال تک انتظار کرلوں گی۔''

''اگر میں نے اطمینان نہ کرلیا ہوتا تو اتنے وثوق کے ساتھ تم سے بات کیوں کررہی ہوتی۔'' عندلیب نے اپنایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے کاشف کے خاندان کو ٹھوک بجا کر اچھی طرح چیک کرلیا ہے۔ ایک سال کا ٹائم بھی وہ اس لیے لے رہے ہیں کہ لڑکا ''ایف آر سی ایس'' کرنے یو کے گیا ہوا ہے۔ وہ انگلینڈ سے اسپیشلسٹ بن کر واپس آئے گا پھر یہاں کلینک کھولے گا، تب شادی کرے گا۔ اس کی اسٹڈی کے کم و بیش دس ماہ باقی ہیں.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''یہ ایک سال پُر لگا کر یوں اڑ جائے گا کہ تمہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوگا اور میں سمجھتی ہوں، ایک سال کا وقت دے کر قدرت نے تمہیں ایک سنہری موقع فراہم کیا ہے۔''

''سنہری موقع.....؟'' عالیہ پلکیں جھپک کر رہ گئی۔ ''میں سمجھی نہیں آپا؟''

''میں سمجھاتی ہوں۔'' عندلیب نے بڑی رسان سے کہا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے تم بہت جذباتی ہوگئی تھیں اور فوزیہ کی شاندار رخصتی کے لیے تم نے اپنا گھر فروخت کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کردیا تھا..... تم نے ایسا کہا تھا نا؟''

''ہاں ..... میں نے یہ کہا تھا۔'' عالیہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اور میں نے یہ بات ایسے ہی خوامخواہ نہیں کہہ دی تھی۔ میں عالیہ کو کسی اچھے گھر میں بیاہنے کے لیے واقعی گھر کو فروخت کرسکتی ہوں۔''

''میری نظر میں یہ سراسر حماقت ہوگی۔'' عندلیب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے قدرت کے فراہم کردہ جس سنہری موقع کی جانب اشارہ کیا ہے، اس کے بعد تم گھر کو فروخت کیے بغیر بھی بڑے شاہانہ انداز میں فوزیہ کو رخصت کرسکتی ہو۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فائدے کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ عالیہ کو بھی لگی۔ اس نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے عندلیب آپا کی طرف دیکھا پھر دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''آپا..... وہ کیسے؟''

''سمجھدار مائیں بیٹی کے پیدا ہوتے ہی اس کے جہیز کی فکر میں لگ جاتی ہیں اور یہ سلسلہ بیٹی کی رخصتی تک جاری رہتا ہے۔'' عندلیب آپا نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''جہاں تک میں ... سمجھی ہوں تو تم نے فوزیہ کی شادی کے لیے اپنے ذہن میں کوئی بجٹ ضرور بنا رکھا ہوگا..... گھر کی فروخت کے علاوہ!''

''میرے پاس جو بھی جمع پونجی ہے، وہ میں فوزیہ کی شادی میں خرچ کرسکتی ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''اور وہ جمع پونجی کتنی ہے؟''

''پانچ لاکھ روپے۔''

''گڈ.....!'' عندلیب نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ پانچ لاکھ کی رقم کیش کی صورت میں تمہارے پاس رکھی ہے یا تم نے اس رقم کو کہیں انویسٹ کر رکھا ہے؟''

''سمجھ لیں کیش ہی رکھے ہیں۔'' عالیہ نے جواب دیا۔ ''میرے اکاؤنٹ میں پڑے ہیں۔ انور کی وفات کے وقت یہ رقم سات لاکھ روپے تھی۔ پچھلے تین سال میں ہم اس میں سے دو لاکھ نکال کر کھا چکے ہیں۔''

''اگر رقم نکالنے کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو آئندہ تین چار سال میں تمہارا بینک اکاؤنٹ زیرو ہوجائے گا۔'' عندلیب نے حقیقتِ حال کو عالیہ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ تمہارے پاس آمدن کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں ہے۔''

''مستقل کیا آپا..... کوئی عارضی ذریعہ بھی نہیں ہے۔'' عالیہ نے پریشانی بھرے لہجے میں کہا۔

''گھر بیٹھے کھاتے رہو تو قارون کا خزانہ بھی ایک دن خالی ہوجاتا ہے!'' عندلیب آپا معنی خیز انداز میں بولی۔

''میں بھی اس حوالے سے سخت فکرمند ہوں۔'' عالیہ نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اس مسئلے کو کیسے حل کروں۔''

''تم نے کیا کرنا ہے بہن.....'' عندلیب نے گول مول انداز میں کہا۔ ''قدرت ہی سب کے مسئلے حل کرنے والی ہے۔ قدرت جس پر مہربان ہوجائے اس کے لیے مواقع کے دروازے کھول دیتی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس وقت قدرت پوری طرح تم پر مہربان ہوچکی ہے۔''

''وہ کیسے آپا.....؟'' عالیہ نے مدد طلب نظر سے عندلیب کی جانب دیکھا۔ ''اگر آپ سمجھ چکی ہیں تو مجھے بھی سمجھائیں.....!''

''کاشف کے گھر والوں نے شادی کے لیے جو ایک سال کا وقت مانگا ہے، اس مدت میں تم اپنے پانچ لاکھ کو آٹھ لاکھ بنا سکتی ہو۔'' عندلیب نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں اس حق میں نہیں ہوں کہ تم تمام جمع پونجی خرچ کر کے بیٹی کو رخصت کرو اور پھر خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ یہ سراسر بے وقوفی ہوگی۔ اگر تم ان پانچ لاکھ کو آٹھ لاکھ بنالو تو پانچ چھ لاکھ میں تم عالی شان جہیز کے ساتھ فوزیہ کو رخصت کرسکتی ہو اور دو ڈھائی لاکھ روپے تمہارے پاس بچ بھی جائیں گے۔''

''آپا! آپ کی بات تو میرے دل کو لگ رہی ہے۔'' عالیہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن میں ایسا کوئی بھی جادو نہیں جانتی جس سے اپنے پانچ لاکھ کو آٹھ لاکھ میں بدل ڈالوں۔ اگر میں ایک سال کے لیے اس رقم کو کسی بینک میں فکس بھی کردوں تو یہ زیادہ سے زیادہ ساڑھے پانچ لاکھ روپے ہوجائیں گے۔ اس سے زیادہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....!''

''اگر تم ایسا کوئی جادو نہیں جانتی ہو تو یہ آپا کس دن تمہارے کام آئے گی.....'' عندلیب اپنے سینے پر بڑے فخر سے ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم مجھ پر بھروسا کرو تو میں ایک سال میں تمہارے پانچ لاکھ روپے کو آٹھ لاکھ میں بدل سکتی ہوں۔ یعنی اصل زر پانچ لاکھ روپے اور ایک سال میں اس رقم پر منافع تین لاکھ روپے۔ کل ملا کر یہ رقم بن گئی آٹھ لاکھ روپے.....!''

''مگر یہ سب کیسے ممکن ہوسکے گا؟'' عالیہ بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اور جہاں تک بھروسے کی بات ہے آپا.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر مجھے آپ پر اعتماد نہ ہوتا تو اس وقت میں آپ کے سامنے بیٹھی اپنی زندگی کا ایک حساس اور اہم مسئلہ ڈسکس نہ کر رہی ہوتی۔''

''تم نے مجھ پر اعتبار کیا ہے تو سمجھ لو، میں تمہارے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں لگنے دوں گی۔'' عندلیب نے اپنائیت بھرے پُرخلوص انداز میں کہا۔ ''میں ایک ایسے شخص کو جانتی ہوں جو پانچ فیصد ماہانہ منافع پر لوگوں سے رقم لے کر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے کاروبار میں لگاتا ہے۔ اگر تم یہ پانچ لاکھ روپے اس کاروباری شخص کے پاس لگا دو تو تمہیں اس رقم پر ماہانہ پچیس ہزار روپے منافع ملے گا۔ اب تم خود حساب لگا لو کہ پچیس ہزار ماہانہ کے حساب سے ایک سال یعنی بارہ ماہ کا منافع کتنا بنتا ہے.....!''

''یہ تو بہت ہی سیدھا سا حساب ہے۔'' عالیہ نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ''پچیس ہزار روپے ماہانہ کا مطلب ہے، تین سو ہزار سالانہ یعنی تین لاکھ روپے سالانہ منافع.....!''

''بالکل ..... میں تمہیں یہی بتانے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' عندلیب نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

عالیہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''ٹھیک ہے آپا! میں ایک سال کے لیے اپنے پانچ لاکھ روپے اس کاروباری آدمی کے بزنس میں لگانے کو تیار ہوں۔ آپ مجھے اس شخص سے ملوا دیں۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' عندلیب نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''کل ہی میں تمہیں اس بندے کے پاس لے چلتی ہوں۔''

''اس کے ساتھ ہی آپ نے کاشف والے رشتے کو بھی اپنی مٹھی میں رکھنا ہے۔'' عالیہ نے ساجت آمیز انداز میں کہا۔

''یہ سارا بندوبست اس رشتے کی خاطر ہی تو کیا جا رہا ہے۔'' عندلیب جھٹ سے بولی۔ ''ورنہ اس کھٹ راگ میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔''

عالیہ اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلی آئی۔

اگلے روز عندلیب نے عالیہ کو مذکورہ کاروباری شخص سے ملوا دیا۔ اس شخص کا نام بدر شاہ تھا۔ بدر شاہ نے دفتر کھول رکھا تھا۔ یہ دفتر کمرشل ایریا کی ایک ذیلی گلی میں واقع تھا۔

بدر شاہ نے بڑے تپاک سے عالیہ کا استقبال کیا۔ عندلیب نے عالیہ کے حوالے سے بدر شاہ کو گزشتہ رات ہی بریف کر دیا تھا۔ لہٰذا رسمی علیک سلیک کے بعد بدر شاہ کام کی بات پر آ گیا۔ اس نے عالیہ کو بتایا۔

''میں اپنی فرم کے لیے مختلف لوگوں سے عارضی طور پر قرضہ لیتا رہتا ہوں اور اس رقم پر معقول معاوضہ بھی دیتا ہوں۔ عندلیب صاحبہ نے آپ کو اس بارے میں یقیناً بتا دیا ہوگا۔''

عالیہ، بدر شاہ کی باتوں سے بے حد متاثر ہوئی تھی تاہم اپنی تسلی کے لیے اس نے پوچھ لیا۔ ''شاہ جی! عندلیب آپا نے آپ کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا ہے اور میں آپا پر بہت اعتماد کرتی ہوں۔ بس، میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آپ کس نوعیت کا بزنس کرتے ہیں؟''

''شاہ ٹریڈرز دراصل ملٹی ڈائمینشن فرم ہے۔'' بدر شاہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ہم امپورٹ، ایکسپورٹ، ٹریڈنگ کے حوالے سے کئی قسم کے کام کرتے ہیں جس کے لیے ہمیں بعض اوقات فوری رقم کی ضرورت پیش آ جاتی ہے جو ہم پُرکشش مارک اپ پر مختلف لوگوں سے لے لیتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے، ہم لوگوں کا پیسا اپنے کاروبار میں لگاتے ہیں تو اس بزنس میں ہمیں کافی منافع حاصل ہوتا ہے اور اسی منافع میں سے ہم، رقم انویسٹ کرنے والے کو بھی پانچ فیصد منافع دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں، ہم نے ایک اصول بنا رکھا ہے.....''

بات ادھوری چھوڑ کر بدر شاہ خاموش ہوا تو عالیہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ ''کیسا اصول شاہ جی؟''

''ہم اجنبی لوگوں کی رقم کو کبھی اپنے کاروبار میں نہیں لگاتے۔'' بدر شاہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس سے بعض اوقات مختلف نوعیت کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہمارے انویسٹرز سالہا سال کے جانے پہچانے ہیں لیکن عندلیب صاحبہ نے آپ کی سفارش کی ہے تو میں آپ کو انکار نہیں کر سکوں گا۔ میں خود بھی ایک بیٹی کا باپ ہوں، بیٹی والوں کی مجبوریوں کو بہ خوبی سمجھ سکتا ہوں۔''

بدر شاہ کی ان باتوں نے عالیہ کی نگاہ میں اس کی قدر و قیمت کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ وہ عقیدت بھری نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

''تو آپ میری رقم اپنے کاروبار میں لگانے کے لیے تیار ہیں؟''

''ہاں..... بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اسی مہینے میں، ہم کنسٹرکشن کے ایک پروجیکٹ میں ہاتھ ڈالنے والے ہیں۔ میں آپ سے لی ہوئی رقم کو اسی پروجیکٹ میں لگاؤں گا لیکن میں آپ پر ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں.....''

''کون سی بات؟'' عالیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھ لیا۔

''آپ میرے پاس جو بھی رقم انویسٹ کریں گی، وہ کم از کم چھ ماہ سے پہلے آپ واپس نہیں لیں گی۔'' بدر شاہ نے کہا۔ ''یعنی چھ ماہ تک آپ کی رقم ہمارے پروجیکٹ میں لگی رہے گی تو تب ہی ہمارے بیچ خوشگوار کاروباری تعلقات استوار ہو سکیں گے۔ اگر اس مدت سے پہلے آپ نے رقم نکالنے کی بات کی تو اس میں آپ کا نقصان ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ کہ ایسی صورتِ حال میں آپ کو طے شدہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

منافع نہیں ملے گا.....''

''پہلی بات یہ کہ میں کم از کم ایک سال کی مدت کے لیے آپ کے پاس پانچ لاکھ کی رقم انویسٹ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔'' عالیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ ٹھیک ایک سال کے بعد اپنی رقم واپس لے لوں گی، یہ میں آپ کو پہلے ہی بتا رہی ہوں لہٰذا کسی کنفیوژن کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بس میں یہ چاہوں گی کہ اس ایک سال میں ہر ماہ پابندی سے مجھے طے شدہ منافع ملتا رہے تاکہ میرا گھر ڈسٹرب نہ ہو۔''

''آپ کی دوٹوک اور کھری بات مجھے پسند آئی مسز عالیہ۔'' بدرشاہ نے ستائشی نظر سے مسز عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ بے فکر ہو کر اپنے پانچ لاکھ روپے میرے پاس انویسٹ کرسکتی ہیں۔ آج تین تاریخ ہے۔ اگر آپ کل یعنی چار تاریخ کو رقم میرے حوالے کردیتی ہیں تو اسی ماہ سے آپ کا منافع شروع ہوجائے گا یعنی آئندہ یکم کو آپ ان پانچ لاکھ پر پورے پچیس ہزار روپے منافع لینے کی حق دار ہوں گی۔''

مطمئن ہونے کے بعد عالیہ وہاں سے آ گئی۔ اگلے روز اس نے ''شاہ ٹریڈرز'' کے آفس جا کر پورے پانچ لاکھ روپے بدرشاہ کے حوالے کردیے۔ بدرشاہ کے ساتھ اس نے آپا عندلیب کا بھی شکریہ ادا کیا اور آئندہ ماہ کی پہلی تاریخ کا انتظار کرنے لگی۔

تیس دن گزرنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے اور پھر اس ماہ میں تو صرف چھبیس دن ہی تھے۔ اگلی یکم کو بدرشاہ نے عالیہ کو فون کیا کہ وہ آفس آ کر اپنے منافع کے پچیس ہزار روپے لے جائے۔ عالیہ خوشی خوشی شاہ جی کے آفس جا کر رقم وصول کرلائی۔ اس سے اگلے ماہ بھی عالیہ کو منافع کے پچیس ہزار مل گئے لیکن اس کے بعد جس گڑبڑ کا آغاز ہوا، اس نے عالیہ کو پریشان کردیا۔

عالیہ کے پاس جو بھی جمع پونجی تھی، وہ بدرشاہ کے پاس جا چکی تھی جس میں سے دو ماہ منافع کے نام پر بدرشاہ نے اسے پچاس ہزار روپے دیے تھے۔ اس حساب سے عالیہ کے ساڑھے چار لاکھ روپے اب بھی بدرشاہ کے پاس دبے ہوئے تھے۔ جب مزید دو ماہ منافع لیے بغیر گزر گئے تو عالیہ بیگم کی تشویش میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ وہ جب بھی بدرشاہ کے پاس جاتی، اول تو وہ اس سے ملتا ہی نہیں اور اگر اتفاقاً کبھی اس سے ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اسے ٹال دیتا۔

تنگ آ کر اس نے عندلیب آپا سے اس پریشانی کا ذکر کیا کیونکہ عالیہ نے اسی کے توسط سے بدرشاہ کے پاس سرمایہ کاری کی تھی۔ عندلیب بھی اسے تسلیوں کے سوا کچھ نہیں دے سکی۔ عندلیب کے مطابق، بدرشاہ کو کسی کاروبار میں بہت زیادہ نقصان ہوگیا تھا جس کی وجہ سے وہ آناً فاناً میں معاشی دباؤ میں آ گیا تھا۔ عندلیب نے عالیہ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ پریشان نہ ہو۔ جیسے ہی بدرشاہ کے حالات اچھے ہوں گے، وہ عالیہ کی رقم واپس کردے گا۔

بدرشاہ کے حالات اچھے ہوئے اور نہ ہی عالیہ کو اس کی اصل رقم واپس مل سکی۔ اصل رقم اس لیے کہ اب اس نے گراں قدر منافع کے بارے میں تو سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ اگر اس کے ڈوبے ہوئے ساڑھے چار لاکھ ہی واپس مل جاتے تو وہ خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت تصور کرتی۔

اس معاملے میں عالیہ بیگم چونکہ خوش قسمت ثابت نہیں ہوئی تھی، لہٰذا اس کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر رفیق چوہان نے عالیہ کو میرے پاس بھیج دیا تھا تاکہ میں اس کی قانونی مدد کرکے اسے بدرشاہ کے چنگل سے نکالوں یعنی کسی طرح اس کی ڈوبی ہوئی رقم وصول کرادوں۔

یہ تھے وہ تمام حالات جو مسز عالیہ کی زبانی مجھے معلوم ہوئے۔ توصیف کی اپنی ماں سے ناراضی کا صرف یہی سبب تھا کہ اس نے عالیہ سے پانچ لاکھ روپے مانگے تھے تاکہ وہ کوئی کاروبار کرسکے لیکن عالیہ کو چونکہ توصیف کی ناتجربہ کاری اور نا سمجھی کا یقین تھا اس لیے اس نے اتنی بڑی رقم بیٹے کے حوالے نہیں کی تھی۔ اس کے علاوہ توصیف کی یہ بھی ضد تھی کہ چالیس پچاس ہزار کی کوئی کار لے لیتے ہیں مگر عالیہ بیگم نے اس کی یہ بات بھی نہیں مانی تھی لہٰذا وہ ماں سے خفا ہوگیا تھا اور اکھڑا اکھڑا رہنے لگا تھا۔ توصیف کے اس رویے کو میں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا تھا۔ اس کے علاوہ توصیف کی باتوں سے میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ وہ بدرشاہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے حق میں نہیں تھا۔ وہ ایسا کیوں چاہتا تھا، یہ سردست میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

جب عالیہ بیگم اپنی داستانِ غم سنا چکی تو میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی کتنی سادہ اور معصوم عورت ہیں۔ اتنی بڑی رقم آپ نے ایک فراڈ شخص کے حوالے کردی۔''

''جب آپ نے مجھے معصوم اور سادہ کہہ ہی دیا ہے تو پھر بات ہی ختم ہوجاتی ہے۔'' وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''گزرے ہوئے وقت کو تو میں لوٹا نہیں سکتی۔ اب آپ یہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بتائیں کہ آپ میرے لیے کچھ کرسکتے ہیں یا میں مایوس ہوکر یہاں سے چلی جاؤں؟''

''گزرے ہوئے وقت کو آپ کیا، کوئی بھی واپس نہیں لاسکتا عالیہ صاحبہ!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''باقی جہاں تک آپ کے مایوس ہوکر یہاں سے واپس چلے جانے کی بات ہے تو میری لغت میں مایوسی کا صرف ایک ہی معنی لکھا ہوا ہے یعنی..... کفر..... اور میں اس گناہ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''گویا آپ یہ کیس لینے کے لیے تیار ہیں؟'' اس کی آنکھوں میں امید کے دیے جل اٹھے۔ ''مطلب، میری ڈوبی ہوئی رقم مجھے واپس مل جائے گی؟''

''میں صرف کوشش کا وعدہ کرسکتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نتائج مالک کے ہاتھ میں ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ میں بدرشاہ کو عدالت میں گھسیٹ کر آپ کو آپ کا حق دلوادوں لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔''

''کس قسم کا تعاون وکیل صاحب؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''میں آپ سے جو کچھ بھی پوچھوں، وہ آپ کو صحیح اور سچ سچ بتانا ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ میں آپ کو جو سبق پڑھاؤں، اسے ذہن نشین کرنا ہوگا۔''

''میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔'' وہ فرماں برداری سے بولی۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے اسے چند ٹپس دیں اور اس کیس کے حوالے سے کریدکرید کر اس کے اندر سے اہم پوائنٹس نکالے۔ اس کے بعد عالیہ بیگم نے میری فیس ادا کی اور پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ بدرشاہ کے خلاف کارروائی کب سے شروع کریں گے؟''

''ابتدائی کارروائی تو کل ہی سے شروع ہوجائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن عدالتی کارروائی کا آغاز ہونے میں چند دن لگ جائیں گے۔ اس دوران میں آپ وہ تمام اہم امور نمٹالیں جو میں نے آپ کے ذمے لگائے ہیں، خاص طور پر عندلیب آپا والا معاملہ.....!''

''جی، وہ میں کرلوں گی۔'' وہ یقین دلانے والے انداز میں بولی۔ ''مجھے امید ہے کہ آپا میرے ساتھ بھرپور تعاون کریں گی۔''

''اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو!'' میں نے خلوصِ دل سے کہا پھر فیس والی رقم کی رسید بنا کر میں نے عالیہ بیگم کے حوالے کردی۔

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

اگلے روز میں نے بدرشاہ کے لیے ایک لیگل نوٹس تیار کیا اور بہ ذریعہ رجسٹرڈ ڈاک یہ نوٹس اس کی فرم ''شاہ ٹریڈرز'' کے پتے پر پوسٹ کردیا۔ احتیاطاً میں نے مذکورہ نوٹس کی دو تین کاپیاں بھی تیار کرکے اپنے پاس رکھ لی تھیں تاکہ اور کسی فوری ضرورت کے وقت کام میں لائی جاسکیں۔

اس نوٹس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:

مسٹر بدرشاہ! میری مؤکلہ مسز عالیہ بیگم بیوہ انور علی نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے مورخہ فلاں فلاں کو مبلغ پانچ لاکھ روپے ایک سال کی مدت کے لیے آپ کی فرم ''شاہ ٹریڈرز'' میں انویسٹ کیے تھے۔ اس رقم پر آپ کی فرم نے میری مؤکلہ کو ماہانہ پانچ فیصد منافع دینا تھا جو مبلغ پچیس ہزار روپے ماہانہ بنتے ہیں۔ میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کی فرم نے پہلے دو ماہ نہایت پابندی کے ساتھ منافع کی رقم ادا کی ہے لیکن اس کے بعد آپ کی فرم کی جانب سے انتہائی غیر ذمے داری کا ثبوت دیا گیا بلکہ میری نظر میں آپ کی فرم نے بددیانتی کا مظاہرہ کیا ہے اور کئی ماہ سے میری مؤکلہ کو خوار کیا جارہا ہے۔ اسے نہ تو منافع کی طے شدہ رقم دی جارہی ہے اور نہ ہی اس کی اصل رقم واپس کرنے کی کوئی بات ہورہی ہے۔ اس پیچیدہ اور الجھے ہوئے معاملے کے حل کے لیے آپ پہلی فرصت میں اس نوٹس کا تحریری جواب دیں کہ آپ نے اس سلسلے میں کیا سوچ رکھا ہے۔ اگر آپ کی طرف سے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا گیا تو اس معاملے کو عدالت کے ذریعے حل کرنے کی چارہ جوئی کی جائے گی۔

مجھے اس بات کی زیادہ امید نہیں تھی کہ وہ شخص شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نوٹس کا فوراً جواب دے دے گا۔ اب تک میں نے عالیہ بیگم کی زبانی بدرشاہ کے بارے میں جو کچھ بھی سنا تھا، اس کی روشنی میں مجھے یہ بندہ انتہائی شاطر اور گھاگ لگا تھا۔ خیر، یہ تو وقت نے فیصلہ کرنا تھا کہ میں اس کا سارا شاطرپن ناک کے راستے نکالتا ہوں یا وہ مجھے جل دینے میں کامیاب ہوتا ہے.....!

رقوم کے لین دین کے سلسلے میں عالیہ بیگم نے مجھے دو رسیدیں بھی دی تھیں جو قانونی زبان میں پکی رسیدیں کہلاتی تھیں۔ ان میں سے ایک رسید کی تحریر کچھ اس طرح تھی۔

''میں نے مبلغ پانچ لاکھ روپے مسز عالیہ انور سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وصول پائے۔''

اس مختصر سی تحریر کے نیچے بدر شاہ کا نام اور دستخط موجود تھے۔ یقیناً یہ تحریر بدر شاہ کی جانب سے تھی جو اس نے عالیہ بیگم سے پانچ لاکھ کی رقم لیتے وقت دی تھی۔ قانونی نقطہ نظر سے یہ خامیوں سے بھرپور ایک فضول سی تحریر تھی جو موجودہ کیس میں عالیہ کے لیے سود مند ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تحریر سے یہ تاثر بھی لیا جا سکتا تھا کہ ماضی میں عالیہ بیگم نے بدر شاہ سے پانچ لاکھ روپے ادھار لیے ہوں گے اور اس رقم کی واپسی پر بدر شاہ نے عالیہ کو یہ رسید لکھ دی تھی۔ وکیلِ صفائی اس تحریر کا پھلکا بنا کر اڑا دیتا۔

دوسری تحریر بھی کچی رسید ہی کی شکل میں تھی جس کا مضمون کچھ یوں تھا۔ ''مبلغ پچیس ہزار روپے بہ حساب پانچ فیصد ماہانہ منافع برائے پانچ لاکھ روپے بدر شاہ سے وصول پائے۔''

اس رسید کے نیچے مسز عالیہ کے دستخط موجود تھے لیکن پہلی رسید کی طرح یہاں پر بھی کسی تاریخ کا اندراج نہیں تھا۔ اصولی طور پر یہ رسید تو بدر شاہ کے پاس ہونا چاہیے تھی۔ جب میں نے یہ بات عالیہ بیگم سے پوچھی تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ رسید بدر شاہ نے اپنے لیے لکھوائی تھی پھر پتا نہیں، میرے پاس کیسے آ گئی۔ میں نے اس بات پر زور نہیں دیا کہ وہ اس بارے میں پتا لگانے کی کوشش کرے.....!

یہ رسید کسی حد تک کام کی چیز تھی۔ اس سے یہ ثابت تو ہوتا تھا کہ بدر شاہ کے پاس عالیہ نے پانچ لاکھ کی رقم انویسٹ کی تھی جس پر وہ پانچ فیصد ماہانہ کے حساب سے پچیس ہزار روپے منافع دے رہا تھا لیکن اس رسید میں بھی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ بدر شاہ اس کی صحت سے انکار کر سکتا تھا۔ وہ یہ موقف اختیار کر سکتا تھا کہ مسز عالیہ نے اسے پھنسانے کے لیے خود ہی یہ رسید تیار کر لی ہوگی۔ بہر حال، عدالت کے کمرے میں پہنچنے کے بعد ہی صورتِ حال کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

میں نے چند روز تک نوٹس کے جواب کا انتظار کیا لیکن بدر شاہ کی جانب مکمل خاموشی دیکھتے ہوئے ایک روز میں نے خود اس کے دیدار کا فیصلہ کر لیا۔ اس روز عدالت میں میرا کوئی کیس لگا ہوا نہیں تھا لہٰذا میں نے عدالت جانے کے بجائے سندھی مسلم سوسائٹی کا رخ کیا جس کے کمرشل ایریا کی ایک ذیلی گلی میں بدر شاہ کی فرم ''شاہ ٹریڈرز'' کا آفس واقع تھا۔

اس وقت دن کے گیارہ بجے تھے۔ جب میں گلی کے کونے پر اپنی گاڑی پارک کر رہا تھا تو میں نے ''شاہ ٹریڈرز'' کے اندر سے توصیف کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ توصیف کو وہاں پا کر مجھے حیرت تو ہوئی تھی لیکن جب تک میں گاڑی کو پارک کر کے باہر آتا، توصیف میری نظر سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ خاصی تیز رفتاری سے ''شاہ ٹریڈرز'' سے نکل کر کہیں گیا تھا۔ توصیف کی وہاں آمد اور جامد کو میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ میں اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک کر اندر داخل ہو گیا۔

''شاہ ٹریڈرز'' کا آفس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ انتظار گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا اور دوسرے حصے میں بدر شاہ کا کمرا بنا ہوا تھا اور ان دونوں حصوں کے بیچ میں ایک فیمیل ریسپشنسٹ حائل تھی۔ میں نے ریسپشنسٹ کے پاس جا کر کہا۔

''میں بدر شاہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ بہت ضروری کام ہے۔''

''لو..... ان کو بہت ضروری کام ہے۔'' انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے ایک عمر رسیدہ شخص نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ہم تو جیسے یہاں اپنا وقت برباد کرنے آئے ہیں۔''

جب میں اندر داخل ہوا تھا تو میں نے انتظار گاہ میں تین چار افراد کو محوِ انتظار پایا تھا۔ یہ انہی میں سے ایک بزرگ تھے۔ ریسپشنسٹ نے اس شخص کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''سر! آپ کے پاس اپوائنٹ منٹ ہے؟''

''اگر میں نے اپوائنٹ منٹ لیا ہوتا تو یہ بات آپ سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔'' میں نے ریسپشنسٹ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک وکیل ہوں۔ شاہ جی کو اس وقت میری اشد ضرورت ہے۔''

پھر قبل اس کے کہ استقبالیہ کلرک مجھ سے مزید کوئی سوال کرتی، میں بڑی پھرتی سے بدر شاہ کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ عقب میں مجھے اسی عمر رسیدہ شخص کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

''عجیب بدمعاشی لگی ہوئی ہے۔ ہم دو گھنٹے سے یہاں بیٹھے انتظار میں سوکھ رہے ہیں اور یہ سوٹڈ بوٹڈ صاحب ابھی آئے ہیں اور آتے ہی شاہ جی کے کمرے میں گھس گئے ہیں۔''

استقبالیہ کلرک کا وضاحتی جملہ بھی میری سماعت سے ٹکرایا۔ ''یہ وکیل صاحب ہیں۔ شاہ جی نے انہیں خاص طور پر بلایا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''شاہ جی نے کوئی نیا گر سیکھنے کے لیے وکیل کی خدمات حاصل کی ہوں گی!'' یہ ایک نئی آواز تھی۔ ''وکیلوں سے زیادہ چالاک اور کوئی ہو نہیں سکتا۔''

انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے افراد اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔ میں ان کی طرف سے دھیان ہٹا کر بدر شاہ کے کمرے میں حاضر ہو گیا۔

کنگ سائز میز کی دوسری جانب بیٹھا ہوا شخص خاصا بارعب اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دوستانہ انداز میں کہا۔

''شاہ جی! معاف کیجیے گا۔ میں اپوائنٹ منٹ کے بغیر ہی آپ سے ملنے چلا آیا ہوں۔ بس ایک ضروری کام تھا اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ بندے کو ایم اے بیگ کہتے ہیں۔''

اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا پھر تنقیدی نگاہ سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''تشریف رکھیں بیگ صاحب۔''

وہ چند لمحات تک ٹٹولنے والی نظر سے مجھے دیکھتا رہا جیسے یہ اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ میں کس مقصد سے اس کے پاس آیا ہوں۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ مجھے اس وکیل کی حیثیت سے پہچان نہیں سکا تھا جس نے چند روز قبل اسے ایک سلگتا ہوا نوٹس بھیجا تھا۔ اس کی آنکھوں سے عیاری اور چالاکی مترشح تھی۔ میں اس کی جانب متوجہ ہوا تو اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''جی فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''شاہ جی! خدمت تو میں آپ کی کرنے آیا ہوں۔''

میں نے ذومعنی انداز میں کہا پھر اپنے بریف کیس میں سے نوٹس کی ایک کاپی برآمد کرنے کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ''چند روز قبل میں نے رجسٹرڈ ڈاک سے آپ کو ایک محبت نامہ ارسال کیا تھا لیکن آپ نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی اس لیے آپ کی الفت میں کھنچا چلا آیا ہوں۔ سوچا، اب کی بار یہ لو لیٹر آپ کو دستی ہی پہنچا دیتا ہوں۔'' بات کے اختتام پر میں نے مذکورہ نوٹس کی کاپی بدر شاہ کی جانب بڑھا دی۔

اس نے چوکنا نظر سے مجھے دیکھا پھر میرے ہاتھ سے نوٹس کی کاپی لے کر اسے پڑھنے لگا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑ دی۔ نوٹس کی تحریر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات ابھرے۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعی کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ میرا ارسال کردہ نوٹس اسے موصول ہو چکا تھا۔ اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا اور عجیب سے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''یہ کیا ہے.....؟''

اس کے انداز سے برہمی آمیز بدتمیزی جھلکتی تھی۔ میں نے اس کے رویے کا برا منائے بغیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ میری مؤکلہ مسز عالیہ انور کی جانب سے ایک لیگل نوٹس ہے۔ آپ نے اس کا جواب دینا تو مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے مجھے خود آپ کے پاس حاضر ہونا پڑا۔ برائے مہربانی اس پر دستخط کر دیں۔''

''اگر میں دستخط نہ کروں تو.....؟'' اس نے چیلنج کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''یہ آپ کا حق ہے..... حق نہیں، یہ آپ کا اختیار ہے کہ اس نوٹس پر دستخط کریں یا نہ کریں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''دستخط نہ کرنے کی صورت میں ہماری اگلی ملاقات عدالت میں ہوگی۔''

''آپ مجھے عدالت کا ڈراوا نہ دیں۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں نے بہت عدالتیں دیکھی ہیں.....!''

''آپ جس نوعیت کا دھندا کر رہے ہیں اس میں آئے دن عدالت کا منہ تو دیکھنا ہی پڑتا ہوگا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس دن سے ڈریں جب یہ معاملہ ایک قدم آگے بڑھ جائے گا.....''

میرے معنی خیز جملے کے جواب میں وہ چونک کر مستفسر ہوا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ابھی تو آپ کو عدالتوں کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس سے اگلا مرحلہ جیل کا منہ دیکھنے..... بلکہ جیل کی ہوا کھانے کا ہے.....''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں.....!'' وہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''نہیں..... '' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''میں آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''گویا آپ مجھے باور کرانے آئے ہیں کہ یہ نوٹس عدالتی کارروائی کا آغاز ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ ضروری نہیں کہ عدالتی کارروائی کی نوبت آئے۔ اگر آپ میری مؤکلہ کے ساتھ راضی نامہ کر لیں تو یہ معاملہ عدالت کے باہر بھی نمٹ سکتا ہے۔''

''راضی نامہ.....!'' اس نے چونک کر دلچسپی بھری نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''اس سے آپ کی کیا مراد ہے وکیل صاحب؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میری مراد بالکل صاف اور سیدھی سی ہے جیسا کہ .....شاہ آباد منزل مراد!'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''آپ مسز عالیہ سے تصفیہ کرلیں تو یہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔''

اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ابھرے جیسے وہ میری آفر سے کھیلنے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔ وہ بہت ہی کائیاں اور موقع پرست شخص تھا، بڑی چالاکی سے بولا۔

''اصل میں آپ سمجھ نہیں رہے ہیں اسی لیے تصفیے کی بات کررہے ہیں۔''

''آپ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں شاہ جی؟'' میں نے تیکھے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میرے اور مسز عالیہ کے بیچ فیملی ٹرمز ہیں۔'' وہ بڑی ہوشیاری سے دروغ گوئی کا سہارا لیتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہی لگتا ہے کہ کسی حاسد نے مسز عالیہ کو ورغلا دیا ہے۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں آج ہی مسز عالیہ سے ملنے جاؤں گا۔ پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہمارے درمیان ایسا کوئی جھگڑا نہیں کہ ہمیں تصفیے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے.....''

میں نے اس چال باز شخص کو اسی کی چال میں پھنساتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کے مسز عالیہ سے فیملی ٹرمز ہیں تو پھر اس نوٹس پر دستخط کرنے میں آپ کو کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہونا چاہیے.....!''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر شاطرانہ انداز میں بولا۔ ''ہاں ہاں..... کیوں نہیں۔ ایک دستخط کرنے میں کیا مسئلہ ہے۔'' پھر اس نے فی الفور نوٹس کی کاپی پر دستخط کیے اور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیجیے وکیل صاحب! آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ شام میں، میں مسز عالیہ کی طرف جاؤں گا تو انہیں سب سمجھا دوں گا۔''

میں نے نوٹس کی دستخط شدہ کاپی کو اپنے بریف کیس میں رکھا، بدرشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس کے کمرے سے نکل آیا۔

جب میں انتظار گاہ سے گزرا تو وہاں محو انتظار افراد نے ناپسندیدہ نظروں سے گھور کر مجھے دیکھا۔ عمر رسیدہ شخص نے تو مجھ پر طنز کا تیر بھی چلا دیا۔

''وکیل صاحب! اللہ کے عذاب سے ڈریں۔ یہ شاہ جی کئی لوگوں کے پیسے کھائے بیٹھا ہے اور آپ اسے قانونی چارہ جوئی سے بچنے کی ترکیبیں پڑھانے آئے ہیں!''

ایک دوسرے شخص نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے، یہ وکیل بھی شاہ جی کے ساتھ ملا ہوا ہے.....!''

مجھے انتظار گاہ کی فضا کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی۔ وہاں موجود تمام افراد بدرشاہ کے ڈسے ہوئے تھے۔ بدرشاہ پر دباؤ بڑھانے کے لیے ان لوگوں کو ساتھ ملانا مفید ثابت ہوسکتا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے ان سے کہا۔

''آپ لوگ میرے بارے میں جیسا سوچ رہے ہو، حقیقت اس کے بالعکس ہے۔ میں تو یہاں اپنی ایک مؤکلہ کے کیس کے سلسلے میں آیا تھا جس کے پانچ لاکھ روپے بدر شاہ ہڑپ کیے بیٹھا ہے۔''

ان کے چہروں پر ندامت کے تاثرات ابھر آئے۔ یہ وہ شرمندگی تھی جو انہوں نے مجھے بدرشاہ کا ساتھی یا معاون سمجھ کر اٹھائی تھی۔ میری نظر میں ان کا ردعمل کچھ زیادہ غلط نہیں تھا۔ وہ جس نوعیت کے اذیت ناک حالات سے گزر رہے تھے ان میں انسان کی ذہنی کیفیت اسی قسم کی ہوجاتی ہے۔

بڑے میاں نے پُراشتیاق انداز میں پوچھا۔ ''کیا شاہ جی نے آپ کی مؤکلہ کے پیسے واپس دینے کا وعدہ کیا ہے؟''

''وعدہ کرنے میں اس شیطان کا ایک دھیلا خرچ نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''لہٰذا اس کے وعدوں پر اعتبار کرنے والے بیٹھے ہی رہ جائیں گے۔ میں تو اس بے ایمان شخص کے خلاف قانونی کارروائی کرنے جارہا ہوں۔''

''اگر ہم بھی انصاف کے لیے قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیں تو.....؟'' وہاں موجود ایک شخص نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''قانون کا دروازہ ہر کس و ناکس کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔'' میں نے کہا پھر اپنے وزیٹنگ کارڈز نکال کر ان سب کو دیتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اگر آپ کو میری مدد کی ضرورت محسوس ہو تو آپ دوپہر کے بعد کسی بھی ورکنگ ڈے میں میرے آفس آکر ملاقات کرسکتے ہیں۔''

وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں ''شاہ ٹریڈرز'' کے آفس سے نکل کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد جب میں آفس پہنچا تو میں نے سب سے پہلے مسز عالیہ کو فون کیا۔ جب وہ لائن پر آئیں تو رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اسے اپنی آج کی کارگزاری سے آگاہ کیا پھر تاکیدی انداز میں کہا۔

''بدرشاہ بہت ہی شاطر شخص ہے۔ وہ آج کسی وقت آپ سے ملنے یا رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

محسوس کیا ہے کہ وہ اس معاملے کو عدالت میں نہیں لے جانا چاہتا۔ وہ آپ کو بے وقوف بنا کر تصفیہ کرنے کی کوشش کرے گا لیکن آپ نے بہت ہوشیار رہنا ہے۔ اس کی باتوں میں نہیں آنا۔ وہ جو بھی اسکیم آپ کے سامنے رکھے، آپ نے بس ایک ہی بات پر ڈٹے رہنا ہے کہ پانچ لاکھ روپے لے کر بیگ صاحب کے آفس پہنچو۔ باقی باتیں وہیں پر وکیل صاحب کی موجودگی میں ہوں گی۔''

''میں سمجھ گئی بیگ صاحب۔'' وہ خاصے توانا لہجے میں بولی۔ ''اب میں مزید الو نہیں بنوں گی۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں آپ کے مشورے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گی اور جہاں تک تصفیے کی بات ہے تو وہ اپنی رقم وصول کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔''

''بالکل درست!'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔

بدرشاہ کے آفس کی انتظار گاہ میں بیٹھے، غصے سے بھرے ہوئے تین چار افراد کے بارے میں، میں نے مسز عالیہ کو بریف کر دیا تھا۔ اچانک مجھے توصیف کا خیال آ گیا۔ آج جب میں سندھی مسلم سوسائٹی پہنچا تھا تو میں نے توصیف کو بدرشاہ کے آفس سے نکلتے دیکھا تھا لیکن بعد میں وہ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے عالیہ بیگم سے پوچھ لیا۔

''آپ کے صاحب زادے کا کیا حال ہے؟''

''اسے کیا ہونا ہے۔'' وہ بیزار سے لہجے بولی۔ ''وہ تو اپنے حال میں مست ہے..... انتہائی غیر ذمے دار۔ میں نے سوچا تھا، انور کی وفات کے بعد اس کے اندر احساسِ ذمے داری جاگ جائے گا مگر اس لڑکے نے مجھے سخت مایوس کیا ہے اور آج کل تو وہ مجھ سے ویسے ہی بہت اکھڑا ہوا ہے.....''

''آپ نے اسے کاروبار کے لیے پانچ لاکھ جو نہیں دیے تھے.....'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''شکر کریں، وہ صرف آپ سے اکھڑا ہوا ہے۔ اگر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا تو پھر کوئی بھی سنگین مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔''

''آپ ڈرانے والی باتیں کیوں کر رہے ہیں بیگ صاحب! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولی۔

''میں آپ کو ڈرا نہیں رہا بلکہ آپ کی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آج میں نے ایک ایسا منظر دیکھا ہے جس نے مجھے فکر میں ڈال دیا ہے۔''

''ایسا کیا دیکھ لیا ہے آپ نے؟'' وہ اضطراری انداز میں مستفسر ہوئی۔

جواب دینے کے بجائے میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا توصیف کا بدرشاہ سے میل جول ہے؟''

''نہیں تو.....'' وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' میں نے مسز عالیہ کو اپنے سوال کا سبب بتا دیا۔

''میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ ''آپ نے بدرشاہ سے نہیں پوچھا کہ توصیف اس کے پاس کیوں آیا تھا۔''

''میں نے پوچھا اور نہ اس نے ذکر کیا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے ساتھ نوٹس والے معاملے پر ہی بات چیت میں مصروف رہا تھا۔''

''میں توصیف سے پوچھتی ہوں کہ وہ وہاں کیا لینے گیا تھا۔'' وہ فکرمندی سے بولی۔

''لیکن بڑی احتیاط کے ساتھ۔'' میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔

''میں کوئی بچی تھوڑی ہوں بیگ صاحب۔'' وہ خاصے مضبوط لہجے میں بولی۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں طریقے سلیقے سے بات کروں گی۔ توصیف کو کچھ احساس نہیں ہونے دوں گی کہ میری اس انکوائری کا مقصد کیا ہے۔''

میں نے دل میں کہا۔ ''آپ یقیناً کوئی بچی نہیں ہیں مگر انتہائی بے وقوف ضرور ہیں۔'' پھر میں نے اسے سنانے کے لیے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آپ اس سچویشن کو بڑی خوبصورتی سے ہینڈل کر لیں گی۔''

''آپ مطمئن رہیں بیگ صاحب!'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

میں نے مطمئن ہونے کے بعد فون بند کر دیا۔

اس روز جب میں اپنے دفتر سے اٹھا تو ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنی کار کو بہادر آباد کی جانب موڑ لیا۔ میرے ذہن میں آیا تھا کہ ذرا عندلیب آپا کا بھی دیدار کر لیا جائے۔ مسز عالیہ نے اپنی جو پتا سائی کی تھی، اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ عندلیب آپا اور بدرشاہ کے بیچ کوئی گہرا کنکشن موجود ہے۔ مسز عالیہ کو یقین تھا کہ عندلیب آپا اس کی بھرپور فیور کرے گی لیکن اگر میرا اخذ کردہ نتیجہ درست تھا تو پھر میرے خیال میں اس سلسلے میں مسز عالیہ کو سخت مایوسی کا سامنا کرنا تھا اور... میرا دل کہتا تھا کہ کچھ ایسا ہی ہونے جا رہا ہے!

میں نے بہادر آباد کے علاقے میں پہنچ کر ''لنکرز

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میرج بیورو'' کے سامنے گاڑی روک دی۔ راستے میں، میں نے نیت بنالی تھی کہ میں رشتے کے خواہش مند ایک شخص کے باپ کی حیثیت سے خود کو عندلیب کے سامنے پیش کروں گا اور اسی آڑ میں اسے گھیرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ مسز عالیہ نے پانچ لاکھ کی رقم بدرشاہ کے حوالے کی تھی لیکن اسے یہ راہ دکھانے والی عندلیب ہی تھی لہٰذا ایک وکیل کی حیثیت سے اپنی مؤکلہ کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے مجھے دونوں محاذوں پر محنت کرنا تھی۔ محاذِ اول بدرشاہ، محاذِ دوم عندلیب آپا۔

میں نے اپنی کار کو اسٹریٹ کے کنارے پارک کیا اور سبک قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ اسی لمحے میں نے ''لنکرز میرج بیورو'' کے آفس سے ایک دراز قامت نوجوان کو برآمد ہوتے دیکھا۔ وہ خاصا برہم نظر آتا تھا۔ میرج بیورو کے دروازے کے سامنے پیلے رنگ کی ایک فیاٹ کار کھڑی تھی۔ مذکورہ مشتعل دراز قد نوجوان نے بڑی بے دردی سے فیاٹ کے بونٹ پر دو چار ٹھڈے رسید کیے، پھر ایک لات اس کے دروازے پر ماری۔ اس دوران میں، میں اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔

مجھ پر نگاہ پڑی تو وہ اس غصیلی کارروائی کو روک کر ٹھٹکی ہوئی نگاہ سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''اس بے زبان پر کیوں ظلم کر رہے ہو.....؟''

''یہ بے زبان سہی مگر اس کی مالکن اپنے منہ میں گز بھر کی زبان رکھتی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''یہ تو آپ ٹریلر دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس کمینی نے میرا کام نہیں کیا تو میں اس کا وہ حشر کروں گا کہ دنیا دیکھے گی.....''

بس، اس کے منہ سے کف نہیں اڑ رہا تھا ورنہ اس کے غیظ و غضب کی انتہا میں کوئی کلام نہیں تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا میں اس کمینی کا نام جان سکتا ہوں جس نے تمہارا کوئی کام نہ کر کے اس قدر طیش دلا دیا ہے؟''

اس نے ٹٹولتی ہوئی نگاہ سے میرا جائزہ لیا پھر پوچھا۔

''آپ کون.....؟''

''میں خدائی فوج دار ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''تم اس بحث میں نہ پڑو کہ یہ کیا ہوتا ہے اور وہ کیا ہوتا ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے

دوست سردار سے۔ ''کیا بیوی سے لڑائی ختم ہوئی؟''

سردار۔ ''ہاں جی! گھٹنے ٹیک کر میرے پاس آئی تھی۔''

دوست۔ ''یہ ہوئی نا مردوں والی بات! بیوی نے گھٹنے ٹیک کر کیا کہا تھا؟''

سردار۔ ''یہی کہ بیڈ کے نیچے سے نکل آؤ کچھ نہیں کہوں گی۔''

مرسلہ۔ محمد قدرت اللہ نیازی،
حکیم ٹاؤن، خانیوال

شادی شدہ

شدید برفانی طوفان چل رہا تھا۔ بیکری والے نے سوچا، ایسے میں کون گاہک آئے گا۔ چنانچہ اس نے شٹر گرانے شروع کر دیے۔ اچانک ایک آدمی ہانپتا کانپتا اور بھیگتا ہوا دکان میں داخل ہوا۔

''ذرا ٹھہریے۔ مجھے ڈبل روٹی دے دیں۔''

دکاندار کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ بیچارہ سر سے پاؤں تک کپکپا رہا تھا۔ ڈبل روٹی تھماتے ہوئے بیکری کے مالک نے پوچھا۔ ''آپ شادی شدہ ہیں؟''

گاہک غصے سے۔ ''ہاں کیا خیال ہے؟ ایسے خراب موسم میں میری ماں مجھے ڈبل روٹی خریدنے کے لیے گھر سے باہر بھیج سکتی تھی۔''

مقبرے کے پہلو میں

میاں بیوی میں بول چال عرصے سے بند تھی۔ خاوند سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے بچنے کی امید نہ رہی تو بیوی نے سوچا، اس وقت مجھے ہی بات چیت میں پہل کر لینی چاہیے چنانچہ وہ قریب المرگ خاوند کے سرہانے پہنچی اور کہنے لگی۔ ''آپ کہاں دفن ہونا پسند کریں گے؟''

خاوند جل کر بولا۔ ''تمہارے مقبرے کے پہلو میں۔''

(مرسلہ، ریاض بٹ، حسن ابدال)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے اس کمینی کا نام بتاؤ جس کی کار پر تم اپنا غصہ اتار رہے تھے۔ ہوسکتا ہے، میں تمہارے زخموں پر مرہم لگانے میں کامیاب ہوجاؤں!''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر لنکرز میرج بیورو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''وہ ادھر بیٹھی ہے..... لوگ اسے عندلیب آپا کہتے ہیں لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ وہ ایک پکی فراڈن ہے۔''

میرے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ اسی عندلیب آپا کا ذکر کررہا تھا جس نے عالیہ کو بدرشاہ کے چنگل میں پھنسایا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوستانہ انداز میں پوچھا۔

''نوجوان! تمہارا نام کیا ہے؟''

''کامران!'' اس نے بتایا۔

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہاری گاڑی کہاں کھڑی ہے؟''

''اگر میرے پاس گاڑی ہوتی تو پھر یہ خبیث عورت مجھے اتنا خوار نہ کرتی۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''یہ دنیا دولت والوں کی ہے، غریبوں کا کسی کو خیال نہیں ہے..... اللہ بھی صرف پیسے والوں کا ہے.....!''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''کامران! مایوسی گناہ ہے اور پھر تمہارے جیسے نوجوان پر تو مایوسی بالکل نہیں جچتی، دولت اتنی اہم ہوتی تو صاحب ثروت لوگوں کی زندگی میں کوئی مسئلہ نظر نہ آتا۔ وہ نہ تو کبھی بیمار پڑتے اور نہ ہی انہیں موت آتی۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ وہ لوگ کیسے کیسے ذہنی عذابوں سے گزرتے ہیں۔''

''ایسی نوجوانی کا کیا فائدہ کہ انسان کی کوئی ویلیو ہی نہیں ہو۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ''میرے پاس جو بیس تیس ہزار روپے تھے وہ عندلیب کو کھلا چکا ہوں مگر اس کا پیٹ ہے کہ بھرنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ جب بھی میں اس کے پاس آتا ہوں، پیسوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ جب میں اپنے کام کے بارے میں پوچھتا ہوں تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگتی ہے۔''

''تم نے ایسا کون سا کام عندلیب کو دے رکھا ہے جس پر تمہارے پیسے تو خرچ ہو رہے ہیں مگر کوئی نتیجہ سامنے نہیں آرہا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''میں ایک لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''عندلیب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس لڑکی سے میرا رشتہ کرادے گی لیکن چھ ماہ گزر گئے۔ ابھی تک یہ بدذات مجھے مختلف حیلوں بہانوں سے ٹرخا رہی ہے۔ مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ مجھے الو بنا رہی ہے۔''

''آؤ کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری کہانی خاصی دلچسپ ہے۔ میں اس معاملے کی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

''مگر آپ ہیں کون؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''اور میرے معاملے سے آپ کو کیا دلچسپی ہے؟''

''یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے برخوردار!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ عورت اور بھی کئی لوگوں کو الو بنا رہی ہے۔ میں ایک وکیل ہوں اور اپنے ایک کلائنٹ کو اس عورت کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اسی سلسلے میں، میں ادھر آیا تھا تو اتفاق سے تم سے ملاقات ہوگئی۔ اگر تم مجھے اپنی کہانی سناؤ تو ہوسکتا ہے، میں تمہارے کسی کام آجاؤں.....!''

اس نے شک زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میں نے سنا ہے، وکیل لوگ مفت میں کسی کو اپنا بخار بھی نہیں دیتے، میں آپ کی فیس ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ فری میں آپ میری مدد کریں گے؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ میں مفت میں کسی کا کوئی کام نہیں کرتا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں فیس کے نام پر تم سے ایک روپیہ بھی وصول نہیں کروں گا۔''

''بات سمجھ میں نہیں آئی وکیل صاحب.....!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''میں سمجھا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے فیس نہیں دینا مگر میں تم سے جیسا کہتا جاؤں، تم ویسا کرتے جانا۔ تم میری ہدایت کے مطابق تھوڑی بھاگ دوڑ تو کرسکتے ہو نا..... مطلب فیلڈ ورک.....؟''

''جی..... وہ میں کرلوں گا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے عندلیب آپا کے درشن کا ارادہ فی الحال ملتوی کیا اور کامران کے ساتھ ایک چائے خانے میں آبیٹھا۔ اس میٹنگ کے نتیجے میں مجھے عندلیب آپا اور اس کے میرج بیورو ''لنکرز'' کے حوالے سے کافی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے کامران کے ذمے چند اہم کام

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لگائے اور اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ تھما کر چائے خانے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

آئندہ روز وہ چاروں افراد میرے دفتر آئے جنہیں میں ''شاہ ٹریڈرز'' کے وزیٹنگ روم میں اپنے وزیٹنگ کارڈز دے کر آیا تھا۔ ان سب کے مسائل بھی عالیہ بیگم جیسے ہی تھے تاہم ان میں سے کسی نے اتنا بھاری اماؤنٹ بدرشاہ کے پاس نہیں پھنسایا تھا جتنا کہ مسز عالیہ نے دے رکھا تھا۔ عالیہ کی طرح مذکورہ افراد کے پاس بھی انویسٹ کی گئی رقم کی کچی رسیدیں ہی تھیں۔ کسی نے ایک لاکھ، کسی نے ڈیڑھ یا دو لاکھ بھاری منافع کے لالچ میں ''شاہ ٹریڈرز'' میں لگا رکھے تھے۔ ان رسیدوں کے برتے پر بدرشاہ کے خلاف بھرپور قانونی کارروائی تو نہیں کی جاسکتی تھی مگر یہ ضرور تھا کہ اگر وہ چاروں بھی اپنے معاملات میرے ہاتھ میں دے دیتے تو اس سے بدرشاہ پر نفسیاتی دباؤ بڑھایا جاسکتا تھا۔

جب میں نے انہیں بتایا کہ میں ان کے حقوق کے لیے قانونی چارہ جوئی کے لیے تیار ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ ایک نے پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ کی فیس کتنی ہے؟''

''میری فیس جتنی بھی ہے، وہ میں ہمیشہ ایڈوانس وصول کرتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آپ لوگوں کے لیے میں دو قسم کی خاص رعایتیں کرسکتا ہوں۔''

''ہم سمجھے نہیں.....'' وہ بہ یک زبان ہوکر بولے۔

''آپ کن رعایتوں کی بات کررہے ہیں؟''

''نمبر ایک.....'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے انہیں بتایا۔ ''میری جو فیس ہے، وہ آپ چاروں پر مساوی تقسیم ہوجائے گی یعنی آپ میں سے ہر کوئی میری فیس کا ایک چوتھائی ادا کرے گا۔ میں ایک فیس میں آپ چاروں کی وکالت کروں گا.....'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نمبر دو..... اور یہ فیس میں آپ لوگوں سے اس وقت وصول کروں گا جب عدالت آپ کے حق میں فیصلہ دے دے گی۔''

وہ چاروں خوش ہوگئے۔ میں نے چند ضروری کاغذات پر ان کے دستخط کرائے اور اس کیس کے حوالے سے چند اہم پوائنٹس انہیں ذہن نشین کرادیے۔ وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

ان چاروں افراد کے لیے یہ رعایتی پیکیج میں نے خاص طور پر رکھا تھا۔ وہ بدرشاہ کے ہاتھوں اتنے زیادہ دکھ اٹھا چکے تھے کہ ان کی دادرسی ایک عظیم نیکی تھی۔ ان کی حالت اور حالات بتاتے تھے کہ وہ فرداً فرداً میری بھاری فیس ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے لہٰذا میں نے ان کے لیے اس معاملے میں حتی الامکان آسانی پیدا کردی تھی۔ آسانیاں پیدا کرنے اور آسانیاں بانٹنے سے مالک خوش ہوتا ہے اور وہ اپنے بندے کے لیے بھی زندگی کو آسان اور راحت بخش بنادیتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ مقدمہ جیتنے کی صورت میں وہ چاروں مل کر لازمی میری فیس ادا کردیتے۔

اسی روز مسز عالیہ میرے پاس آئی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے پوچھا۔ ''کیا بدرشاہ آپ کے پاس آیا تھا یا آپ سے اس نے کوئی رابطہ کیا؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کی جانب سے مکمل خاموشی ہے اور میں نے از خود رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''توصیف کا سنا ئیں..... کیا آپ کی اس سے کوئی بات ہوئی؟''

''میں نے ڈھکے چھپے انداز میں اس سے پوچھا تھا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''مگر اس نے صاف انکار کردیا ہے۔ میں نے اس لیے زیادہ کریدنہیں کی کہ کہیں اسے شک نہ ہوجائے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''یعنی وہ اس بات پر ڈٹا ہوا ہے کہ وہ بدرشاہ سے رابطے میں نہیں ہے.....؟''

''جی.....!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''لیکن میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے توصیف کو ''شاہ ٹریڈرز'' سے نکل کر تیزی سے ایک طرف جاتے دیکھا تھا۔ خیر.....'' میں نے تھوڑا توقف کیا پھر مسز عالیہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مستحکم انداز میں کہا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کل یہ کیس حوالۂ عدالت کررہا ہوں۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ادھر عدالت کے کمرے ہی میں ہوگا۔ آپ کو میں نے بدرشاہ کے حوالے سے جو ہدایات دے رکھی ہیں، آپ نے انہیں ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرنا۔''

''آپ بے فکر ہوجائیں بیگ صاحب۔'' وہ بڑے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اعتماد سے بولی۔ ''میں ایک بار اس شیطان سے دھوکا کھا چکی ہوں۔ اب میں اس کی کسی بات میں نہیں آؤں گی۔ اس سے جو بھی بات ہوگی، وہ آپ کی موجودگی میں ہوگی یا عدالت کے کمرے میں ہوگی۔''

میں مطمئن ہوگیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوگئی۔

اگلے روز میں نے بدر شاہ کے خلاف فراڈ کا ایک مضبوط کیس تیار کر کے مقدمہ عدالت میں دائر کردیا۔ یہ مقدمہ بنیادی طور پر مسز عالیہ انور کی مدعیت میں تھا۔ باقی چار افراد بھی مسز عالیہ کے پیچھے ایک ہی قطار میں کھڑے تھے۔ استغاثہ میں نے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ میں نے بدر شاہ کو گھیرنے کے لیے ایسا جال بُنا تھا جس سے وہ نکل نہیں سکتا تھا۔

اسی دن میں نے مزید چار نوٹس بھی بہ ذریعہ رجسٹرڈ ڈاک بدر شاہ کی کمپنی کے ایڈریس پر پوسٹ کرادیے تھے۔ یہ لیگل نوٹس ان چار افراد کے حوالے سے تھے، جو مسز عالیہ کی طرح بدر شاہ کے ڈسے ہوئے تھے۔ میں نے حتیٰ الامکان بدر شاہ پر دباؤ ڈال دیا تھا۔ باقی کے معاملات مجھے عدالت میں دیکھنا تھے۔

دو روز بعد کامران میرے دفتر میں آیا۔ وہ خاصا خوش اور پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ میرے استفسار پر اس نے مجھے بتایا کہ میں نے اس کے ذمے جو کام لگایا تھا، وہ اس نے بہ خوبی سرانجام دے ڈالا تھا۔ کامران سے حاصل ہونے والی معلومات میں سردست آپ سے شیئر نہیں کروں گا۔ اس کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ آپ اسے کہانی کا تقاضا سمجھ لیں.....!

مقدمہ دائر کیے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ایک شام توصیف میرے آفس آیا۔ اسے اکیلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تاہم میں نے اسے بٹھایا اور رسمی علیک سلیک کے بعد کہا۔

''توصیف میاں! کیا حال چال ہیں۔ آج کل تمہاری مصروفیات کیا ہیں؟''

''میں آپ سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔'' وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ''امید ہے آپ میرے کہے کو توجہ سے سنیں گے۔''

''آپ لوگ میرے کلائنٹ ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور میں اپنے ہر کلائنٹ کی بات کو پوری توجہ ہی سے سنتا ہوں۔''

''میں اسی سلسلے میں آپ کو اپ ڈیٹ کرنے آیا ہوں۔'' وہ روکھے لہجے میں بولا۔ ''آپ اس کلائنٹ و لائنٹ کے معاملے کو یہیں پر ختم کردیں۔ ہم کیس نہیں کرنا چاہتے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے اور تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''دراصل بدر شاہ مقدمے بازی سے ڈر گیا ہے۔'' وہ بے تاثر انداز میں بولا۔ ''آپ کی پھرتیوں نے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ بہت شرمندگی کا اظہار کررہا تھا۔ درحقیقت اسے کاروبار میں بہت نقصان ہوگیا ہے جس کی وجہ سے وہ اچانک مالی دباؤ میں آگیا ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم مقدمہ واپس لے لیں تو وہ ایک ماہ کے اندر ہماری رقم لوٹا دے گا۔''

''بدر شاہ نے یہ دعویٰ کیا تمہاری والدہ کی موجودگی میں کیا ہے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ابھی اس کی مجھ سے بات ہوئی ہے۔ اگر آپ کسی قسم کی قانونی کارروائی سے باز آجائیں تو ہمارا مسئلہ گھر بیٹھے حل ہوسکتا ہے۔''

توصیف کا رویہ شروع ہی سے مجھے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی ہمدردی اپنی ماں کے بجائے بدر شاہ کے ساتھ تھی۔ اب یہ بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ بدر شاہ کے رابطے میں تھا اور ان دونوں کے بیچ کوئی زہریلی کھچڑی پک رہی تھی۔ اس روز بھی توصیف اسی سلسلے میں ''شاہ ٹریڈرز'' کے آفس آیا تھا لیکن بدر شاہ نے ایک بار بھی اس کی آمد کا ذکر نہیں کیا تھا۔ گویا ان دونوں کے بیچ کوئی پکی سیٹنگ چل رہی تھی جو یقیناً مسز عالیہ کے حق میں نہیں تھی۔ اس خیال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا۔ میں نے توصیف کی طرف دیکھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ بدر شاہ تمہیں بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا ہے۔ تم اس کی باتوں میں نہ آؤ تو اچھا ہے۔''

''ہم اپنے فائدے نقصان کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔'' وہ بے مروتی سے بولا۔ ''آپ کو ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''برخوردار! میں فکر نہیں غور کرتا ہوں۔'' میں نے اس کے کانوں کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اور میرے غور کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہاری ماں نے میرے ذمے جو کام لگایا ہے، اسے میں ہر حال میں پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔''

روزِ اول ہی سے توصیف کا اپنی ماں کے ساتھ عدم تعاون والا رویہ تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسز عالیہ کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خلاف اور بدرشاہ کا وفادار تھا جس کا ایک ہی مطلب نکالا جاسکتا تھا کہ بدرشاہ نے اس نادان کو قابو میں کرنے کے لیے کسی گیدڑ سنگھی کا استعمال کیا تھا۔

"آپ خوامخواہ کی ضد کر رہے ہیں۔" وہ برا سامنہ بناتے ہوئے بولا۔ "امی نے آپ کو فیس کی مد میں جو پیسے دیے ہیں، وہ آپ رکھ لیں اور اس معاملے کو ختم سمجھیں۔"

"بات فیس والے پیسوں کی نہیں بلکہ اصول کی ہے۔" میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں نے تمہاری امی کے ایما پر یہ کیس لیا تھا۔ اگر مسز عالیہ خود آکر مجھ سے کیس واپس لینے کے لیے کہہ دیں گی تو میں اس کیس سے دستبردار ہوجاؤں گا۔"

وہ چند لمحات تک ناپسندیدہ نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے چیمبر سے نکل گیا۔

میں نے فوراً مسز عالیہ کو فون کیا اور اسے توصیف سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کرنے کے بعد واشگاف الفاظ میں کہا۔

"میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ آپ کا بیٹا بدرشاہ کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے، لہٰذا اس کی طرف سے آپ کو بے حد محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ کم ازکم اس وقت تک جب تک اس کیس کا فیصلہ نہیں ہوجاتا، آپ کوئی بھی اہم بات توصیف سے ڈسکس نہیں کریں گی۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟"

"جی بیگ صاحب! میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "کمال ہے، جس قسم کی باتیں توصیف نے آپ سے کی ہیں ان سے تو یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ سراسر بدرشاہ کی حمایت کر رہا ہے۔ حیرت اس بات کی ہے کہ اس کم بخت نے مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔"

"ذکر نہیں کیا تو اس پوائنٹ سے آپ بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "آپ بھی یہی ظاہر کریں کہ نہ تو آپ کو توصیف کے عزائم کی خبر ہے اور نہ ہی میں نے اس بارے میں آپ کو کچھ بتایا ہے۔"

"سمجھ گئی۔" وہ بڑی فرمانبرداری سے بولی پھر قدرے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ "آپ نے کیس کی تیاری تو اچھی طرح کرلی ہے نا......؟"

"آپ اس سلسلے میں بالکل مطمئن رہیں۔" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "اس کیس کے ایک ایک زاویے پر میری گہری نظر ہے۔ عدالت میں ہر نوعیت کی صورتِ حال کو میں بہ طریقِ احسن ٹیکل کرلوں گا۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ بیگ صاحب۔" وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔

"آپ اپنا خیال رکھیں۔" میں نے کہا۔ "اب ہماری ملاقات عدالت کے کمرے میں ہی ہوگی۔"

میں نے مسز عالیہ سے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کیا ہی تھا کہ کامران مجھ سے ملنے کے لیے آن پہنچا۔ وہ بہت پُراعتماد اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مجھے مزید مفید معلومات فراہم کیں اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد واپس چلا گیا۔

کامران کے بارے میں، میں آپ کو چند باتیں بتادوں تاکہ آپ کا ذہن اس سے آشنائی حاصل کرلے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، کامران پہلی بار مجھے "لنکرز میرج بیورو" کے سامنے ملا تھا۔ وہ غصیلے انداز میں عندلیب کی فیاٹ کار کو ٹھوکریں مار رہا تھا کہ میں نے اس سے یاداللہ کرلی تھی۔ پیشے کے اعتبار سے وہ باربر یعنی ہیئر ڈریسر تھا۔ گلشن اقبال کے علاقے تیرہ ڈی میں اس کا ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ وہ شادی کرنا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ لنکرز میرج بیورو تک پہنچا تھا۔ عندلیب نے رجسٹریشن کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"آپ کو کس قسم کی لڑکی چاہیے؟"

"میڈم! کیا آپ میری چوائس پوچھ رہی ہیں؟" وہ پُرمسرت لہجے میں بولا۔

"یہی سمجھ لیں۔" عندلیب نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"میری چوائس کافی اونچی ہے......"

"آپ بتائیں تو سہی۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میں کوشش کروں گی کہ آپ کی خواہش کو پورا کرسکوں۔"

وہ قدرے شرماتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو کل بتاؤں گا۔"

عندلیب نے کہا۔ "ٹھیک ہے، جیسی آپ کی مرضی۔"

اگلے روز کامران ایک فوٹو کے ساتھ لنکرز میرج بیورو پہنچ گیا اور مذکورہ فوٹو عندلیب کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

عندلیب نے فوٹو دیکھا تو چونک اٹھی پھر اضطراری انداز میں کہا۔ "کامران صاحب! آپ کی چوائس تو واقعی بہت اونچی ہے۔ یہ تو کراچی کی ایک معروف ماڈل انیتا ہے۔"

"جی...... میری چوائس تو یہی ہے۔" وہ باچھیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''اب بتائیں، آپ میری خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیا کوشش کرسکتی ہیں؟''

شوبزنس سے تعلق رکھنے والی خواتین سے شادی کرنے کی خواہش رکھنے والے مردوں کی ایک مخصوص سوچ ہوتی ہے۔ ایسے افراد چمک دمک اور رنگ و نور کی دنیا کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ چیزوں کے مصنوعی پن پر ان کا دھیان نہیں جاتا اور وہ اسی شے پر یقین کرلیتے ہیں جو اور جیسی انہیں دکھ رہی ہوتی ہے۔ ان میں سے اکثر افراد تو ایسی خواہش دل میں لیے ہی اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں اور اگر ایک آدھ فیصد اس کوشش میں کامیاب بھی ہوجاتے ہیں تو جلد ہی ان کا بریک اپ بھی ہوجاتا ہے یعنی..... اے محبت! ترے انجام پہ رونا آیا..... کیونکہ..... ہر چمکیلی چیز میری جاں! کب ہوتی ہے سونا.....!

عندلیب نے ایک مشاق شکاری کی نظر سے اپنے سامنے بیٹھے انیتا کے عاشق زار کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ میں ایک بنا بنایا الّو کا پٹھا اس کے روبرو تھا۔ وہ یکدم سنجیدہ ہوگئی۔ کامران نے تڑپ کر پوچھا۔

''میڈم! آپ چپ کیوں ہوگئی ہیں۔ کیا میری خواہش کو پورا کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہے؟''

''میری ڈکشنری میں ''ناممکن'' کا لفظ نہیں ہے۔'' وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن.....!''

اس نے کامران کے جذبات سے کھیلتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تو وہ بے چین ہوکر مستفسر ہوا۔

''لیکن کیا میڈم.....؟''

''آپ جانتے ہیں کہ انیتا اس ملک کی ایک ٹاپ ماڈل ہے۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ ''اسے اپنی راہ پر لانے کے لیے معمول سے زیادہ محنت کرنا ہوگی اور اس کام میں تھوڑا وقت لگ جائے گا۔''

''مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔'' وہ جذبات سے لبریز آواز میں بولا۔ ''آپ کو جتنا وقت چاہیے، لے لیں لیکن کسی طرح میری انیتا سے شادی کرادیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''

''سمجھ لیں، بہت جلد آپ کا یہ کام ہوجائے گا۔'' عندلیب نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''میں انیتا کو راضی کرنے کے لیے کوئی سیاست لڑاتی ہوں۔ آپ اطمینان سے گھر جائیں اور مجھ سے رابطے میں رہیں۔ اس دوران میں، میں آپ سے جو بھی کہوں، اس پر آنکھیں بند کرکے عمل کرتے جایئے گا۔''

کسی اندھے عقیدت مند کی کامران نے عندلیب کے احکامات کی تعمیل کا وعدہ کیا اور شاداں و فرحاں گھر لوٹ گیا۔

اس کے بعد آئے دن عندلیب کی فرمائشوں کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ مختلف مدوں میں کبھی دو ہزار، کبھی تین ہزار اس سے نکلواتی گئی۔ کامران نے مجھے بتایا کہ پچھلے چھ ماہ میں وہ اس سے کم و بیش تیس ہزار روپے بٹور چکی تھی اور ابھی تک انیتا تک رسائی کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کامران کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں اس نے اپنی جھنجلاہٹ کے طور پر پہلی فیاٹ کو زدوکوب بھی کیا تھا۔ کم و بیش پچھلے چھ ماہ سے عندلیب آپا نے کامران کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگایا ہوا تھا لیکن اب وہ اس کے ٹرانس سے نکل آیا تھا لیکن اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی تھی کہ وہ..... سپر ماڈل انیتا کے ٹرانس سے بھی کبھی باہر نکل سکے گا۔

دو روز بعد بدرشاہ میرے آفس آدھمکا۔ وہ خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے بڑے اخلاق سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ اگلے ہی لمحے اس کی برہمی کا سبب سامنے آگیا۔

''یہ کیا حرکت ہے وکیل صاحب.....؟'' وہ چند لفافے میرے سامنے پھینکتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے روزگار کا بہت عمدہ طریقہ دریافت کرلیا ہے.....!''

مجھے یہ پہچاننے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ یہ وہی چار لیگل نوٹس تھے جو میں نے چند روز پہلے رجسٹرڈ ڈاک سے اس کے آفس کے پتے پر پوسٹ کیے تھے۔

میں نے اس کے رویے کا برا منائے بغیر معتدل انداز میں کہا۔ ''یہ میرا پیشہ ہے، میرا روزگار ہے۔ ہر انسان اپنے پیشے سے روزی روٹی کماتا ہے، یہ الگ بات کہ کسی کا روزگار جائز اور کسی کا ناجائز ہوتا ہے۔''

''میں یہاں پر ''نورِ بصیرت'' کا پروگرام دیکھنے نہیں آیا ہوں۔'' وہ ترش لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے اخلاقیات سکھانے کی کوشش نہ کریں۔''

''میں نے تو آپ کے سوال کا جواب دیا ہے شاہ جی۔'' میں نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''آپ خوامخواہ.....''

''آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں ان نوٹس کی وجہ سے ڈر گیا ہوں۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میرے ڈسٹ بن میں ایسے بہت سے کاغذات پرزوں کی صورت پڑے رہتے ہیں۔''

''او کے..... میں نے نوٹ کرلیا کہ آپ انتہائی نڈر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انسان ہیں۔'' میں نے بہ دستور اعتدال کے دامن کو تھامے رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی چال کو برے طریقے سے ناکام بنا دیا تھا۔ اس نے میرے چیمبر میں قدم رکھتے ہی جو طرزِ گفتگو اختیار کیا تھا، اس کے ردِعمل میں مجھے مشتعل ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی تھی۔

میری مستقل مزاجی اور اعتماد کو دیکھتے ہوئے اس نے پینترا بدلا اور قدرے معتدل انداز میں بولا۔ ''وکیل صاحب! میں بہت صاف گو اور کھرا انسان ہوں.....''

اب کی بار میں نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا۔ ''او کے شاہ جی! میں نے اپنے ریکارڈ کو اپ ڈیٹ کر لیا ہے .....آپ ایک نڈر، صاف گو اور کھرے انسان ہیں۔''

اگرچہ میرا لہجہ دھیما اور انداز انتہائی سلجھا ہوا تھا لیکن میرے الفاظ اس کے ذہن کا فیوز اڑانے کے لیے کافی تھے۔ وہ چند لمحات تک مجھے تولتی ہوئی نظر سے گھورتا رہا پھر مزید نرم پڑتے ہوئے شائستہ لہجے میں بولا۔

''آپ سمجھے نہیں..... آپ چاہے، روزانہ مجھے ایک نوٹس بھیج دیا کریں اور آپ کا جتنا من چاہے، مجھ پر اتنے ہی مقدمے دائر کر ڈالیں تاکہ آپ کی فیسیں حلال ہوتی جائیں لیکن میری آپ سے دوستانہ اپیل ہے کہ آپ ان مقدمات پر زیادہ مغز ماری نہ کریں۔ امید ہے، آپ میرا مقصد سمجھ گئے ہوں گے.....؟''

بات کے اختتام پر اس نے معنی خیز انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''وکیل آپ ہیں یا میں؟''

''ظاہر ہے، وکیل تو آپ ہی ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا آپ کو میری وکالت یا میری پیشہ ورانہ قابلیت پر کوئی شک ہے؟''

''نن..... نہیں.....'' وہ گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ کے کام کی کوالٹی ہی تو مجھے کھینچ کر یہاں لائی ہے۔''

''جب آپ میرے کام سے مطمئن ہیں تو پھر مجھے کچھ سکھانے یا پڑھانے کی کوشش نہ کریں۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اول..... میں ہمیشہ اپنی فیس حلال کرتا ہوں لہٰذا میری مخالف پارٹی کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دوم .....مقدمات پر مغز ماری کیے بغیر بات بنتی نہیں شاہ جی۔ اپنے مؤکل کو کیس جتوانے کے لیے مجھے یہ سب کرنا پڑتا ہے اس لیے دماغ سوزی اور مغز ماری کو آپ میری مجبوری سمجھ لیں۔ سوم..... میں آپ کی بات کا مطلب بہ خوبی سمجھ گیا ہوں۔ چہارم.....'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھ سے دوستانہ اپیل کی ہے۔ آپ کی اس خواہش میں ایک بہت بڑا ٹیکنیکل فالٹ ہے۔''

''کون سا ٹیکنیکل فالٹ.....؟'' اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔

''کسی بھی قسم کی اپیل کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے دفتر میں اس نوعیت کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی اور..... آخری بات یہ کہ ہمارے بیچ کبھی دوستی کا رشتہ نہیں رہا۔ پھر ''دوستانہ اپیل'' ..... چہ معنی دارد.....؟''

وہ اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے شاطرانہ انداز میں بولا۔ ''آپ بھی کمال کرتے ہیں وکیل صاحب'' ..... اس نے اپنی جیب میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ برآمد کیا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اب تک ہمارے درمیان دوستی کا ناتا نہیں تو کیا ہوا؟ آج ہی یہ تعلق قائم کر لیتے ہیں.....'' اس نے پھولے ہوئے مذکورہ لفافے کو میری طرف کھسکاتے ہوئے چارا ڈالنے والے انداز میں اضافہ کیا۔ ''اس لفافے کے اندر اتنی رقم موجود ہے جتنی آپ نے اپنے ان پانچ کلائنٹس سے مجموعی طور پر وصول کی ہوگی۔ یہ آپ میری طرف سے دوستی کا تحفہ سمجھ کر رکھ لیں.....'' اس نے تھوڑا توقف کیا پھر ایک آنکھ دبا کر بولا۔

''اپنے کلائنٹس سے آپ نے جو فیس وصول کی ہے وہ انہیں واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی تسلی کے لیے بس دو چار ماہ تک ڈھیلے ڈھالے انداز میں مقدمے کو چلاتے رہیں۔ وہ خود ہی تھک ہار کر مایوس ہو جائیں گے اور اگر وہ بہت ہی ڈھیٹ ثابت ہوں تو کچھ عرصے کے بعد آپ یہ کیس ہار جائیے گا۔ آپ جیسے تجربہ کار وکیل کے لیے یہ کون سا مشکل کام ہے.....!''

''آپ نے بجا فرمایا شاہ جی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ تو واقعی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن میں بہت تن آسان قسم کا وکیل ہوں۔ میری پہلی ترجیح یہ ہوگی کہ اگر اس سے بھی ایزی کوئی کام میرے سامنے ہو تو میں پہلی فرصت میں اس کام کو نمٹا ڈالوں۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' اس نے تعجب خیز نظر سے مجھے دیکھا۔ ''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میں انتہائی آسان کام کا ذکر کر رہا تھا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اور ایسا ایک کام اس وقت میرے ذہن میں ہے.....!''

''کون سا کام؟'' وہ چونکے ہوئے انداز میں مستفسر ہوا۔

''یہ کام کہ.....'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''.....کہ اگر آپ ایک منٹ کے اندر یہاں سے دفع نہ ہوئے تو میں آپ کو رقم والے اس لفافے سمیت اٹھا کر اپنے آفس کی کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا یہ آفس بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ہے.....!''

وہ کسی اسپرنگ کے مانند اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر دھمکی آمیز انداز میں یہ کہتے ہوئے پاؤں پٹخ کر میرے آفس سے نکل گیا۔

''وکیل کے بچے! میں تمہیں عدالت میں دیکھ لوں گا۔''

''میرا باپ وکیل نہیں تھا۔'' میں نے اس کے عقب میں تمسخرانہ انداز میں یہ جملہ پھینکا۔ ''اور نہ ہی ابھی میری شادی ہوئی ہے جو آپ اس وقت میرے بچے سے مخاطب ہوں لہٰذا آپ کی ''دیکھنے کی حسرت'' کبھی پوری نہیں ہو سکے گی۔''

بدر شاہ کی میرے آفس میں آمد اور ایک تگڑی رقم سے مجھے خریدنے کی کوشش اس حقیقت کی جانب اشارہ کرتی تھی کہ اس کا بازو گنا بیلنے والی مشین میں آ چکا تھا.....!

☆☆☆

کیس کو عدالت میں لگے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ وکیل صفائی نے تاخیری حربے استعمال کر کے ابھی تک کیس کی باقاعدہ سماعت کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر رکھی تھی ۔ بالآخر میری کوششوں سے چوتھے ماہ اس کیس کی باقاعدہ سماعت کا آغاز ہو گیا۔

جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم بدر شاہ نے صحتِ جرم سے نیم انکار کر دیا۔ نیم انکار سے میری مراد یہ ہے کہ اس نے صرف عالیہ بیگم سے رقم لینے کا اقرار کیا تھا، باقی چار مدعیان کو اس نے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ جب مدعیان اور گواہان کے بیان ہو چکے تو میں جج کی اجازت سے اکیوزڈ باکس (ملزم والے کٹہرے) کے قریب چلا گیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

''بدر شاہ صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اپنی آسانی کے لیے آپ کو ''شاہ جی'' کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟''

آخری ملاقات میں، میں نے اپنے آفس میں اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ اسے بھولا نہیں تھا۔ میرے لیے ناپسندیدگی اور برہمی اس کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ بڑے روکھے پھیکے لہجے میں اس نے جواب دیا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''شاہ جی! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جرح کے ریگ مال کو اس پر آزماتے ہوئے کہا۔

''کس بات کا شکریہ؟'' اس نے خفگی آمیز انداز میں پوچھا۔

''میری مؤکلہ مسز عالیہ انور کو پہچاننے کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ اس کی شناخت سے بھی انکار کر دیتے تو میں بے چارہ تو ہاتھ ملتا رہ جاتا.....!''

''جو سچائی ہے، میں نے وہی بیان کی ہے۔'' وہ میرے طنز کے تیر کو اپنے سینے پر کھاتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا۔ ''اب آپ کی مرضی ہے کہ ہاتھ ملتے رہ جائیں یا انگلیاں چبھاتے.....!''

''چلیں، ہم دونوں مل کر اس کیس کے پاؤں دباتے ہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کسی بشریٰ نامی خاتون کو جانتے ہیں۔''

''کون بشریٰ.....؟'' اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

''ایک غریب عورت جو ادھر گل بہار المعروف بہ گولیمار میں رہتی ہے۔'' میں نے کامران سے حاصل ہونے والی معلومات کا برمحل استعمال کرتے ہوئے پوچھا۔ ''جس کی ایک چودہ سال کی لڑکی بھی ہے.....غالباً اس کا نام شازیہ ہے؟''

''میں کسی بشریٰ یا شازیہ کو نہیں جانتا۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''آبجیکشن یور آنر۔'' وکیل صفائی فوراً بدر شاہ کی مدد کو لپکا۔ ''زیرِ سماعت کیس کا کسی شازیہ یا بشریٰ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وکیل استغاثہ غیر متعلقہ باتوں کو زیرِ بحث لا کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے استفسار کیا۔ ''کیا ان دونوں کرداروں کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی لنک ہے؟''

''یس یور آنر۔'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''اور وقت آنے پر میں یہ لنک ثابت بھی کر دوں گا۔''

''بیگ صاحب!'' جج اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پلیز پروسیڈ۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''شاہ جی!'' میں شاطر ملزم بدر شاہ کی جانب متوجہ ہوگیا اور سوال کیا۔ ''فیڈرل بی ایریا کے مکان نمبر فلاں میں ایک دل کش خاتون رہائش پذیر ہیں۔ کیا آپ بھری عدالت کو ان خاتون کا نام بتا سکتے ہیں؟''

''میں ایسی کسی عورت کو بھی نہیں جانتا......'' وہ برہمی سے بولا۔ ''آپ پتا نہیں، کون کون سی بے پر کی اڑا رہے ہیں۔''

''چلیں، آپ کی خوشی کی خاطر اس بے پر کی کو پر لگا لیتے ہیں۔'' میں نے کامران کی فراہم کردہ مفید معلومات کے استعمال کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس پرکشش عورت کے دو پر بھی ہیں جن میں ایک کا نام فیصل غوری اور دوسرے کا نام عبدالصمد خان ہے یعنی مذکورہ خاتون کے دائیں اور بائیں کے مکین......؟''

''یہ دونوں جائیں جہنم میں۔'' وہ سلگتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

وکیل صفائی نے ایک مرتبہ پھر اپنی فیس حلال کرنے کی کوشش کی۔ وہ جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''جناب عالی! وکیل استغاثہ کی لایعنی باتوں سے یہ کیس اپنی پٹری سے اتر رہا ہے۔ میرے فاضل دوست کو تو دی پوائنٹ رہنے کی تاکید کی جائے۔''

اس بار جج نے وکیلِ صفائی کی فرمائش پوری کردی۔

''شاہ جی!'' میں نے اپنی توجہ بدر شاہ پر مرکوز کردی۔

''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ نے ''شاہ ٹریڈرز'' نامی یہ فرم کب بنائی تھی؟''

اب تک کی جرح میں میری طرف سے پوچھے گئے تمام سوالات اگرچہ اس کیس کی نسبت سے غیر متعلقہ نظر آتے تھے لیکن ہر سوال کے عقب میں میرا ایک خاص مقصد چھپا ہوا تھا۔ میں عدالت کی نگاہ میں دراصل بدر شاہ کو ایک دروغ گو شخص ثابت کرنا چاہتا تھا۔ بدر شاہ نے تھوڑی دیر سوچنے کے بعد جواب دیا۔

''کم وبیش آٹھ سال پہلے۔''

''جب یہ کمپنی قائم کی گئی تو کیا اس وقت آپ اکیلے ہی اس کے مالک تھے یا آپ کے ساتھ کوئی پارٹنر بھی تھا؟'' میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

وکیلِ صفائی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! مجھے سخت اعتراض ہے۔ زیر سماعت کیس کا تعلق ذاتی قرض کے بارے میں ہے لہٰذا فاضل وکیل کو اس بات کے لیے پابند کیا جائے کہ وہ ''شاہ ٹریڈرز'' کو اس کیس میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں۔''

''جناب عالی! یہ ٹھیک ہے کہ قرض کے حوالے سے تیار کی جانے والی پکی رسیدوں میں کہیں بھی ''شاہ ٹریڈرز'' کا ذکر نہیں ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ملزم بدر شاہ نے مسز عالیہ سے یہ قرض کاروبار کے لیے لیا تھا۔ اگر شاہ جی معزز عدالت کو یہ بتا دیں کہ وہ ''شاہ ٹریڈرز'' کے پلیٹ فارم سے ہٹ کر بھی کوئی کاروبار کرتے ہیں جس کے لیے انہوں نے میری مؤکلہ سے پانچ لاکھ روپے قرض لیا تھا تو میں اس سوال سے باز آجاؤں گا۔''

جج نے بدر شاہ سے جب استفسار کیا تو وہ بغلیں جھانکنے لگا۔

جج نے وکیلِ صفائی کا اعتراض مسترد کرتے ہوئے مجھے جرح جاری رکھنے کا اشارہ کردیا۔ میں نے بدر شاہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! میرے سوال کا جواب دیں؟''

''جب ''شاہ ٹریڈرز'' قائم کی گئی تو میں اکیلا ہی اس کا مالک تھا۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''کوئی بھی شخص اس فرم میں نہ کبھی میرا پارٹنر تھا اور نہ اب ہے۔ میرا خیال ہے،

سیر

میاں بیوی ایک ڈاکٹر کے پاس گئے۔ بیوی اندر سے آئی تو شوہر سے کہنے لگی۔ ''ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ مختلف ملکوں کی سیر کریں تاکہ صحت پہ اچھا اثر پڑے۔''

شوہر ہونہہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ بیوی پھر بولی۔ ''اب فیصلہ کرلیں کہ کہاں کہاں جانا ہے۔''

میاں بولا۔ ''چلو دوسرے ڈاکٹر کے پاس۔''

بہو

بیٹا بیاہ کر بہو لایا تو وہ سستی کی عادی نکلی۔ ایک دن ماں بیٹے سے کہنے لگی۔ ''بیٹا! جب میں جھاڑو دینے لگوں تو کہنا رہنے دیں امی، میں دے دیتا ہوں۔ اس طرح بہو کو کچھ تو شرم آئے گی۔'' بیٹا راضی ہوگیا۔ جب بہو صحن میں آئی تو ساس جھاڑو دینے لگی۔ بیٹے نے رٹا ہوا جملہ بول دیا۔ یہ سن کر بہو کہنے لگی۔

''بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک دن امی جھاڑو دیں اور ایک دن بیٹا۔''

مرسلہ: ماہین بابر/فضل عباس، گلیانہ روڈ کھاریاں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

اب آپ کی تسلی ہوگئی ہوگی.....؟''

''اتنی جلدی کہاں شاہ جی۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ابھی تو مجھے ایک فریادی کی دکھ بھری آواز کو معزز عدالت کی منصفانہ سماعت تک رسائی دلانا ہے.....!''

''کون فریادی؟'' وہ چوکنا نظر سے اِدھر اُدھر تکنے لگا۔

''وہ آپ کے سر پر بیٹھی ہے.....!''

میکانکی انداز میں اس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف چلا گیا پھر حماقت کا احساس ہوتے ہی وہ خفت آمیز انداز میں بڑبڑایا۔ ''یہ کیسا مذاق ہے؟''

''یہ مذاق نہیں مسٹیک ہے شاہ جی۔'' میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے مسٹیک ہوگئی۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ..... وہ فریادی آپ کے سر کے اندر، آپ کی یادداشت میں بیٹھی ہوئی ہے۔''

''میں ایسی کسی عورت کو نہیں جانتا جو میرے اندر چھپی بیٹھی ہو اور مجھے کوئی خبر ہی نہ ہو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

''وہ صرف چھپی ہی نہیں بیٹھی بلکہ ایک خطرناک دعویٰ بھی کررہی ہے۔'' میں نے کامران کی محنت کو رنگ لاتے ہوئے کہا۔

''کیسا دعویٰ؟'' بدرشاہ نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس فریادی عورت کا دعویٰ ہے کہ.....'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا ''.....وہ اس بزنس کی ابتدا پر آپ کی ففٹی ففٹی کی پارٹنر تھی جو کہ تکنیکی اعتبار سے فورٹی نائن۔ ففٹی ون پارٹنرشپ کہلاتی ہے.....؟''

بدرشاہ کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ لکنت زدہ لہجے میں اس نے جواب دیا۔ ''وہ..... جو کوئی..... بھی ہے، جھوٹی ہے..... مکار ہے..... میں نے کبھی کسی سے پارٹنرشپ نہیں کی۔''

''اگر ایسی کوئی دروغ گو عورت ہے تو آپ اس کا نام عدالت کے سامنے لائیں میرے فاضل دوست۔'' وکیل صفائی نے براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''صرف نام ہی نہیں، میں ضرورت پڑنے پر مذکورہ عورت کو بھی گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرسکتا ہوں۔'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''لیکن ابھی اس سے بھی ضروری کام نمٹانا ہیں۔''

''کیا آپ کی بیان کردہ فریادی عورت کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق ہے؟'' وکیل صفائی نے مجھ سے پوچھا۔

''بہت گہرا تعلق ہے۔'' میں نے وکیل صفائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر بدرشاہ کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا۔

''شاہ جی! میری معلومات کے مطابق آپ نے دو شادیاں کی ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''دو شادیاں کرنا کوئی گناہ تو نہیں!'' وہ غصے سے بولا۔

''گناہ اور ثواب کے معاملات اللہ پر چھوڑ دیں۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''آپ ہاں یا نہ میں میرے سوال کا جواب دیں۔''

''ہاں..... میں نے دو شادیاں کی ہیں۔'' وہ بڑے فخر سے بولا۔

میں نے اس کے فخر کو خاک چٹانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا اس وقت آپ کی دونوں شادیاں برقرار ہیں؟''

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''پہلی شادی ختم ہوچکی ہے۔''

''ختم ہوچکی ہے.....'' میں نے اسی کے الفاظ دہرانے کے بعد استفسار کیا۔ ''طلاق، خلع یا علیحدگی.....؟''

''طلاق!'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''کیا آپ اپنی پہلی بیوی کا نام بتانا پسند کریں گے؟''

''بشریٰ.....'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

وکیل صفائی سر پیٹ کر رہ گیا۔

''وہی بشریٰ جس سے آپ کی ایک چودہ سالہ بیٹی بھی ہے۔'' میں نے بدرشاہ کو سوچنے کا موقع دیے بغیر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جس کا نام شازیہ ہے۔ یہ ماں بیٹی گل بہار کے علاقے میں رہتی ہیں؟''

''جی ہاں.....!'' اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے آپ نے میرے ایک سوال کے جواب میں ان ماں بیٹی سے اپنی لاعلمی اور لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔'' میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟''

وہ بری طرح پھنس چکا تھا، کمزور سی آواز میں بولا۔ ''پہلے مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ حقیقت یہی ہے کہ بشریٰ میری پہلی بیوی تھی۔''

''تم ''تھی'' کا الفاظ استعمال کرکے اب بھی سنگین غلطی کررہے ہو۔'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''بشریٰ کے لیے ماضی کا صیغہ جائز نہیں ہے کیونکہ تم نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔ وہ اس وقت بھی شرعاً تمہاری بیوی ہے اور.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا پھر ڈرامائی انداز میں کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہاری جس پہلی بزنس پارٹنر کا ذکر کیا تھا، وہ فریادی عورت یہی بشریٰ ہے کیونکہ نہ تو تم نے اس کا سرمایہ واپس کیا تھا اور نہ ہی پارٹنرشپ بزنس کو ختم کرنے کی کوئی دستاویز تیار کی۔ وہ قانوناً اب بھی تمہاری پارٹنر ہے۔ ''شاہ ٹریڈرز'' کے نصف اثاثوں کی مالک!''

''پ پ..... پانی.....'' وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامتے ہوئے نحیف سی آواز میں منمنایا۔

''نو پانی، نو مانی!'' میں نے سفاکی سے کہا۔ ''جب تک یہ جرح جاری ہے، تمہیں میرے سوالات کا سامنا کرتے ہوئے بار بار خود کو جھوٹا ثابت کرنا ہوگا۔ اس کیس کے اختتام پر تمہیں نیم کے رس میں کھلی بھگو کر کھلائی جائے گی تاکہ تم آئندہ کبھی دروغ گوئی کا تصور بھی نہ کرسکو.....'' میں نے ذرا دیر کو تھم کر ایک گہری سانس لی پھر اگلا سوال داغ دیا۔

''میری مؤکلہ سرمایہ کاری کے لیے تمہارے پاس اکیلی آئی تھی یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا؟''

''یہ عندلیب کے ساتھ میرے پاس آئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''عندلیب کو تم کب سے جانتے ہو؟''

''دو تین سال سے۔''

''اس جان کاری کا سبب کیا ہے؟''

''وہ ایک معروف سماجی شخصیت ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس نے ''لنکرز'' کے نام سے ایک میرج بیورو کھول رکھا ہے۔''

''میری معلومات کے مطابق، یہ عندلیب بہت..... دل کش عورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں اس کے گھر کا ایڈریس معلوم ہے؟''

لمحاتی تذبذب کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''نہیں!''

''تمہیں اپنے گھر کا ایڈریس تو یاد ہوگا؟''

''اپنا ایڈریس بھلا کون بھول سکتا ہے.....؟'' الٹا اس نے مجھ سے سوال کردیا۔

''جو شخص اپنی بیوی کا نام بھول سکتا ہو، اس سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کیا تم معزز عدالت کو اپنے بائیں اور دائیں والے پڑوسیوں کے نام بتاسکتے ہو؟''

''کیوں نہیں.....'' وہ میری چال میں آگیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ ''فیصل غوری اور عبدالصمد خان.....''

میں نے تیکھے اور تیکھے سوالات کی بوچھار کرکے اس کی مت ماردی تھی۔ وہ بے خبری میں، میری تیار کردہ دلدل کے اندر دھنستا چلا جارہا تھا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''لیکن تھوڑی دیر پہلے تو تم ان دونوں افراد کو جہنم جانے والی ٹرین میں سوار کرا چکے ہو اور تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جس گھر میں تم رہائش پذیر ہو، وہ دل کش عورت بھی ادھر ہی رہتی ہے..... میرا اشارہ لنکرز میرج بیورو والی عندلیب آپا کی طرف ہے۔ کیا تم بھی اسے آپا ہی کہہ کر مخاطب کرتے ہو؟''

''یہ کیا بکواس ہے.....!'' وہ آتش زیرپا ہوتے ہوئے بولا۔ ''عندلیب میری بیوی ہے.....''

''ویل ڈن.....!'' میں نے بدرشاہ کی بھد اڑاتے ہوئے کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! میں نے معزز عدالت کے روبرو بدرشاہ کو جھوٹا، فریبی اور دھوکے باز ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اب عدالت سے بس میری اتنی سی استدعا ہے کہ میری مؤکلہ کو اس کی ڈوبی ہوئی رقم واپس دلائی جائے۔ دیٹس آل یور آنر۔''

''آپ کو ملزم سے اور کچھ تو نہیں پوچھنا؟'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے نہایت ہی ادب سے جواب دیا۔ ''یور آنر! میں اپنی جرح مکمل کرچکا۔''

جج نے بدرشاہ سے پوچھا۔ ''مسز عالیہ انور کی ہڑپ کی ہوئی رقم کے بارے میں تم نے کیا سوچ رکھا ہے؟''

''جناب عالی!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ رقم تو میں واپس کرچکا۔''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔ ''دی کورٹ از ایڈجارنڈ.....!''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور کٹہرے میں بدرشاہ عرف شاہ جی کھڑا تھا۔

پچھلی پیشی کا اختتام انتہائی ڈرامائی انداز میں ہوا تھا۔ شاہ جی نے بڑے اعتماد کے ساتھ دعویٰ کیا تھا کہ وہ مسز عالیہ سے لی ہوئی رقم واپس کرچکا ہے۔ میرے اصرار پر جج نے اس سے رقم کی واپسی کا ثبوت مانگ لیا تھا اور آج وہ اسی ثبوت کے ساتھ عدالت میں حاضر ہوا تھا۔ میرے پاس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھی ثبوتوں کی کمی نہیں تھی۔

میں نے پچھلی پیشی پر شاہ جی کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی اور اس کی ایسی حالت ہوگئی تھی کہ بس وہ بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ عدالت سمجھ چکی تھی کہ بدرشاہ ایک عیار، مکار اور فراڈ شخص ہے لیکن آخری وقت پر اس نے جو دعویٰ کیا تھا، اس سے صورتِ حال میں سنسنی سی پیدا ہوگئی تھی۔

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے روئے سخن جج کی جانب کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جنابِ عالی! جیسا کہ میں نے گزشتہ پیشی پر کئی زاویوں سے یہ ثابت کردیا تھا کہ ملزم بدرشاہ ناقابلِ اعتبار شخص ہے۔ اس نے مختلف مواقع پر عدالت کے سامنے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور زندگی بھر لوگوں کو دھوکا دیتا آیا ہے۔ میں اپنی بات کے ثبوت کے لیے اس کی پہلی بیوی بشریٰ، اس کی بیٹی شازیہ، اس کے حالیہ پڑوسی فیصل غوری اور عبدالصمد خان کو لے کر آیا ہوں۔ یہ تمام افراد اس وقت عدالت کے کمرے کے باہر موجود ہیں۔ ملزم کی دوسری بیوی عندلیب منظر سے غائب ہوچکی ہے۔ فی الحال حاضر اسٹاک افراد سے کام چلایا جاسکتا ہے۔ عدالت جب چاہے، انہیں اندر بلا کر میری بات کی تصدیق کرسکتی ہے۔''

جج نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر مذکورہ افراد کو اندر بلا کر ان کا بیان ریکارڈ کرالیا۔ میرے اس اقدام نے بدرشاہ کے فراڈ کے غبارے میں سے رہی سہی ہوا بھی نکال دی۔

جج نے کڑے لہجے میں وکیل صفائی سے کہا۔ ''پچھلی پیشی پر آپ کے مؤکل نے رقم کی واپسی کا جو دعویٰ کیا تھا، آپ اس کا ثبوت لائے ہیں؟''

وکیل صفائی نے اپنی فائل میں سے چند کاغذات نکال کر جج کی خدمت میں پیش کردیے۔ ان کاغذات کی رو سے بدرشاہ نے کاروبار میں شدید نقصان اٹھانے کے بعد مسز عالیہ کی رقم قسطوں میں واپس کردی تھی۔ اس سلسلے سے تعلق رکھنے والی تمام رسیدیں بھی موجود تھیں جن کے مطابق دو لاکھ یک مشت اور تین لاکھ بارہ اقساط کی صورت میں ایک سال میں اس نے لوٹائے تھے۔ میں نے مذکورہ رسیدوں کا جائزہ لیا تو اس کمینے شخص کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی۔

ان تمام رسیدوں پر توصیف کے دستخط موجود تھے۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا، یا تو پچھلے ایک سال میں توصیف نے پانچ لاکھ کی وہ رقم وصول کرلی تھی اور یا پھر بدرشاہ نے کوئی اونچا خواب دکھا کر اس بے وقوف نوجوان سے مختلف رسیدوں پر دستخط کروالیے تھے۔ توصیف میں عقل کی جتنی مقدار موجود تھی، اس کی روشنی میں وہ ایسا کرسکتا تھا۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آرہی تھی کہ توصیف روزِ اول سے بدرشاہ کی حمایت کیوں کررہا تھا لیکن میں اتنی آسانی سے ہمت ہارنے والا نہیں تھا۔

''بدرشاہ!'' میں نے اس چال باز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے پانچ لاکھ کی رقم مسز عالیہ سے لی تھی یا ان کے بیٹے توصیف سے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''مسز عالیہ سے۔''

''کیا اس موقع پر توصیف موجود تھا؟''

''نہیں!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''عالیہ، عندلیب کے ساتھ میرے پاس آئی تھی۔''

''وہی دل کش خاتون جو آپ کی دوسری بیوی اور زمانے بھر کی آپا ہیں.....'' میں نے طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔

وہ قہر آلود نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جی!''

''باقی دی وے .....'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''عندلیب صاحبہ پچھلے آٹھ دس روز سے کہاں غائب ہیں؟ میں ان کے میرج بیورو کے بھی دو تین چکر لگا چکا ہوں۔ کم از کم وہ کراچی میں تو نہیں ہیں.....؟''

''وہ جہاں بھی ہیں، جلد ہی واپس آجائیں گی۔ آپ کو ان کی فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔'' وہ معاندانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا ان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''میں اتنا موٹا نہیں ہوں کہ مجھے دبلا ہونے کی فکر لاحق ہوجائے۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''دوسری بات یہ کہ عندلیب کا اس کیس سے بہت گہرا تعلق واسطہ ہے۔ وہی میری مؤکلہ کو گھیر گھار کر تمہارے پاس لائی تھی لہٰذا جب بھی عدالت ضرورت محسوس کرے گی، عندلیب کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا اور یہ حاضری آپ کی ذمے داری ہوگی کیونکہ جگت آپا عندلیب آپ کی منکوحہ دوم ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں، شاید عندلیب کو عدالت میں بلانے کی ضرورت پیش نہ آئے.....''

میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ چونک کر بولا۔ ''کیوں؟''

''تمہاری اس ''کیوں...'' کا جواب میں بعد میں دوں گا اگر اس کی ضرورت باقی رہی تو.....'' میں نے سخت لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''پانچ لاکھ کی رقم پر بہ حساب پانچ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فیصد منافع یعنی پچیس ہزار روپے ماہانہ پہلے دو ماہ تم نے کس کو دیے تھے..... مسز عالیہ کو یا ان کے بیٹے توصیف کو؟''

''منافع کی رقم مسز عالیہ ہی نے وصول کی تھی۔''

''او عقل سے پیدل اور حماقت کے گھوڑے پر سوار فراڈ ابن فراڈ.....'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''پانچ لاکھ تم نے میری مؤکلہ سے لیے۔ اس رقم پر دو مرتبہ پچیس ہزار ماہانہ کے حساب سے منافع تم نے میری مؤکلہ کے ہاتھ میں رکھا پھر جس خطیر رقم کی واپسی کی تم نے عدالت میں بوگس رسیدیں پیش کی ہیں، وہ تم نے میری مؤکلہ کے بیٹے کو کیوں ادا کیں اور وہ بھی مسز عالیہ کے علم میں لائے بغیر؟''

''میں بتاتا ہوں۔'' وکیل صفائی نے بدرشاہ کو بچانے کی آخری کوشش کرتے ہوئے کہا پھر اپنی فائل میں سے ایک اسٹیمپ پیپر نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''جناب عالی! یہ پاور آف اٹارنی ہے۔ مسز عالیہ نے بدرشاہ کو بتایا تھا کہ وہ جوڑوں کی شدید تکلیف میں مبتلا ہیں لہٰذا وہ بار بار ''شاہ ٹریڈرز'' کے چکر نہیں کاٹ سکتیں لہٰذا انہوں نے اپنے بیٹے توصیف کے نام پر پاور آف اٹارنی بنا کر دیا تھا اور بدرشاہ سے درخواست کی تھی کہ آئندہ رقم کا لین دین ان کا بیٹا توصیف کرے گا۔ اس پاور کے اندر یہ سب باتیں لکھی ہوئی ہیں۔''

پاور آف اٹارنی تیار کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ بدرشاہ نے نقلی مختار نامہ تیار کرالیا ہوگا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، بدرشاہ اپنے اندر اعتماد بھرتے ہوئے گویا ہوا۔

''اس پاور آف اٹارنی کی روشنی میں، میں مسز عالیہ سے لیے ہوئے پانچ لاکھ روپے واپس کر چکا ہوں اور رسیدوں کی شکل میں تمام ثبوت میرے پاس موجود ہیں۔''

''لہٰذا یہ فراڈ کا نہیں، ہتک عزت کا کیس بنتا ہے۔'' وکیل صفائی نے پھرتی دکھائی۔ ''میرے مؤکل پر جو کیس بنایا گیا اس میں ان کی بہت تذلیل اور جگ ہنسائی ہوئی ہے۔ اس ہزیمت کے جواب میں یہ ہرجانے کا دعویٰ کریں گے۔ جو پانچ لاکھ یہ مسز عالیہ کو قسطوں کی صورت ادا کر چکے ہیں، وہ ڈبل، ٹرپل ہوکر ہرجانے کی صورت میں میرے مؤکل کے پاس آجائے گی۔''

''ایک منٹ میرے فاضل دوست!'' میں نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''سپر ایکسپریس بلٹ ٹرین بننے کی کوشش نہ کریں۔ راستے میں چھوٹے موٹے بہت سے اسٹیشن ابھی باقی ہیں۔ آپ کے مؤکل اور اس کیس کے ملزم بدرشاہ نے رقم کی واپسی کا جو ڈراما عدالت میں پیش کیا ہے، اس کی تصدیق یا تردید صرف ایک ہی شخص کرسکتا ہے اور وہ ہے میری مؤکلہ کا بیٹا توصیف جو اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔'' پھر میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! میں توصیف کو کٹہرے میں بلانا چاہتا ہوں۔''

اگلے ہی لمحے توصیف وٹنس باکس میں پہنچ گیا۔

میں گواہوں والے کٹہرے کے پاس گیا اور نہایت ہی دھیمے لہجے میں توصیف سے کہا۔ ''تمہارے پاس آخری موقع ہے۔ حق کا ساتھ دو یا باطل کا، یہ تمہاری صوابدید پر ہے لیکن اتنا بتادوں کہ آج ہر باطل میرے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہوگا اور جیت صرف حق کی ہوگی۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے چند منٹ دے رہا ہوں۔ فیصلہ کرلو، تم نے کس کشتی پر سوار ہونا ہے.....!''

پھر میں نے بدرشاہ کی طرف مڑتے ہوئے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ''جب تم ساری رقم ادا کر چکے تھے تو پھر مجھے رشوت دے کر اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں.....!'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ ''میں نے کب آپ کو رشوت کی آفر کی ہے؟''

میں نے اپنے بیگ میں سے ایک کیسٹ نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اگرچہ یہ غیر اخلاقی عمل ہے لیکن بدرشاہ جیسے گھاگ مگرمچھوں کو شکار کرنے کے لیے بعض اوقات ایسے اقدام مجبوری میں کرنا پڑتے ہیں۔ اس کیسٹ کے اندر میری اور بدرشاہ کی وہ تمام گفتگو ریکارڈ ہے جس میں اس شخص نے بھاری رقم کے عوض مجھے خریدنے کی کوشش کی تھی۔''

اس سے پہلے کہ عدالت میں اس کیسٹ کو پلے کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جاتا، بدرشاہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

''یو ڈرٹی وکیل..... میں تمہیں قتل کردوں گا.....''

''یور آنر! پوائنٹ ٹو بی نوٹیڈ پلیز۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ملزم مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے اور وہ بھی معزز عدالت کے روبرو۔ کل کلاں اگر میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجائے تو اس کی ذمے داری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بدرشاہ پر ہوگی۔''

اسی لمحے توصیف بول اٹھا۔''وکیل صاحب! میں نے سوچ لیا ہے۔ میں حق کا ساتھ دوں گا۔''

''ویٹس گریٹ یو اسمارٹ بوائے۔'' میں نے سراہنے والی نظر سے توصیف کو دیکھا پھر روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ حق کا ساتھ دینے والے کی آواز کو پہلے سنا جائے۔ کیسٹ میں تو ملزم کی عیاریوں اور مکاریوں کی داستان ریکارڈ ہے۔ اس کا نمبر بعد میں آنا چاہیے۔''

جج نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے توصیف کو بولنے کی اجازت دے دی۔

اب تک کی عدالتی کارروائی کے دوران میں، میں نے بدرشاہ کی جو درگت بنائی تھی، اس نے توصیف کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اچھی طرح یہ بات سمجھ چکا تھا کہ میں کسی بھی صورت بدرشاہ کو بچ کر جانے نہیں دوں گا لہٰذا اس نے سچ بولنے ہی میں اپنی عافیت جانی تھی۔

توصیف نے جو کہانی عدالت کے روبرو سنائی، میں کم وبیش ایسی ہی کسی کتھا کی توقع کر رہا تھا۔ توصیف اپنی ماں سے خفا تھا اور اس کی اس کمزوری کا بدرشاہ نے بھرپور فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے یہ وعدہ کر کے توصیف کو اپنے فریب کے شیشے میں اتار لیا تھا کہ اگر وہ اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے تو بدرشاہ اسے اپنے بزنس میں پارٹنر بنالے گا اور مسز عالیہ والے پانچ لاکھ روپے توصیف کی طرف سے کاروبار میں انویسٹ ہو جائیں گے۔ بدرشاہ کی اسکیم توصیف کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے بدرشاہ کے ایما پر مختلف کاغذات پر دستخط کر دیے تھے۔

توصیف کے حلفیہ بیان نے بدرشاہ کے فراڈ کا تابوت تیار کر دیا تھا۔ اس کے بعد میری فراہم کردہ کیسٹ کو عدالت میں پلے کیا گیا۔ یہ کیسٹ بدرشاہ کی عیاری کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔

جج نے فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر عدالت نے میری مؤکلہ مسز عالیہ انور کے حق میں فیصلہ سنا دیا اور بدرشاہ کو پابند کیا کہ وہ عرصہ دس یوم کے اندر عالیہ سے لی ہوئی تمام رقم اسے لوٹا دے۔

دس یوم کیا، بدرشاہ نے اس فیصلے کے دوسرے روز ہی مسز عالیہ کے تمام واجبات ادا کر دیے۔

میرے دیگر چار مؤکلوں کو بدرشاہ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ جب پہلی پیشی پر بدرشاہ نے انہیں پہچاننے سے انکار کیا تو وہ بہت مایوس ہو گئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کیس میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

عندلیب آپا کی کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل لیا۔ عدالت نے تقاضائے انصاف کو پورا کرتے ہوئے چونکہ میری مؤکلہ کو اس کا حق دلا دیا تھا لہٰذا عندلیب کی ذات میں میری دلچسپی باقی نہیں رہی تھی لیکن اس شہر میں ایک شخص ایسا بھی تھا جو بڑی شدومد سے عندلیب کو تلاش کر رہا تھا اور وہ تھا..... کامران!

کامران نے اس کیس میں میری بہت مدد کی تھی۔ بشریٰ اور عندلیب کے حوالے سے اس کی فراہم کردہ معلومات کی بنا پر میں نے بدرشاہ کا باجا بجا دیا تھا۔ کامران جب بھی مجھ سے ملنے آتا تو اس کی پژمردگی کو دیکھ کر میں اسے یہی سمجھاتا تھا۔

''انیتا کا خیال دل سے نکال دو۔ شوبز کی دنیا میں حقیقت کم اور مصنوعی پن زیادہ ہوتا ہے اسی لیے اس کا نام ''شوبزنس'' ہے یعنی جو دکھے گا، وہ بکے گا.....''

اس نے ہر بار مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ انیتا کو بھولنے کی کوشش کرے گا پھر اس نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ چند روز بعد روزمرہ کی مصروفیات کی وجہ سے وہ میرے ذہن سے محو ہو گیا۔

دو ماہ بعد ایک سنسنی خیز اخباری خبر نے مجھے چونکا دیا۔ کامران نامی ایک شخص نے استرے کی مدد سے عندلیب آپا نامی ایک خوبرو عورت کا گلا کاٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جب میں نے اس خبر کی تفصیل پڑھی تو پتا چلا کہ کامران کافی عرصے سے عندلیب کی تلاش میں تھا۔ وہ جیسے ہی کامران کو ملی، اس نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔

کامران کو انیتا نہیں مل سکی تھی اور نہ ہی وہ اس کی یاد کو اپنے دل سے نکال سکا تھا تاہم اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر تقاضائے انصاف کو پورا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا قبلہ چونکہ درست نہیں تھا لہٰذا اس عمل کی پاداش میں وہ جیل چلا گیا۔

زندگی میں کامیابی کے لیے انسان کی نیت کا صاف ہونا اور سمت کا درست ہونا بہت ضروری ہے ورنہ..... کوشش تو سبھی کرتے ہیں!

(تحریر: حُسام بٹ)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوسرا دشمن

ثمر عباس

دنیا میں یہ کچھ ایسا انوکھا نہیں ہے جب ایک جیسی زیادتی کا شکار کئی لوگ ہوجائیں مگر... یہ انوکھا ضرور تھا کہ ایک بے زبان جانور اپنے غم سے کسی انسان کو مکمل تفصیل کے ساتھ آگاہی دے دے۔ مغربی معاشرے کی ویسے بھی یہ روایت رہی ہے کہ چاہے انسان کتنی ہی ناانصافیوں کا شکار ہوجائے مگر جانور کے حقوق پر کوئی آنچ نہیں آنی چاہیے اور... اس نے بھی اپنے عمل سے اسی نظریے پر چلتے ہوئے تصدیق ثبت کردی۔

۔ مغربی دنیا میں انسان سے دوری اور جانوروں سے محبت کا دہرا معیار

خدا میرے معالج کو خوش رکھے۔ وہ نہیں جانتی کہ میں اس سے ہر بار جھوٹ بولتی ہوں۔ مجھے ہفتے میں ایک مرتبہ اس کے پاس معائنے کے لیے آنا ہوتا ہے۔ اس کا نام گریس پامہ ہے۔ وہ بڑی خوش لباس اور خوش ذوق ڈاکٹر ہے۔ پینٹ کوٹ کے ساتھ اسی رنگ کی جیکٹ، سیاہ کمانیوں والا چشمہ اور کاندھوں پر جھولتے سنہری ریشمی بال..... پہلی نظر میں وہ کوئی فلمی اداکارہ یا ماڈل دکھائی دیتی ہے۔ ویسے تو میں خود بھی کوشش کررہی ہوں کہ فوج سے سبکدوش ہونے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے بعد مجھے لباس کے انتخاب میں محتاط رہنا چاہیے اور یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کون سے اسکرٹ کے ساتھ کس قسم کا جوتا یا پرس مناسب رہے گا۔

بہرحال ہم جب بھی اس کے چھوٹے اور صاف ستھرے دفتر میں ملتے ہیں جہاں ایک میز، فائل کیبنٹ اور کمپیوٹر ٹیبل کے سوا کچھ نہیں تو وہ ہمیشہ ایک خیر مقدمی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتی ہے۔ ''آج تم کیسا محسوس کر رہی ہو جیسیکا؟''

''بہت اچھا۔'' حالانکہ میرے کندھے میں مسلسل درد ہو رہا ہے اور جب میں اسے حرکت دیتی ہوں تو اس میں سے ایسی آواز آتی ہے جیسے مائیکرو ویو اوون میں پاپ کارن گرم ہو رہے ہوں۔ میرے دائیں گھٹنے میں ابھی تک اکڑاہٹ ہے۔ میرے پیٹ اور کمر پر زخموں کے نشان ہیں جن میں درد نہیں ہونا چاہیے لیکن وہاں بھی ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔

''نیند کیسی آ رہی ہے؟''

''تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ مجھے کتنی اچھی نیند آتی ہے۔ خاص طور پر جب میں سونے سے پہلے لیموں کا رس اور خاص مشروب ملا کر پیتی ہوں۔''

''یہ جان کر خوشی ہوئی۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے گزشتہ ہفتے جو وعدہ کیا تھا، اس پر کتنا عمل کیا؟''

میں کافی جھوٹ بول چکی تھی۔ اس لیے اب تھوڑا سا سچ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ''نہیں، ابھی نہیں...... مجھے تھوڑی سی ہچکچاہٹ ہو رہی تھی لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ اگلی میٹنگ سے پہلے میں کسی رات ضرور باہر جاؤں گی۔''

''بہت اچھے۔'' اس نے کہا۔ ''میں یہ بات دوبارہ زور دے کر کہہ رہی ہوں کہ ہم تمہاری حالت میں بہتری دیکھنا چاہتے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لیے پبلک مقامات پر جاؤ۔ لوگوں میں گھلنے ملنے کی کوشش کرو۔ ان پر دوبارہ بھروسا کرنا سیکھو، بس اتنی سی بات ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں گریس۔''

''شاباش۔'' وہ بولی۔ ''اور کوئی نئی بات؟''

''تم یقین کرو یا نہیں۔ میں نے ایک کتا پالنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

گریس نے مجھے مسکرا کر دیکھا اور ایک کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ میرے جانے کے بعد فائل میں بھی یہ بات لکھی جائے گی پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''بہت اچھی بات ہے۔ کتا لینے کب جا رہی ہو؟''

میں نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''بس ایک گھنٹے میں۔''

''نر یا مادہ؟''

''کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شیلٹر والوں نے مجھے ایک کتا دینے پر رضامندی ظاہر کردی ہے۔ وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا کہ مجھے کیسا جانور ملتا ہے۔''

''بہت خوب! یہ تمہارے لیے اچھا رہے گا۔''

اس نے کاغذ پر مزید کچھ لکھا اور بولی۔ ''تم نے کتا گود لینے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''بات دراصل یہ ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے گھر سے بہت محبت کرتی ہوں لیکن اس کا خالی پن مجھے بہت عجیب لگتا ہے اور یہ ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ میری صحت کے پیش نظر مستقبل قریب میں کسی سے ڈیٹنگ کا امکان بھی نہیں ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی میرے پاس رہے۔ بلی بھی پالی جاسکتی ہے لیکن بیشتر اوقات وہ آپ کو نظرانداز کردیتی ہے۔ اس لیے میں ایک کتا پالنا چاہتی ہوں جو میرے ساتھ کھیلے۔ مجھے کمپنی دے اور میرے ساتھ باہر جائے۔''

''میری خواہش ہے کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہمارا آج کا سیشن ختم ہوگیا۔ میں باہر نکل کر اپنی جیپ تک آئی اور یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے دائیں بائیں کسی نے اپنی گاڑی کھڑی نہیں کی تھی۔ میں نے جیپ کے اطراف چکر لگایا اور نیچے جھک کر دیکھا۔ اس بار میرے دونوں کندھوں اور گھٹنے میں شدید درد ہونے لگا۔ میں جیسے تیسے جیپ میں سوار ہوئی اور انجن اسٹارٹ کردیا۔ آج مجھے ایک کتا ہی گود نہیں لینا تھا بلکہ اس کے علاوہ میں ابھی تک اس شخص کو بھی تلاش کر رہی تھی جس نے کئی ماہ قبل مجھے زخمی کیا تھا اور جسے میں قتل کرنے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔

ذہنی صحت کے مرکز سے کاؤنٹی اینیمل شیلٹر تک پہنچنے میں مجھے پندرہ منٹ لگ گئے۔ وہ ایک دو منزلہ سفید رنگ کی عمارت تھی۔ بائیں جانب باڑ لگی ہوئی گھوڑوں کی چراگاہ تھی۔ میں نے عمارت کے سامنے جیپ کھڑی کی اور استقبالیہ پر چلی گئی۔ ایک نوجوان لڑکی مجھے عمارت کے عقبی حصے میں لے گئی جہاں کتوں کے باڑے بنے ہوئے تھے۔ ہمارے اطراف میں پرندوں اور خرگوشوں کے پنجرے رکھے ہوئے تھے اور ایک بڑی شیشے والی کھڑکی کے پار بلیوں کے پنجرے بھی نظر آ رہے تھے۔

اس لڑکی نے کتوں کے باڑے کی جانب والا دروازہ کھولا... مجھے ہر طرف سے بھونکنے اور غرانے کی آوازیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آنے لگیں۔ وہاں پنجروں کے اوپر پنجرے رکھے ہوئے تھے اور ان میں ہر نسل کا کتا موجود تھا۔ امینڈا نے اونچی آواز میں کہا۔ ''تم اچھی طرح دیکھ لو۔ ہر کتے کے سامنے ایک کارڈ لگا ہوا ہے جس پر اس کے بارے میں تفصیل درج ہے۔ میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

کتوں کے بھونکنے اور چلانے کی آوازیں میری سماعت سے ٹکرا رہی تھیں جس سے میرا دل خراب ہونے لگا۔ میں نے چاہا کہ امینڈا کا بازو پکڑ کر کہوں۔ ''میں ان سب کو لے جاؤں گی۔'' لیکن میں نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ یہ ایک احمقانہ بات ہوتی۔

میں نے وہاں آدھ گھنٹا گزارا اور آہستہ آہستہ ایک پنجرے سے دوسرے پنجرے تک جاتی رہی۔ کچھ کتے مجھے دیکھ کر اچھلنے اور بھونکنے لگے۔ شاید وہ اس امید پر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ میں انہیں گود لے لوں۔ ہر دروازے پر ایک ہلکے نیلے رنگ کا کارڈ لگا ہوا تھا جس پر کتے کا نام، جنس اور اس کا مختصر پس منظر لکھا ہوا تھا۔ میں نے تقریباً تمام نسلوں کے کتے دیکھ ڈالے مگر ان میں سے ایک ہی میری توجہ کا مرکز بن پایا۔ وہ ایک مادہ لیبرا ڈور تھی جو اپنے پنجرے کے آخری کونے میں لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر اپنا سر اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر دو بستروں پر براجمان تھی۔ کارڈ پر اس کا نام ٹروڈی اور عمر تقریباً دو سال لکھی ہوئی تھی جبکہ مزید معلومات کے بجائے لکھ دیا گیا تھا کہ دیگر تفصیلات کے لیے عملے سے رجوع کریں۔

امینڈا آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''ٹروڈی کا کیا پس منظر ہے؟''

وہ اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے بولی۔ ''کچھ اچھا نہیں ہے۔ اسے پولیس میں شکایت درج ہونے پر یہاں پناہ دی گئی تھی۔ اسے بھوکا رکھا گیا، مارا گیا۔ اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹ گئی جو ٹھیک نہ ہو سکی۔ یہ ہمارے پاس ایک مہینے سے ہے اور اسے کسی کو دینا مشکل ہو رہا ہے۔''

میں نے پنجرے کی طرف جھک کر اسے پکارا۔ ''ٹروڈی..... ٹروڈی۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے سر اٹھایا اور پھر جھکا لیا۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا؟''

امینڈا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں کہہ سکتی۔ یہ خفیہ ہے۔ اب تو تم اس کے بارے میں جان گئی ہو۔''

''میں اسے لے جاؤں گی۔''

''لیکن ہم یہ ضمانت نہیں دے سکتے کہ یہاں سے جانے کے بعد اس کا رد عمل کیا ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں سنبھال لوں گی۔''

''ہمیں مار پیٹ کے علاوہ اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ نئے گھر میں اس کا کیا ردعمل ہوگا۔''

''اس کی فکر نہ کرو۔ میں ایک لڑکی ہوں اور یہ بھی مادہ ہے۔ امید ہے کہ یہ بہت جلد مجھ سے مانوس ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی مرد اس کے بہت زیادہ قریب ہونا چاہے تو یہ بھونکنا اور غرانا شروع کر دیتی ہے۔ یہ مردوں کو پسند نہیں کرتی۔''

میں نے ٹروڈی کے پنجرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ مجھے بھی مرد پسند نہیں۔''

اس کے بعد میں نے ضروری کاغذات پر دستخط کیے۔ مطلوبہ رقم کا چیک ان کے حوالے کیا۔ امینڈا نے ضروری باتیں بتانے کے علاوہ ٹروڈی کا سامان بھی ساتھ کر دیا جن میں ایک پانی کا پیالہ، کھانے کی ڈش، ٹروڈی کے دو بستر، رسی اور کالر شامل تھا۔ امینڈا نے تنبیہ کی۔ ''اس کے بستر تبدیل مت کرنا۔ یہ انہی کی عادی ہے۔''

جب میں وہاں سے رخصت ہونے لگی تو اس نے رسمی مصافحہ کرنے کے بجائے مجھے گلے سے لگا لیا اور بولی۔ ''گڈ لک! ہمیں بہت یاد آئے گی لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ایک اچھے گھر میں جا رہی ہے۔''

''میں اس کا پورا خیال رکھوں گی۔'' میں نے کہا اور ٹروڈی کی رسی پکڑ کر پارکنگ لاٹ کی طرف چل دی، میں نے پسنجر سیٹ کی طرف والا دروازہ کھولا تو ٹروڈی میری طرف دیکھنے لگی پھر اس نے گہری سانس لی اور چھلانگ لگا کر جیپ میں بیٹھ گئی۔ میں چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر گئی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''چلو گھر چلتے ہیں۔ اپنے گھر۔'' میرا گھر ایک چھوٹا سا کاٹیج ہے جو دریا کے ساتھ ساتھ بنایا گیا ہے۔ میں نے اپنی جیپ مقررہ جگہ پر کھڑی کی اور پسنجر سیٹ والا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔ ''آؤ ٹروڈی..... گھر آ گیا۔''

اس نے سر اٹھایا اور اپنی پھیلی ہوئی براؤن آنکھیں مجھ پر جما دیں۔ میں نے اس کی ناک پکڑی اور بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں باہر آنے میں تمہاری مدد کرتی ہوں۔''

میں نے نیچے ہاتھ ڈال کر اسے نشست سے اوپر اٹھایا اور آہستہ سے اسے زمین پر کھڑا کر دیا جس کی وجہ سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میرے بائیں کندھے میں شدید تکلیف شروع ہوگئی۔ میں نے جلدی سے اس کا پٹا پکڑلیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ دوڑ نہ لگادے لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ میں نے اس کا چھ فٹ لمبا چمڑے کا پٹا پکڑ کر کاٹیج کی طرف چلنا شروع کردیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی پچھلی بائیں ٹانگ میں لنگڑاہٹ تھی۔

میں ابھی دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہائے جیسیکا.....رک جاؤ۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ آواز میرے قریب ترین کنوارے پڑوسی آرٹ ووڈز کی تھی۔ وہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑا تھا۔ صحت مند جسم، ترشی ہوئی ڈاڑھی اور نیلی آنکھیں۔ وہ شاید مچھلیاں پکڑ کر آرہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کتنی مچھلیاں پکڑیں؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''صرف پاؤں ہی پانی میں ڈوبے رہے۔'' وہ ایک مقامی کمیونٹی کالج میں انگریزی کا استاد تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اپنے فالتو وقت میں ایک ناول لکھ رہا ہے۔ وہ ایک اچھا انسان اور ایک اچھا پڑوسی بھی تھا۔ وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے نئے ساتھی کو دیکھ کر بولا۔ ''واہ، کتنا خوب صورت کتا ہے۔ نر ہے یا مادہ؟''

''مادہ۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا نام ٹروڈی ہے۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ آرٹ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ اس کے سر کے پاس لاتے ہوئے بولا۔ ''ہے ٹروڈی! یہ کیا ہے.....''

ایک تیز غراہٹ کے ساتھ ٹروڈی اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے کوئی کروز میزائل فضا میں بلند ہو رہا ہو، آرٹ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور میں ٹروڈی کا پٹا پکڑ کر اسے آرٹ سے دور کرنے کوشش کرنے لگی۔ وہ غضب ناک حالت میں آرٹ پر بھونک رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے مذاق کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''کسی کو ناپسند کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ شیلٹر میں پناہ لیے ہوئے تھی اور میں اسے آج ہی لے کر آئی ہوں۔ اس کے ساتھ پرانے گھر میں زیادتی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ مردوں کو پسند نہیں کرتی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے سڑک کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک پیاری لڑکی کی طرح لگتی ہے۔ گڈ لک جیسیکا۔''

اندر جاکر میں نے ٹروڈی کو پورا گھر دکھایا جس میں اوپر دو چھوٹے بیڈ روم، نیچے لیونگ روم، باتھ روم اور کچن وغیرہ تھا۔ وہ پُرسکون دکھائی دے رہی تھی یا اسے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے شاید یہ یقین نہیں تھا کہ میں اسے کب تک اپنے پاس رکھتی ہوں۔ اسے تہ خانہ کے علاوہ پورا گھر پسند آیا۔ جہاں آئل فرنیس اور الیکٹرانک واٹر ہیٹر نصب تھے لیکن اس نے نیچے جانے سے انکار کردیا۔ میں نے وہاں کی لائٹ جلائی اور اسے تہ خانے میں لے جانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئی اور میں سوچنے لگی کہ کہیں پہلے گھر میں اسے تہ خانے میں تنہا رکھ کر سزا تو نہیں دی گئی تھی۔

وہ اپنے ساتھ دو بستر لائی تھی۔ ان میں سے ایک لیونگ روم اور دوسرا اوپر لگادیا۔ پہلے میں سوچ رہی تھی کہ اسے فالتو بیڈ روم میں لگادوں لیکن میں اسے پہلی رات میں ہی تنہا اور خوفزدہ نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا اپنے بیڈ روم میں اس کا بستر لگادیا۔ وہ اپنے پیالے میں سے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ میں نے اپنے لیے ڈنر تیار کیا اور وہیں کچن کاؤنٹر پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ وہ بھی میرے اسٹول کے ساتھ بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور پھر کندھے اچکا دیے۔ ''شاید میں ایک غلط مثال قائم کررہی ہوں لیکن بہت سے لوگ مجھے ایک بری لڑکی سمجھتے ہیں پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

لہٰذا میں نے اسے بیف کا ایک ٹکڑا دیا جسے وہ بڑے مزے سے کھا گئی پھر میں نے اسے ایک گاجر دی جسے اس نے منہ میں رکھ لیا لیکن ایک دو سیکنڈ بعد ٹائل کے فرش پر پھینک دیا۔ میں سمجھ گئی کہ اسے سبزیاں نہیں صرف گوشت پسند ہے۔ برتن دھونے کے بعد میں نے کچھ دیر اخبار پڑھا۔ اس کے بعد ٹی وی پر ایک فلم دیکھی پھر میں نے گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے تھے۔ ٹروڈی لیونگ روم میں تھی۔ میں کاؤچ سے اٹھی اور آواز لگائی۔

''واک ٹائم ہوگیا ہے۔''

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ مجھے کچن میں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں نے کیبنٹ کھول کر ایک پیکٹ نکالا جس میں اعشاریہ تین پانچ سات کا روگر ریوالور رکھا ہوا تھا۔ اسی کیبنٹ سے ایک سیل فون لیا۔ ٹروڈی کا پٹا پکڑا اور باہر نکل گئی۔ بعض وجوہات کی بنا پر رات میں بہتے پانی کی آواز تیز ہوجاتی ہے۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ سڑک پر ایک بھی لائٹ روشن نہیں تھی۔ ہم ستاروں کی روشنی میں سڑک پر چلتے رہے۔ میری آنکھیں بہت جلد اندھیرے کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اچھا ہوا کہ یہ موقع مل گیا۔'' اس نے جولی کو روکا اور خود بھی ایک نشست سنبھال لی۔ اب وہ وہاں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ جب سے وہ آیا تھا، آج پہلی بار وہ دونوں یوں تنہائی میں ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تھے۔ وہ اپنا پورا دن مہاجر کیمپ میں گزارتی اور صرف صبح ناشتے اور رات کے کھانے پر ہی ان کی ملاقات ہو پاتی تھی۔ اس کے بارے میں اسے چاند بانو کی زبانی علم ہوا تھا کہ دن کا بیشتر حصہ وہ اپنے والد اور اسد اللہ کے گھر میں ہونے کی صورت میں ان کے ساتھ گزارتا ہے یا پھر کبھی کیتھی آجاتی ہے تو اس سے گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ کیتھی کو اس نے کوٹھی میں رہنے کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہاسٹل سے اس کے لیے اپنی جاب پر آنا جانا آسان رہتا ہے۔ یہاں سے اسپتال کا فاصلہ زیادہ تھا۔ عذر مضبوط ہونے کی وجہ سے زیادہ زور بھی نہیں دیا جاسکا تھا البتہ یہ طے ہوگیا تھا کہ جب کیتھی شادی کے لیے چھٹیاں لے گی تو کوٹھی منتقل ہوجائے گی اور یہیں سے ڈاکٹر داؤد کے ساتھ رخصت ہوگی۔

''میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن ابا جان اور چچا جان کی موجودگی میں موقع نہیں مل پاتا۔ میں آپ کے دکھ اور آنسوؤں کی وجہ اچھی طرح جانتا ہوں۔ اللہ کی قسم آپ کا ہر آنسو میرے دل پر انگاروں کی طرح گرتا ہے اور میں ہر روز خود سے عہد کرتا ہوں کہ آپ کے مجرم کو ایسی دردناک سزا دوں گا کہ اس کی روح تک بلبلاتی رہے گی۔ میں نے اس خبیث آدمی کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کرلی ہیں۔ آپ یوں سمجھیں کہ میرا ہاتھ اس کی گردن پر ہے لیکن میں صرف کیتھرائن کی شادی تک رکا ہوا ہوں۔ اس لڑکی کا بہت حق ہے مجھ پر۔ وہ مجھے اپنی سگی بہن جیسی ہی پیاری ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس کی خوشیوں کے رنگ میں بھنگ پڑے۔ وہ رخصت ہوجائے تو پھر اس کے بعد دلدار آغا اس زمین پر دوسرا سانس نہیں لے سکے گا، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' وہ نظریں جھکائے بولتا جارہا تھا۔ جولی نے ایک نظر اس پر ڈالی اور رخساروں پر آنسوؤں سے بن جانے والے نشانات کو صاف کرتے ہوئے دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

''انسان بڑا جاہل اور جلد باز ہے محب اللہ صاحب۔ اسے نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے جس علم کی بنیاد پر فیصلے کر رہا ہے، وہ علم کتنا ناقص ہے اور وہ جس کی ''علیم'' ہونا صفت ہے اور جو ہر شے پر قادر ہے... وہ زیادہ بہتر اور منصفانہ فیصلے کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ میرے معاملے میں بھی اللہ نے انصاف کر دیا ہے۔'' وہ اسے تمام تفصیل سے آگاہ کرتی چلی گئی۔

''اف میرے اللہ! رقابت کا جذبہ انسان کو اس درجے تک لے جاتا ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ کون یقین کرسکتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس کے پیچھے ایک عورت کے رقیبانہ جذبات کارفرما ہوں گے۔'' سن کر وہ متحیر رہ گیا۔

''عورتیں تو اپنی چالوں سے بڑی بڑی حکومتوں کا تختہ الٹ دیتی ہیں۔ عورت کو کمزور سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوتی ہے۔ یہ تو آدمی آدمی کا نصیب ہوتا ہے کہ اسے عورت کی نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا محبت کا اور میرے حساب سے آپ بڑے خوش نصیب ہیں محب اللہ کہ آپ سے چاند بانو جیسی بے لوث محبت کرنے والی لڑکی اس دنیا میں موجود ہے۔ جیسی محبت وہ آپ سے کرتی ہے ایسی محبت تو بہت نایاب اور نادر ہوتی ہے۔ آپ کو اس بے لوث محبت کی قدر کرنی چاہیے۔'' وہ بہت سلیقے سے گفتگو کا رخ بدل گئی تھی۔

جس دن سے اسے یہ علم ہوا تھا کہ محب اللہ ہی چاند بانو کا محبوب ہے اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں محب اللہ سے بات کرے گی۔ وہ چاند بانو جیسی پیاری لڑکی کو اس کے دل کی خوشی دینا چاہتی تھی اور پہلے ہی مرحلے پر اپنی اس خواہش سے دستبردار ہوگئی تھی کہ وہ اپنے عم زاد محب اللہ کے ساتھ ایک پُرسکون اور خوشیوں بھری زندگی کا آغاز کرے۔ اس محب اللہ کے ساتھ جو بمبئی کا فاروق تھا اور جس کی نگاہوں نے ہمیشہ اس سے کہا تھا کہ ہم تم پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔

''مجھے چاند بانو کی بے لوث محبت کا اعتراف ہے۔ میں اس کی محبت کی قدر بھی کرتا ہوں لیکن اس سے آگے اپنے آپ کو بے اختیار پاتا ہوں اور چاند بانو کو میری اس بے اختیاری کا علم ہے ورنہ زندگی میں ایک موقع وہ بھی آیا تھا جب چاند بانو کو مایوسی کے اندھیروں سے نکالنے کے لیے میں نے خود اسے شادی کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے میری اس پیشکش کو رد کردیا تھا کہ اس کی بے لوث محبت کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ محض اسے سہارا دینے کے لیے اپنی زندگی میں شامل کروں۔ وہ بہت سمجھدار اور حساس لڑکی ہے جمیلہ جو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ کسی کے دل کی بے اختیاری خود اس کے بس میں نہیں ہوتی تو دوسرا کیسے اسے قابو کرسکتا ہے۔''

محب اللہ کا جواب اسے نظریں جھکانے پر مجبور کر گیا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے دل کی کس بے اختیاری کی بات کر رہا ہے۔

''میرا نہیں خیال کہ آپ ہمارے بزرگوں کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میرے بائیں کندھے میں شدید تکلیف شروع ہوگئی۔ میں نے جلدی سے اس کا پٹا پکڑلیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ دوڑ نہ لگادے لیکن وہ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ میں نے اس کا چھ فٹ لمبا چمڑے کا پٹا پکڑ کر کاٹیج کی طرف چلنا شروع کردیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی پچھلی بائیں ٹانگ میں لنگڑاہٹ تھی۔

میں ابھی دروازے پر پہنچی ہی تھی کہ ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''ہائے جیسیکا.....رک جاؤ۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ آواز میرے قریب ترین کنوارے پڑوسی آرٹ ووڈز کی تھی۔ وہ مجھ سے تقریباً دس سال بڑا تھا۔ صحت مند جسم، ترشی ہوئی ڈاڑھی اور نیلی آنکھیں۔ وہ شاید مچھلیاں پکڑ کر آرہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کتنی مچھلیاں پکڑیں؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''صرف پاؤں ہی پانی میں ڈوبے رہے۔'' وہ ایک مقامی کمیونٹی کالج میں انگریزی کا استاد تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اپنے فالتو وقت میں ایک ناول لکھ رہا ہے۔ وہ ایک اچھا انسان اور ایک اچھا پڑوسی بھی تھا۔ وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آیا اور میرے نئے ساتھی کو دیکھ کر بولا۔ ''واہ، کتنا خوب صورت کتا ہے۔ نر ہے یا مادہ؟''

''مادہ۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا نام ٹروڈی ہے۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ آرٹ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا اور اپنا ہاتھ اس کے سر کے پاس لاتے ہوئے بولا۔ ''ہے ٹروڈی! یہ کیا ہے.....''

ایک تیز غراہٹ کے ساتھ ٹروڈی اپنی جگہ سے یوں اچھلی جیسے کوئی کروز میزائل فضا میں بلند ہورہا ہو، آرٹ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور میں ٹروڈی کا پٹا پکڑ کر اسے آرٹ سے دور کرنے کوشش کرنے لگی۔ وہ غضب ناک حالت میں آرٹ پر بھونک رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس نے مذاق کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''کسی کو ناپسند کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔''

''معاف کرنا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ شیلٹر میں پناہ لیے ہوئے تھی اور میں اسے آج ہی لے کر آئی ہوں۔ اس کے ساتھ پرانے گھر میں زیادتی ہوئی ہے۔ اس لیے یہ مردوں کو پسند نہیں کرتی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں۔'' اس نے سڑک کی طرف چلتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک پیاری لڑکی کی طرح لگتی ہے۔ گڈ لک جیسیکا۔''

اندر جاکر میں نے ٹروڈی کو پورا گھر دکھایا جس میں اوپر دو چھوٹے بیڈ روم، نیچے لیونگ روم، باتھ روم اور کچن وغیرہ تھا۔ وہ پُرسکون دکھائی دے رہی تھی یا اسے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے شاید یہ یقین نہیں تھا کہ میں اسے کب تک اپنے پاس رکھتی ہوں۔ اسے تہ خانہ کے علاوہ پورا گھر پسند آیا۔ جہاں آئل فرنس اور الیکٹرانک واٹر ہیٹر نصب تھے لیکن اس نے نیچے جانے سے انکار کردیا۔ میں نے وہاں کی لائٹ جلائی اور اسے تہ خانے میں لے جانا چاہا لیکن وہ اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گئی اور میں سوچنے لگی کہ کہیں پہلے گھر میں اسے تہ خانے میں تنہا رکھ کر سزا تو نہیں دی گئی تھی۔

وہ اپنے ساتھ دو بستر لائی تھی۔ ان میں سے ایک لیونگ روم اور دوسرا اوپر لگادیا۔ پہلے میں سوچ رہی تھی کہ اسے فالتو بیڈ روم میں لگادوں لیکن میں اسے پہلی رات میں ہی تنہا اور خیفہ زدہ نہیں کرنا چاہتی تھی لہٰذا اپنے بیڈ روم میں اس کا بستر لگادیا۔ وہ اپنے پیالے میں سے آہستہ آہستہ کھا رہی تھی۔ میں نے اپنے لیے ڈنر تیار کیا اور وہیں کچن کاؤنٹر پر بیٹھ کر کھانے لگی۔ وہ بھی میرے اسٹول کے ساتھ بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

میں نے ایک لمحے کے لیے غور کیا اور پھر کندھے اچکادیے۔ ''شاید میں ایک غلط مثال قائم کررہی ہوں لیکن بہت سے لوگ مجھے ایک بری لڑکی سمجھتے ہیں پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

لہٰذا میں نے اسے بیف کا ایک ٹکڑا دیا جسے وہ بڑے مزے سے کھاگئی پھر میں نے اسے ایک گاجر دی جسے اس نے منہ میں رکھ لیا لیکن ایک دو سیکنڈ بعد ٹائل کے فرش پر پھینک دیا۔ میں سمجھ گئی کہ اسے سبزیاں نہیں صرف گوشت پسند ہے۔ برتن دھونے کے بعد میں نے کچھ دیر اخبار پڑھا۔ اس کے بعد ٹی وی پر ایک فلم دیکھی پھر میں نے گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے تھے۔ ٹروڈی لیونگ روم میں تھی۔ میں کاؤچ سے اٹھی اور آواز لگائی۔

''واک ٹائم ہوگیا ہے۔''

اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ مجھے کچن میں جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ میں نے کیبنٹ کھول کر ایک پیکٹ نکالا جس میں اعشاریہ تین پانچ سات کا روگر ریوالور رکھا ہوا تھا۔ اسی کیبنٹ سے ایک سیل فون لیا۔ ٹروڈی کا پٹا پکڑا اور باہر نکل گئی۔ بعض وجوہات کی بنا پر رات میں بہتے پانی کی آواز تیز ہوجاتی ہے۔ اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ سڑک پر ایک بھی لائٹ روشن نہیں تھی۔ ہم ستاروں کی روشنی میں سڑک پر چلتے رہے۔ میری آنکھیں بہت جلد اندھیرے کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عادی ہوگئیں۔ میں ایک بڑے سے چپٹے ٹیلے پر جا کر رک گئی جہاں کچھ دیر بیٹھ سکتی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ٹھیک دس بج رہے تھے۔ میں نے سیل فون نکال کر ایک نمبر ملایا جو مجھے اچھی طرح یاد تھا۔

پہلی ہی گھنٹی پر جواب مل گیا اور ایک مردانہ آواز نے میرے ملائے ہوئے نمبر کے آخری چار ہندسے دہرائے۔

”تین آٹھ دو ایک۔“

”گڈ ایوننگ!“ میں نے کہا۔ ”تازہ ترین اطلاع کیا ہے؟“

”ہولڈ کرو۔“ اس نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”وہ یقینی طور پر ملک میں ہی ہے۔ نیو انگلینڈ میں کسی جگہ۔ اس سے ایک غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے ہم اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے میں کامیاب ہوسکے۔“

مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ اس بات کو کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ ”تمہارا اگلا قدم کیا ہوگا؟“

”ہم مزید گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ اگر وہ کوئی دوسری غلطی کرتا ہے تو تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔“

”شکریہ۔“

مرد کی آواز میں ایک واضح تبدیلی آگئی۔ اس نے کہا۔ ”جیسیکا! میں نے فائلیں پڑھیں اور ویڈیوز دیکھی ہیں۔ میں اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس میں کتنی دیر لگتی ہے لیکن یہ کام ضرور ہوگا۔“

”شکریہ۔“

میں اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی اور سیل فون کو پوری قوت سے دریا میں پھینک دیا۔ وہ ڈسپوزیبل فون تھا جس کے ضائع ہونے پر کوئی افسوس نہ ہوا۔ پھر میں ٹروڈی کو لے کر گھر واپس آگئی۔ میں نے تمام دروازوں کے تالے چیک کیے۔ کھڑکیاں بند کیں اور معمول کے مطابق رات کو سونے سے پہلے اپنا مخصوص مشروب پیا۔ مجھے ہمیشہ کی طرح ڈراؤنے خواب آنے لگے۔ کبھی میں دیکھتی کہ اپنے یونٹ کے پرانے ساتھیوں کے ساتھ کھانا کھا رہی ہوں اور ہنسی مذاق کر رہی ہوں پھر ان کے چہرے اور ہاتھوں سے خون بہنے لگا۔ کبھی مجھے گولیوں اور دھماکوں کی آواز آتی۔ میرا دم گھٹنے لگتا جیسے کوئی مجھ پر بوجھ ڈال رہا ہو۔ مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی تھی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے سینے پر بھاری بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں آنکھیں کھول کر دیکھا اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”میرے خدا۔ ٹروڈی ...... تم مجھے کچلنا چاہ رہی ہو۔“

میں نے اسے اپنے اوپر سے دھکیل کر ہٹایا اور کھڑی ہوگئی۔ نائٹ اسٹینڈ کا بلب روشن کیا۔ وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔

میں نے اس کے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری جگہ وہ ہے۔ وہاں جا کر لیٹو۔“

وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ میں نے پھر کہا۔ ”ٹروڈی جاؤ۔“

اس نے پھر بھی کوئی حرکت نہیں کی۔ میں نے اس کا کالر پکڑا اور غصے سے کہا۔ ”جاؤ۔“

میرا خیال تھا کہ وہ غرائے گی لیکن اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی جگہ پر ہی پلٹ گئی۔ اب مجھے اس کا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس کا کالر چھوڑ دیا۔ وہ خوفزدہ تھی اور لوٹ لگا رہی تھی۔ میں اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں لرزش محسوس کی۔ وہ جلدی جلدی سانس لے رہی تھی۔ اس زاویے سے میں اس کی پچھلی ٹانگ کا زخم دیکھ سکتی تھی۔

میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ”ٹھیک ہے ہنی! میں تمہارے لیے جگہ بناتی ہوں۔“

دو دن بعد میں اسے جانوروں کے اسپتال لے کر گئی۔ میں اپنے ساتھ وہ کاغذات بھی لائی تھی جو شیلٹر والوں نے مجھے دیے تھے۔ ڈاکٹر ڈینس نے ٹروڈی کا تفصیل سے معائنہ کیا۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب ایک آدمی کسی کام کے سلسلے میں کمرے میں آیا اور ٹروڈی اسے دیکھ کر غرانے لگی۔ ڈاکٹر ڈینس نے نرمی سے کہا۔ ”رالف! اس وقت تم چلے جاؤ۔“ اس کے جاتے ہی ٹروڈی پُرسکون ہوگئی۔

ڈاکٹر نے اسے دیکھنے کے بعد ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور بولی۔ ”یہ بہت اچھی ہے لیکن اس کے ساتھ کچھ مسائل تھے۔ یہ مردوں کو پسند نہیں کرتی اور میں اس کی وجہ بتاتی ہوں۔ اس کی پٹائی ہوئی ہے جس کے نتیجے میں کم از کم تین پسلیاں اور الٹی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ پسلیاں تو ٹھیک ہوگئیں لیکن ٹانگ میں مستقل لنگڑاہٹ آگئی۔“

میری نبض کی رفتار تیز ہوگئی اور چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ بہ مشکل اتنا ہی کہہ سکی۔ ”اوہ ...... اب میں سمجھی۔“

ڈاکٹر نے فائل بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تمہارے پاس ایک راستہ ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ توجہ اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پیار دو۔ جسمانی زخم تو بھر گئے لیکن......''

''اس آدمی کے بارے میں کیا کہو گی جس نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا؟''

''کیا شیلٹر کے پاس اس بارے میں کوئی معلومات ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ غصے سے بولی۔ ''میں اسے نہیں مانتی لیکن بعض اوقات سمجھوتا ہوجاتا ہے اور لوگ کسی حیل وحجت کے بغیر اپنے پالتو جانوروں سے دستبردار ہوجاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ چپکے سے اس کا معقول جرمانہ ادا کرتے ہوں اور آئندہ کوئی جانور نہ پالنے کا وعدہ بھی کرتے ہوں۔ اس کے بدلے میں کوئی مقدمہ نہیں چلتا اور نہ ہی کوئی سزا ہوتی ہے۔''

''اوہ۔ اب سمجھی۔'' میں نے کہا اور ٹروڈی کو لے کر گھر واپس آگئی۔

آئندہ چند دنوں میں ہم دونوں کافی گھل مل گئے۔ میں اسے اپنے ساتھ روزانہ لمبی واک پر لے کر جاتی اور کیونکہ اس سڑک پر برائے نام ٹریفک ہوتا تھا اس لیے میں اس کا پٹا چھوڑ دیتی تھی۔ پہلے دو دن تو وہ میرے ساتھ ہی چلتی رہی لیکن تیسرے دن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے کسی چیز کی بو محسوس کی اور جنگل کی طرف دوڑ پڑی اور جب میں نے اس کا نام لے کر بلایا تو وہ دلکی چال چلتی ہوئی واپس آگئی۔ ہم تقریباً آدھ گھنٹے تک یہ کھیل کھیلتے رہے اور میں نے اس سے بھرپور لطف اٹھایا۔

میں نے گھر پر بھی اس کے لیے دوسرے کھیلوں کا انتظام کیا لیکن اب اس نے ان میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ میرے ساتھ ہی سو رہی تھی۔ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ اب میں نے وہ ڈراؤنے خواب دیکھنا چھوڑ دیے تھے اور میں اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔ جب مجھے کہیں جانا ہوتا تو وہ میرے ساتھ ہی جیپ میں جاتی۔ پہلی بار وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی کچھ گھبرا رہی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے واپس شیلٹر ہوم چھوڑنے جارہی ہوں لیکن جب میں نے جیپ ایک اخبار کے اسٹال پر روکی تو وہ مطمئن ہوگئی۔

اسے گود لینے کے ایک ہفتے بعد میں ڈاک خانے سے اپنی ڈاک لینے گئی تو اس میں ایک بڑے سائز کا لفافہ ہی تھا جو دماغی امراض کے مرکز سے آیا تھا۔ اس کے ہر ایک پوسٹ کارڈ کی پشت پر لکھا ہوا تھا۔

''اپنا وعدہ یاد رکھنا۔ گریس۔''

میں نے وہ پوسٹ کارڈ ٹروڈی کے منے لہراتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ رہی تھی ڈسچارج پیپر کرنے کے بعد مجھے ان کے احکامات کی تعمیل نہیں کرنا ہوگی۔''

ٹروڈی نے جھک کر پوسٹ کارڈ سونگھا تو میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ کوئی حکم نہیں بلکہ وعدہ تھا اور میں بھی اسے نظر انداز نہیں کرسکتی۔''

شام کو دو گلاس لیموکارس اور مشروب پینے کے بعد میں اپنے مشن پر روانہ ہونے کی تیاری کرنے لگی۔ اس کے بعد میں نے غسل کیا۔ ٹروڈی باتھ روم میں بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی ناک پکڑ کر پیار سے کہا۔

''تم کہاں سے آئی ہو میری جان؟''

اس نے سر گھما کر مجھے دیکھا تو میں نے کہا۔ ''وہ کون تھا جس نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا اور کیوں؟'' پھر مزید کہا۔ ''کوئی تم جیسی سوئٹ کو تکلیف کیوں پہنچائے گا؟ کیوں؟''

میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا اور مجھے فوراً ہی یاد آنے لگا کہ میں نے آخری بار یہ لفظ فوجی ہوائی جہاز میں نیند سے بیدار ہونے کے بعد سرگوشیوں میں ادا کیا تھا۔ ''کیوں۔ کیوں۔ کیوں۔''

کپڑے بدلنے سے پہلے میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ میرے بائیں کندھے پر ایک گلابی رنگ کا داغ نظر آرہا تھا اور ایسا ہی ایک داغ دائیں گھٹنے پر بھی تھا۔ میری کلائی سے کہنی تک اس طرح کے کئی چھوٹے چھوٹے داغ موجود تھے۔ مجھے خیال آیا کہ وہی چست پتلون دوبارہ پہن لوں۔ اس طرح کم از کم گھٹنے کا داغ چھپ جائے گا لیکن میں نے اس خیال کو فوراً مسترد کردیا۔ اس کا دباؤ مجھے ان پٹیوں اور بینڈ ایج کی یاد دلادیتا تھا جو ایک مرتبہ میرے زخموں پر کی گئی تھی اور میں تاریک یادوں کو اپنے اوپر مسلط کرنا نہیں چاہتی تھی۔

گھر سے نکلتے وقت ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ ٹروڈی بھی میرے ساتھ جانے کے لیے پیچھے پیچھے چلی آئی حالانکہ میں نے گھر کی لائٹیں روشن رکھیں اور ٹی وی بھی آن کردیا تھا تاکہ میری غیر موجودگی میں وہ انسانوں کی آوازیں سنتی رہے۔ ''نہیں۔'' میں نے اسے آہستہ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے ساتھ نہیں جاسکتیں۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گی۔ کچھ نہیں ہوگا۔ تم آرام سے بیٹھو۔''

وہ خاموشی سے کچن کے فرش پر بیٹھ گئی۔ میں جلدی سے جیپ میں بیٹھی اور دس منٹ میں اپنی منزل پر پہنچ گئی۔ یہ جھیل کے کنارے ایک ریسٹوران تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام لیک فرنٹ رکھا گیا تھا۔ میں نے اپنا چھوٹا ہینڈ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بیگ اٹھایا اور اندر چلی گئی۔ اس میں میرا ڈرائیونگ لائسنس، کریڈٹ کارڈ، نقد رقم اور کچھ چھوٹی موٹی چیزیں تھیں البتہ اسلحہ رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ میں مطمئن تھی کہ جیپ میں اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور رکھا ہوا ہے۔ میں نے اندر جا کر بار سے چیز برگر اور سام ایڈمز کا ایک ٹن خریدا۔ ابھی دوسرا ٹن ختم نہیں ہوا تھا کہ موسیقی شروع ہوگئی۔ ایک عورت کونے میں کھڑی ہوئی گا رہی تھی۔ وہاں ایک بہت بڑا ڈانس فلور تھا جہاں سے جھیل اور ڈوبتے سورج کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اس عورت کا گانا سن کر میرے دل میں بھی امنگ جاگ اٹھی۔ اس وقت تک کوئی مرد فلور پر نہیں آیا تھا البتہ کچھ عورتیں ناچ رہی تھیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوگئی، تیسرا گانا ختم ہونے تک میرے کندھے اور گھٹنے بری طرح درد کرنے لگے لیکن میں پھر بھی ناچتی رہی۔

کچھ دیر بعد مرد بھی میرے ساتھ ناچ رہے تھے اور حیرت کی بات ہے کہ میں نے اس کا بالکل برا نہیں منایا۔ مزید مشروب منگوایا گیا اور میں مردوں کی فیاضی کا فائدہ اٹھاتی رہی۔ میں نے انہیں تین مختلف نمبر دیے اور اپنا نام مینڈی بتایا۔ جب کافی دیر ہوگئی تو مجھے خیال آیا کہ ٹروڈی گھر میں اکیلی ہے۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر آ گئی۔ گو کہ میں کافی تھک چکی تھی لیکن اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ کئی مہینوں بعد میں نے اپنے آپ کو اتنا خوش اور پُرسکون محسوس کیا تھا۔ گریس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ لوگوں پر بھروسا کرنا سیکھو لیکن اگلے ساٹھ سیکنڈ میں صورتِ حال بدل گئی۔ میں اپنی جیپ کے قریب پہنچی تھی کہ ایک آدمی مجھے پکارتا ہوا آیا۔ ''ہے مینڈی۔ مینڈی..... رک جاؤ۔''

میں اسے نظر انداز کرتی ہوئی جیپ کی جانب بڑھتی رہی۔ گاڑی کی چابی میرے ہاتھ میں تھی اور پارکنگ لاٹ میں اندھیرا تھا۔ وہاں کھڑی ہوئی تمام گاڑیوں کی روشنیاں بھی بند تھیں۔ وہ آدمی میرے قریب آ کر بولا۔

''مینڈی! میں اور ٹومی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہم تمہیں جلد ہی فارغ کردیں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے کو چھوا۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اپنا بازو اوپر اٹھایا اور اس کی ناک پر زوردار ضرب لگائی۔ پھر میں نے گھوم کر اس کی ٹانگ کے نچلے حصے پر لات جمائی۔ وہ تکلیف سے چلّانے لگا اور گر پڑا۔ ایک اور آدمی اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کی گردن پر دو گھونسے مارے۔ وہ بھی گر پڑا۔

میں رک گئی۔ مجھے چکر آنے لگا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور سانس بھی تیز چل رہی تھی۔ میں نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ دونوں آدمی زمین پر لوٹ رہے تھے۔ ان کے حلق سے غراہٹیں نکل رہی تھیں اور وہ مجھے برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں جیپ میں سوار ہوئی اور گھر کی طرف چل دی۔

گھر پہنچ کر میں نے ٹروڈی کی پیٹھ تھپکی۔ ٹی وی بند کیا اور منہ دھونے کے بعد بستر میں لیٹ گئی لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اپنے آپ پر افسوس اور ان مردوں پر غصہ آ رہا تھا جو مجھے تنہا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے جبکہ میں چند گھنٹوں کے لیے شہری زندگی میں گئی تھی اور اس کے ہر منٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

اگلے دو دن گھر میں کھانا کھاتے، سوتے اور کچھ نہ کرتے ہوئے گزرے۔ ٹروڈی میرے موڈ کو سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ میرے ساتھ چپکی رہی۔ میں اسے اپنے ساتھ لمبی واک پر لے جاتی رہی۔ تیسرے روز ہم گھر واپس آ رہے تھے کہ میں نے دیکھا ٹروڈی کی لنگڑاہٹ بڑھ گئی ہے۔ میں رک گئی اور ایک دیوار پر بیٹھ گئی۔ ہم اس وقت گھر سے تقریباً چوتھائی میل کے فاصلے پر تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ تکلیف میں مبتلا ہونے کے ساتھ ساتھ پیاسی بھی ہے۔ وہاں سے دریا پندرہ فٹ کے فاصلے پر تھا لیکن اس کے لیے پانی کیسے لایا جائے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی کہ شاید کوئی خالی بوتل مل جائے لیکن وہاں دور دور تک ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ اچانک ٹروڈی کے حلق سے ایک آواز نکلی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں میرا پڑوسی آرٹ ووڈز کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی صورتِ حال کا اندازہ لگالیا۔ اس نے مچھلی پکڑنے کا سامان سڑک کے کنارے رکھا۔ اپنے تھیلے میں سے پلاسٹک کی پیالی نکالی اور دریا سے پانی لے کر آ گیا۔ میں نے وہ پیالی ٹروڈی کے منہ سے لگائی تو اس نے فوراً ہی پانی پی لیا۔ اس کے بعد آرٹ دو مرتبہ پانی لے کر آیا اور تیسری مرتبہ اس نے خود ہی پیالی اس کے منہ کے قریب کردی۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد ٹروڈی نے وہ پانی پی لیا۔ آرٹ آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی تھوتھنی پر لایا۔ ٹروڈی نے پیار سے اسے سونگھا پھر آرٹ کا ہاتھ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پر پہنچا اور وہ اسے سہلانے لگا۔

''میں ابھی واپس آتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اس کی ضرورت نہیں۔ ہم چلے جائیں گے۔''

''ممکن ہے کہ تمہیں نہ ہو لیکن میں ایسا چاہتا ہوں۔''

پانچ منٹ بعد وہ اپنی ٹویوٹا کار لے کر آ گیا اور میں نے آہستگی سے ٹروڈی کو اس کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ آرٹ نے ہمیں گھر چھوڑا۔ جیسے ہی میں نے ٹروڈی کو گاڑی سے اتارا، وہ خوشی خوشی لنگڑاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ آرٹ بڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جس شخص نے اس پر تشدد کیا تھا، اس کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی؟''

''میں نہیں سمجھتی کہ ایسا کچھ ہوا ہوگا۔''

وہ اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ''یہ بہت بری بات ہے۔'' اس کی نظریں میرے کندھے اور گھٹنے کے نشانات پر تھیں۔ ''جو لوگ انسانوں یا کتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، انہیں اس طرح نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

''میں تم سے متفق ہوں۔''

اگلی مرتبہ میں اپنی معالج گریس سے ملنے گئی تو اس نے حسب معمول ادھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ میں بے دلی سے اس کی باتوں کا جواب دیتی رہی پھر میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میری فائل میں کیا لکھا ہے۔ یہی نا کہ میں نے بڑی بہادری سے جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ زخمی ہوئی اور اس کے بعد میں ذہنی وجذباتی دباؤ کا شکار ہوگئی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟''

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بالکل ٹھیک ہے جیسیکا۔''

''میں تمہیں ایک کہانی سناتی ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم ایک ہوشیار، مضبوط اور جوان لڑکی ہو۔ تمہیں فوج میں بھرتی کر کے خفیہ ایجنسی کی ذمے داری سونپ دی جاتی ہے اور کیونکہ وہ ایک عورت ہے، اس لیے اسے دنیا کے ان حصوں میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں عورتوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرنا، انہیں اذیت دینا یا جان سے مار دینا ایک عام بات ہے۔ لہٰذا اسے ٹوہ لینے اور جاسوسی جیسے سخت اور مشکل کام سونپے جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس کی زندگی ہمیشہ خطرے میں رہتی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ وہ پوری توجہ سے مجھے سن رہی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ سخت جان لڑکی فوج، میزبان ملک اور مختلف خفیہ ایجنسیوں کے لیے کام کرتی ہے۔ جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے، اسے وہاں بھیج دیا جاتا ہے جس طرح بڑے مقابلوں میں کسی کارآمد بیس بال کے کھلاڑی کو بھیجا جاتا ہے لیکن بعض اوقات انہیں قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا ہے۔''

میرے گال آنسوؤں سے تر ہو گئے اور ہاتھ پاؤں کپکپانے لگے۔ ''پھر ایک دن اس خاص کھلاڑی کو ایسے صوبے میں بھیج دیا گیا جس پر باغیوں کا کنٹرول تھا۔ شاید یہ اس کی زندگی کا سب سے خطرناک آپریشن تھا۔ اس علاقے میں داخل ہوتے ہی وہ نظروں میں آ گئی۔ وہ بڑی مشکل سے گولیوں اور دھماکوں سے بچتی ہوئی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی لیکن وہ بری طرح زخمی ہو چکی تھی۔''

گریس نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ ''وہ جرمنی کے ایک اسپتال میں زیر علاج تھی۔ وہیں ایک بوڑھی عورت اسے دیکھنے آئی جو بہت جلد ایسی ہی ایک خفیہ ایجنسی سے ریٹائر ہونے والی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ ''وہ کوئی حادثہ نہیں تھا۔ ایک مقامی وارلارڈ کی پوزیشن مستحکم کرنے کے لیے تمہارے ساتھ دھوکا کیا گیا۔'' اس عورت نے امریکی حکومت کے اس عہدیدار کا نام بھی بتا دیا جس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ایسا کرنا ہر ایک کے بہترین مفاد میں ہوگا کہ اس فوجی اور سیاسی آپریشن میں اس کارآمد کھلاڑی کی قربانی دی جائے۔''

میں نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولی۔ ''لیکن وہ عورت اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد کسی بھی فوجی یا سیاسی آپریشن میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ اب اس کا واحد مقصد اس امریکی عہدیدار کو تلاش کرنا اور اسے جان سے مارنا ہے جس نے اس کی زندگی کی پروا نہیں کی۔ یہی چیز اسے زندہ رکھے ہوئے ہے اور وہ رات کو ٹھیک طرح سو بھی نہیں سکتی۔ وہ ہر وقت اس سے انتقام لینے کا منصوبہ بناتی رہتی ہے۔ اب اس عورت کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہے کہ اس شخص سے ایک ہی دفعہ میں سارا حساب بے باق کر دے۔''

خاموشی کا ایک اور وقفہ آیا۔ میں نے قریب رکھے ہوئے باکس میں سے ایک ٹشو پیپر نکالا اور اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ گریس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''جیسیکا.....''

''ہاں۔ وہ لڑکی میں ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جیسیکا! اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ کوئی جرم سرزد ہونے والا ہے تو قانون کے تحت مجھ پر لازم ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس کی اطلاع دوں۔''

''ٹھیک ہے لیکن پہلے تمہیں تو یقین آ جائے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کیا مطلب؟''

''کیا تم بھول گئیں کہ میں نے شروع میں کیا کہا تھا؟'' میں نے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک کہانی سنا رہی ہوں اور میں نے صرف یہی کیا ہے۔''

☆☆☆

رات کو میں ٹہلنے کے لیے ٹروڈی کے ساتھ باہر گئی۔ میں نے ایک ڈسپوزیبل فون بھی لے لیا اور ایک اونچے ٹیلے پر بیٹھ گئی جہاں سے میں عموماً اس طرح کی کال کیا کرتی تھی اور مطلوبہ نمبر ملایا۔

''تھری ایٹ ٹو ون۔'' فوراً ہی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

''تازہ ترین اطلاع کیا ہے؟''

''ہولڈ کرو۔''

تھوڑی دیر بعد ایک اور جانی پہچانی آواز آئی۔ ''میرے پاس تمہارے لیے کچھ مزید معلومات ہیں۔''

''میں سن رہی ہوں۔''

اس نے اپنی بات ختم کرنے کے بعد کہا۔ ''جیسیکا! یاد ہے میں نے پہلے کیا کہا تھا۔ وہی بات اب بھی لاگو ہوتی ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک رہے گا۔''

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''تم نے اس یونانی فلسفی کا مقولہ سنا ہے کہ دریا بہتا رہتا ہے، وقت آگے بڑھتا ہے، تبدیلیاں آتی ہیں اور سب کچھ بدل جاتا ہے۔''

''تم کچھ بھی کہو جیسیکا۔'' اس نے کہا۔ ''ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر فون کرنا۔''

بات ختم ہوئی تو میں نے فون دریا میں پھینکا اور گھر کی طرف چل دی۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر میں ٹروڈی کو لے کر چہل قدمی کے لیے نکلی۔ اس بار بھی میرے پاس ڈسپوزیبل سیل فون تھا۔ میں نے اپنے مخصوص ٹیلے پر پہنچ کر وہ نمبر ملایا تو فوراً ہی... جانی پہچانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وہ ہمیں مل گیا۔ اس کا نام بل فرائٹ ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے ایک پتا اور کچھ دوسری معلومات فراہم کیں جنہیں میں نے بہ آسانی ذہن نشین کرلیا۔ ''یہی تمہارا مطلوبہ شخص ہے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے بہت زبردست کام کیا ہے۔''

''شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم دو باتیں اچھی طرح سمجھ لو۔ یہ گفتگو ختم ہونے کے بعد ہمارا کام مکمل ہوجائے گا اور یہ فون نمبر بھی دوبارہ کام نہیں کرے گا۔''

''سمجھ گئی۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ دوسری بات کیا ہے؟''

''تمہارا کام کرنا میرے لیے ایک اعزاز تھا۔'' اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ''براہِ مہربانی محتاط رہو اور اپنا بہت خیال رکھنا..... خدا حافظ۔''

بات ختم ہوتے ہی میں نے فون دریا میں پھینک دیا اور یوں محسوس ہوا جیسے بھی اس شخص کو جانتی ہی نہیں تھی۔

اگلے روز میں نے آرٹ کے گھر جا کر اسے حیران کردیا۔ دروازہ اسی نے کھولا اور بولا۔ ''جیسیکا! میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

ٹروڈی میرے ساتھ تھی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے آرٹ کو دیکھ کر کوئی سخت ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا، جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ کچھ زخم بہرحال بھر ہی جاتے ہیں۔

''اگر تم آج رات فارغ ہو تو میرا ایک کام کردو۔''

''ہاں۔ میں فارغ ہوں۔ کام بتاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے رات کو کچھ دیر کے لیے باہر جانا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم میرے گھر آجاؤ اور ٹروڈی کا خیال رکھو۔ میں نہیں جانتی کہ واپسی کب ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ نصف شب یا اس کے بعد آؤں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور یہ امکان بھی ہے کہ کبھی واپس نہ آؤں۔ اگر ایسا ہوا تو تم ٹروڈی کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور اس کا خیال رکھو گے۔ میری کتابوں کی الماری میں کئی ہزار ڈالرز رکھے ہوئے ہیں۔ وہ تم رکھ لینا۔''

آرٹ خاموش رہا تو میں نے کہا۔ ''اگر میں واپس آ گئی تو تم مجھ سے کبھی نہیں پوچھو گے کہ میں کہاں گئی تھی۔ کس سے ملنے گئی تھی اور کیا کر کے آئی ہوں۔''

آرٹ کا چہرہ بالکل خاموش اور پُرسکون تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ''مجھے کس وقت تمہارے گھر آنا ہوگا!''

☆☆☆

صرف بارہ گھنٹے بعد میں یٹھل نامی قصبے میں تھی۔ گھر سے نکلنا میری توقع سے زیادہ آسان رہا۔ آرٹ نے بڑی ہوشیاری سے ٹروڈی کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا اور میں چپکے سے باہر نکل گئی۔ بل ایک عمدہ مضافاتی علاقے میں رہتا تھا۔ وہ ایلب ریٹائر ہو چکا تھا اور اپنی بیوی مارتھا کے ساتھ یہاں رہ رہا تھا۔ گھر پر کوئی بچہ نہیں تھا اور نہ ہی وہاں الارم سسٹم لگا ہوا تھا۔ میں نے عقبی دروازے سے اندر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ پہلی منزل کی لائٹس ایک ایک کر کے بند ہو رہی تھیں۔ البتہ ٹیلی ویژن کی نیلی روشنی نظر آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہو گئی۔ میں نے مزید آدھ گھنٹے انتظار کیا پھر میں آگے بڑھی اور لان سے گزرتی ہوئی عقبی دروازے تک پہنچ گئی۔ اسے کھولنے میں چند سیکنڈ لگے۔ چھوٹی سی راہداری سے ہوتے ہوئے میں ایک بڑے اور صاف ستھرے کچن میں داخل ہوئی۔ اس کے بائیں جانب بھی ایک بہت بڑا لیونگ روم تھا۔ میں سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر گئی۔ بائیں جانب والے بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بستر پر دائیں جانب مارتھا اور بائیں جانب بل فرائٹ سو رہا تھا۔ میں نے بستر کے گرد ایک چکر لگایا پھر اپنے فوجی تھیلے سے ایک پولیس کا ڈنڈا نکالا جس کی لمبائی بڑھائی جا سکتی تھی اور اسے کھول کر بل کے سر کی ایک جانب ضرب لگائی۔ وہ چلایا اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔ مارتھا نے اٹھنے میں کچھ دیر لگائی لیکن میں نے اسے کچھ کہنے یا شور مچانے کا موقع نہیں دیا اور فوراً ہی اس کے سر پر پہنچ کر اس کے منہ پر ٹیپ لگا دیا اور پلاسٹک کی ڈوری سے اس کی کلائیاں اور ٹخنے باندھ دیے۔

میں واپس بل کی طرف آئی جو فرش پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ خون آلود چہرے پر رکھے ہوئے تھے اور بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے اسے خاموش کرنے کے لیے اس کے منہ پر بھی ٹیپ لگا دیا اور جھکتے ہوئے اس کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر بولی۔

''مسٹر فرائٹ! یہ ہے تمہارا انعام۔ اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔''

اس کے بعد میں نے اس پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیے۔ جب وہ بری طرح نڈھال ہو گیا تو میں نے اپنا اعشاریہ تین پانچ سات کا ریوالور اس پر تان لیا۔ اسے دیکھ کر وہ زور زور سے کراہنے اور غرانے لگا لیکن منہ پر بندھے ہوئے ٹیپ کی وجہ سے یہ آوازیں گھٹ کر رہ گئیں۔ میں نے اس کے قریب جا کر سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''بہن کی جانب سے ایک آخری تحفہ مسٹر فرائٹ۔''

پھر میں نے اپنا ریوالور نیچے کیا اور احتیاط سے نشانہ لیتے ہوئے گولی چلا دی۔ اس کے بعد میں نے وہاں رکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میرا مشن پورا ہو چکا تھا اور میں اپنے طور پر بہت خوش تھی۔

تین دن بعد اس وقت مشکل پیش آئی جب میں لان میں بیٹھی ٹروڈی سے کھیل رہی تھی۔ اچانک ہی وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور سڑک کی جانب دیکھنے لگی۔ میں بھی کھڑی ہو گئی اور دیکھا کہ ایک گہرے نیلے رنگ کی امپالا میری جیپ کے پیچھے آ کر رک گئی تھی۔ اس کی ڈکی پر ایک انٹینا اور پولیس کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

دو آدمی پولیس کی گاڑی سے برآمد ہوئے اور ٹروڈی غراتی ہوئی ان کی طرف لپکی۔ میں نے بمشکل تمام کالر پکڑ کر اسے پیچھے ہٹایا۔ ان دونوں آدمیوں نے ہلکے گرے رنگ کے سوٹ پہن رکھے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف پولیس سراغ رساں کے طور پر کروایا۔ ان میں سے ایک بولا۔

''کیا تمہارا نام ہی جیسیکا پیٹس ہے؟''

''ہاں۔ میرے ڈرائیونگ لائسنس پر یہی نام لکھا ہے۔''

دوسرا بولا۔ ''میم! اپنے کتے کو قابو میں رکھو۔''

''یہ ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔'' میں نے ٹروڈی کو پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''دراصل یہ مردوں کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔''

لیکن ٹروڈی مسلسل ان دونوں پر بھونکتی اور غراتی رہی۔ چھوٹے بالوں والا پیچھے ہٹا اور اپنا پستول نکالتے ہوئے بولا۔ ''تم ابھی اسی وقت اپنے کتے کو کنٹرول کرو۔ ورنہ میں اسے خطرہ سمجھتے ہوئے اس کے مطابق کارروائی کروں گا۔''

دوسرے نے نرم لہجے میں کہا۔ ''کیا تم اس کتے کو گھر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے اندر لے جاسکتی ہو؟''

میں نے ٹروڈی کو کچن کے دروازے سے باندھ دیا۔ اس کے باوجود وہ بھونکتی اور غراتی رہی۔ وہ دونوں چلتے ہوئے میری جیپ کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ میں فرار کی کوشش کرسکتی ہوں۔

سنہری بالوں والے نے کہا۔ ''میم! ہم بیتھل میں ہونے والے ایک واقعے کی تفتیش کررہے ہیں۔''

''بیتھل..... وہ تو یہاں سے کافی فاصلے پر ہے۔''

''کیا تم حال ہی میں وہاں گئی تھیں؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، نہیں۔''

چھوٹے بالوں والا بولا۔ ''کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو؟''

سنہری بالوں والا بولا۔ ''کیا تم بل فرائٹ نام کے کسی شخص کو جانتی ہو؟''

''نہیں۔''

چھوٹے بالوں والے نے ایک بار پھر کہا۔ ''کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''کون ہے یہ؟''

سنہری بالوں والے نے کہا۔ ''تم گزشتہ ہفتے کی شب کہاں تھیں؟''

''رات تو بہت بڑی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم کسی خاص وقت کی بات کرو۔''

چھوٹے بالوں والے کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''بارہ اور ایک کے درمیان۔''

''میں گھر میں ہی تھی۔ اپنے کتے کے ساتھ۔''

اس نے حسبِ عادت اپنا سوال دہرایا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ وہ دونوں مجھے دھمکی آمیز انداز میں دیکھنے لگے لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ میں ان سے بھی زیادہ سخت لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرچکی تھی جن میں فوجی اور اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسر اور دشمنوں کے لوگ شامل تھے۔

میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ''کیا فرائٹ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟''

سنہری بالوں والے نے کہا۔ ''گزشتہ ہفتے کی شب کوئی اس کے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی اور اس پر حملہ کیا۔ بیوی کو تو معمولی چوٹیں آئیں لیکن مسٹر فرائٹ کی بہت بری طرح پٹائی ہوئی اور پھر انہیں گولی ماردی گئی۔''

''تم مجھ سے کیوں پوچھ گچھ کررہے ہو؟''

لوک کھاوتیں

☆ محبت اندھی ہوتی ہے لیکن پڑوسی اندھے نہیں ہوتے۔

☆ اپنے لفظوں کو تول کر ادا کرو ورنہ لفظ تمہیں تلوادیں گے۔

☆ جس کے سب ہی دوست ہوں اس سے تعلق پر نظر ثانی کرو۔

☆ بارش ٹوٹی ہوئی جھونپڑی پر زیادہ زور سے برستی ہے۔

☆ تجربہ وہ کنگھی ہے جو زندگی ہمیں ایسے وقت دیتی ہے جب بال جھڑ جاتے ہیں۔

☆ اگر کپڑے کو وقت پر رفو کردیا جائے تو نو جگہ پر کپڑے پھٹنے سے بچ جاتے ہیں۔

☆ دو آدمیوں سے ملنا ناممکن ہے، ایک وہ جو خود کو پہچان لے دوسرا وہ جو خود سے بچھڑ جائے۔

☆ حسن خاموش بھی ہو تو بولتا ہے۔

☆ بے کار لوگ شیطان کو اکساتے ہیں۔

(مرسلہ: خان آصف گل۔ مانسہرہ)

اقوالِ زریں

☆ کائنات میں کوئی کسی کا اتنا انتظار نہیں کرتا جتنا اللہ اپنے بندے کی توبہ کا انتظار کرتا ہے۔

☆ زندگی اسی کو آزماتی ہے جو مشکل راستوں پر چلنا جانتا ہے۔ زندگی میں جیت بھی اسی کی ہوتی ہے جو سب کچھ کھو کر مسکرانا جانتا ہے۔

☆ زندگی میں اگر کوئی آپ سے روٹھ جائے تو یہ مت دیکھنا کہ غلطی کس کی ہے، اسے آگے بڑھ کے منا لینا کیونکہ ضد کی جنگ میں اکثر جدائی جیت جاتی ہے۔

☆ زندگی میں جو لوگ عزیز ہوتے ہیں، وہ ماضی کی دھند میں کہیں کھو جاتے ہیں اور جن سے مطلب کا تعلق ہوتا ہے وہ اتنے قریب ہوجاتے ہیں کہ پھر بچھڑنے کا تصور بھی محال لگتا ہے۔

☆ زندگی بذاتِ خود جینے کے قابل نہیں اسے جینے کے قابل بنانا پڑتا ہے۔

☆ دل کے دروازے ان لوگوں کے لیے ہمیشہ کھلے رکھو جو دستک کے قائل نہیں ہوتے۔

(مرسلہ: عبدالجبار رومی انصاری۔ چوہنگ سٹی لاہور)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کیونکہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، اس کی تین یا چار پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں اور کسی نے اس کے گھٹنے کا نشانہ لے کر گولی چلائی ہے۔ یہ طریقہ آئرش ری پبلکن آرمی کا ہے جو وہ ان مقامی لوگوں سے انتقام لینے کے لیے اختیار کرتی ہے جو انہیں تنگ کرتے ہیں۔ اس کا گھٹنا اور جوڑ تباہ ہو چکے ہیں۔ اگر وہ ٹھیک ہو گیا تب بھی ساری عمر لنگڑا کر چلتا رہے گا۔''

میں اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولی۔ ''بے چارہ..... لیکن تم مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کیوں آئے ہو؟'' چھوٹے بالوں والوں نے کہا۔

''کیونکہ ہماری تفتیش کے مطابق وہ کبھی ایک مادہ کتیا کا مالک تھا، ایک تحقیقات کے نتیجے میں وہ اس سے محروم ہو گیا۔ اس کتیا کی ٹانگ اور پسلیاں زخمی ہو گئی تھیں اور اسے ایک پناہ گاہ میں پہنچا دیا گیا جہاں سے چند ہفتے پہلے تم نے اسے گود لے لیا۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ وہ نہیں ہے۔''

''مس۔'' سنہری بالوں والا بولا۔ ''تم نفسیاتی مسائل کی وجہ سے فوج سے ڈسچارج ہوئی ہو۔ اگر تم تعاون کے لیے تیار ہو تو ہم بھی تم سے جائز نرمی برت سکتے ہیں۔ ہم تم سے آخری بار پوچھ رہے ہیں کہ گزشتہ ہفتے کی شب کیا ہوا تھا؟ اگر تم نے اب بھی تعاون نہ کیا تو تمہارے لیے بہت سنگین صورت حال ہو سکتی ہے۔''

''اگر تم مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو تو اس میں تمہیں ناکامی ہوگی۔''

چھوٹے بالوں والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''میں نے بہت برداشت کر لیا۔ ہمیں مقامی جج سے وارنٹ لے کر اسے گرفتار کرنا ہوگا اور ہم یہ شکایت بھی کریں گے کہ اس نے اپنے کتے کے ذریعے ہمیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔''

وہ دونوں واپس جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ میں نے کسی کے سیٹی بجانے کی آواز سنی جو ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ آرٹ ووڈز تھا۔ اس نے قریب آ کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''ہائے جیسیکا! کیا ہو رہا ہے؟''

''جناب.....'' سنہری بالوں والے نے کچھ کہنا چاہا لیکن آرٹ نے اس کی بات کاٹ دی اور مجھ سے کہا۔

''تم نے ابھی تک مجھے وہ کھانے کی ترکیب نہیں دی جس کا وعدہ تم نے گزشتہ ہفتے ڈنر پر کیا تھا۔ یقین کرو، اس روسٹ کا ذائقہ میں ابھی تک محسوس کر رہا ہوں۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایک دو دن میں دے دوں گی۔ دراصل وہ میری کتابوں میں کہیں دب گئی ہے۔''

سنہری بالوں والے نے آگے بڑھ کر اپنا کارڈ دکھایا اور آرٹ سے پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کون ہو؟''

''میں جیسیکا کا قریب ترین ہمسایہ ہوں۔''

سنہری بالوں والا بولا۔ ''تم نے ابھی کہا کہ تم دونوں نے گزشتہ ہفتے کی شب ایک ساتھ ڈنر کیا تھا؟''

''بالکل۔ جیسیکا نے مجھے کھانے پر بلایا تھا۔ میں نے زندگی میں اتنا مزے دار کھانا نہیں کھایا۔ واقعی یہ کھانا پکانے کا فن جانتی ہے۔''

چھوٹے بالوں والے نے بے یقینی کے انداز میں پوچھا۔ ''گویا تم نے گزشتہ ہفتے کی شب اس کے ساتھ ڈنر کیا تھا؟''

''ہاں۔'' آرٹ نے کہا۔ ''کیا کوئی گڑبڑ ہے؟''

''اور تم کتنی دیر اس کے ساتھ رہے؟''

آرٹ نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں یہ نہیں بتا سکتا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میں جیسیکا کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا۔''

''اس میں شرمندہ ہونے والی کیا بات ہے؟'' سراغ رساں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''کیونکہ میں اتوار کی صبح ناشتے تک یہیں تھا۔''

اس کے بعد دونوں سراغ رسانوں نے آرٹ سے کچھ اور سوالات کیے۔ آرٹ نے ان سے وعدہ کیا کہ ضرورت پڑنے پر وہ اپنا بیان حلفیہ بھی دے سکتا ہے۔ وہ دونوں کچھ مطمئن اور کچھ مایوس ہو کر چلے گئے۔ اس کے بعد میں نے ٹروڈی کو باہر نکالا اور آرٹ سے کہا۔ ''تم بالکل صحیح وقت پر آئے۔''

''میں نے پورے دن میں یہی ایک کام کیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم یہاں کیسے آ گئے؟'' میں نے کہا۔ ''عام طور پر اس وقت تم مچھلیاں پکڑنے نہیں جاتے۔''

ٹروڈی زمین پر لوٹنے لگی۔ وہ نیچے بیٹھ کر اس کا پیٹ سہلانے لگا۔ ''جب پولیس کی گاڑی تمہارے دروازے پر آ کر رکی اور میں نے ان سراغ رسانوں کو گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ گو کہ میں ایک عام سا استاد ہوں لیکن اتنا احمق بھی نہیں کہ سامنے کی بات نہ سمجھ سکوں۔ جب تم نے ہفتے کی شام مجھے اپنے گھر آنے اور ٹروڈی کا خیال رکھنے کے لیے کہا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ تم کسی خاص مقصد کے تحت گھر سے باہر جا رہی ہو اور فوراً میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ پولیس اسی سلسلے میں یہاں آئی ہے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چنانچہ میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

''یہ تم نے کوئی عقل مندی کا کام نہیں کیا بلکہ اس میں تمہارے لیے خطرہ بھی تھا۔ اگر بات بگڑ جاتی اور پولیس والے تمہارے بیان پر یقین نہ کرتے تو تمہیں بھی ہتھکڑی لگ جاتی اور تم میرے ساتھ پولیس کی گاڑی میں حوالات جا رہے ہوتے۔''

''میرے لیے اس سے زیادہ خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ تمہارا ساتھ مل جائے۔'' وہ شوخی سے بولا۔

اس نے جو کچھ میرے لیے کیا، اس پر میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی لیکن میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ میرے دائیں گھٹنے اور بائیں کندھے میں اب بھی درد ہو رہا تھا لیکن لگ رہا تھا جیسے میری کوئی چیز کھو گئی ہے۔ اس کے باوجود میں مطمئن تھی۔

آرٹ نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم وہ کھانے کی ترکیب نکال کر لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دوبارہ آ جائیں۔''

''میرے پاس ایسی کوئی ترکیب نہیں ہے۔''

آرٹ نے آہستہ سے کہا۔ ''میری دادی کے پاس یہ ترکیب تھی۔ اگر تم میرے ساتھ ڈنر کرنا چاہو تو میں تمہارے لیے یہ ڈش بنا سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں آج تمہارے ساتھ ڈنر کروں گی۔''

آرٹ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔''

ٹروڈی میرے پاس آئی اور میری دائیں ٹانگ پر سر رگڑنے لگی جیسے وہ مجھے کوئی پیغام دے رہی ہو، میں اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولی۔ ''آرٹ! آج کی رات تمہارے نام۔''

''پوری زندگی کیوں نہیں۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

ٹروڈی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس لمحے وہ مجھے بہت خوش لگ رہی تھی اور کافی عرصے بعد میں نے بھی پہلی بار اپنے آپ کو ایسا ہی محسوس کیا۔ پڑھنے والے سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے دشمن کو تلاش کرتے کرتے ٹروڈی کے سابق مالک تک کیسے پہنچ گئی..... لیکن سچ تو یہ ہے کہ ٹروڈی کی حالت دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گئی۔ میرا دشمن بدل گیا۔ اب میں اس شخص سے حساب بے باق کرنا چاہ رہی تھی جس نے ٹروڈی کو اس حال تک پہنچایا تھا۔

دبادو...

ایک خاتون پالتو جانوروں کی دکان میں گئیں اور وہاں انہوں نے ایک نوکیلی چونچ والی بڑی سی چڑیا دیکھی تو دکاندار سے پوچھا۔ اس انوکھی چڑیا کو کیا کہتے ہیں؟

اس کا نام سم سم ہے اور اس کی نسل علی بابا کے زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ کرتی کیا ہے؟ دکاندار نے خاتون کو جواب دینے کے بجائے چڑیا سے کہا کرسی دبادو۔ چڑیا اڑ کر کرسی پر پہنچی اور چٹ چٹ کر کے منٹوں میں اسے ہڑپ کر گئی۔

خاتون کو بڑی حیرت ہوئی۔ انہوں نے چڑیا سے کہا میز کو دبادو چڑیا میز پر پہنچی اور اسے بھی ہڑپ کر گئی۔ خاتون نے کہا میں یہ چڑیا ہر قیمت پر خریدوں گی۔

دکاندار نے وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا شام کو جب میرا شوہر دفتر سے گھر آئے گا تو پوچھے گا یہ کون سی چڑیا ہے؟ میں کہوں گی اس کا نام سم سم ہے۔ اس کی نسل علی بابا سے چلی آ رہی ہے۔ وہ حسب معمول جوتے اتار کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہے گا، بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا میرے پاؤں دبادو۔

زخم

ایک صاحب کو ملازم کی شدید ضرورت تھی۔ ان کا ایک دوست ایک شخص کو ملازمت کے لیے ان کے پاس لے آیا۔ انہوں نے پوچھا کیا تم شادی شدہ ہو؟ ملازمت کا امیدوار بولا۔ نہیں صاحب! میرے چہرے پر جو زخم ہیں وہ دراصل سائیکل کے ایک حادثے کا نتیجہ ہیں۔

بندوق

عورت نے کہا۔ ہائے مجھے موسیقی سے کتنی محبت ہے، کاش میں ایک گانے والا پرندہ ہوتی۔ مرد نے اس پر اپنی محبت کا اظہار یوں کیا کہ اگر تم پرندہ ہوتیں تو کاش میں ایک بندوق ہوتا۔

تاک میں

حضرت لقمان نے باوجود عمر درازی کے کوئی مکان نہیں بنایا، ایک جھونپڑی میں جاں بحق تسلیم ہوئے۔ ملک الموت نے پوچھا باوجود اتنی بڑی زندگی کے آپ نے مکان کیوں نہیں بنایا؟ آپ نے فرمایا جس کی تاک میں آپ رہیں تو اس کو مکان بنانے کی کب سوجھتی ہے۔

(مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

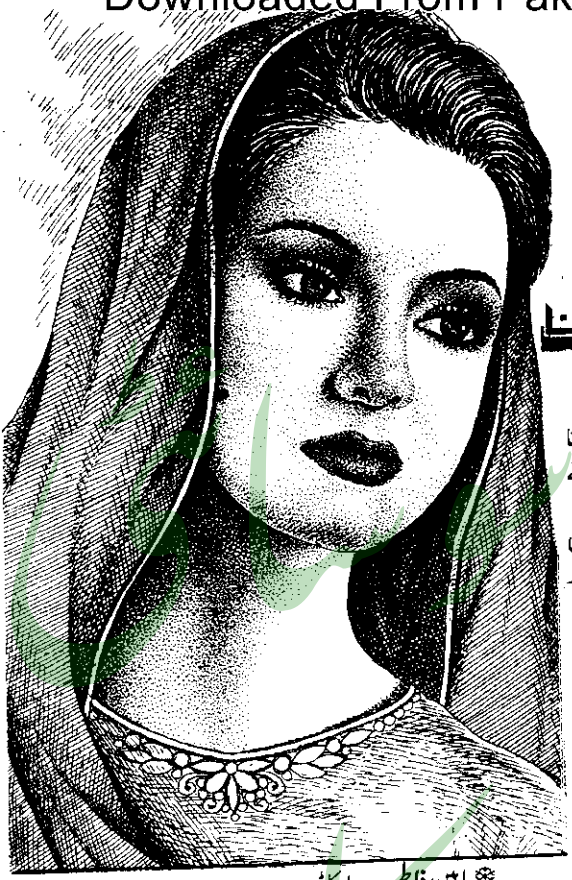

محفلِ شعروسخن

❄ محمد نوید ہاشمی، استاد فرحان ہاشمی..... قصور
کتنا مشکل تھا اس کو خدا حافظ کہنا
کاش اس وقت ہم بے زباں ہوتے

❄ احمد خان توحیدی..... راولپنڈی
لاریب تیری روح کو تسکین ملے گی
تو قرب کے لمحات میں قرآن پڑھا کر

❄ محمد اشفاق سیال .... شورکوٹ سٹی
آدمی آدمی کو کھائے چلے جاتا ہے
کچھ تو تحقیق کرو اس نئی بیماری پر

❄ مہوش خان..... حیدرآباد
کچھ لوگ بچھا کر کانٹوں کو گلشن کی توقع رکھتے ہیں
شعلوں کو ہوائیں دے دے کر ساون کی توقع رکھتے ہیں
ماحول کے تپتے صحرا سے حالات کی اجڑی شاخوں سے
ہم اہلِ جنوں پھولوں سے بھرے دامن کی توقع رکھتے ہیں

❄ محمد شہباز اکرم نوئی..... پاکپتن شریف
لفظ کریں گے اشارہ جانے کا دلنشیں
تم آنکھیں پڑھنا اور رک جانا

❄ داؤد اشفاق ..... اوکاڑہ
جاں تک دینے کی باتیں ہوتی ہیں یہاں
پر یقین مانو، لوگ دل سے دعا تک نہیں دیتے

❄ ناہید یوسف..... اسلام آباد
میری عقل و ہوش کی سب حالتیں
تم نے سانچے میں جنوں کے ڈھال دیں
کرلیا تھا میں نے عہدِ ترکِ عشق
تم نے پھر بانہیں گلے میں ڈال دیں

❄ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ
راہِ حیات کی تلخیاں پیتے پیتے
اب تو محسن بہت کڑوے ہوگئے ہیں ہم

❄ اشفاق شاہین..... لاہور
ہوا کے عکس میں تخلیق کررہا ہوں تجھے
مجھے خبر ہے میرا خواب ٹوٹ جائے گا

❄ زرین آفریدی..... حیدرآباد، سندھ
ایسا نہ ہوکہ یہ درد بنے درد لا دوا
ایسا نہ ہوکہ تم بھی مداوا نہ کرسکو
میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو جستجو
میرے سوا کسی کی تمنا نہ کرسکو.....

❄ ملائکہ حریم..... حجرہ شاہ مقیم
اس لیے نہ کیا تلخیِ جہاں کا گلہ
ترا خیال پسِ پردہ مسکراتا تھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

❄ رمضان پاشا...... گلشنِ اقبال، کراچی
آج موسم کا اشارہ ہے، کوئی آئے گا
گھر کا آنگن نہ سہی دل ہی کشادہ کرلیں

❄ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ شرقی
عید کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

❄ وزیر محمد خان...... بٹل ہزارہ
کچھ یاد کرکے آنکھ سے آنسو نکل گئے
مدت کے بعد گزرے جو اس گلی سے ہم

❄ مرحا گل، رمنا گل...... درابن کلاں
جو دوستی نہیں ممکن تو پھر یہ عہد کریں
کہ دشمنی میں بہت دور تک نہ جائیں گے

❄ سید ظفر عباس زیدی...... بھوانہ
صدیوں سے تجھے تکتے ہوئے سوچ رہا ہوں
جی تیرے خدوخال سے بھر کیوں نہیں جاتا

❄ محمد یونس چودھری...... لاہور
پھولوں میں دلکشی نہ ستاروں میں روشنی
اک تیرے روٹھنے سے زمانے بدل گئے

❄ مہتاب احمد...... حیدرآباد
کوئی تعویذ دو ردِ بلا کا
محبت میرے پیچھے پڑگئی ہے

❄ ریاض بٹ...... حسن ابدال
کھڑکیاں جاگتی آنکھوں کی کھلی رہنے دو
چاند کو دل میں اترنا ہے اسی زینے سے

❄ منیر شگفتہ...... وہاڑی
فاختہ کے لیے لکھتے ہیں قصیدے بھی وہی
جن کے الفاظ سے بارود کی بو آتی ہے

❄ سلیم قادر...... میانوالی رانجھا
عدل کی تم نہ ہمیں آس دلاؤ کہ یہاں
قتل ہوجاتے ہیں زنجیر ہلانے والے

❄ شاہد علی...... فیصل آباد
قصۂ درد سناتے ہوئے ڈر لگتا ہے
کوئی پسِ دیوار کھڑا ہو جیسے

❄ قاضی عرفان احمد، ماسٹر جمیل انور...... چواسیدن شاہ
یہ شرطِ الفت بھی عجب ہے جمیل
میں پورا اترتا ہوں وہ معیار بدل دیتے ہیں

❄ محمد حسان گل سیال...... روہڑی، سکھر
بندے تجھے کس طرح بھلادیتے ہیں مولا
ہم سے ترا اک شخص بھلایا نہیں جاتا
اک بار جو ہوجائے رقم صفحۂ دل پر
وہ نام کبھی دل سے مٹایا نہیں جاتا

❄ عبدالجبار رومی انصاری...... لاہور
کوئی تو پھول کھلائے دعا کے لہجے میں
عجب طرح کی گھٹن ہے ہوا کے لہجے میں
نہ جانے خلقِ خدا کون سے عذاب میں ہے
ہوائیں چیخ پڑی ہیں التجا کے لہجے میں

❄ عاصمہ سعید...... سرگودھا
کل رات ہوائیں تیز بہت تھیں
اور بادل ٹوٹ کے برسا تھا
گلیاں کوچے جل تھل تھے
پر سوچ کا صحرا پیاسا تھا

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ...... خانیوال
بہت دیر سے کوئی پیغام نہیں آیا
بھولنے والوں کی خدا خیر کرے

❄ ادریس احمد خان...... ناظم آباد، کراچی
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان...... فورٹ عباس
رنگ جدا آہنگ جدا مہکار جدا
پہلے سے اب لگتا ہے گلزار جدا

❄ سنعیہ منظور...... یوحنا آباد۔ لاہور
ہزار تشنہ سی حسرتوں کے بوجھ تلے
یہ جو دھڑکتا ہے دل ...... کمال کرتا ہے

❄ عاطف علی...... میرپورخاص
چاند کی پگھلی ہوئی چاندی میں
آؤ کچھ رنگ سخن گھولیں گے
تم نہیں بولتی ہو؟ مت بولو
ہم بھی اب تم سے نہیں بولیں گے

❄ سائرہ نواب...... پشاور
غم ہائے روزگار میں الجھا ہوا ہوں میں
اس پر ستم یہ ہے اسے یاد آرہا ہوں میں
اے وحشتو! مجھے اسی وادی میں لے چلو
یہ کون لوگ ہیں یہ کہاں آگیا ہوں میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

❄ اسد خان...... مانسہرہ

شہرِ محنت میں بھی ہیں یاد وہ اشک
اب جو قطرے مری جبیں کے ہیں

❄ لبنیٰ وکیل ......کوئٹہ

ہم کو مٹا نہ دیں یہ زمانے کی مشکلیں
لیکن یہ مشکلیں تو ہزاروں کے ساتھ ہیں

❄ عظیم احمد......جھنگ سٹی

اسے دیکھے زمانے بھر کا یہ چاند
ہماری چاندنی سائے کو ترسے

❄ صبا سحر......کراچی

ہے فرق دیر و حرم میں فقط یہی کہ حیات
یہاں ہے جانِ تمنا وہاں تمنائی

❄ زوہیب احمد ملک......گلستانِ جوہر کراچی

کبھی مورخ فصلِ جنوں سے کر معلوم
کیا ہے کتنے مقاتل کو سرخرو ہم نے
امامِ شہر سے پوچھ اس نمازِ خوف کا حال
کیا تھا جس کے لیے خون سے وضو ہم نے

❄ انعم کمال ......حیدرآباد

سلا کر حال کی تاریکیوں میں
مجھے ماضی میں چونکاتے ہیں یہ خواب

❄ نوشتہ گلزار......بھکر

وقت کے جسم کی خراش ہوں میں
اپنے اندر سے پاش پاش ہوں میں

❄ کاشف علی......ملتان

جمودِ جنبش کی رزم گاہوں میں ساعتِ جنگ آچکی ہے
سماج کے استخواں فروشوں سے زندگی تنگ آچکی ہے

❄ ثنا صادق......کراچی

اک سبز سبز جھیل میں کشتی ہے سرخ سرخ
اک جسم خواب خواب ہے اک جاں ہے خواب خواب

❄ شاہینہ مہتاب......چنیوٹ

جو اپنے طور سے ہم نے کبھی گزارے تھے
وہ صبح و شام تو جیسے فسانے ہوگئے ہیں

❄ عنبرین خان......بہاولپور

اُس کے عروج کی تھی بہت آرزو ہمیں
جس کے عروج ہی میں ہمارا زوال تھا

❄ زویا علی......سکھر

ترا خیال تو ہے پر ترا وجود نہیں
ترے لیے تو یہ محفل سجائی تھی میں نے

❄ جنید احمد ملک......گلستان جوہر کراچی

مجھ میں آ کے گرا تھا اک زخمی
جانے کب تک پڑا رہا مجھ میں

❄ امتیاز احمد......پھالیہ

اب جس کی دید کا ہے سودا ہمارے سر میں
وہ اپنی ہی نظر میں اپنا ہی اک سماں تھا

❄ اسامہ جنید......کراچی

فکرِ ایجاد میں گم ہوں مجھے غافل نہ سمجھ
اپنے انداز پر ایجاد کروں گا تجھ کو

❄ صائمہ زبیر......بہاولنگر

ملتے رہیے اسی تپاک کے ساتھ
بے وفائی کی انتہا کیجیے

❄ ولدار پرویز......راولپنڈی

دل میں اب سوزِ انتظار نہیں
شمعِ امید بجھ گئی ہو کیا

❄ عالیہ خان ......پشاور

وہ زلف ہے پریشاں، ہم سب ادھر چلے ہیں
تم بھی چلو کہ سارے آشفتہ سر چلے ہیں

❄ ہاشم علی......ملتان

کیسے زمیں پرست تھے عہدِ وفا کے پاس دار
اڑ کے بلندیوں میں ہم، گردِ ملال ہوگئے

کوپن برائے شمارہ اگست 2017

محفلِ شعر و سخن

نام : ____________________

پتا : ____________________

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اعتماد شکن

ظفر اقبال ظفر

چاہے شطرنج کی بساط ہو یا زندگی کی بازی لگی ہو...دونوں صورتوں میں حاضر دماغی اور چالوں کو چلنے اور سمجھنے کا ہنر آنا چاہیے ورنہ دوستوں کے روپ میں دھوکا ایسے ہی اعتماد کو ڈستا ہے جیسے اس کے آستین کے سانپ نے اسے ڈنک مارا تھا مگر ...اس بار سانپ کو اسے اپنا ہی زہر لے ڈوبا۔

اس ہم سفر کا قصہ جسے نہ سفر کی فکر تھی اور نہ ہی ہم سفر کی

احمر کا اضطراب کم نہیں ہو رہا تھا۔

اس کے دل میں شکستگی کے طوفان اٹھ رہے تھے۔ دن بھر دفتر میں اندیشوں بھرے خیالات کی یلغار اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کرتی رہتی تھی۔ گزشتہ کئی دنوں سے رات رات بھر جاگنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ آنکھوں میں نیند کی جگہ خوف اور غصے کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔ اب وہ خود کو انتہائی بے بس اور کمزور سمجھنے لگا تھا۔ جیون سفر کی ساری خوشیاں اس سے روٹھ گئی تھیں۔ زندگی کے حسین خوابوں کی کرچیاں چنتے چنتے اب تو اس کی پلکیں بھی زخمی ہو گئی تھیں۔ احمر کے سامنے اب رنج و غم کا طویل صحرا تھا۔ کاش..... کاش یہ سب کچھ نہ ہوتا..... کاش زندگی کے حصار میں کوئی دراڑ نہ آئی ہوتی۔ کاش دکھ اور بے یقینی کا کوئی جھونکا اسے الجھن

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

زدہ دنوں اور اذیت ناک راتوں کی طرف نہ دھکیلتا۔ اضطراب تھا کہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

آج بھی لگاتار تین سگریٹوں کا دھواں اڑانے کے باوجود احمر کے سینے میں غصے اور شکستگی کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ دیوار گیر گھڑی میں رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ بیڈ روم میں شائلہ لحاف اوڑھے بے خبر سو رہی تھی..... اپنے حسن کی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ۔ شائلہ کے ہونٹوں پر ہر وقت ایک قدرتی مسکان رہتی تھی اور یہ مسکان سوتے ہوئے بھی اس کے لبوں پر مچلتی دکھائی دے رہی تھی۔

احمر نے تھکی تھکی نظروں سے شائلہ کے خوابیدہ سراپا کو دیکھا اور بیڈ روم سے باہر نکل گیا۔ گیلری کے خنک ماحول میں آج ایک بار پھر احمر خود کو بکھرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

شائلہ، احمر کا خوبصورت انتخاب تھی کیونکہ اسے دیکھنے سے پہلے احمر محبت کی تڑپ اور لگن سے بالکل آشنا نہیں تھا۔ وہ خاندان میں شادی کی ایک تقریب تھی جس میں احمر نے شائلہ کو پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ بلاشبہ شائلہ طلسماتی حسن کا..... پیکر تھی۔ اس کے حسین چہرے پر بکھری ہوئی مسکراہٹ نے احمر کے دل میں تلاطم برپا کر دیا۔ اسے اپنے سینے میں شائلہ کو پا لینے اور حاصل کر لینے کی خواہش شدت کے ساتھ سر پٹکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ احمر اپنی کیفیت پر قابو نہیں پا سکا۔

اپنے سینے کی ساحلی دیواروں کو توڑتے ہوئے طوفان کے تھم جانے کا انتظار بھی نہ کر سکا۔ موقع پاتے ہی شائلہ کے قریب جا کر سرگوشی کر ڈالی۔

''آپ مجھے اچھی لگی ہیں۔''

''میں تو سب کو اچھی لگتی ہوں۔'' شائلہ نے ایک ادائے بے نیازی سے احمر کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''نہیں، آپ مجھے بہت زیادہ اچھی لگی ہیں۔'' احمر نے اپنی تیز سانسوں کو ضبط کی گرہ دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' شائلہ نے ایک بار پھر اپنے جادوئی لہجے کی کھنک احمر کی طرف اچھال دی۔ اس کے بعد شائلہ نے احمر کی جانب دیکھتے ہوئے مترنم قہقہہ بھی لگایا۔

احمر کے دل نے بچکولا کھایا اور پھر احمر نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شائلہ کی مسکراہٹ اور کھنکتی ہوئی ہنسی کو اپنے سینے میں سمیٹ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

احمر خود بھی کچھ کم نہیں تھا۔ مردانہ وجاہت سے بھرپور شخصیت کا مالک تھا اور ایک معروف تجارتی کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر پُرکشش جاب کر رہا تھا۔ احمر کو نارسائی کا دکھ زیادہ دن نہیں جھیلنا پڑا۔ ناہید آپی نے احمر کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیا پھر..... احمر اور شائلہ کے ملاپ میں اہم کردار ادا کیا۔ رشتے کے پیغام سے لے کر شادی کی تکمیل تک سارے مرحلے بخوبی انجام پا گئے۔ احمر شائلہ کو پاتے ہی گویا محبت کی راجدھانی کا پریم راجا بن گیا۔ دفتر سے طویل رخصت کے سبب شادی کے ابتدائی دن چاہت کے خوش گوار جزیروں پر پیار کی رنگینیوں میں کٹ رہے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے فراغت کے دن ڈھل گئے۔ چھٹی کا آخری دن غروب ہونے سے پہلے ہی احمر کو کراچی تبادلے کا پروانہ مل گیا۔

شائلہ کچھ دن میکے میں گزارنا چاہ رہی تھی لیکن احمر نہیں مانا اور شائلہ کو اپنی بے تاب چاہت کی آغوش میں لے کر کراچی آ گیا۔ کمپنی کی طرف سے تین کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت اور آرام دہ فلیٹ کراچی کے پوش علاقے میں انہیں مل گیا تھا۔ احمر کے لیے پریشانی بس یہی تھی کہ اس کا فلیٹ دفتر سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر تھا جبکہ احمر اپنے دفتر سے پلک جھپکتے ہی گھر پہنچنے کی فکر میں رہتا تھا۔ شائلہ کی محبت کی دھیمی دھیمی آنچ شادی کے بعد کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔ چاہت کی چنگاریاں ہر لمحہ احمر کے رگ و پے میں بکھرتی جا رہی تھیں۔

لیکن کبھی کبھی ایک کسک احمر کے دل میں بے تابی کے ساتھ سر ابھارتی تھی۔

☆☆☆

تین ماہ قبل کمپنی کے نئے مرکزی دفتر کا افتتاح ہوا تھا۔ احمر کی عدیل سے ملاقات اسی افتتاحی تقریب میں ہوئی تھی۔ اتفاق سے احمر کو بیٹھنے کے لیے عدیل کے برابر والی نشست ملی تھی۔ عدیل چینی زبان کا ٹیوٹر تھا اور ایک مقامی لینگویج انسٹی ٹیوٹ میں چینی زبان کی کلاسیں لیتا تھا۔ عدیل پینتیس سال کے لگ بھگ انتہائی خوب رو شخص تھا۔ اس کی شخصیت وجاہت اور جمالیاتی حسن سے بھرپور تھی اور انداز گفتگو بھی شائستہ اور شگفتہ تھا۔ احمر کو چینی زبان سے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی البتہ گفتگو کے دوران جب عدیل نے بتایا کہ وہ شطرنج کھیلنے کا شوقین ہے تو احمر کی دلچسپی عدیل میں دو چند ہو گئی اور احمر کو یوں لگا جیسے پیاسے کو کنویں کا پتا مل گیا ہو۔ احمر کو زمانہ طالب علمی سے جنون کی حد تک شطرنج کا شوق تھا۔ شادی کے فوراً بعد کمپنی نے ٹرانسفر کر کے اسے کراچی بھیج

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیا۔ اب عدیل سے تعارف ہوا تو احمر اور عدیل کا یہ مشترکہ شوق دونوں کو قریب لے آیا۔ روز و شب کی بساط پر شائلہ کے ساتھ محبت کی ایسی ہوش ربا بازی شروع ہوئی کہ احمر کو شطرنج کی بساط بچھانے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ ویسے بھی احمر اور شائلہ کو یہاں آئے ابھی تین ماہ ہوئے تھے۔ نہ کسی سے شناسائی تھی نہ ایسی آشنائی کہ احمر کسی کے سامنے اپنی شطرنج میں دلچسپی کا اظہار کرتا۔ عدیل کی صورت میں احمر نے شطرنج کی حریفانہ دوستی کا فیصلہ کرلیا اور یہ ایک خوشگوار شام تھی۔

احمر نے عدیل کو اپنے ہاں چائے پر مدعو کیا تھا۔ شائلہ نے بھی ایک اجنبی مہمان کے لیے پُرتکلف اہتمام کیا تھا۔ دراصل احمر اور شائلہ کو یہاں رہتے ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے۔ ان کا کشادہ فلیٹ صرف ان دونوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا تھا اور عدیل پہلا فرد تھا جو پہلی مرتبہ مہمان بن کر ان کے ہاں آیا تھا۔ حالانکہ یہ پہلی ملاقات تھی لیکن جانے کیا بات تھی کہ اس پہلی ملاقات میں تینوں کے درمیان اجنبیت کے سائے لمحوں میں معدوم ہوگئے۔ تکلفات کی دیواریں خوش گپیوں اور قہقہوں سے گرتی چلی گئیں اور اس پہلی ملاقات کا دورانیہ بڑھ گیا۔ اگلے روز ہفتہ وار چھٹی تھی اس لیے شطرنج کی بساط بچھائی گئی اور رات گئے تک محفل جمی رہی۔ احمر کو پہلی بار ہی اندازہ ہوگیا کہ عدیل شطرنج کے کھیل میں پوری مہارت رکھتا ہے۔ عدیل نے احمر اور شائلہ کی آنکھوں میں نیند کا خمار اترتے دیکھا تو اس نے جانے کی اجازت چاہی۔

''ایک شرط پر اجازت مل سکتی ہے۔'' احمر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''شرط بیان کریں جناب۔'' عدیل نے استفسار کیا۔

''یہی کہ آپ ہر ویک اینڈ کی شام ہمارے ساتھ گزاریں گے۔'' شائلہ نے احمر کے دل کی بات خود ظاہر کردی۔

''جی، وعدہ رہا۔'' عدیل نے ہامی بھری اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا۔ احمر اور شائلہ معمول کے مطابق ناشتا کررہے تھے اور ایک بحث بھی زیرِ موضوع تھی۔ ''بھئی! آخر ضرورت کیا ہے؟'' احمر نے زچ ہوکر کہا تو شائلہ نے اپنی گھنی پلکوں کے سائبان اٹھادیے۔

''بات ضرورت کی نہیں، شوق کی ہے احمر۔''

اچھا، میں سمجھا شاید تم چینی زبان سیکھ کر چائنا میں کوئی جاب کرنا چاہتی ہو۔'' احمر نے چٹکی لی اور پھر مٹھے ہوگیا کہ ہر ویک اینڈ پر شطرنج کی بساط سمیٹ لینے کے بعد شائلہ کے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ جولائی 2017ء
کی جھلکیاں

انشمند دیوان
ایک بڑے مسلم سائنسداں کا زندگی نامہ

عشق کامل
اس صحابی کا ذکر جس نے کبھی رسول ﷺ کا دیدار نہیں کیا

ہوائے حجاز
اسلامی تاریخ پر اردو تحریروں کے خالق کا احوالِ زیست

قوالی
فنِ سماع پر ایک مختصر سی مگر نہایت اہم تحریر

اور بھی بہت سی ایمان افروز و سبق آموز تحریریں

ایک ایسا شمارہ جسے آپ جلد بندی کرا کر محفوظ رکھنا چاہیں گے۔ اس لیے آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر ''سرگزشت'' مختص کرالیں

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے۔
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جمائیاں

ایک باتونی عورت اپنے شوہر سے بولی۔
''آپ کے دوست کی بیوی کو تو گفتگو کے آداب ہی نہیں آتے۔ کل رات میں جتنی دیر اس سے باتیں کرتی رہی وہ جمائیاں لیتی رہی۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہے۔'' شوہر بولا۔ ''ممکن ہے وہ کچھ کہنے کے لیے بار بار منہ کھول رہی ہو۔''

لیے چینی زبان کی ٹیوشن کا اہتمام بھی ہوگا۔

احمر جنون کی حد تک شطرنج کا دلدادہ تھا مگر عدیل نے خود کو احمر کے مقابلے میں پوری طرح مشاق اور شاطر ثابت کیا تھا۔ آغاز کے دن سے لے کر اب تک عدیل نے ہر بازی پر احمر کو شکست دی تھی اور اس مسلسل ہار نے احمر کو بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔

بظاہر احمر پُرسکون دکھائی دیتا تھا لیکن شائلہ کے سامنے مسلسل عدیل کی برتری احمر کو خجل کیے جا رہی تھی اور اب عدیل کو ہرانے کی خواہش اس کے اعصاب میں چٹخنے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ویک اینڈ پر بچھائی جانے والی بساط اب ہر رات بچھائی جانے لگی۔ روزانہ کا معمول بن گیا تھا کہ احمر شکست کھانے کے بعد اپنی تیز سانسوں کو اعتدال پر لاتے ہوئے خجالت کے ساتھ صوفے پر نیم دراز ہو جاتا اور ٹیبل پر شطرنج کی جگہ چینی زبان کے ابتدائی قاعدے اور رسالے پھیل جاتے۔ شائلہ عدیل کے روبرو بیٹھ کر چینی زبان سیکھنے کے عمل میں مصروف ہو جاتی۔

''شائلہ! آپ کو چینی زبان سیکھنے کا شوق کب سے ہوا؟''

ایک دن دھیمے لہجے میں عدیل کی سرگوشی ابھری۔

''آپ سے ملنے کے بعد۔'' بلا تامل شائلہ کے لبوں کی مسکان سے جواب پھسل گیا اور عدیل نے چونک کر شائلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کمند ڈالی۔

''اس طرح غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' شائلہ کی سرگوشی مہکی۔

''کچھ ڈھونڈ رہا ہوں۔'' عدیل کے لہجے کا دھیما پن کچھ اور گہرا ہو گیا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟'' شائلہ کی مترنم آواز تھرتھرائی۔

''اپنے لیے جگہ۔'' عدیل نے جواب طلب جملہ کہا۔

''آنکھوں میں جگہ نہیں ڈھونڈی جاتی، زینہ تلاش کیا جاتا ہے کسی کے دل میں اترنے کے لیے۔''

شائلہ کی وضاحت نے عدیل کا حوصلہ بڑھا دیا اور پھر دونوں ہی آنکھوں کے رستے ایک دوسرے کے دل میں اترتے چلے گئے۔

☆☆☆

اب روز کا معمول بن گیا تھا۔

شطرنج کی بساط پر احمر اپنی شکست سمیٹتا اور عدیل بڑے تفاخر کے ساتھ دبے دبے انداز میں تمسخرانہ جملے احمر کی طرف اچھالتا رہتا۔ عدیل کی فاتحانہ ہنسی میں شائلہ کے قہقہے بھی شامل ہونے لگے۔ یہی بات احمر کے لیے زیادہ شرمندگی اور تکلیف کا باعث بننے لگی تھی کہ اب کھیل کے دوران شائلہ کی ہمدردی اور توجہ عدیل کا ساتھ دینے لگی تھی۔ کھیل میں شکست کی جھنجلاہٹ اپنی جگہ لیکن رفتہ رفتہ شائلہ اب عدیل کی کھلی طرف داری کرنے لگی تھی۔ یہ صورتِ حال احمر کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ بازی ہار جانے کے بعد احمر خاموشی سے الگ ہو جاتا اور شائلہ عدیل کے سامنے بیٹھ کر چینی زبان کا سبق لینے میں مصروف ہو جاتی۔ چینی زبان میں اچانک ہی شائلہ کی دلچسپی اور محویت احمر کے لیے سمجھ سے بالاتر تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں عدیل نے کچھ ایسے جملے شائلہ کو سکھا دیے تھے کہ شطرنج کی بازی کے دوران بھی عدیل اور شائلہ کے درمیان نظروں کے تصادم کے ساتھ ساتھ چینی زبان میں جملوں کا تبادلہ ہونے لگا تھا۔ احمر یہی سمجھتا رہا کہ شائلہ بڑی ذہانت کے ساتھ چینی زبان میں مہارت حاصل کر رہی ہے جبکہ عدیل اور شائلہ احمر کی موجودگی میں اب کھل کر اپنے پروان چڑھتے ہوئے جذبات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ شائلہ کے ہونٹوں کی دلفریب مسکراہٹ پوری طرح عدیل کو اسیر کر چکی تھی اور عدیل کی مسحور کن شخصیت نے شائلہ کو سرتاپا اپنے دامِ فریب میں جکڑ لیا تھا۔

اگرچہ جذبات کا یہ اعتماد شکن کھیل شطرنج کی طرح پوری مہارت کے ساتھ کھیلا جا رہا تھا لیکن احمر کی بے خبری زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔

☆☆☆

تھکا دینے والی طویل مصروفیت کے بعد احمر نے اپنے آفس میں کافی منگوائی تھی۔ کافی کی پہلی چسکی کے ساتھ ہی یونہی اس کا دل چاہا کہ شائلہ سے فون پر بات کر کے ذرا بوریت کا احساس کم کیا جائے چنانچہ احمر نے شائلہ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف شائلہ کا نمبر مصروف جا رہا تھا۔ کافی ختم کر لینے کے بعد احمر نے دوبارہ شائلہ سے رابطے کی کوشش کی تو نمبر اب تک مصروف تھا۔ احمر کی جھنجلاہٹ بڑھ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گئی۔ اچانک احمر نے بے یقینی کی بندگلی میں ایک اندیشے کی سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا اور سیل فون پر عدیل کا نمبر ڈائل کیا۔ عدیل کا نمبر بھی مصروف جارہا تھا۔

شائلہ اور عدیل کے نمبر ایک ہی وقت میں مصروف! گویا، دونوں رابطے میں، نہیں نہیں..... شاید..... شاید نہیں یقیناً..... پھر احمر نے دس منٹ کے اذیت ناک وقفے سے دوبارہ شائلہ سے رابطے کی کوشش کی تو اب شائلہ کا نمبر غیر متوقع طور پر بند تھا۔

''شائلہ کا نمبر بند! ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔''

احمر کے وجود میں شک کے تازیانے لہرانے لگے۔ پھر ایک بے عنوان ارادے سے احمر نے عدیل کا نمبر ڈائل کیا تو اب عدیل کا نمبر بھی بند جارہا تھا۔

''اُف! یہ ماجرا کیا ہے؟ پہلے ایک ہی وقت میں دونوں نمبر مصروف اور اب دونوں طرف سکوت۔''

بے یقینی کی آڑی ترچھی لکیریں اب شک و شبہے کے ناگ بن کر احمر کے چاروں طرف پھنکارنے لگی تھیں۔

احمر سے عدیل کی اتفاقیہ ملاقات، احمر کے گھر عدیل کا متواتر آنا جانا، شائلہ کی اچانک ہی چینی زبان میں دلچسپی، شطرنج کی بساط پر احمر کی شکست اور اس پر عدیل کے ہونٹوں پر پراسرار فاتحانہ ہنسی، شائلہ اور عدیل کا روبرو بیٹھ کر سرگوشیوں میں گھنٹا بھر پڑھنا پڑھانا، ہنسی مذاق میں تکلفات کی گرتی ہوئی دیواریں، دونوں طرف سے مسکراہٹوں کی بوچھاڑ، چینی زبان میں جملوں کے تبادلے اور کبھی کبھی دھیمے پن کے زنجیر وسلاسل توڑتے ہوئے شائلہ اور عدیل کے کھنکتے ہوئے قہقہے۔

احمر کے وجود میں شکوک وشبہات کی خودرو جھاڑیاں اب تیزی سے پھیلتی جارہی تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں یقین میں بدلتی ہوئی بدگمانیاں رینگنے لگی تھیں۔ احمر اپنی ہنستی کھیلتی زندگی سے یکدم دور ہوتے ہوئے ذہنی اذیت کے اس طویل صحرا میں برہنہ پا دوڑتا چلا جارہا تھا کہ اس کے تلووں میں چبھنے والے کانٹے اسے اپنے دل اور دماغ میں سرابھارتے محسوس ہونے لگے تھے۔

احمر تو پہلے ہی اس کسک میں مبتلا تھا کہ شائلہ احمر کی جنوں آمیز محبت کے جواب میں اتنی گرم جوشی نہیں جس کی توقع احمر ابتدا سے کرتا چلا آرہا تھا اور اب چینی زبان سیکھنے کی آڑ میں شائلہ اور عدیل کی قربت نے احمر کو ذہنی طور پر مفلوج بناڈالا تھا۔

''آخر، شائلہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ زندگی شطرنج کی بساط

انتساب

میں نے ہوش سنبھالا تو ایک ہی فرد کو گھر میں پایا۔ وہ میرے اور میں اس کے دل ونگاہ کا مرکز بن گیا۔ مجھ پر جوانی اور اس پر بڑھاپا آتا گیا لیکن ہم گردش لیل ونہار سے بے نیاز ایک دوسرے کے سہارے زندگی کی شاہراہ پر گامزن رہے۔ ہماری تیس سالہ رفاقت میں مفارقت کی دیوار پہلی بار اس وقت حائل ہوئی جب میں اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان روانہ ہوا۔ جدائی کے چار برسوں میں خواہ وہ مشرقی پاکستان کے پرآشوب ماحول میں گزرے ہوں یا بھارت کے تنگ وتاریک بندی خانوں میں، اس پیکر شفقت کا سایہ ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ چنانچہ جب بھی میں یاس وحرماں کی ویرانیوں میں بھٹکنے لگا تو ایک مانوس آواز نے مجھے راہ سجھائی اور جب میں قید وبند کی تاریکیوں کو ہمہ گیر سمجھنے لگا تو ایک ٹھنڈی کرن نے مجھے روشنی مہیا کی۔

قید ہند سے رہا ہوکر واہگہ (لاہور) پہنچا تو استقبال کرنے والوں میں بہت لوگ تھے لیکن وہاں وہ آواز تھی نہ وہ کرن جس کی مجھے تلاش تھی۔ میں بھاگا بھاگا اس گاؤں پہنچا جہاں برسوں پہلے ہماری رفاقت کا آغاز ہوا تھا لیکن وہاں بھی سنسان خاموشی اور مہیب اداسی کے سوا کچھ نہ تھا۔

البتہ قریبی قبرستان میں ایک تازہ قبر کی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

یہ ماتا تھی جو آج بھی میرا استقبال کرنے کو بے قرار تھی۔

صدیق سالک کی کتاب ''ہمہ یاراں دوزخ'' سے اقتباس

مرسلہ۔ ایم عمران قاسم، سمبل، تحصیل کلر سیّداں

نہیں کہ میں اپنی محبت کو کسی حریف کے سامنے ہاردوں۔''

ایک دن احمر ... اندر کی گھٹن سے گھبرا کر چیخ اٹھا۔

شائلہ پرسکون رہی۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے لبوں کی مسکان کو گہرا کرتے ہوئے احمر کی طرف دیکھا اور پھر بے نیازی کے ساتھ اپنی توجہ چینی زبان کے رسالے پر مرکوز کردی۔

احمر کے ذہن میں تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ سینے میں منہ زور طوفان صبر اور ضبط کے ساحلوں میں شگاف

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ڈال رہا تھا اور دوسری طرف شائلہ کا وجدانی حسن شانتی اور اطمینان کا پیکر بنا ہوا تھا جیسے احمر کا اضطراب شائلہ کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

اور پھر احمر کا ذہن بھی کسی فیصلے کی پناہ گاہ کی طرف رینگنے لگا۔

☆☆☆

آج بوجھل دن کی اوٹ سے سورج طلوع ہوا تھا۔

شائلہ صبح جلد سو کر اٹھنے کی عادی تھی لیکن آج اس کے لبوں کی مسکان کے رنگ پھیکے پڑے ہوئے تھے۔ احمر نے شائلہ کی پیشانی کو چھوا تو بخار کا احساس ہوا۔ احمر کے ہاتھ کا لمس ملتے ہی شائلہ نے بھی پلکوں کے سائبان اٹھا لیے۔ اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں بے چینی کے بادبان پھڑ پھڑا رہے تھے۔ احمر نے خود ناشتا تیار کیا اور انکار کرتی شائلہ کو بھی مجبور کر کے ہلکا سا ناشتا کرا دیا۔ آج دفتر میں اہم میٹنگ بھی تھی، احمر کا دفتر جانا ضروری تھا ورنہ احمر چھٹی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''شائلہ! میں گیارہ بجے تک میٹنگ سے فارغ ہو کر آجاؤں گا اور پھر ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔'' احمر نے شائلہ کے رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''دس بجے تک تو عدیل بھی اپنا لیکچر پڑھا کر فارغ ہو جاتے ہیں، آپ کہیں تو میں عدیل کے ساتھ چلی جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس۔''

شائلہ کا یہ جملہ احمر کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل گیا۔

''تم جیسے چاہو۔'' احمر نے بہ مشکل شکست خوردگی کے ساتھ اتنا کہا اور آفس کے لیے روانہ ہو گیا۔

نفرت، رقابت اور پسپائی کے ملے جلے عفریت احمر کو چاروں طرف سے جکڑتے چلے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر بہتے ٹریفک کے سیلاب میں وہ دو مرتبہ حادثے کا شکار ہوتے ہوتے بچا اور بالآخر آفس پہنچ گیا۔

گیارہ بجے تک میٹنگ سے فارغ ہو کر گھر جانے کا خیال ایک ناکام آرزو کی طرح آیا۔ احمر نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا جس سے اس نے شائلہ کی جلتی ہوئی پیشانی کو چھوا تھا۔ اب احمر نے تصور میں عدیل کا ہاتھ شائلہ کی پیشانی پر رکھے دیکھا تو وہ سر سے لے کر پاؤں تک ایک نادیدہ آگ کے شعلوں میں جھلستا چلا گیا۔ احمر کو یوں لگا جیسے زندگی کی بساط پر شطرنج کے تمام مہرے عدیل کے اشارۂ ابرو کے منتظر ہیں۔

اب دور ہوتی شائلہ کو پھر سے پا لینے کا ایک ہی رستہ بچا تھا کہ وہ زندگی کی بساط پر کھیلی جانے والی اس عشق کی بازی میں عدیل کو مات دے اور یہ بازی جیت کر شائلہ کی مسکان پر صرف اپنا حق ثابت کر سکے۔

احمر نے ایک بار پھر جذبات کے تھپیڑوں سے اپنے اعصاب کے ٹوٹتے گھروندوں کو بچایا اور پھر کسی فیصلے کے محاذ کی طرف اس کے دماغ نے رینگنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

شام کا اندھیرا پھیلنے تک شائلہ کا ٹمپریچر زیادہ بڑھ گیا۔ شائلہ نیم غنودگی کے عالم میں اپنے بستر پر لحاف اوڑھے دراز تھی۔ میز پر شطرنج کی بساط حسب معمول جمی تھی۔ احمر اور عدیل آمنے سامنے بیٹھے حریفانہ انداز میں انتہائی سست روی کے ساتھ اپنی اپنی چال چل رہے تھے۔ آج عدیل کے کھیلنے کا انداز عدم دلچسپی کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ محفل کا رنگ اور دونوں کی نسبت پھیکا تھا۔ شاید اس کی وجہ شائلہ کی ناسازی طبیعت تھی۔ بخار کی وجہ سے شائلہ کے لبوں کی مسکان لبوں کے حصار میں قید تھی۔ آج نہ تو عدیل اور شائلہ کے قہقہے گونج رہے تھے اور نہ ہی چپقلش زبان میں اظہارِ محبت کے جملوں کا تصادم ہو رہا تھا۔ شاید کھیل میں عدیل کی عدم دلچسپی کا سبب بھی یہی تھا۔ شائلہ کی ناساز طبیعت نے آج عدیل کو شائلہ کی قربت اور التفات آمیز نظروں سے محروم کر رکھا تھا لیکن بے توجہی کے باوجود شطرنج کی بازی عدیل کے ہاتھوں سے نہیں نکلی تھی۔ احمر آج بھی اپنی شکست کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''شائلہ کے بخار نے آج تو ہمیں کافی سے بھی محروم کر دیا احمر۔''

عدیل کے جملے نے کمرے کے جان لیوا سکوت کو توڑا۔

''اب ایسی بھی بات نہیں، کافی تو میں بھی بنا لوں گا۔ یہ الگ بات کہ اس میں شائلہ جیسا لطف نہ ہو۔'' احمر نے جواب دیا۔

''شائلہ کی تو بات ہی کچھ اور ہے احمر۔ نو ڈاؤٹ، شائلہ کا جواب نہیں۔'' عدیل کا ستائشی انداز معنی خیز تھا۔

''ہاں، یہ تو ہے، شائلہ کا واقعی جواب نہیں۔'' احمر بساط سے نگاہیں سمیٹتے ہوئے اٹھا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔

اسی لمحے بیڈ پر دراز شائلہ نے کروٹ بدلی اور اپنی غنی پلکوں کے دبیز پردے اٹھا دیے۔ عدیل اور شائلہ کی نگاہیں ایک دوسرے سے گلے ملیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں فاصلے پگھل کر قربت میں تبدیل ہونے کے لیے بے چین ہو گئے۔

عدیل یکلخت اپنی جگہ سے اٹھا اور شائلہ کے قریب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پہنچ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

شائلہ کے بخار کی حرارت عدیل کی ہتھیلیوں میں جذب ہو کر پورے بدن میں پھیل گئی۔ ''آج کھیل میں بالکل مزہ نہیں آ رہا۔'' عدیل نے سرگوشی کی۔

''لیکن پھر بھی بازی تو تم ہی جیتو گے عدیل۔''

''میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں تمہیں جیت چکا ہوں شائلہ۔''

''مجھے ہمیشہ کے لیے جیت لو عدیل۔'' شائلہ کے بخار سے تمتماتے چہرے پر مسکان کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔

''میں بہت جلد تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جیت لوں گا۔''

''آ خر کب؟''

''بس تھوڑا سا انتظار اور.....''

کچن سے واپس آتے احمر کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو عدیل تیزی سے آ کر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

''معاف کرنا دوست، اناڑی ہوں نا اس لیے کافی بنانے میں ذرا دیر ہوگئی۔'' احمر نے مسکراہٹ کے ساتھ معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، میں اتنی دیر میں اپنی چال پر غور کرتا رہا ہوں۔'' عدیل نے جواباً کہا۔

احمر نے ٹرے میں سے کافی کی ایک پیالی اٹھا کر عدیل کے برابر میں موجود تپائی پر رکھ دی اور دوسری پیالی اٹھا کر اپنے دائیں طرف میز کے کنارے پر رکھ لی۔

بازی ایک بار پھر شروع ہوگئی۔

''معاف کرنا احمر! پیاس لگی ہے، فریج میں سے پانی کی بوتل.....''

''ابھی لایا دوست!'' احمر، عدیل کی بات کاٹتے ہوئے اٹھا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔

احمر کے جاتے ہی عدیل نے کافی کی دونوں پیالیاں پھرتی سے تبدیل کر دیں اور بساط پر نظریں گاڑے کسی گہری سوچ میں مستغرق دکھائی دینے لگا۔

اگلے ہی لمحے احمر پانی کی بوتل اور گلاس لیے آ گیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ عدیل نے پانی پیا اور کافی کی پیالی اٹھا کر چسکیاں لینے لگا۔

احمر نے بھی پیالی اٹھا کر چسکیاں لینی شروع کر دیں۔ بساط پر شطرنج کی بازی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ حسبِ معمول جیت آج بھی عدیل سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی لیکن خلافِ توقع اس موقع پر احمر کے چہرے پر جو ہیجان ہوا کرتا تھا وہ مفقود تھا۔ عدیل کے لیے یہ بات حیرت کا باعث تھی کہ احمر کے چہرے پر پُرسکون سمندر جیسا ٹھہراؤ تھا۔

یہاں تک کہ بازی ختم ہوئی۔ عدیل ہمیشہ کی طرح فاتح اور احمر ہر روز کی طرح پسپا اور شکست خوردہ ٹھہرا۔

''احمر! شطرنج کھیلنا چھوڑ دو یار۔ جیت شاید تمہارے مقدر میں نہیں ہے۔''

عدیل نے حسبِ عادت تمسخر کا پتھر احمر کی طرف اچھالا۔

جواب میں احمر کا قہقہہ بلند ہوا۔ عدیل نے چونک کر حیرت بھری نظروں سے احمر کی طرف دیکھا۔

''عدیل! بظاہر تو ہمیشہ کی طرح تم آج بھی جیت گئے ہو لیکن نہیں میرے دوست، ایسا نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ ہے کہ آج تم جیت کر بھی بری طرح ہار گئے ہو۔'' احمر نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' عدیل نے الجھن زدہ نظروں سے احمر کو دیکھا۔

''غور سے سنو عدیل! شائلہ کے ساتھ تمہارے تعلق سے میں بے خبر نہیں رہا، تم واقعی بہت اونچے شاطر ثابت ہوئے۔ تم نے شطرنج کے ساتھ ساتھ زندگی کی بساط پر بھی مجھے ہرانا شروع کر دیا۔ اب شائلہ کو تم سے محفوظ رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں تمہیں راستے سے ہٹا دوں۔ چنانچہ میرے دوست، تم نے جو کافی پی ہے وہ زہر آلود تھی۔''

''اچھا!'' عدیل کے ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''احمر! تم مجھے اونچا شاطر تو تسلیم کر چکے ہو نا، تو پھر سنو! تم جب فریج سے پانی کی بوتل لینے گئے تھے تو میں نے کافی کی پیالیاں تبدیل کر دی تھیں اب کہو، راستے سے کون ہٹا، تم یا میں؟''

''اوں ہوں! تم پوری طرح میری بات سمجھے نہیں عدیل۔'' احمر پُرسکون لہجے میں بولا۔ ''دراصل شائلہ کی میری طرف واپسی اب بالکل بے معنی تھی۔ میں تو اپنی شائلہ کو گنوا کر پہلے ہی ایک طرح سے مر چکا تھا۔ اب تو میں شائلہ کو تم جیسے اعتماد شکن دوست سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے میرے دوست، کافی کی دونوں پیالیوں میں زہر تھا۔''

شائلہ جو یہ سب کچھ سن رہی تھی جھٹکے سے بستر پر اٹھ بیٹھی لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ احمر اور عدیل دونوں موت کے قدموں کی چاپ سن رہے تھے اور شائلہ ٹوٹے ہوئے اعتماد کے ریزے سمیٹنے کے قابل تک نہ تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

قسط نمبر: 4

وقت

حُسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا، ایک ایسے پُرعزم بازی گر کی بازی گری ..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاؤ ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ دل دوز نسوانی چیخ نے مجھے ذہنی طور پر ریڈ الرٹ کر دیا تھا۔ اس چیخ میں بے پناہ اذیت پائی جاتی تھی جیسے کسی شخص کو بڑی بے دردی سے زندگی کے نازک لمحات سے گزارا جارہا ہو۔ اس بنگلے میں میری معلومات کے مطابق صرف ایک ہی عورت موجود تھی اور وہ تھی ڈیلفینا عرف ڈیلفی۔ اس دردناک چیخ کا ایک ہی مطلب تھا کہ ڈیلفی کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی۔

ڈیلفی کے ساتھ میرے تعلقات کو ابھی ایک آدھ دن ہی گزرا تھا لیکن یہ رفاقت مختصر ہونے کے باوجود بھی صدیوں پر محیط محسوس ہوتی تھی اسی لیے اس کی ممکنہ کرب ناک چیخ نے مجھے بری طرح بے چین کر دیا تھا اور میں ربی کی ہدایت کو ..... یکسر نظر انداز کر کے اس کے عقب میں دوڑ پڑا تھا۔

ہم دونوں آگے پیچھے لیونگ روم سے نکلے تھے۔ ربی آگے اور میں اس کے پیچھے۔ ہمارے بیچ چند قدم کا فاصلہ تھا جسے میں نے چند سیکنڈ میں پاٹ ڈالا تھا۔ اب ہم دونوں پہلو بہ پہلو ایک راہ داری میں دوڑ رہے تھے۔ میں اس بنگلے میں پہلی مرتبہ آیا تھا لیکن ربی آئزک باروخ لاؤ کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ وہ اس بنگلے کے اندرونی حصے سے بہ خوبی واقف ہے جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ پہلے بھی اس بنگلے کی یاترا کرتا رہا ہے، میری طرح یہ اس کی پہلی انٹری نہیں تھی۔ ڈیلفی کے بیان کے مطابق، مذکورہ بنگلا اس کی ایک دوست سارا ملر کی ملکیت تھا جو ڈیلس کاؤنٹی کی میئر بھی رہ چکی تھی، گویا ربی سارا ملر سے ملنے یہاں آیا کرتا تھا۔

وہ بڑے تشویش ناک لمحات تھے۔ میں ربی آئزک کی معیت میں مختلف راہ داریوں سے ہوتے ہوئے بنگلے کے عقبی حصے میں نکل آیا۔ اس دوران میں وہ اذیت ناک چیخ دوبارہ نہیں سنائی دی تھی لیکن ربی کی پیش قدمی سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ درست سمت میں آگے بڑھ رہا ہے۔ اس نے ایک بار بھی میری آمد پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ میں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ شاید اس نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے یہ محسوس کر لیا تھا کہ میں اس کے روکنے سے ہرگز رکنے والا نہیں ہوں۔

ہم دونوں گراسی لان کی طرف نکل آئے۔ یہ میرے بیڈروم سے مخالف سمت کا حصہ تھا یعنی سوئمنگ پول کی دوسری جانب۔ میں نے ربی کے ہمراہ مذکورہ لان عبور کیا اور ہم ایک بند کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ بند کمرا ان معنوں میں کہ اس کا دروازہ بند نظر آرہا تھا۔ وہ اندر سے لاک تھا یا نہیں اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ربی آئزک باروخ نے جس اعتماد کے ساتھ یہاں تک رسائی حاصل کی تھی، اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اس بات کا بہ خوبی علم تھا کہ ڈیلفینا ادھر ہی ہوگی یا..... کم از کم وہ عورت ادھر ہی پائی جائے گی، چند لمحے پہلے ہم نے جس کی کرب ناک چیخ سنی تھی۔

ربی بند دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر آواز میں بولا۔ ''وہ دونوں اس کمرے کے اندر ہیں۔''

''کون دونوں؟'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''میں ڈیلفی اور اس کے بدن سے جلا وطن ہونے والی منفی قوت کی حامل اس عورت کی بات کر رہا ہوں جو شکل و شباہت میں ڈیلفی کی جڑواں دکھائی دیتی ہے لیکن عمل اور فطرت میں وہ ڈیلفی کے بالعکس ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ منفی عورت جسے تم نے گزشتہ رات سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے دیکھا تھا۔''

میں شک زدہ نظر سے ربی کو تکنے لگا لیکن میں نے اس سے یہ سوال نہیں کیا کہ اسے کیسے خبر ہوئی کہ وہ دونوں اس کمرے میں ہوں گی جو وہ دوڑا ہوا سیدھا یہاں چلا آیا تھا۔

''وہ دونوں اس کمرے کے اندر کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ ربی جواب دیتا' کمرے کے اندر سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے فکر مندی سے ربی کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

''اب تو تمہیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ دونوں کمرے کے اندر کیا کر رہی ہیں!''

کمرے کے اندر سے باقاعدہ اٹھا پٹخ کی آوازیں ابھر رہی تھیں جیسے کسی اکھاڑے میں دو پہلوان آپس میں نبرد آزما ہوں اور ایک دوسرے کو چت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں لیکن کسی کا کسی پر بس نہ چل رہا ہو اور وہ ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں کامیاب نہ ہو رہے ہوں۔

''مجھے تو لگتا ہے' وہ آپس میں گتھم گتھا ہیں۔'' میں نے ربی کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''مائی سن! تمہیں بالکل ٹھیک لگتا ہے۔'' وہ مربیانہ انداز میں بولا۔ ''اس وقت کمرے میں حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے۔ سچائی، جھوٹ سے پنجہ لڑا رہی ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھو کہ فتح سچ کی ہوگی۔ اس معرکے میں ڈیلفی اس عورت پر حاوی آجائے گی جو اس کا منفی عکس ہے، جسے ڈیلفی نے اپنے وجود کے اندر سے نکال باہر کیا ہے۔ مجھے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

یقین ہے کہ ڈیلفی آج اس منحوس عورت کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے گی..... اس دنیا سے نکال باہر کرے گی۔''

ربی کے لہجے میں بے پناہ اعتماد پایا جاتا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ ڈیلفینا اس عورت کو شکست دینے میں کامیاب ہوجائے گی جسے میں نے گزشتہ شب سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے دیکھا تھا' جس کی آنکھوں میں انگاروں کی دہک تھی۔ ربی کا اعتماد اپنی جگہ لیکن میں ڈیلفینا کے لیے فکرمند تھا۔ وہ اس وقت خاصے کڑے حالات سے گزر رہی تھی۔ اسے مدد کی ضرورت تھی۔

''ہمیں ڈیلفینا کی مدد کرنا چاہیے۔'' میں نے ربی آئزک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کہیں تو میں کمرے کا دروازہ توڑ کر اندر جاتا ہوں.....''

''میرا خیال ہے' دروازہ توڑنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔'' ربی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ڈیلفی تربیت یافتہ ہے۔ وہ اپنے ٹیگیٹو سے بہ آسانی نمٹ لے گی البتہ.....'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''مائی سن! میں نے تمہیں ادھر لیونگ روم میں ہی رکنے کے لیے کہا تھا مگر تم نے میری بات پر عمل نہیں کیا۔ اٹس اوکے۔ اگر یہاں تک آ ہی گئے ہو تو چند منٹ کے لیے بالکل خاموشی اختیار کرلو۔ میں ڈیلفی کی مدد کرنے جارہا ہوں۔ مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا۔''

''کیا آپ کمرے کے اندر جاکر ڈیلفی کی مدد کریں گے؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''نہیں.....'' اس نے نفی میں گردن ہلائی پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں ادھر رہ کر ہی اس کی مدد کروں گا۔ پلیز..... اب تم خاموش رہنا۔''

آخری جملہ اس نے تنبیہ کرنے والے انداز میں ادا کیا تھا۔ میں چپ چاپ اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ دروازے کے نزدیک پہنچا پھر آنکھیں بند کرکے دروازے کے رخ پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں میں مخصوص انداز کی حرکت ہونے لگی جیسے وہ دل میں کچھ پڑھ رہا ہو پھر اس کی زبان سے عبرانی الفاظ ادا ہونے لگے۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ وہ ڈیلفینا کی مدد کرنے کے لیے مقدس آیات کا ورد کررہا تھا۔

کمرے کے اندر اٹھا پٹخ جاری تھی۔ کبھی ایسی آوازیں بھی آنے لگتیں جیسے ایک انسان دوسرے انسان کا گلا دبا رہا ہو..... سانس رکنے اور دم گھٹنے کی مخصوص..... ''خرخراہٹ'' بھی سنائی دینے لگتی تھی۔ میں بند کمرے کے اندر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اندر کی صورتِ حال کیا ہے لیکن اس بات کا مجھے اندازہ تھا کہ ڈیلفینا مشکلات میں گھری ہوئی ہے۔

وہ میری محسن تھی' میری خیر خواہ تھی۔ اب تک اس نے میری بے لوث مدد کی تھی لہٰذا اخلاقیات کا تقاضا یہ تھا کہ ان آزمائشی لمحات میں مجھے بھی اس کی مدد کرنا چاہیے لیکن ربی آئزک نے مجھے کسی بھی قسم کی مہم جوئی سے یکسر منع کردیا تھا۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ میں بند دروازے کو توڑ کر کمرے کے اندر جاؤں اور ڈیلفینا کی دشمن کی ایسی کم تیسی کر ڈالوں مگر میں مجبور تھا۔ میں ربی کو سرپاس نہیں کرسکتا تھا چنانچہ مجھے انتظار کرنا تھا..... بے صبری سے کرتا یا صبر کے ساتھ!

ربی آئزک باروخ لاؤ کی آنکھیں بند اور ہونٹ متحرک تھے۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ عبرانی میں کوئی موثر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ میری نگاہ ربی کے چہرے پر اور سماعت بند کمرے کے اندر ہونے والی دھینگا مشتی پر لگی ہوئی تھی۔ کمرے کے اندر نبرد آزمائی کی مخصوص آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں اور ربی بھی پورے انہماک کے ساتھ مصروفِ عمل تھا۔

اچانک ایک ہیبت ناک آواز سنائی دی۔ یہ آواز اگرچہ انسانی تھی لیکن اس نسوانی آواز سے درندگی جھلکتی تھی جیسے کسی خوں خوار درندے کو ذبح کیا جارہا ہو۔ یہ جانور کی گردن پر چھری چلتے وقت پیدا ہونے والی آواز تھی۔ میں نے ایک انسان کو کمرے کے اندر بے بسی سے ڈکراتے ہوئے سنا اور میرے دل سے نکلا..... کاش! یہ آواز ڈیلفینا کی نہ ہو.....!

اگلے ہی لمحے کمرے کے اندر خاموشی چھا گئی۔ اب وحشت بھری انسانی آواز ابھر رہی تھی اور نہ ہی دنگا فساد کی مخصوص اٹھا پٹخ سنائی دے رہی تھی۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ کمرے کے اندر جاری معرکہ اختتام پذیر ہوچکا ہے۔ کون جیتا' کون ہارا..... میں نہیں جانتا تھا۔ کمرے کے اندر طاری دبیز سناٹا اس امر کا گواہ تھا کہ فیصلہ ہوچکا۔ ایک فریق جیت سے ہم کنار ہوگیا۔ فریقِ ثانی کے نصیب میں شکست رقم کردی گئی۔ ان لمحات میں میری دلی آرزو یہی تھی کہ حق و باطل کی یہ جنگ ڈیلفینا نے جیتی ہو.....!

''مبارک ہو مائی سن..... سچ کی جیت ہوئی' باطل ہار گیا..... فنا ہوگیا..... نیست و نابود ہوگیا..... خس کم' جہاں پاک!''

''کیا ڈیلفینا نے اپنے منفی روپ کو شکست دے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دی؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''صدفی صد!'' وہ پُروثوق انداز میں بولا۔

میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''اب ہم کمرے کے اندر جاسکتے ہیں نا؟''

''ضرور.....'' وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ''ہمیں فوراً کمرے کے اندر پہنچ کر ڈیلفینی کی خیریت معلوم کرنا چاہیے۔ اسے ہماری مدد کی ضرورت ہوگی۔''

میں میکانکی انداز میں آگے بڑھا اور کمرے کے دروازے کو زور کا دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ میرے دھکے نے اسے آن واحد میں وا کر دیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے میں نے کمرے کے اندر دیکھا اور مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ کوئی اسٹور روم ٹائپ کمرا تھا۔ کمرے کے اندر گارڈننگ میں استعمال ہونے والے مختلف آلات اور دیگر کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ اس بنگلے میں ایک وسیع و عریض گراسی لان موجود تھا جس کے گرد پھلوں اور پھولوں کے منتخب پودے لگے ہوئے تھے۔ باغبانی کے مذکورہ آلات اسی مقصد سے اس کمرے میں رکھے گئے تھے اور ان آلات کے بیچوں بیچ میری نگاہ ڈیلفینا پر جم کر رہ گئی۔

وہ فرش سے اٹھ رہی تھی۔ اس کی حرکات وسکنات میں بے پناہ تھکاوٹ پائی جاتی تھی۔ اس کا لباس بے ترتیب اور گرد سے اٹا ہوا تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا' اس کے مخفی روپ نے اس کی خوب درگت بنائی تھی۔ اس کا چہرہ مضمحل اور نقاہت زدہ دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا' وہ برسوں کی صحرائی مسافت طے کرنے کے بعد یہاں پہنچی ہو۔ اس کے بدن پر وہ لباس بھی نہیں تھا جس میں' میں نے اسے لیونگ روم سے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر یہی آیا کہ لیونگ روم سے جانے کے بعد اس نے لباس تبدیل کرلیا ہوگا۔

ربی نے آگے بڑھ کر ڈیلفینا کے سر پر ہاتھ رکھا اور شفقت بھرے انداز میں بولا۔ ''میں تمہاری بہادری کو سلام پیش کرتا ہوں۔ آج تم نے اپنے سب سے خطرناک دشمن کو شکست دے کر اپنی منزل کا حصول آسان بنالیا ہے۔''

میرے کان ربی کے الفاظ پر لگے ہوئے تھے لیکن نگاہ بے چینی سے اس اسٹور روم کے چپے چپے میں کچھ تلاش کررہی تھی۔ میری آنکھیں اس ڈیلفینا کو ڈھونڈ رہی تھیں جسے ڈیلفی نے شکست دی تھی لیکن انگارا آنکھوں والی وہ ڈیلفینا مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔

''محترم ربی!'' میں نے اپنے اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوکر پوچھا۔ ''وہ ڈیلفینا کہاں ہے جس نے ڈیلفی کا جینا دوبھر کررکھا تھا۔ میرا مطلب ہے..... ڈیلفی کی ذات کا منفی عکس؟''

''وہ ڈسپوز ہوگئی..... فنا ہوگئی۔'' ربی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب وہ کسی کو دکھائی نہیں دے گی۔''

''میں سمجھا نہیں.....'' میرے لہجے سے الجھن جھلکتی تھی۔

''مائی سن! تم جا کر لیونگ روم میں بیٹھو۔'' ربی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں وہاں آکر تمہیں سب سمجھاتا ہوں۔''

میرے پاس ربی کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لہٰذا میں اپنے دماغ میں سوچوں کا طوفان لیے مضمحل قدموں کے ساتھ لیونگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

یہ دنیا ایک عجائب خانہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر عجوبہ روزگار افراد سے آپ کا واسطہ پڑتا ہے اور ہر روز ایک نیا تماشا آپ کا منتظر ہوتا ہے۔ انسانی آنکھ ایک حد تک ہی چیزوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور جب معاملات حد سے متجاوز ہوجائیں تو یہی آنکھ تحیر اور تجسس کی کیفیت سے دوچار ہوجاتی ہے۔ ان دنوں مجھ پر بھی حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور ہر قدم پر ایک نئی الجھن میری راہ دیکھ رہی ہوتی تھی۔ میں لیونگ روم کے صوفے پر بیٹھا تازہ ترین حالات پر غور کررہا تھا۔

میں ربی کے کہنے پر یہاں چلا تو آیا تھا لیکن میرے دل میں اطمینان تھا اور نہ دماغ میں سکون۔ ڈیلفینا کو پیش آنے والے واقعے نے میرے دماغ میں ایک ہنگامہ برپا کررکھا تھا۔ ربی آنزک نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے ڈیلفینا کے ''مسئلے'' سے آگاہ کردیا تھا کہ کس طرح اس نے کڑی ریاضت کے بعد اپنی ذات کے منفی پہلو کو جسم سے بے دخل کرکے چھٹکارا پالیا تھا لیکن بدقسمتی سے وہ اس منفی قوت کو مناسب انداز میں ڈسپوز نہیں کرپائی تھی لہٰذا اس شیطانی قوت نے ڈیلفینا کی زندگی اجیرن بنا کر رکھ دی اور اب..... ربی نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے بتایا تھا کہ ڈیلفینا نے اپنی دشمن کو فنا کردیا' نیست و نابود کردیا' ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ اب وہ کبھی کہیں کسی کو دکھائی نہیں دے گی۔

ربی کی بات میں کس حد تک صداقت تھی' اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت ہی نے کرنا تھا۔ ویسے ابھی ربی نے مجھ سے وعدہ تو کیا تھا کہ وہ مجھے سب ''سمجھا'' دے گا۔ میں نے اگر گزشتہ رات کو خود اپنی آنکھوں سے انگارا آنکھوں والی اس ہاؤنٹیڈ ڈیلفینا کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید ربی کی بیان کردہ کہانی کو فسانے سے زیادہ اہمیت نہ دیتا۔ میں نے سوئمنگ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پول میں غسل نصف شب کرنے والی اس آسیب زدہ ڈیلفینا کو بہ قائمی ہوش وحواس دیکھا تھا لہٰذا میں ربی کی باتوں کو یکسر رد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا تاہم بعض باتیں میرے ذہن کو مسلسل الجھا رہی تھیں اور یقیناً یہ باتیں اس وقت تک میرے ذہن کو الجھاتی رہتیں جب تک کہ ربی یا کوئی اور اس کی کلی وضاحت نہ کر دیتا۔

میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالی۔ کلاک میں دن کا ایک بجا تھا۔ میں نے لگ بھگ گیارہ بجے ناشتا کیا تھا پھر ربی آئزک آ گیا تھا اور ڈیلفینا مجھے ربی کے ساتھ مصروف کر کے بنگلے کے کسی اندرونی حصے میں غائب ہو گئی تھی۔ اس دوران میں وہ کیا کرتی رہی تھی' اس کی مجھے مطلق خبر نہیں تھی۔ البتہ' اسٹور روم میں ڈیلفینا کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ اس دو گھنٹے کے وقفے میں اس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا کیونکہ جب وہ مجھے ربی کے پاس چھوڑ کر لیونگ روم سے نکلی تھی تو اس کے بدن پر وہ لباس نہیں تھا جو اسٹور روم میں مجھے اس کے جسم پر دکھائی دیا تھا۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ ربی آئزک لیونگ روم میں داخل ہوا۔ میں اس کے احترام میں یکبارگی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہاتھ سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں بولا۔

''بیٹھ جاؤ مائی سن.....!''

میں نے اس کی خواہش کی تعمیل کی لیکن میری متلاشی نگاہ اس کے عقب میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی اور وہ ''کچھ'' یقیناً ڈیلفینا کے سوا اور کوئی نہیں تھا کیونکہ ربی اکیلا ہی وہاں آیا تھا۔

ہم آمنے سامنے بیٹھ چکے تو ربی نے میری بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو؟''

''ڈیلفینا کہاں ہے؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''وہ آرام کر رہی ہے۔'' ربی نے بڑی رسان سے جواب دیا۔ ''میں نے اسے سلا دیا ہے۔ وہ چند گھنٹے کی گہری نیند لے لے گی تو اس کی طبیعت سیٹ ہو جائے گی۔''

''کیا وہ اپنے بیڈ روم میں سو رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' ربی نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کہا۔ ''مائی سن! مجھے تم سے چند باتیں کرنا ہیں یا یوں سمجھ لو کہ ہم جو گفتگو کر رہے تھے، اس کا کچھ حصہ باقی ہے۔''

''جی ضرور۔'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''تمہیں بھوک تو نہیں لگ رہی؟'' ربی نے پوچھا۔

''نہیں جناب۔'' میں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو ناشتا کیا ہے۔ بھوک بالکل محسوس نہیں ہو رہی۔''

''او کے مائی سن!'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی پھر بولا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہمیں میڈم غریدہ کے بطن سے پیدا ہونے والے الفریڈ کے بچے کی تلاش ہے جو غیر معمولی صلاحیت کا مالک ہے اور عمر میں تمہارے برابر ہی ہے۔ غریدہ اور الفریڈ کے بارے میں' میں تمہیں تفصیلاً بتا چکا ہوں۔ وہ تینوں افراد جب سے غائب ہیں' ہم مسلسل انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ ہمیں غریدہ یا الفریڈ سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہماری اصل ضرورت اور ترجیح ان کا بیٹا ہے جو تمہارا ہم عمر ہے.....'' یہاں تک پہنچنے کے بعد اس نے توقف کیا پھر ٹٹولنے والی نگاہ سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ میرے اندر غریدہ کے صاحب زادے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ لمحاتی جائزے کے بعد وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے گویا ہوا۔

''اسی تلاش کے دوران میں تم ہمیں مل گئے۔ ڈیلفی کی زبانی تمہاری تعریف سنی تو مجھے شک ہوا کہ کہیں وہ تم ہی تو نہیں ہو جس کی ہمیں تلاش ہے لیکن تم سے ملنے کے بعد معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھ گیا ہے۔ تمہیں اپنے والدین کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تمہاری بات پر یقین کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری اپنے والدین کے حوالے سے لاعلمی نے میری تسلی نہیں کی بلکہ میرا یہ شک اپنی جگہ موجود ہے کہ تم غریدہ کے بیٹے ہو سکتے ہو۔''

''مجھے بہتر گھنٹے تک ڈیلفینا نے اس بنگلے پر قیام کرنے کو کہا ہے۔'' ربی کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

''یہ آپ سے میرا وعدہ ہے کہ یہاں سے جاتے ہی میں انکل سلطان سے اپنے والدین کے بارے میں ضرور پوچھوں گا۔ پھر وہ جو بھی بتائیں گے' وہ تفصیل میں ڈیلفینا کو پہنچا دوں گا۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ان بہتر گھنٹوں میں سے کم و بیش چھبیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ چھیالیس گھنٹے باقی ہیں۔ میں وعدے کے مطابق' باقی ماندہ وقت اس بنگلے پر گزارنے کے بعد اپنے انکل کے پاس جاؤں گا۔ پھر آپ کو آپ کے سوال کا جواب بہ الفاظ دیگر آپ کی تلاش کی حقیقت کا پتا چل جائے گا۔''

''چھیالیس گھنٹے اچھا خاصا وقت ہوتا ہے مائی سن!'' وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہوسکتا ہے، تمہارے یہاں سے نکلنے سے پہلے ہی مجھے تمہاری اور تمہارے والدین کی اصلیت کی خبر ہوجائے اور اگر......''

وہ بولتے بولتے رکا' ایک طویل سانس خارج کی پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اگر یہ ثابت بھی ہوجاتا ہے کہ تم ہمارے مطلوبہ نوجوان یعنی میڈم غریدہ کے بیٹے نہیں ہو تو بھی تم ہمارے لیے گہری دلچسپی کا باعث ہو۔ ڈیلفی نے تمہاری جو تعریف کی تھی، اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے لیکن تمہارے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم ہماری ضرورت ہو۔ اگر تم اس بنگلے پر بہتر گھنٹے گزارنے کے بعد ڈیلفی کے ساتھ ایک ایگری منٹ سائن کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہو تو سمجھ لینا پھر تم اس دنیا کے کنگ ہوگے۔ تمہاری ہر خواہش' ہر ضرورت کو پورا کرنا ہماری سوسائٹی کی ذمے داری ہوگی۔''

''اور اگر میں وہ ایگری منٹ سائن نہیں کرتا تو......؟''

میں نے سوالیہ نظر سے ربی کی طرف دیکھا۔

''تم اپنے فیصلے کے لیے آزاد ہو۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''تم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہوگا۔ تم اپنے حق میں اپنی مرضی کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتے ہو۔''

''اور اس دوران میں' میں آپ لوگوں کے جتنا قریب آچکا ہوں، اس کا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ لوگوں کو یہ ڈر نہیں ہوگا کہ میں یہ سارے راز باہر کی دنیا سے ڈسکس کروں گا تو آپ کے لیے یہ اچھا نہیں ہوگا؟''

''قطعاً نہیں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔ ''میں نے اپنے سیٹ اپ کے حوالے سے تم سے جتنی بھی باتیں شیئر کی ہیں اس میں ایسا کچھ نہیں جو ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو۔ یہ ساری معلومات تمہیں گوگل بادشاہ کے دربار میں مل جائیں گی۔ باقی جہاں تک معاملہ ''راز'' کا ہے تو وہ ہم اس وقت تک کسی سے شیئر نہیں کرتے جب تک وہ ہماری سوسائٹی کا باقاعدہ ممبر نہیں بن جاتا اور......'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

''......اور ممبر بن جانے کے بعد بے وفائی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ آج تک جن لوگوں نے سوسائٹی کے اصولوں کو توڑا ہے ان کا انجام بڑا حسرت ناک بلکہ عبرت ناک ہوا ہے...... چاہے وہ کسی طاقتور... ملک کا سربراہ ہی کیوں نہ ہو۔ جو طاقت کسی انسان کو اس دنیا کا حاکم بنا سکتی ہے' وہ اسے نیست و نابود بھی کرسکتی ہے۔''

ربی نے آخری جملے بڑی سنجیدگی بلکہ سفاکی سے ادا کیے تھے۔ اس کے الفاظ نے میرے وجود میں ایک سرد لہر...... سی دوڑا دی تھی۔ ایسی بات نہیں کہ اس نے براہِ راست مجھے کوئی دھمکی دی ہو لیکن انداز ایسا ہی تھا کہ...... بیٹا! صُمّ بُکمّ ہونے ہی میں تمہاری سالمیت ہے۔ اگر تم نے زبان کو لگام نہ دی تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے...... کچھ بھی!

ربی آئزک نے انٹرنیٹ سرچ انجن ''گوگل'' کے لیے ''گوگل بادشاہ کے دربار'' کے الفاظ ادا کیے تھے جو مجھے اچھے لگے۔ یہ سچ ہے کہ ''گوگل'' سرچ پر دنیا کی ہر شے کے بارے میں معلومات حاصل ہوجاتی ہیں لیکن یہ طے کرنا بہت ہی حساس اور نازک معاملہ ہے کہ وہ معلومات کتنے فی صد صحت...... ہوتی ہیں' خاص طور پر ایسی کسی سوسائٹی کے بارے میں معلومات کہ جو ساری دنیا کو چلانے کی دعوے دار ہو۔

میں کبھی بھی ہسٹری کا اچھا طالب علم نہیں رہا لیکن میرے پاس تاریخ کا جتنا بھی علم ہے، اس کے مطابق میں یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہودیوں کی طاقت کا راز اس علمی خزانے سے جڑا ہوا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ورثہ کہلاتا ہے۔ کنگ ڈیوڈ اینڈ کنگ سولومن...... یہ دونوں ہستیاں بادشاہ نبی گزری ہیں اور انہوں نے اپنے علم کے زور پر انسانوں، پرندوں، چرندوں، درندوں الغرض ہواؤں، سمندروں اور پہاڑوں پر بھی حکمرانی کی تھی۔ اسی پراسرار علم یا اس کے کچھ حصے کو کام میں لاکر یہودی اکابرین نے ساری دنیا کو وقت ڈال رکھا ہے......!

مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ربی نے کہا۔ ''کھانا کچن میں موجود ہے۔ تمہیں جب بھوک محسوس ہو، نکال کر کھا لینا۔''

کھانے کی بات ربی نے پہلے بھی کی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ شاید اسے بھوک لگ رہی ہے کیونکہ جب سے وہ اس بنگلے پر آیا تھا' میں نے اسے کچھ کھاتے پیتے نہیں دیکھا تھا۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس سے کہا۔

''محترم ربی! مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔ اگر آپ کچھ کھانا پسند کریں تو میں آپ کے لیے نکال لاتا ہوں......!''

''نہیں مائی سن۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے مخصوص وقت پر صرف دو مرتبہ دن میں کھانا کھاتا ہوں۔ ایک بار صبح میں ناشتا اور دوسری دفعہ رات کا کھانا۔ میں لنچ نہیں کرتا اور ناشتے اور ڈنر کے بیچ بھی کھانے کی کوئی چیز نہیں کھاتا البتہ سادہ یا نیم گرم پانی حسبِ ضرورت پی لیتا ہوں۔ میں نے کھانے کا ذکر صرف

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہاری خاطر کیا تھا۔ خیر.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں جب بھی کچھ کھانے پینے کی حاجت ہو' فریج سے نکال لینا۔ کچن کے فریج میں ہفتے بھر کے لیے کھانے پینے کا تمام سامان یعنی تیار کھانا موجود ہے۔''

''جی ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''مجھے اب جانا ہوگا۔'' وہ ایک گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور جانے سے پہلے میں تمہیں ایک خاص بات بتانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تمہیں اپنے والدین کا سراغ لگانے کے لیے بہت زیادہ کٹھنائیوں سے گزرنا ہوگا۔ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو اور ایک بات ذہن نشین کرلو کہ اپنے والدین تک پہنچنے کے لیے تمہیں ہزاروں کلومیٹرز کا طویل سفر کرنا پڑے گا۔''

بات ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے احترام میں، میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور کہا۔

''آپ تو جا رہے ہیں۔ ڈیلفینا کا کیا ہوگا؟''

''وہ سکون سے اپنے بیڈ روم میں سو رہی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں نے اسے گہری نیند سلا دیا ہے۔ جب تک وہ خود نہ اٹھے' تم اسے جگانے کی کوشش نہیں کرنا۔ وہ جب سو کر اٹھے گی تو ایک دم فریش ہوگی۔''

''دوپہر کا ایک بج چکا۔'' میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کچھ اندازہ ہے' ڈیلفینا کتنے بجے تک بیدار ہوجائے گی؟''

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب تک اس کی نیند پوری نہیں ہوگی، وہ سکون سے سوتی رہے گی۔ نیند پوری ہونے سے میری مراد یہ ہے کہ جب تک وہ جسمانی، ذہنی اور روحانی طور پر ہر نوعیت کی تھکن سے آزاد نہیں ہوجاتی اور..... لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اور اس میں ایک گھنٹا بھی لگ سکتا ہے' دو گھنٹے بھی اور دس گھنٹے بھی..... اسی لیے میں نے کہا ہے کہ تمہیں جب بھی بھوک محسوس ہو' کچن سے کھانا نکال کر کھا لینا۔''

میں خود چونکہ دماغ کو ہدایت دے کر سونے کا عادی تھا لہٰذا ربی آئزک کی بات کو سمجھنے میں مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی۔ وہ ڈیلفینا کا روحانی پیشوا بھی تھا اور میں نے اسے بند دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر ہیرو (عبرانی) میں مقدس الفاظ کا ورد کرتے دیکھا اور سنا تھا۔ یقیناً ربی نے

انسان

روسی ادیب گورکی اور چیخوف کریمیا کے علاقے کی سیر کر رہے تھے۔ چلتے چلتے ان کی نظر ساحل پر بیٹھے روسی ادیب ٹالسٹائی پر پڑی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب بیٹھ گئے۔ کچھ دیر توقف کے بعد انہوں نے آپس میں گفتگو شروع کردی' ان کی گفتگو کا موضوع عورت تھی۔

ٹالسٹائی کی توجہ ان کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر خاموشی سے انہیں سننے کے بعد وہ بول پڑا۔

''میں عورت کے متعلق سچی بات اس وقت کھل کر کروں گا جب میرا ایک پاؤں قبر میں ہوگا۔ سچی بات کرنے کے بعد میں چھلانگ لگا کر اپنے تابوت میں جا پڑوں گا۔ تابوت کا ڈھکنا اپنے اوپر بند کرتے ہوئے میں کہوں گا۔ اے عورت! اب جو سلوک چاہو مجھ سے کرلو۔''

☆☆☆

انگلستان میں کاؤنٹ کیسر لنگ نے کتاب شادی مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اپنے ہم وطن ادیب جارج برنارڈ شا سے التجا کی کہ اس کتاب میں شامل کرنے کے لیے وہ لازماً ایک مضمون لکھ کر دے۔

جارج برنارڈ شا نے یہ کہہ کر معذرت کرلی۔

''دنیا کا کوئی مرد شادی کی حقیقت کے بارے میں اس وقت تک لکھنے کی جرأت نہیں کرسکتا، جب تک اس کی بیوی زندہ ہے۔'' ان بڑے ادیبوں نے اکیلی بے چاری عورت کو نشانہ بنایا ہے۔ کیا مناسب ہے کہ جہاں لفظ عورت لکھا گیا ہے اور جہاں عورت کی طرف بطور بیوی اشارہ ہے، وہاں ہم لفظ انسان جس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، لکھ دیں۔

مرسلہ۔ جاوید شبیر برہ، علی پور مظفر گڑھ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ڈیلفینا کو ایک خاص قسم کی نیند سلا دیا تھا اور ظاہر ہے' مجھے اس کے بیدار ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

ربی رخصت ہونے لگا تو میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''محترم! میں آپ کو گیٹ تک چھوڑ آتا ہوں.....''

''نہیں.....اس کی ضرورت نہیں مائی سن!'' وہ ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کرتے ہوئے نرمی سے بولا۔ ''میں چلا جاؤں گا۔ تمہارا یہاں موجود رہنا ضروری ہے۔ مجھ سے زیادہ ڈیلفی کو تمہاری ضرورت ہے۔''

اس وضاحت کے بعد میں مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

ربی آئزک نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا اور شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مائی سن! اس بنگلے میں تم دونوں کو کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ بہتر گھنٹوں میں جتنا وقت باقی بچا ہے' اس میں ڈیلفی کی باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا۔ اگر وہ باتیں تمہاری سمجھ میں آجائیں تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گا۔ تم سمجھ دار ہو.....میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہو گے۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

ربی چلا گیا اور میں ایک بار پھر لیونگ روم کے آرام دہ ...صوفے میں دھنس کر بیٹھ گیا۔ وہ صوفہ یقیناً بہت آرام دہ تھا' میرے بدن کو آسودگی فراہم کر رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا' کسی نے اپنی مہربان آغوش میں سمیٹ رکھا ہو لیکن اس تمام تر آرام و آسائش کے باوجود بھی میرا ذہن بے حد بے چین اور مضطرب تھا۔ جب سے میں پریسٹن ہالو کے اس بنگلے پر پہنچا تھا' پے در پے حیرت انگیز واقعات کا ایک تسلسل چل نکلا تھا جس نے میری سوچ کو الجھا کر رکھ دیا تھا۔ کچھ چیزیں میری سمجھ میں آرہی تھیں لیکن زیادہ تر معاملات میری عقل و فہم سے بالاتر تھے۔ اس حوالے سے میرے ذہن میں جو سوالات ابھر رہے تھے، ان کے جوابات یا تو ربی آئزک باروح لاؤ دے سکتا تھا یا پھر ڈیلفینا۔ ربی رخصت ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا' دوبارہ اس سے میری ملاقات ہوگی اور ہوگی بھی یا نہیں اور ڈیلفینا.....وہ ربی کے کسی عمل کے زیر اثر گہری نیند میں تھی۔

میں ربی آئزک کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اس نے میرے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ کر جو باتیں کی تھیں' میں ان سے متاثر ہوا تھا۔ مستقبل میں میرے ساتھ کیا پیش آنے والا تھا، یہ تو میرا مالک ہی جانتا تھا لیکن میرے ماضی اور حال کے حوالے سے ربی نے جو انکشافات کیے تھے، ان میں ننانوے فی صد صداقت موجود تھی۔ اس حیرت انگیز اور متاثر کن ریکارڈ کی بنا پر کہا جاسکتا تھا کہ میرے مستقبل کے حوالے سے بھی ربی کی پیش گوئیاں درست ثابت ہوں گی۔

ربی آئزک کی جس بات نے میرے ذہن کو سب سے زیادہ الجھایا تھا، وہ میرے والدین کا معاملہ تھا۔ ربی کو شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ میں غریدہ اور الفریڈ کی اولاد ہوں مگر میرے ریکارڈ میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میں کسی غریدہ کو جانتا تھا اور نہ ہی کسی الفریڈ سے میری شناسائی تھی لیکن ربی کی اس بات میں بہت وزن تھا کہ میں غریدہ اور الفریڈ کی اولاد ہونے سے یکسر انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا کہ اگر مجھے اپنے والدین کے بارے میں ٹھوس معلومات حاصل ہوتیں اور.....ایسا نہیں تھا۔

میرے والدین کے بارے میں صرف انکل سلطان ہی جانتے تھے اور انہوں نے مجھے اس حوالے سے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں جب بھی ان سے سوال کیا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا.....''میرے بچے! مناسب وقت آنے پر میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔''

میں نہیں جانتا تھا' مناسب وقت آنے میں ابھی کتنی دیر باقی تھی لیکن یہ حقیقت تھی' ربی کی گفتگو سننے کے بعد میں اپنے والدین کے حوالے سے بہت الجھ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال بھی آتا تھا کہ کہیں میں غریدہ اور الفریڈ ہی کی اولاد تو نہیں ہوں.....؟

میرے اس سوال کا جواب صرف اور صرف انکل سلطان کے پاس تھا۔ وہی ربی کے خیال کی تصدیق یا تردید کرسکتے تھے اور انکل تک پہنچنے یا ان سے ٹیلی فونک رابطہ کرنے میں ابھی کم از کم پینتالیس گھنٹے باقی تھے۔

دنیا میں پائی جانے والی اکثر چیزیں استعمال کرنے سے کم ہوجاتی ہیں لیکن انسان کا دماغ ایک ایسا عجوبہ ہے کہ اسے جتنا زیادہ استعمال کیا جائے' اس کی وسعت، کارکردگی اور کشادگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ''وسعت اور کشادگی'' کے الفاظ میں نے یہاں دماغ کے دائرۂ کار کو بیان کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اس سے ہرگز میری مراد دماغ کا سائز بڑھنے سے نہیں ہے.....!

میں جس قدر اپنے والدین کے بارے میں سوچ رہا تھا' میرے ذہن میں اس حوالے سے نئے نئے دروا ہو رہے تھے۔ بعض اوقات تنہائی میں' میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ کہیں میں انکل سلطان ہی کی اولاد تو نہیں ہوں اور انہوں نے کسی مجبوری یا مصلحت کی بنا پر یہ راز مجھ سے چھپا رکھا ہو۔ ایسا ہونا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ناممکن تو نہیں تھا۔ میں انکل سلطان کے بارے میں جتنی معلومات رکھتا تھا، وہ انہی کی فراہم کردہ تھیں اور ان معلومات کے مطابق انکل سلطان اچھے وقتوں میں پاکستان سے امریکا آئے تھے۔ وہ امریکی ریاست اوٹاہ کے شہر سالٹ لیک سٹی میں سیٹل ہوئے۔ ایک عیسائی عورت ریٹا میگڈالین سے شادی کی۔ ان کی ایک بیٹی ٹفنی اس وقت ''فوکس نیوز چینل'' میں اچھی پوسٹ پر فائز تھی لیکن میں انکل کے پاس کیسے پہنچا' یہ راز ابھی تک مجھ پر نہیں کھل سکا تھا۔ ربی کو جس باصلاحیت نوجوان کی تلاش تھی، اس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ فرض بھی کرلیا جاتا کہ میں ٹفنی کا بھائی ہوں تو پھر میری ماں عیسائی اور باپ مسلمان ہوجاتا اور حقیقت یہ ہے کہ میں اپنے والدین کے بارے میں کوئی بھی بات وثوق سے کرنے کے قابل نہیں تھا کیونکہ میں اس حوالے سے کچھ بھی نہیں جانتا تھا..... کچھ بھی نہیں!

ربی کا بیان کردہ ایک اور نکتہ بھی میرے ذہن کو الجھا رہا تھا۔ اس نے رخصت ہونے سے پہلے کہا تھا۔ ''ایک بات ذہن نشین کرلو کہ اپنے والدین تک پہنچنے کے لیے تمہیں ہزاروں کلومیٹرز کا طویل سفر کرنا پڑے گا۔''

اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میرے والدین کم از کم امریکا میں تو نہیں تھے۔ نہ شمالی امریکا میں اور نہ ہی جنوبی امریکا میں۔ اگر وہ امریکا میں ہوتے تو پھر مجھے ان تک پہنچنے کے لیے ہزاروں کلومیٹرز کا طویل سفر طے کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر ربی آئزک کی بات درست تھی تو پھر میرے والدین کو افریقا، یورپ، ایشیا یا آسٹریلیا میں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کا ایک واضح مطلب یہ بھی تھا کہ انکل سلطان اور ریٹا میرے والدین نہیں تھے کیونکہ وہ مجھ سے ہزاروں میل کی مسافت پر نہیں تھے.....!

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر کلاک دوپہر..... بلکہ سہ پہر تین بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کب سو گیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں سونے سے پہلے اپنے والدین کی شناخت کے مسئلے پر غور کررہا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ علی سلطان اور ریٹا میرے والدین نہیں تھے۔ اس کے بعد کب میری آنکھ لگ گئی' مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔

مجھے بھوک کا احساس ہوا تو ربی آئزک کی ہدایت بلکہ مشورہ یاد آگیا کہ کچن کے فریج میں کھانے پینے کا سامان وافر مقدار میں رکھا ہے۔ پیٹ پوجا کے خیال کے ساتھ ہی میرا دھیان آپوں آپ ڈیلفینا کی طرف چلا گیا۔ ہم دونوں نے

چیدہ چیدہ

ایک گدھا دو گز کی رسّی سے بندھا ہوا ہے۔ چھ گز کے فاصلے پر گھاس پڑی ہے، گدھا گھاس کیسے کھائے گا۔ ''ہوں..... ہار مان لی۔''

گدھے نے بھی ہار مان لی تھی۔

☆☆☆

لڑکا۔ ''بابا میری شادی کیوں نہیں ہورہی؟'' نجومی ''بیٹا کیسے ہوسکتی ہے۔ تمہاری قسمت میں تو سکھ ہی سکھ لکھا ہوا ہے۔''

☆☆☆

جب ہم چھوٹے تھے، ہمیں بڑے ہونے کا انتظار کرنا مشکل لگتا تھا۔ اب جبکہ ہم بڑے ہوگئے تو ہمیں احساس ہوا کہ ٹوٹے کھلونے اور زخمی گھٹنے ٹوٹے دلوں اور زخمی جذبات سے بہتر ہیں۔

مذاق

شوہر۔ ''تمہاری امی کی مذاق کرنے کی عادت نہیں گئی۔''

بیوی۔ ''کیا کہہ دیا امی نے؟''

شوہر۔ ''آج مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری بیٹی سے شادی کرکے خوش تو ہو نا؟''

سڑک

ڈاکٹر۔ ''جب کار ایک عورت چلا رہی تھی تو تمہیں سڑک سے دور ہٹ جانا چاہیے تھا۔''

مریض۔ ''کون سی سڑک؟ میں تو پارک میں لیٹا ہوا تھا۔''

عجیب دنیا

ایک بوڑھی غیر شادی شدہ عورت نے اخبار میں خبر دیکھ کر اپنی ہم عمر غیر شادی شدہ سہیلی کو اپنی تیسری مشترکہ سہیلی کے بارے میں بتایا۔ کل کیتھرین کا تیسرا شوہر بھی مرگیا۔ وصیت کے مطابق اسے نذر آتش کیا گیا ہے۔ بوڑھی سہیلی نے تاسف سے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ کیسی عجیب دنیا ہے۔ کسی کو ایک شوہر بھی نصیب نہیں ہوتا اور کوئی شوہر پر شوہر ہی جلائے جاتی ہے۔

(انتخاب: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ)

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چار گھنٹے پہلے ایک ساتھ ہی ناشتا کیا تھا۔ اگر مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی تو یقیناً ڈیلفینا کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی.....!

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا کہ جا کر ڈیلفینا کو جگاتا ہوں۔ پھر ہم دونوں بیٹھ کر ایک ساتھ لنچ کریں گے لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال کو ذہن سے نکال باہر کیا کیونکہ ربی آئزک کی تاکید مجھے یاد آ گئی تھی کہ میں نے کسی بھی صورت میں ڈیلفینا کو بیدار نہیں کرنا۔ وہ جب بھی اٹھے گی، خود ہی اٹھے گی۔ میں ربی کی نصیحت کے خلاف چل کر خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

میں چپ چاپ لیونگ روم سے اٹھا اور کچن کی سمت قدم بڑھا دیے۔ اس دوران میں میڈم غریدہ بھی میرے ذہن میں موجود تھی۔ ربی نے ان خاتون کی اسٹوری سنا کر میرے ذہن کو ایک خاص انداز میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس اسٹوری میں بے پناہ تحیر اور تجسس چھپا ہوا تھا۔ ایک بااثر اور طاقت ور بیوروکریٹ خاندان سے تعلق رکھنے والی میڈم غریدہ راول پنڈی (پاکستان) سے سان ڈیاگو (امریکا) پہنچتی ہے اور یام ایونیو پر واقع سیون الیون اسٹور کی فرنچائز منیجر بن جاتی ہے۔ پھر وہ تینتیس سالہ الفریڈ نامی ایک عیسائی مرد سے شادی کرتی ہے اور تینتیس ماہ سیون الیون اسٹور پر جاب کرنے کے بعد ایک دن اچانک اپنے شوہر اور بیٹے کے ہمراہ غائب ہو جاتی ہے۔ وہ منظر سے اس طرح غائب ہوتی ہے کہ پھر ڈھونڈے نہیں ملتی۔ یہ سارے واقعات کسی مسٹری سے کم نہیں تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان معاملات کے پیچھے کوئی سنسنی خیز گہرا راز نہ چھپا ہو.....!

جہاں تک کسی گہرے راز کی بات ہے تو ربی آئزک نے بڑے واشگاف الفاظ میں مجھے باور کرایا تھا کہ ان کی سیکرٹ سوسائٹی کا دائرۂ کار اس دنیا کے وہ حصے ہیں جو تھرٹی تھری پیرلل نارتھ یعنی تینتیس درجہ عرض البلد شمال پر یا اس کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ راول پنڈی اور سان ڈیاگو اسی درجے پر پائے جاتے تھے۔ گویا نمبر تینتیس کی کسی خاص حوالے سے بہت اہمیت تھی۔

سوچوں کے اسی گورکھ دھندے کے دوران میں، میں نے ہلکی پھلکی پیٹ پوجا بھی کر لی۔ اس کے ساتھ ہی دماغ کی بتی بھی روشن ہوگئی۔ جب پیٹ میں خوراک پہنچ جائے تو پھر انسان کو ہری ہری سوجھنے لگتی ہے۔ میرے ذہن میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ مجھے گھوم پھر کر اس بنگلے کا سروے کرنا چاہیے۔ ربی نے صرف مجھ پر پابندی عائد کی تھی کہ میں نے ڈیلفینا کو جگانا نہیں، گویا میں اس بنگلے میں نقل و حرکت کے لیے کُلی طور پر آزاد تھا۔ میں لیونگ روم سے نکل کر بنگلے کے داخلی گیٹ پر پہنچ گیا۔

سارا طرنا می سابق میئر آف ڈیلس کا وہ بنگلا کم و بیش ڈیڑھ ہزار گز یا اس سے زیادہ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ پریسٹن ہالو کا انتہائی پُرسکون اور ٹربل فری علاقہ تھا۔ یہاں بسنے والے افراد کی زندگی میں کسی قسم کی ٹینشن نہیں ہوتی۔ یہ الگ بات کہ کوئی ہاؤنٹیڈ کریکٹر (آسیب زدہ کردار) کسی طرح دار حسینہ کی زندگی میں اودھم مچانے آ جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتے.....!

بنگلے کا داخلی گیٹ بند تھا۔ میں نے اسے اندر سے کنڈی بھی لگا دی۔ مین گیٹ سے بنگلے کی اندرونی عمارت کے بیچ ایک سرسبز راہ داری تھی، میں نے مذکورہ راہ داری پر قدم بڑھا دیے۔ یہاں کا ہر بنگلا الگ تھلگ اور پرائیویسی کا ماحول لیے ہوئے تھا۔ ربی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہاں کوئی ہمیں ڈسٹرب کرنے نہیں آئے گا اور مجھے اس کی بات درست نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے بڑے اعتماد کے ساتھ راست گوئی کرتے دیکھا تھا۔ ربی کی بعض باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔

میں کار پورچ سے ہوتے ہوئے بنگلے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ پورچ میں وہ گاڑی موجود تھی جس میں گزشتہ شام میں نے ڈیلفینا کی ہم نشینی میں پریسٹن ہالو کی سیر کی تھی۔ بنگلے کے سامنے والے پورشن میں ایک کشادہ لیونگ روم کے ساتھ ہی کچن بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد کاریڈور تھا۔ کاریڈور کی دوسری جانب کمرے بنے ہوئے تھے۔ میں ان کمروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مذکورہ کمروں کے پہلو سے ایک تنگ سا کاریڈور بنگلے کے عقبی حصے کی طرف جاتا تھا۔ یہ وہی راہ داری تھی جس سے گزر کر میں اپنے بیڈ روم تک پہنچا تھا۔ میرے بیڈ روم کے آس پاس بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے جس میں سے ایک کمرے میں، میں نے خوابیدہ ڈیلفینا کے شاداب بدن کی جلوہ افروزی دیکھی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق وہ ڈیلفینا کا بیڈ روم تھا۔ دوسری جانب والے کمرے کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں، ان بیڈ رومز کے بعد بنگلے کا کشادہ لان تھا جس کے بیچ ایک عالی شان سوئمنگ پول بنا ہوا تھا جہاں میں نے لاسٹ نائٹ منفی ڈیلفینا کے حشر ساماں حسن کو سوئمنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سرخ انگارا آنکھوں والی وہ ڈیلفینا ربی کے بیان کے مطابق اب قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ ڈیلفی نے زبردست معرکہ آرائی کے بعد

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسے شکست دے کر ڈسپوز کر دیا تھا یعنی ٹھکانے لگا دیا تھا۔

اپنے والے بیڈروم کے سامنے پہنچ کر میرے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ یہ خیال اتنا طاقت ور اور فی الفور تھا کہ میں نے آناً فاناً میں اس پر عمل کر ڈالا۔ اگلے ہی لمحے میں اپنے بیڈروم کے اندر تھا۔ میں نے ابھی جس فوری خیال کا ذکر کیا، وہ ڈیلفینا کے بیڈروم کے حوالے سے تھا۔

میرے اور ڈیلفینا کے بیڈروم کے بیچ ٹنڈ گلاس وال تھی۔ شیشے کی اس بھوری دیوار کے اس پار ڈیلفینا کا بیڈروم تھا جہاں پچھلی رات وہ سرخ نائٹی میں ملبوس سرخ بیڈ پر محوِ استراحت تھی۔ اس کے خوابیدہ حسن کا تصور رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دیتا تھا۔ ربی آئزک نے مجھے بتایا تھا کہ ڈیلفینا اپنے بیڈروم میں گہری نیند سو رہی ہے۔ یہی دیکھنے کے لیے میں اپنے بیڈروم میں چلا گیا تھا لیکن یہاں کا معاملہ میری سوچ سے بالعکس نکلا۔ میرا ذہن یک لخت گہری الجھن میں گھر گیا۔

مجھے امید تو نہیں تھی کہ اندھے شیشے والی اس بھوری دیوار کی دوسری سمت ڈیلفینا کے بیڈروم میں روشنی ہوگی اور میں اسے محوِ خواب دیکھ سکوں گا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ادھر کا منظر میری نگاہ سے اوجھل رہے گا لیکن سب کچھ اس کے الٹ ثابت ہوا۔

ڈیلفینا اس بیڈروم میں موجود نہیں تھی۔ سرخ بیڈ شیٹ کی سلوٹیں اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ یہاں سے اٹھ کر جانے والا دوبارہ اس طرف نہیں آیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ ڈیلفینا نے گزشتہ رات تو اس بیڈروم میں گزاری تھی مگر اس وقت وہ کسی اور بیڈروم میں سو رہی تھی۔ ٹنڈ گلاس وال والے بیڈروم کے حوالے سے میرے ذہن میں اَن گنت سوالات موجود تھے۔ میں نے بیڈروم کو ڈیلفینا کے وجود سے خالی پایا تو ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوری طور پر ڈیلفینا کے بیڈروم کا معائنہ کرنا چاہیے.....!

میں نے الٹے ہاتھ کی ٹھوکر سے مذکورہ دیوار کو دستک دینے والے انداز میں بجا کر دیکھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں دستک دے کر دیوار کھلوانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا مقصد اس دیوار کی ''خیریت'' دریافت کرنا تھا۔ میری انگلیوں کے جوڑوں نے ٹھونک بجا کر یہ معلوم کرلیا کہ وہ براؤن ٹنڈ گلاس وال خاصی مضبوط اور موٹی تھی۔ دستک کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مخصوص دبیز آواز نے مجھے بتا دیا کہ اس دیوار کی موٹائی کم و بیش چار انچ رہی ہوگی۔

میرے لیے حیرت کا باعث یہ بات تھی کہ اس.... بیڈروم کی تمام لائٹس آن تھیں، اسی لیے مجھے ادھر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ آج صبح یعنی لگ بھگ گیارہ بجے جب میں ڈیلفینا کی دستک پر بیدار ہوا تھا تو اس وقت مذکورہ بیڈروم کی لائٹس آف تھیں لہٰذا میں ٹنڈ گلاس وال کی دوسری طرف کچھ بھی دیکھ نہیں پایا تھا۔ جب میں نے پچھلی رات اس ٹنڈ گلاس وال کو دریافت کیا تھا تو اس وقت میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ یہ دیوار میرے والے بیڈروم میں موجود افراد کو دیکھنے اور ان کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے لیے بنائی گئی ہے لیکن اگر ایسا تھا تو پھر سرخ بیڈ والے اس بیڈروم کو میری نگاہ کے سامنے روشن نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ابھی تک جو کچھ پیش آیا تھا اس سے منطقی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا تھا کہ مذکورہ براؤن ٹنڈ گلاس وال میرے والے بیڈروم سے ڈیلفینا والے بیڈروم میں دیکھنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اصل حقیقت کیا تھی، یہ تو ڈیلفینا سے اس موضوع پر بات کر کے ہی معلوم کی جاسکتی تھی۔

میں نے اپنے بیڈروم میں رہتے ہوئے ڈیلفینا والے بیڈروم کا تنقیدی جائزہ لیا۔ بیڈروم کا داخلی دروازہ بند تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ربی آئزک نے ڈیلفینا کو اسی بیڈروم میں سلایا ہو اور میرے یہاں اپنے بیڈروم میں پہنچنے سے پہلے وہ بیدار ہوگئی ہو اور اس وقت واش روم میں فریش اپ ہو رہی ہو.....!

ایسا ہوسکتا تھا مگر میرے ذہن میں ایک سوال شروع سے چبھ رہا تھا اور وہ یہ کہ ڈیلفینا اپنے بیڈروم کا منظر میری نگاہ کے سامنے کیوں روشن کرنا چاہتی تھی؟ کیا یہ اس کے کسی خاص پروگرام کا حصہ تھا یا وہ خود بھی براؤن ٹنڈ گلاس وال کی مسٹری سے ناواقف تھی؟

یہ دوسری صورت خارج از امکان نہیں تھی کیونکہ ڈیلفینا کے بیان کے مطابق' یہ بنگلا اس کی دوست سارا ملر کا تھا جو ان دنوں اپنے شوہر کے ہمراہ آسٹریلیا گئی ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ سارا ملر، ڈیلفینا کو براؤن ٹنڈ گلاس وال کے بارے میں بتانا بھول گئی ہو یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ سارا نے دانستہ ڈیلفینا کو کچھ نہ بتایا ہو۔

اس بیڈروم کے پچھلے حصے میں واش روم بنا ہوا تھا۔ میری نگاہ ڈیلفینا والے بیڈروم کے واش روم پر جمی ہوئی تھی اور سماعت اس واش روم میں گرنے والے پانی کی آواز کو سننے کے لیے کوشاں تھی حالانکہ میرے ذہن میں یہ حقیقت موجود تھی کہ اتنے موٹے ٹنڈ گلاس کی اس جانب سے پانی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گرنے کی آواز اس طرف رسائی حاصل نہیں کرسکتی تھی لیکن میری سماعت کی یہ سعی ایک اضطراری عمل تھا جو موجودہ صورتِ حال کا پیدا کردہ تھا۔

جب اگلے دس منٹ تک بھی ڈیلفینا والے بیڈ روم کے واش روم کا دروازہ نہیں کھلا تو میرے ذہن نے ایک اہم فیصلہ کرلیا اور وہ فیصلہ تھا..... ڈیلفینا والے بیڈ روم میں جاکر حقیقت کو آشکار کرنے کا۔

ظاہر ہے' میں کوئی سپر مین نہیں تھا جو ٹنڈ گلاس وال میں سے گزر کر اس طرف پہنچ جاتا۔ میں گوشت و پوست سے بنا ہوا ایک عام انسان تھا لہٰذا مجھے ایک بیڈ روم سے دوسرے بیڈ روم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے وہی راستہ اختیار کرنا تھا جو عموماً انسان اپناتے ہیں۔

میں اپنے بیڈ روم سے باہر کاریڈور میں نکل آیا پھر اپنے بیڈ روم کا دروازہ بند کرنے کے بعد ملحقہ بیڈ روم کی سمت بڑھ گیا۔ کاریڈور میں مکمل خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ڈیلفینا کے بیڈ روم کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر.. یہ آہستگی اسے گھمانے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دروازہ لاک نہیں تھا۔ میرے ہاتھ کے دباؤ سے ہینڈل گھوم گیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ دروازہ کھولا اور ڈیلفینا کے بیڈ روم میں داخل ہوکر دروازہ اندر سے بند کردیا۔

اگرچہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی۔ کسی کی خواب گاہ میں اس کی اجازت کے بغیر داخل ہونا ایک قابلِ مذمت فعل ہے اور میں نے یہ فعل ارادی طور پر کیا تھا لہٰذا میرے جرم کی سنگینی دوگنا شمار کی جانا چاہیے تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت تھی کہ میں نے یہ ''حرکت'' خود کو پیش آمدہ حالات سے مجبور ہوکر کی تھی۔ میں نے یہ سوچ کر اپنے ذہن کو مطمئن کردیا کہ اس بنگلے پر بہتر گھنٹے کے قیام کے دوران میں ڈیلفینا کی طرف سے مجھ پر صرف ایک پابندی عائد کی گئی تھی اور وہ یہ کہ میں اس بنگلے سے باہر کسی سے رابطہ نہیں کروں گا۔ میں نے ابھی تک اس پابندی کا پاس کیا تھا اور تیرہ جون بروز جمعہ دوپہر گیارہ بجے تک میں اس عہد کو پورا کرنے کا پابند تھا۔

میں نے باتھ روم کے دروازے پر کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ اندر مکمل سناٹا اور خاموشی تھی۔ یہی محسوس ہوتا تھا باتھ روم کے اندر کوئی موجود ہے اور نہ ہی اس بیڈ روم میں کسی ذی روح کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اپنی تسلی کی خاطر میں نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ باتھ روم خالی تھا۔ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور باتھ روم کا دروازہ بند کردیا۔

یہ اطمینان ہوجانے کے بعد کہ اس بیڈ روم میں کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا' میں اپنے اصل ٹارگٹ کی جانب بڑھ گیا اور وہ ٹارگٹ تھا..... براؤن ٹنٹڈ گلاس وال کی مسٹری تک رسائی حاصل کرنا!

میں نے جیسے ہی اس دیوار پر نگاہ ڈالی' میری نظر پتھرا کر رہ گئی کیونکہ اس دیوار کی ادھر والی سائڈ میرے بیڈ روم والی سائڈ سے مختلف تھی۔ میرے بیڈ روم میں یہ دیوار چھت تک ایک ہی جیسی ٹنٹڈ تھی لیکن یہاں پر یہ چھت سے آٹھ دس انچ نیچے سے شروع ہوتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ڈیلفینا والے بیڈ روم کی چھت میرے والے بیڈ روم سے آٹھ دس انچ زیادہ بلند تھی یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ میرے بیڈ روم کی چھت اس بیڈ روم سے آٹھ دس انچ نیچی تھی۔

میں نے ٹنٹڈ گلاس وال کا بہ غور جائزہ لیا تو ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی۔ مذکورہ آٹھ دس انچ کے حصے میں ایک جدید ریلنگ نصب تھی اور دیوار کے آخری حصے پر ایک کونے میں' ایک دبیز پردہ لٹکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس... پردے کا کلر ڈارک براؤن تھا۔ گویا میں جسے ٹنٹڈ گلاس سمجھ رہا تھا، وہ لائٹ براؤن کلر کا ایک موٹا سا عام شیشہ تھا جس کے آر پار دیکھنا ممکن تھا۔ اسے ''اندھا'' بنانے کا کام اس دبیز بھورے پردے سے لیا جاتا تھا۔ جب اس بیڈ روم کے منظر کو اس بیڈ روم میں دکھانا مقصود ہوتا تو اس پردے کو ہٹا دیا جاتا تھا یعنی جب سرخ بیڈ پر جلوہ افروز خوابیدہ حسن کو تمام تر شبابی رعنائیوں اور شادابیوں کے ساتھ دوسرے بیڈ روم تک پہنچانا مقصود ہوتا تو اس پردے کو ایک طرف کھینچ کر نظارے کی راہ میں حائل ہر رکاوٹ دور کردی جاتی تھی۔ اس دبیز پردے کے تفصیلی معائنے کے بعد مجھے یہ بھی پتا چلا کہ اسے ریموٹ کی مدد سے کنٹرول کیا جاتا تھا یعنی بیڈ پر لیٹا ہوا شخص جب چاہتا اس دیوار کو ''اندھا'' بنا دیتا اور جب چاہتا اس کی ''بصارت'' بحال کردیتا۔

میں تھوڑی دیر تک مزید اس بیڈ روم میں رہا پھر گھوم پھر کر واپس لیونگ روم میں آگیا۔ ڈیلفینا والے بیڈ روم کی یاترا نے میرے دماغ کو گھما کر رکھ دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا سوچوں اور کیا نہ سوچوں۔ میرا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ گزشتہ رات ڈیلفینا نے بہ صد اہتمام مجھے ''دعوتِ نظارہ'' دی ہوگی۔ تو کیا وہ سرخ نائٹی کی چلمن سے جھانکنے والا بے ترتیب بدن کسی ڈیلفینا نما کا تھا.....!

☆☆☆

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیوار گیر کلاک نے شام کے چھ بجے کا اعلان کیا۔ میں لیونگ روم کے صوفے پر بیٹھا ایل ای ڈی کی اسکرین سے دل بہلا رہا تھا۔ میں کسی دلچسپ پروگرام کی تلاش میں اوپر تلے چینلز بدل رہا تھا مگر کوئی چینل میری توجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ گزشتہ روز ڈیلفینا نے مجھے اسی اسکرین پر نہایت ہی اہم چیزیں دکھائی تھیں جن میں ایک ویڈیو کلپ چرچ چکن ریسٹورنٹ کے کچن کا تھا جہاں میں نے پیبلو کی ایسی پٹائی کی تھی کہ وہ جان کی بازی ہار گیا تھا۔ اس کے علاوہ ڈیلفینا نے مجھے شارو کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا تھا کہ لیونارڈو اسے اغوا کر کے کیوبا لے گیا تھا اور آگے اسے بہاماز کے شہر ناسو پہنچا کر اس سے عصمت فروشی کا دھندا کرانے کا ارادہ تھا پھر اس سے ایک قدم آگے نیوز بلیٹن نے میرا دماغ چکرا کر رکھ دیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ پیبلو کا قاتل ایلفینڈرو اینگلٹن سے ایلون جاتے ہوئے ہائی وے تھری فائیو پر پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایلفینڈرو نامی اس دراز قامت ہسپانوی شخص نے ایل جے پی ڈی کی کسٹڈی میں اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ پیبلو میرے ہاتھوں جہنم واصل ہوا تھا۔

میری حیرت اور الجھن کو دور کرنے کی غرض سے ڈیلفینا نے کہا تھا۔ ''ہم تو ایسے ہی کام کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ رہو گے تو ساری زندگی اسی طرح عیش کرو گے۔''

میں ڈیلفینا کے پاس عیش کرنے کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ میں پیبلو کی موت کے سلسلے میں خارج از شکوک ہو چکا تھا۔ اب اگر شارو بھی مجھے مل جاتی تو میرا مقصد حاصل ہو جاتا تھا۔ میں نے انہی دو مشکلات سے نمٹنے کے لیے ڈیلفینا سے مدد کی درخواست کی تھی۔ میرا ایک کام تو ہو گیا تھا اور ڈیلفینا نے شارو کی دستیابی کا بھی وعدہ کیا تھا مگر کسی خاص شرط کی بنیاد پر۔ مجھے شدت سے اس لمحے کا انتظار تھا جب ڈیلفینا اپنی وہ شرط کھول کر میرے سامنے رکھ دیتی۔ یہ اہم کام انہی بہتر گھنٹوں میں کسی وقت ہونا تھا۔

میں ڈیلفینا اور اس کی شرط کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ لیونگ روم کے باہر قدموں کی مخصوص چاپ سنائی دی۔ اس بنگلے میں اس وقت میرے اور ڈیلفینا کے سوا اور کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ قدموں کی یہ آواز ڈیلفینا کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے ٹی وی کی آواز بہت نیچی کر دی اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

اگلے ہی لمحے وہ میری نگاہ کے فریم میں آ گئی۔ وہ کاریڈور سے لیونگ روم میں داخل ہوئی تو ایک دم ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ پانچ گھنٹے پہلے وہ کتنے بڑے طوفان سے گزر چکی تھی۔ شاید یہ تازگی اور بشاشت ربی آئزک کے اس روحانی عمل کا ثمر تھا جو اس نے ڈیلفینا کو گہری نیند سلاتے وقت کیا تھا۔ ڈیلفینا نے فریش ہو کر لباس بھی تبدیل کر لیا تھا اور بڑی چمکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر پھسلی جا رہی تھی۔

وہ ایک شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے لیونگ روم میں پہنچی پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے بولی۔

''کیا ہو رہا ہے؟''

''ٹی وی چینلز سے دل بہلا رہا ہوں۔'' میں نے بھی اسی کے انداز میں جواب دیا۔

''تو تمہارا دل بہل گیا؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جواباً کہا۔ ''بالکل نہیں!''

اس کے شنگرفی ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر دوستانہ لہجے میں بولی۔ ''یار! تم ایسے کام کرتے ہی کیوں ہو جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا!''

''کام ایسا ہو یا ویسا، اس کا نتیجہ لازمی برآمد ہوتا ہے ڈیلفی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ الگ بات کہ کسی کام کا فوراً اور کسی کام کا کچھ عرصے بعد۔''

''یار! فلسفے کی نہیں ہو رہی۔'' وہ دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولی۔ ''شام ہو رہی ہے اور مجھے بھوک محسوس ہو رہی ہے۔''

''تم ادھر آرام سے بیٹھو۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے لیے کھانا نکال کر لاتا ہوں۔''

''مہمان تم ہو یا میں۔'' اس نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

''ظاہر ہے میں تمہارا مہمان ہوں۔''

''تو پھر تم بیٹھو۔ کھانا میں لگاتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''میں نے کھانا کھا لیا ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کب؟'' وہ حیرت سے مجھے تکنے لگی۔

''لگ بھگ تین بجے۔''

''اوہو...... تم نے اکیلے ہی کھا لیا'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔ ''میرا انتظار بھی نہیں کیا؟''

''میں نے تمہارا انتظار کرنے کے لیے ہی تھوڑا سا کھایا تھا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میرا انتظار کرنے کے لیے۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''میرا مطلب یہ ہے کہ میں نے صرف اتنا کھایا تھا کہ جسم میں تھوڑی سی توانائی آجائے اور میں اس مکمل توانائی کے سہارے تمہارے انتظار کے لمحات کو گزار سکوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ..... اب تو اس بات کو تین گھنٹے گزر چکے۔'' وہ پُرتشویش انداز میں بولی۔ ''تمہیں بھی بھوک لگ رہی ہوگی؟''

''لگ رہی تھی.....'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی پھر پوچھا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب اب نہیں لگ رہی۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''اب ایسا کیا ہوگیا ہے کہ تمہاری بھوک ہی اڑ گئی؟'' اس کی الجھن میں اضافہ ہوگیا۔

''بس تمہیں اپنی آنکھوں سے ہنستے مسکراتے اور صحیح سلامت دیکھ لیا تو میرا دل مطمئن ہوگیا ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

''تم شاعری بھی کرتے ہو؟'' میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا سوال کردیا۔

''نہیں..... میں نے کبھی شاعری نہیں کی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن شعری ذوق ضرور رکھتا ہوں۔ کوئی اچھا شعر سننے کو مل جائے تو طبیعت خوش جاتی ہے لیکن کھانے پینے کے تذکرے میں شاعری کا ذکر کہاں سے آگیا؟''

''اصل میں کھانا پینا معدے کی شاعری ہے۔'' وہ تبسم ریز لہجے میں بولی۔

''معدے کی شاعری؟'' میں نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔

''کیوں .....کیا ہوا؟'' وہ شرارت بھرے انداز میں مستفسر ہوئی۔

''یہ ٹرم کبھی سنی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اعضا کی شاعری کا ذکر سنا ہے؟''

''یس!'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''رقص کو اعضا کی شاعری کہا جاتا ہے۔''

''معدہ بھی انسانی جسم کا ایک عضو ہے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''جب خالی معدے کے اندر لذیذ کھانا قدم رکھتا ہے تو یہ وجد کے عالم میں محوِ رقص ہوجاتا ہے۔ اس دوران میں ذائقے اور لذت کی جو شاعری ہوتی ہے، اسے معدے کی شاعری کہا جاتا ہے.....''

''تکنیکی اعتبار سے تو تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو۔'' میں نے اس کی وضاحت سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا پہلے کبھی سنا نہیں تھا۔''

''اب تو سن لیا نا؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں سن لیا اور تسلیم بھی کرلیا۔''

''تو پھر تم جلدی سے فریش ہوجاؤ۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''ہم باہر جارہے ہیں۔''

''باہر جارہے ہیں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اور وہ جو تمہیں بھوک لگ رہی تھی.....!''

''اسی بھوک کے علاج کے لیے تو باہر جارہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''آج کا ڈنر کسی ریسٹورنٹ میں ہوگا۔''

''گڈ آئیڈیا۔'' میں نے سراہنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ ''اس سے پہلے کہ شاعرِ معدہ چوہوں کی یلغار کا شکار ہوجائے اور سزا کے طور پر اسے آنتوں کی بے ہنگم قوالیاں سننا پڑیں، ہمیں ڈنر کے لیے روانہ ہوجانا چاہیے۔''

''یہ چوہے کہاں سے آگئے؟'' اس نے پوچھا۔

''میڈم! میں نے تمہاری معدے کی شاعری والی بات مان لی نا!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تم بھی میری بات کو بے چون و چرا تسلیم کرلو.....'' لمحاتی توقف کے بعد میں نے ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کردی۔

''تمہارے ذہن کی الجھن کو دور کرنے کے لیے بتاتا چلوں کہ جب انسان کی بھوک شدت پکڑتی ہے تو پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے ہیں اور آنتیں قوالیاں شروع کردیتی ہیں۔''

''اوہ..... آئی سی!'' وہ ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی پھر کہا۔ ''تو پھر تمہیں اور بھی جلدی فریش ہوجانا چاہیے۔''

''میں پانچ منٹ میں تمہیں ریڈی ملوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میری ایک شرط ہے۔''

''کیسی شرط؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''آج کا ڈنر میری طرف سے ہے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہ جو بھی بات ہوئی .....اس سے مجھے سروکار نہیں۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''آج کا ڈنر تمہاری کامیابی کی خوشی میں میری طرف سے ہے۔ تم نے منفی ڈیلفینا کو شکست دے کر بلکہ نیست و نابود کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

''اوہ.....'' وہ دلچسپی بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تو تم اس کے بارے میں جانتے ہو؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''صرف جانتا ہی نہیں بلکہ پچھلی رات میں نے اسے سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔'' میں نے کہا۔

وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی ''شکر ہے کہ مجھے اس مصیبت سے چھٹکارا مل گیا۔''

''اس منفی ڈیلفینا کے بارے میں ربی آئزک نے مجھے تفصیلاً آگاہ کردیا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''جس وقت تم سوئمنگ پول والے اسٹور روم میں اس منفی قوت سے نبرد آزما تھیں' ربی آئزک کے ہمراہ میں بھی وہاں پہنچا تھا اور ربی جب تک عبرانی میں کوئی عمل کرتے رہے' میں وہاں موجود رہا تھا۔ جب تم نے اپنی دشمن کو زیر کرکے فنا کردیا تو میں نے اسٹور روم کے اندر جاکر تمہیں دیکھا تھا۔ تمہاری حالت بہت تشویش ناک ہورہی تھی پھر ربی نے مجھے واپس لیونگ روم جانے کے لیے کہا تھا اور تمہیں تمہارے بیڈ روم میں گہری نیند سلادیا تھا۔''

''اس موضوع پر بعد میں کبھی بات کریں گے۔'' وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی۔ ''جلدی سے تیار ہوکر آجاؤ۔ اب میری بھوک برداشت سے باہر ہورہی ہے۔''

''اوکے میڈم!'' میں نے کہا۔ ''ابھی گیا اور ابھی آیا.....''

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ کر بنگلے سے روانہ ہوگئے۔ مین روڈ پر آنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''کہاں چلیں؟''

''جہاں تم لے چلو۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔ ''میں بہتر گھنٹے کے لیے تمہاری کسٹڈی میں ہوں جس میں سے بتیس گھنٹے گزر چکے' چالیس گھنٹے باقی ہیں.....''

''اور اگر میں جہنم میں جانا چاہوں تو.....!'' وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اگر وہ مجھے اپنے ساتھ جہنم لے جانے کا ارادہ رکھتی ہو تو اس صورت میں میرا فیصلہ کیا ہوگا!

''میڈم! تم اتنی دل کش ہو کہ تمہارے ساتھ جہنم جانے میں بھی کوئی مضایقہ نہیں ہے۔'' میں نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری ہم نشینی میں دہکتا ہوا جہنم میرے لیے بہشت زار بن جائے گا۔''

''میں تم سے اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ آج کا ڈنر تمہاری طرف سے ہے۔'' وہ بڑی مہارت سے اصل موضوع ..... کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے ڈسپوزل پر ہوں لہٰذا ریسٹورنٹ بھی تمہاری پسند ہی کا ہونا چاہیے۔''

ڈیلفینا بہت ہی ذہین اور چالاک تھی۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی کہ میں نے جب بھی اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تھی تو وہ بڑی ہوشیاری سے موضوع کو بدل دیتی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا اس سے عشق وشق لڑانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ فری ہونے کا مقصد یہی تھا کہ میں اس کے اندر سے وہ راز اگلوا سکوں جنہوں نے میرے ذہن کو الجھا رکھا تھا۔ ڈیلفینا' ربی آئزک اور ان کے سیٹ اپ کے حوالے سے میرے ذہن میں اُن گنت سوالات تھے جن کے جوابات مجھے اسی وقت مل سکتے تھے جب ڈیلفینا میرے قریب ہوجاتی اور..... وہ کم بخت دوستی اور محبت کو فضول سمجھتی تھی۔ اس کی نظر میں صرف ضرورت کی اہمیت تھی ..... نظریۂ ضرورت کی اولاد کہیں کی!

''میں تو پریسٹن ہالو پہلی مرتبہ آیا ہوں۔'' میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ''یہاں کے ریسٹورنٹس کے بارے میں میری معلومات صفر کے برابر ہیں۔ راہ نمائی تو تمہیں ہی کرنا ہوگی جیسے.....''

''جیسے کیا؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''جیسے گزشتہ شب تم نے مجھے اسٹرپ کلبس کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔'' میں نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بالکل ویسے ہی ریسٹورنٹس کے بارے میں بھی راہ نمائی کردینا۔''

''اوکے!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر بہ دستور سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''کیا تمہیں چینیز فوڈ کا شوق ہے؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' میں نے گردن کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ جاپانی کھانے بھی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ پتا نہیں کیا الا بلا پکا کر رکھ دیتے ہیں۔''

''پھر تو کوناگرل جانا فضول ہی ہوگا۔'' اس نے کہا اور بتایا۔ ''کوناگرل پریسٹن ہالو کا ایک معروف ریسٹورنٹ ہے۔''

''کچھ اور بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''بھوک کی شدت اس بات کا تقاضا کررہی ہے کہ ہمیں فی الفور کسی ریسٹورنٹ کے نام پر اتفاق کرلینا چاہیے۔'' وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''اس وقت ہم نارتھ سینٹرل ایکسپریس وے پر ہیں اور ہمارے قریب دو ریسٹورنٹس ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔''

''ان دو ریسٹورنٹس کی تفصیل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک کا نام تاج محل ہے اور دوسرا پی۔ ایف چینگز کہلاتا ہے۔'' ڈیلفینا نے بتایا۔

''ان کے کوزین کے بارے میں بتاؤ۔''

''تاج محل انڈین کھانے فراہم کرتا ہے۔'' اس نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جواب دیا۔ ''اور پی۔ ایف چینگو کا کوزین ایشین/ چائنیز ہے۔''

''پی۔ ایف چینگ ڈن!'' میں نے فیصلہ سنا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم نارتھ پارک کے سامنے سے گزرے پھر ڈیلفینا نے گاڑی کو نارتھ سینٹرل ایکسپریس وے پر ڈوراتے ہوئے پی۔ ایف چینگو پہنچا دیا۔

اس ریسٹورنٹ کا ماحول بہت ہی پُرسکون اور خواب ناک تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا' ہم کسی اور ہی دنیا میں نکل آئے ہوں۔ کھانے تو اکثر ریسٹورنٹس کے اچھے ہی ہوتے ہیں لیکن اچھے کھانے کے ساتھ اگر پُرسکون رومانٹک ماحول بھی میسر ہو تو کھانے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ پی۔ ایف چینگو بھی ایک ایسا ہی ریسٹورنٹ تھا۔ ڈیلفینا نے مجھے بتایا کہ پیر سے جمعرات تک یہ ریسٹورنٹ دوپہر گیارہ سے رات گیارہ بجے تک کھلا رہتا ہے جبکہ جمعہ سے اتوار تک دوپہر گیارہ سے رات کے بارہ بجے تک اس کی سروس جاری رہتی ہے۔ آج بدھ تھا لہٰذا ہم زیادہ سے زیادہ گیارہ بجے تک پی۔ ایف چینگو میں بیٹھ سکتے تھے اور..... آج رات گیارہ بجے ڈیلفینا کی ''کسٹڈی'' میں میرے چھتیس گھنٹے پورے ہو جاتے یعنی آدھا وقت گزر جاتا اور آدھا باقی رہ جاتا۔

ہم نے باہمی مشاورت سے ڈنر کا آرڈر دے دیا۔ اس سلسلے میں ڈیلفینا نے میری بھرپور راہ نمائی کی تھی۔ اسٹارٹر کے طور پر عموماً اپی ٹائزر لیا جاتا ہے تاکہ بھوک کا دروازہ کھل جائے اور خوب سیر ہو کر کھایا جائے۔ ڈیلفینا کو تو پہلے ہی اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی لہٰذا اپی ٹائزر سونے پر سہاگے کا کام کرتا۔ ہم نے ہاٹ اینڈ سار سوپ جنسوئے اسپیشل کا آرڈر کیا تھا۔ چائنیز سوپس میں ''جنسوئے سوپ'' کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مین کورس کھانے میں ہم نے چینگو چکن لیٹس ریپس اور چکن سیٹے کا آرڈر کیا۔ ''چینگو چکن لیٹس ریپس'' بہت لذیذ ڈش ہے۔ کرسپی رائس اسٹکس کے اوپر چکن کے پیس، مشروم، ہری پیاز اور چیسٹ نٹس کا سالن سجا کر سرو کیا جاتا ہے۔ جبکہ ''چکن سیٹے'' میری نیٹیڈ چکن اسٹرپس کی ایک خاص ڈش ہے جس میں فلیم گرلڈ چکن کو کھوپرے اور مونگ پھلی کی چٹنی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بند گوبھی، گاجر، لیٹس اور سبزیوں کا کول سلا (بٹر سلاد) بھی موجود ہوتا ہے۔

ویٹر نے جنسوئے اسپیشل سرو کرتے ہوئے کہا۔ ''سر! ہمارے یہاں ڈیزرٹ کمپلیمنٹری ہوتا ہے۔ آپ ڈیزرٹ روم سے اپنی پسند کا ڈیزرٹ لے سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اوکے..... تھینکس۔''

میں نے جنسوئے کا معائنہ کیا تو اس کے اندر مشروم، (کھمبیاں) انڈے، بانس کی کونپلیں اور سلکن ٹوفو اور چکن پیس موجود تھے۔ سلکن ٹوفو دودھ، دہی اور سویا بین کی آمیزش سے تیار کردہ ایک خاص قسم کا پنیر ہوتا ہے۔ اس کی لذت اور صحت بخش اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

''جن سوئے یا جن جاگے' اس سے اس کی خوب صورتی میں کوئی فرق نہیں آتا۔'' میں نے سوپ کا سپ لیتے ہوئے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''یہ جنسوئے سوپ ہے۔'' ڈیلفینا الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''اس میں کسی جن کے سونے یا جاگنے کا کیا تعلق ہے؟''

''دراصل، جنسوئے سوپ کے تصور سے میرے ذہن میں ایک ایسے خوب صورت جن کا خیال آ گیا تھا جو پورے پانچ گھنٹے تک گہری نیند سویا رہا اور اب جاگ رہا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔

''سوری..... جن نہیں بلکہ جن زادی!''

''کون جن زادی؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''ہے ایک خوب صورت ہستی۔''

''کون..... کچھ پتا تو چلے؟''

''اس کا نام ڈیلفی ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سونے سے پہلے اور جاگنے کے بعد اس کے حسن اور تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔''

''سوپ کیسا ہے؟'' اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''اچھا ہے مگر اس جن زادی کی رعنائی اور دل کشی کے مقابلے میں ایک دم پھیکا.....'' میں نے کہا۔

''پھیکا ہے تو چلی ساس ڈال لو۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''سوپ میں یا جن زادی کے اوپر؟''

وہ کریکرز کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''جو پھیکا محسوس ہو رہا ہے، اس پر۔''

''اوکے..... پھر تو سوپ ہی میں ڈالنا ہوگی۔'' میں نے کہا۔

وہ سوپ کو چھوڑ کر کریکرز کو اس طرح چبا رہی تھی جیسے مجھے کچا چبانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ڈیلفی! کیا تم یہودی ہو؟''

''نہیں..... میں پیدائشی طور پر عیسائی ہوں۔''

''پھر آنزک باروخ لاؤ سے اتنی میل ملاقات کیوں؟'' میں نے سوپ کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سوال کیا۔

''ربی میرے پیشوا ہیں۔ میں ان کی باتوں کو بہت اہمیت دیتی ہوں۔'' وہ دوبارہ سوپ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''وہ یہودی ہیں اور میں عیسائی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جس سوسائٹی سے تعلق رکھتی ہوں، اس میں دنیا کے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے پرفیکٹ افراد شامل ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے' سیکرٹ سوسائٹی؟''

''ہاں.....'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ربی آئزک نے مجھے اس سوسائٹی کے بارے میں کافی کچھ بتایا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور بہت کچھ جاننا ابھی باقی ہے جیسا کہ ابھی تم نے میری معلومات میں اضافہ کیا کہ اس سیکرٹ سوسائٹی میں دنیا کے ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد شامل ہیں۔''

''میں نے پرفیکٹ افراد کی بات کی ہے۔'' وہ لفظ ''پرفیکٹ'' پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ بات بھی ذہن میں رکھنا کہ اس سوسائٹی کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ شخص کسی نہ کسی مذہب کو ماننے والا ہو۔''

''اور جو لوگ لادین، نیتی اتھیسٹ ہیں.....؟''

''ایسے افراد کے لیے ہماری سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''جو لوگ لادین ہیں، کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے، ان کا خدا پر بھی ایمان نہیں ہوتا۔ ہماری سوسائٹی خیر اور شر کی جنگ کی تفسیر ہے اور اس میں خدا کو مرکزیت حاصل ہے چاہے وہ کوئی بھی ہو۔''

''تم بہت الجھی ہوئی باتیں کر رہی ہو۔'' میں نے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے کہا۔ ''تم تو ایک سے زیادہ خداؤں کے تصور پر بات کر رہی ہو۔''

''یہ سارا الجھ کا پھیر ہے۔'' وہ سوپ کا آخری سپ لیتے ہوئے بولی۔ ''ہمارے ساتھ رہو گے تو تمہارا ذہن کھلے گا، پھر ان چھوٹی موٹی باتوں پر الجھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

میں یک ٹک ڈیلفی کو دیکھتا چلا گیا۔

اس دوران میں ویٹر نے مین کورس میز پر چن دیا۔ عورت کو پہیلی بھی کہا جاتا ہے۔ ڈیلفینا بھی ایک عورت تھی لیکن پہیلی کا لفظ اس کے لیے بہت چھوٹا تھا۔ وہ تو مجھے مجسم طلسم ہوش ربا لگ رہی تھی۔ میں اس کی باتوں کو جتنا بھی سمجھنے کی کوشش کرتا' ذہن اتنا ہی الجھ جاتا تھا۔ اس کے ہر لفظ میں ایک بھارت، ہر بات میں ایک انکشاف اور ہر کہانی میں ایک چیلنج موجود ہوتا تھا۔

مین کورس کی دونوں ڈشز ''چینگو چکن لیٹس ریپس'' اور ''چکن سیٹے'' میز پر آئیں تو ہم دونوں ہاتھوں سے کھانے سے انصاف کرنے لگے۔ اس دوران میں ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ میں نے کہا۔

''ڈیلفی! میرے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو تم مجھے ان کے جواب دو تا کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔''

''میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''لیکن کچھ باتیں ایسی بھی ہیں، جو اس وقت تک تم سے شیئر نہیں کی جا سکتیں، جب تک تم ہماری سوسائٹی کے باقاعدہ ممبر نہیں بن جاتے۔''

''ٹھیک ہے' ان چند باتوں کو چھوڑ دو۔'' میں نے اس کی منطقی دلیل سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی سوالوں کے جوابات تو مجھے ملنا چاہیے نا؟''

اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی جواب دیتی، اس کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو.....!''

اس نے دوسری طرف کی آواز سنی پھر کہا۔ ''خیر مبارک۔ تمہیں کس نے بتایا؟''

دوسری طرف بولنے والے نے اس کی بات کا جواب دیا تو وہ بولی ''ہاں۔ ربی آج صبح آئے تھے پھر جب دن میں سب نمٹ چکا تو وہ واپس چلے گئے۔ اگر محترم ربی کی مدد مجھے حاصل نہ ہوتی تو یہ کٹھن کام ممکن نہیں تھا۔ میں تو کافی عرصے سے اس بدبخت سے نمٹنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی مگر وہ کسی طرح میرے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''تم ڈیلس کب آئی ہو؟''

ڈیلفی کے طرزِ تکلم سے اندازہ ہوا کہ وہ کسی عورت سے بات کر رہی تھی۔ دوسری طرف بولنے والی نے کچھ کہا ہوگا۔ ڈیلفی نے توجہ سے سنا پھر کہا۔

''تمہاری اگر ربی سے بات ہوئی ہے تو انہوں نے تمہیں یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ میں کہاں ٹھہری ہوئی ہوں؟''

وہ چند لمحات تک ادھر کی بات سنتی رہی پھر کہا۔ ''میں ایک آدھ دن مزید پریسٹن ہالو میں قیام کروں گی۔ تم کل صبح آ جاؤ پھر بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

دوسری جانب سے یقیناً ''بائے'' کہا گیا ہوگا۔ ڈیلفی نے یہ کہتے ہوئے رابطہ موقوف کردیا۔

''او کے۔ ٹیک کیئر۔ کل صبح ملتے ہیں۔''

میں نے سوالیہ نظر سے ڈیلفی کی طرف دیکھا تو وہ سیل فون کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

''میری ایک دوست تھی ..... ایما اپیل بام۔ ایما ہماری سوسائٹی کی ممبر بھی ہے۔ ربی آزک کی زبانی اسے پتا چلا ہے کہ میں آج کل پریسٹن ہالو میں ہوں۔ وہ ڈیلس آئی ہوئی ہے۔ جب اسے پتا چلا کہ مفتی ڈیلفینیا سے مجھے نجات مل گئی ہے تو وہ مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہوگئی۔''

''لہٰذا وہ کل صبح تم سے ملنے آرہی ہے!'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔

''وہ صرف مجھ سے ملنے کی پابند نہیں ہے۔'' وہ فراخ دلی سے بولی۔ ''تمہارا دل چاہے تو تم بھی اس سے گپ شپ کرلینا۔''

''جس سے گپ شپ کرنے کو میرا دل چاہتا ہے، وہ تو ہر پل کنی کاٹنے کے چکر میں رہتی ہے۔'' میں نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میں کسی اپیل کے بام سے مل کر کیا کروں گا۔''

اس نے میری ''شکایت'' کو دور کرنے کی ضرورت سمجھی اور نہ ہی اس پر کوئی تبصرہ کیا۔ وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔

''مجھے یقین ہے کہ ایما کے ساتھ تمہاری خوب جمے گی۔''

''اس خوب جمنے کا سبب.....؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''تم سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ ہو اور وہ پروفیسر آف فلاسفی۔'' ڈیلفی نے بتایا۔ ''ان دونوں مضامین کا ازلی ابدی ساتھ ہے۔''

''ازلی ابدی ساتھ والی بات تو تم نے بالکل ٹھیک کہی ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا تم کسی نوجوان حسینہ سے ملوانے والی ہو۔ یہ اپیل بام تو کوئی بوڑھی پروفیسر نکلیں۔''

وہ بے ساختہ ہنس پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ ''ایک نمبر کے فلرٹ ہو علی۔''

''میں فلرٹ نہیں ..... سنجیدہ اور سچا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر کسی کو میرے جذبات کا احساس ہی نہیں ہے.....!''

''ایما کی عمر تو اڑتالیس انچاس سال رہی ہوگی مگر دیکھنے میں وہ تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''ایک دم فریش اور تروتازہ۔ تم دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے اور جہاں تک تمہارے جذبات کا تعلق ہے تو.....'' اس نے معنی خیز انداز میں توقف کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ان جذبات کو تم شارو کے لیے سنبھال کر رکھو۔ اگر اس خزانے کو وافر مقدار میں ادھر ادھر لٹاتے رہو گے تو شارو تک پہنچتے پہنچتے تمہارے پلے کچھ بھی نہیں رہے گا۔ کیا اسے خالی دامن کے ساتھ ریسیو کرو گے؟''

ڈیلفی نے تفریحی انداز میں اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ میں تڑپ کر رہ گیا۔ یہ سچ ہے کہ میں ان حالات میں شارو کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہا تھا اور میں نے بہتر گھنٹے تک جو ڈیلفینیا کی کسٹڈی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا، اس کے پیچھے بھی میرا مقصد شارو کا حصول ہی تھا لیکن میں فی الحال مجبور تھا۔ بہتر گھنٹے کی مدت پوری ہونے سے پہلے میں اس بندھن سے باہر نہیں نکل سکتا تھا ورنہ میں پہلی فرصت میں اڑ کر کیوبا پہنچ جاتا اور اپنی شارو کو بدکردار افراد کے چنگل سے نکال لاتا۔ ڈیلفینیا نے مجھ سے کہا تھا کہ۔ اگر ان کے ساتھ میرا ایگری منٹ ہوجاتا ہے تو پھر شارو کی بازیابی ان کی ذمے داری ہوگی۔ جس طرح انہوں نے مجھے پیلو مرڈر کیس سے صاف بچالیا تھا، بالکل ایسے ہی وہ شارو کو بھی صحیح سلامت میرے سامنے لاکر کھڑا کردیں گے۔ مجھے ڈیلفینیا کے وعدے پر بھروسا تھا کیونکہ میں پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کی طاقت اور اختیار کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرے انتظار کے چونتیس پینتیس گھنٹے باقی تھے۔

''کن سوچوں میں گم ہو؟'' ڈیلفی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''میں گم نہیں صم ہوں۔''

''تم گم ہو صم ہو یا تم ہو..... اب واپس آجاؤ کیونکہ کھانا ختم ہوچکا ہے۔'' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ڈیزرٹ کی طرف بڑھنا ہے۔ ڈیزرٹ اس ریسٹورنٹ میں کمپلیمنٹری یعنی فری ہے اور یہ ٹیبل پر سرو نہیں کیا جاتا۔ اس فری آف کاسٹ ڈش کے لیے ہمیں ڈیزرٹ روم کی طرف جانا ہوگا..... تو چلیں؟''

بات ختم کرکے اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''بالکل چلیں۔''

ڈیزرٹ روم ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا۔ ہم دونوں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ڈیزرٹ روم میں پہنچ گئے۔ میں نے وہاں موجود ڈیزرٹس (سویٹ ڈشز) پر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

طائرانہ سی نگاہ ڈالی تو دل خوش ہوگیا۔ کم و بیش پچاس ڈیزرٹس بڑے سلیقے سے اپنے اپنے خانے میں سجے ہوئے تھے جن میں دس سے زیادہ انواع واقسام کی آئس کریم بھی شامل تھیں۔

''تم کیا لو گے علی؟'' ڈیلفی نے مجھ سے پوچھا۔

''جو تمہیں پسند ہو وہی میرے لیے بھی نکال لو۔'' میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔

''پھر بھی کچھ بتاؤ؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولی پھر خود ہی کہا۔ ''اچھا ٹھیک ہے۔ تم اپنی مرضی سے نکالو۔''

''میں نے کہا نا' میں تمہاری پسند کا ڈیزرٹ کھاؤں گا۔'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''تم تو یہاں آتی رہتی ہو۔ اس ریسٹورنٹ کی جو اسپیشلیٹی ہے' وہی نکال لو۔''

''اسپیشلیٹی..... اسپیشلیٹی.....'' وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھی پھر ایک ڈیزرٹ کے سامنے رکتے ہوئے مجھے بتایا ''علی! یہ ڈیزرٹ یہاں کی اسپیشلیٹی ہے۔''

میں نے مذکورہ ڈیزرٹ کا نام پڑھا ''ایپل چائے کوبلر'' پھر میں نے ڈیلفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کس قسم کا نام ہے جس میں ایپل بھی ہے، چائے بھی ہے اور کوبلر بھی ہے۔ سیب، چائے اور موچی کا آپس میں کیا رشتہ ناتا.....؟''

''بہت گہرا رشتہ بھی ہے اور ناتا بھی۔'' وہ ایپل چائے کو بلر کو دو پلیٹوں میں بھرتے ہوئے مجھے بتانے لگی۔ ''بہ شرط یہ کہ تم کوبلر کو موچی نہ سمجھو.....''

''میرے کچھ سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں بول اٹھا۔ ''ساری دنیا جانتی ہے کہ جوتے مرمت کرنے والے شخص کو کوبلر یعنی موچی کہا جاتا ہے۔''

''درست!'' وہ بڑی ادا سے گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''لیکن ہوٹل اور بیکری کی دنیا میں ''کوبلر'' کے معانی فروٹ پائی یعنی پھلوں والا کیک کے بھی ہیں۔''

''اوکے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

ہم ڈیزرٹ لے کر دوبارہ اپنی ٹیبل پر آگئے۔ نام سے قطع نظر وہ ڈیزرٹ اپنی مثال آپ تھا۔ میں نے ایسا یکی ڈیزرٹ پہلے کبھی نہیں کھایا تھا۔ اس ڈیزرٹ میں گرم سیب کے ٹکڑے، کرسپی دلیا، کدوکش کیا ہوا کوکونٹ، وینلا آئس کریم کے ساتھ ایک خاص انداز میں شامل کیا جاتا ہے۔ بیس آئس کریم کی ہوتی ہے۔ باقی تمام اشیا کی ٹاپنگ لگائی جاتی ہے۔ اب ذرا چائے کا قصہ بھی سن لیں۔ یہ ایک قسم کا بہت گاڑھا سا مشروب ہوتا ہے جو شیرے کی شکل میں اس ڈش کے ساتھ ہی نکال لیا جاتا ہے جیسے گلاب جامن کے ساتھ اس کا شیرہ نکالا جاتا ہے۔ چائے نامی اس مشروب میں کالی چائے کی پتی کا عرق، دودھ، شہد اور مختلف مسالا جات شامل ہوتے ہیں۔

''ایپل چائے کوبلر'' سے انصاف کرنے کے دوران میں ڈیلفی مجھے بتاتی رہی کہ اس کی دوست ایما ایپل بام کا تعلق واشنگٹن ڈی سی سے ہے۔ وہ ایک امریکن پولش ہے۔ یعنی اس کا باپ امریکن اور ماں پولش مطلب پولینڈ کی رہنے والی تھی۔ ایما اس وقت ییل یونیورسٹی میں فلاسفی کی پروفیسر تھی۔

''ییل یونیورسٹی!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ یونیورسٹی تو ریاست کنکٹیکٹ میں ہے..... کنکٹیکٹ کے شہر نیوہیون میں۔''

''بالکل وہیں پر ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر پوچھا۔ ''کیا تمہارے ذہن میں اس حوالے سے کوئی خاص بات آرہی ہے؟''

''یس!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آج صبح ربی آئزک نے بھی یہی بتایا تھا کہ وہ تل ابیب سے کسی ضروری کام سے کنکٹیکٹ آئے ہوئے تھے پھر وہ مجھ سے ملنے پریسٹن ہالو تشریف لائے۔ اب یہ تمہاری دوست ایپل بام بھی کنکٹیکٹ سے تشریف لا رہی ہیں۔ یہ کیا کنکشن ہے؟''

''یہ بہت گہرا کنکشن ہے علی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''لیکن میں تمہیں صرف اتنا ہی بتاؤں گی جتنا کسی نان ممبر کو جاننے کی اجازت دی جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے، کچھ تو بتاؤ۔'' میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرے اندر ایک تجسس سا جگا دیا ہے۔ میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں۔''

''ویٹس اے گڈ سائن۔'' وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کسی چیز کو جاننے کے حوالے سے انسان کے اندر تجسس پیدا ہونا ایک صحت مند علامت ہے۔ اس قسم کے تجسس سے ذہن کو انرجی ملتی ہے اور انسان کی تجسس میں ایک خاص نوعیت کا پوٹینشل بھر جاتا ہے۔ پھر یہی پوٹینشل اس کی کامیابی کا سبب بن جاتا ہے۔''

''تمہید بہت ہو چکی۔'' میں نے تیز آواز میں کہا۔ ''اب اصل موضوع کی طرف آجاؤ۔''

''اوکے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر بتانے لگی۔ ''ییل یونیورسٹی دنیا کی چند معروف یونیورسٹیز

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں سے ایک ہے اور اس یونیورسٹی کے ساتھ ہمارا کنکشن ''ییل یونیورسٹی سوسائٹی'' کی وجہ سے ہے۔ ہماری سیکرٹ سوسائٹی کا نام ''اسکل اینڈ بونز'' ہے جو اٹھارہ سو بتیس میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے ٹاپ کلاس ممبرز میں جارج ڈبلیو بش اور جان کیری شامل ہیں۔ اس سیکرٹ سوسائٹی کا ہیڈ کوارٹر ییل یونیورسٹی میں بنے ایک ٹومب میں ہے۔ یہ ٹومب ایک بڑا سا ہال ہے جسے سوسائٹی کا میٹنگ کمپلیکس بھی کہا جاتا ہے۔ اس پتھروں سے بنی ہوئی عمارت میں نہ کوئی کھڑکی ہے، نہ کوئی دروازہ اور نہ ہی کوئی روشن دان۔ بس صرف ایک داخلی دروازہ ہے جو اندر کی جانب کھلتا ہے۔ اس ''میٹنگ کمپلیکس'' میں صرف ممبرز کو داخلے کی اجازت ہوتی ہے۔ ربی آئزک بار روخ لاؤ ہوں یا ربی بیٹ زاک سائمن یا دیگر یہودی اکابرین، وہ اس ٹومب کا چکر لگاتے رہتے ہیں۔ میں نے تمہیں ''اسکل اینڈ بونز'' سیکرٹ سوسائٹی کے حوالے سے جتنی معلومات بھی فراہم کی ہیں، اس میں کوئی بھی سیکرٹ نہیں ہے۔ اتنی باتیں تو ہر ذی شعور امریکی کے علم میں ہیں لہٰذا میں نے تمہارے ساتھ کوئی اہم راز شیئر نہیں کیا۔''

''اس بے در و کھڑکی و روشن دان پتھر کی عمارت کے اندر کیا ہوتا ہے؟'' میں نے اس کی وضاحت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''آئی ایم ریئلی ویری سوری علی۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ''یو آر ناٹ اے ممبر۔''

''اوہ شٹ!'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا نان ممبر ہونا تو ایک گالی بن گیا ہے' میرے دامن کا داغ بن گیا ہے......''

''ڈونٹ وری۔'' وہ تشفی آمیز انداز میں بولی۔ ''اگر تم نے عقل مندی کا ثبوت دیا تو تمہارے دامن پر لگا داغ اور دھبا دھل جائے گا جیسے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''جیسے پیلو مرڈر کیس سے تمہارا دامن صاف ہو چکا ہے۔''

میں کچھ نہیں بولا۔ ٹٹولنے والی نظر سے بس اسے دیکھتا چلا گیا۔

''باقی باتیں گھر جا کر کریں گے۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''ریسٹورنٹ بند ہونے میں چند منٹ رہ گئے ہیں۔ اب ہمیں شرافت سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ریسٹورنٹ کا اسٹاف ہمیں اٹھا کر باہر پھینک دے۔''

''تمہیں کوئی اٹھا کر باہر پھینکے گا۔'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں......؟''

''کیا میں اتنی موٹی ہوں کہ مجھے اٹھایا نہیں جا سکتا؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

''موٹی تو نہیں مگر بہت ہیوی ہو مطلب...... بہت بارسوخ اور ٹھسّے دار۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

اس نے ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کر دیا۔

☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ میں اور ڈیلفینا لیونگ روم میں آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔

''تمہاری دوست اپیل پام کا فون آنے پر ہماری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ کیا وہیں سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا جائے؟''

''تمہیں چند سوالوں کے جواب چاہیے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''اور میں نے کہا تھا کہ جس حد تک ممکن ہوا، میں جواب دوں گی۔ ایک بات ذہن میں رکھنا کہ سیکرٹ سوسائٹی کے حوالے سے جہاں تک ممکن تھا میں نے تمہیں معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں بتا سکوں گی۔ ہاں' اگر تم ہماری سوسائٹی کے ممبر بن جاتے ہو تو پھر تمہیں ٹومب یعنی ''اسکل اینڈ بونز'' کے میٹنگ کمپلیکس کے اندر جانے کی بھی اجازت ہوگی اور اس سوسائٹی کے دیگر سیکرٹ بھی تم پر آشکار کر دیے جائیں گے۔''

''تم نے مجھے ''اسکل اینڈ بونز'' کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس میں کوئی ڈھکی چھپی یا راز کی بات نہیں ہے۔'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''صرف ''اسکل اینڈ بونز'' ہی نہیں بلکہ دنیا کی تیرہ بڑی سیکرٹ سوسائٹیز کے حوالے سے بہت سارا مواد انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ میں دراصل......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں سیکرٹ سوسائٹی سے ذرا ہٹ کر دوسرے ٹاپکس پر تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ ایسے سوالات جو میرے ذہن کو الجھاتے ہیں۔''

''تم نے انٹرنیٹ کا حوالہ دیا تو میں مانتی ہوں کہ وہاں سیکرٹ سوسائٹیز کے بارے میں کافی معلومات موجود ہیں لیکن اس بات کا فیصلہ کرنا ہما شما کے بس کی بات نہیں کہ اس میں کیا درست ہے اور کیا غلط۔ بعض چیزیں محض انسانی ذہن کو گمراہ کرنے والی ہیں۔ صد فی صد درست علم صرف سوسائٹی سے وابستہ افراد ہی کو حاصل ہے۔ اینی ہاؤ......'' وہ ذرا دیر کو تھمی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''تم سوال کرو۔ میں حتی الامکان تمہاری تسلی کرنے کی کوشش کروں گی۔''

''اس وقت تم ڈیڑھ دو ہزار گز کے بنگلے میں رہ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا کہ یہاں رہائش اختیار کرنے کا تمہارا اصل مقصد کیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ تم نے یہاں اپنی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی نہیں رکھا ہوا۔ آخر کیوں.....؟''

''نمبر ون' مجھے کبھی بھی اپنی خدمت کرانے کا شوق نہیں رہا۔ میں بہت پریکٹیکل ہوں۔ نمبر ٹو' سوسائٹی ممبرز کو خاص طور پر یہ ٹریننگ دی جاتی ہے کہ انہیں اپنے سارے کام خود کرنا ہیں۔ دوسروں پر انحصار کرنا چھوڑ کر ہی انسان خودمختار بن سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس بنگلے پر کسی ملازم کی ضرورت محسوس نہیں کی۔''

''تم نے بتایا تھا کہ تمہاری سوسائٹی صرف پرفیکٹ افراد کا انتخاب کرتی ہے۔'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''پرفیکٹ کا مطلب پرفیکٹ!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جو لوگ ذہانت، فطانت، علم، تجربے اور زندگی کے کسی بھی شعبے میں پرفیکٹ ہوتے ہیں، ان پر ہم گہری نظر رکھتے ہیں پھر ان پرفیکٹ افراد میں سے اپنے مطلب کے لوگوں کا چناؤ کر لیتے ہیں۔''

''میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ایک عام سا انسان ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھ میں سرخاب کے پر نہیں لگے ہوئے پھر مجھ پر نظرِ کرم کیوں؟''

''تم جو کچھ بھی ہو، اس کا تمہیں ادراک نہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''ہم جوہر شناس ہیں۔ پتھر اور ہیرے کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ اگر تم ہماری سوسائٹی کے ممبر بن جاتے ہو تو پھر ہم تمہاری سوپٹنگ کریں گے۔ ''سوپٹنگ'' ایک مخصوص روحانی عمل ہے جس کی مدد سے انسان کے اندر موجود خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا جاتا ہے۔ نہ صرف بیدار کیا جاتا ہے بلکہ انہیں قابلِ عمل بھی بنایا جاتا ہے۔ تم اگر ہمارے ساتھ جڑے رہے تو ہم تمہیں زمینی خدا بنا دیں گے۔''

زمینی خدا کا ذکر اس نے دو تین مرتبہ پہلے بھی کیا تھا۔ میں اپنے مالک کا بندہ تھا اور ہر حال میں اپنے خالق کا شکر گزار۔ مجھے کبھی بھی خدا بننے کا شوق نہیں رہا تھا۔ میں نے زمینی خداؤں نمرود، شداد، فرعون وغیرہ کی کہانیاں پڑھ رکھی تھیں اور ان کے انجام سے عبرت بھی پکڑی تھی۔ لہٰذا ڈیلفینا کی اس پیش کش میں میرے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ڈیلفی کی اس صلاحیت کو مان گیا تھا کہ اس کے پاس ہر سوال کا مدلل جواب موجود تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ کسی سوال کا جواب دینا چاہے یا نہ دینا چاہے۔ بلاشبہ وہ ایک قابل اور ذہین عورت تھی اور.....اس کے ساتھ ہی حسین و جمیل بھی!

''ڈیلفی! آج صبح تم مجھے ربی آئزک کے پاس چھوڑ کر لیونگ روم سے اٹھ گئی تھیں۔'' میں نے استفسار کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد میں نے تمہیں اسٹور روم میں دیکھا تھا۔ جب تم لیونگ روم سے نکلیں تو تمہارے جسم پر کوئی اور لباس تھا اور جب میں نے تمہیں اسٹور روم میں دیکھا تو تمہارے بدن پر کوئی دوسرا لباس تھا۔ تم نے لباس کب تبدیل کیا؟''

وہ چند لمحات تک خاموش نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد بولی۔ ''میں لیونگ روم سے اٹھ کر سیدھی اپنے بیڈ روم میں گئی تھی اور پھر میرا میڈی ٹیشن کا موڈ بن گیا۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور میڈی ٹیشن (ارتکازِ توجہ) کے لیے بیٹھ گئی۔ اسی دوران میں اس بدبخت نے مجھ پر حملہ کر دیا اور پھر ہمارے بیچ ایک خوف ناک معرکہ شروع ہو گیا۔ میں.....''

''ایک منٹ ڈیلفی!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے بیڈ روم میں میڈی ٹیشن کر رہی تھیں اور جب میں اور ربی تمہاری خوف ناک چیخ پر دوڑے تو تم اسٹور روم کے اندر اس منفی قوت کی حامل ڈیلفینا سے نبرد آزما تھیں۔ یہ ماجرا میری سمجھ میں نہیں آ رہا؟''

''میں سمجھاتی ہوں۔'' وہ بڑی رسان سے بولی۔ ''پہلی بات تو یہ کہ جو نسوانی چیخ آپ لوگوں کی سماعت تک پہنچی، وہ میری نہیں بلکہ اس منفی ڈیلفینا کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ جب اس نے مجھے میڈی ٹیشن میں محو دیکھ کر مجھ پر حملہ کیا تو میں نے اس کے حملے کا بھرپور جواب دیا تھا۔ جب ہمارے بیچ مار دھاڑ شروع ہوئی تو ایک مرحلے پر اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ میں نے اس کا تعاقب کیا اور ہم دونوں اسٹور روم میں پہنچ گئے۔ اس نے اسٹور روم میں چھپنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اس کی کوشش ناکام بنا دی اور پھر اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔''

''اسٹور روم سے یاد آیا کہ.....شاید اس نے اسٹور روم میں پناہ لے رکھی تھی۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

ڈیلفی نے پوچھا۔ ''اگرچہ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے لیکن یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ رہے ہو؟

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کیا اس حوالے سے تمہارے پاس کوئی معلومات ہیں؟''

''بالکل ہیں میرے پاس معلومات۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ربی نے تو آج صبح مجھے تمہارے اور اس منفی ڈیلفینا کے چکر کے بارے میں بتایا ہے لیکن میں نے پچھلی رات خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔''

''کہاں؟'' وہ اچھل پڑی۔ ''تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟''

''سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے ہوئے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں ڈیلفی کو بتایا۔ ''غسلِ نصف شب کے بعد اس نے اپنے بھیگے ہوئے سر کے بالوں اور بدن کو تولیے سے خشک کیا اور پھر ایک سمت چل پڑی تھی اور مجھے شک ہے کہ وہ اسٹور روم کی طرف ہی گئی ہوگی۔''

پھر میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں ڈیلفی کو سرخ انگارا آنکھوں والی اس حشر ساماں منفی ڈیلفینا کے بارے میں بتادیا۔

''اوہ.....'' وہ تشویش ناک انداز میں ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟''

''اول تو مجھے موقع ہی نہیں ملا تم سے اس موضوع پر بات کرنے کا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''صبح میں تمہارے جگانے پر بیدار ہوا تھا۔ اس کے بعد ربی آگئے اور تم مجھے ان کے پاس چھوڑ کر لیونگ روم میں نکل گئی تھیں۔''

''یہ کمینی کافی دنوں سے میرے تعاقب میں تھی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''ادھر گیلویسٹن والے ریزورٹ میں بھی اس نے میرے ساتھ بہت خرمستیاں کی تھیں۔ اینی ہاؤ..... ربی کے تعاون سے میں نے ہمیشہ کے لیے اس منفی شیطانی قوت سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے۔''

''تم نے شکایت کی کہ میں نے سرخ انگارا آنکھوں والی اس منفی ڈیلفینا کے بارے میں تمہیں پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' میں نے ڈیلفی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے شرارت آمیز انداز میں کہا پھر ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔ ''میں نے گزشتہ رات جو جوان ڈور اینڈ آؤٹ ڈور نظارے دیکھے ہیں' وہ سب ناقابلِ بیان ہیں۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اصولی طور پر اسے مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔ ''علی! تم کن نظاروں کی بات کررہے ہو؟'' اس نے مجھ سے ایسا کوئی سوال نہیں کیا بلکہ میری بات کے جواب میں کسمسا کر رہ گئی تھی جس سے میرے اس شک کو تقویت پہنچی کہ میں نے پچھلی رات اپنے بازو والے بیڈ روم میں جس ڈیلفی کو سرخ نائٹی میں انتہائی کھلے ڈلے انداز میں محوِ استراحت دیکھا تھا وہ کوئی اور نہیں بلکہ یہی ڈیلفی تھی جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اگر اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہوتا تو یہ سوال کیے بنا رہ نہیں سکتی تھی۔ میں نے بھی سوچ لیا کہ ابھی اس راز کو نہیں کھولوں گا اور اگر کھولنا مقصود ہوا تو یہ کام ایک خاص طریقے سلیقے سے کروں گا۔

''ایک اور کانٹا میرے ذہن میں چبھ رہا ہے۔'' میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''جب میں ربی کے ساتھ اسٹور روم میں داخل ہوا تو تم وہاں اکیلی ہی تھیں۔ منفی ڈیلفینا کو تم نے شکست دی تھی تو وہ کہاں چلی گئی۔ وہ مجھے اسٹور روم میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی؟''

''تم ڈی کمپوزیشن کے بارے میں تو جانتے ہوگے؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ہاں جانتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کی سب سے بڑی مثال نائٹروجن سائیکل کی ہے نائٹروجن سائیکل میں انسان ہوں، جانور ہوں... یا پودے ہوں، وہ اپنی زندگی کے اختتام پر کسی نہ کسی رنگ میں، کسی نہ کسی ڈھنگ میں خاک میں مل جاتے ہیں یعنی ان کی ڈی کمپوزیشن کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ اس خاک کے اندر ان کی باقیات کا ست موجود رہتا ہے پھر جب اس خاک کا اثر لیے پودے اگتے ہیں تو وہ جانوروں... کی خوراک بنتے ہیں اور بعض جانور... انسان کی خوراک کا حصہ ہیں۔ قدرتی طور پر نائٹروجن سائیکل اسی طرح مصروفِ عمل رہتا ہے۔''

''بس تو سمجھ لو کہ وہ منفی ڈیلفینا بھی اسٹور روم کے اندر ڈی کمپوز ہوگئی تھی۔'' وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ''اس لیے وہ تمہیں کہیں دکھائی نہیں دی۔''

''لیکن ڈی کمپوزیشن ایک قدرتی عمل ہے۔'' میں نے معترض انداز میں کہا۔ ''اور اس عمل کو مکمل ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ادھر تم نے منفی ڈیلفینا کو شکست دی اور ادھر وہ پلک جھپکتے میں ڈی کمپوز ہوگئی.....؟''

''اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بس' آپ کو وہ کام کرنے کا طریقہ آنا چاہیے۔''

''تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیمسٹری کی دنیا میں کسی کیمیائی عمل کو تیز کرنے کے لیے کیٹا لسٹ یعنی عمل انگیز کا استعمال کیا جاتا ہے۔'' وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''کیلکولسٹ کی موجودگی سے وہ کیمیائی عمل اسپیڈاپ ہوجاتا ہے اور گھنٹوں کا کام منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں ہوجاتا ہے۔ ایسے.....'' بات کے اختتام پر اس نے بڑے دل نشین انداز میں چٹکی بجائی۔

''کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم نے کسی کیلکولسٹ کی مدد سے منفی ڈیلفینا کے وجود کو چٹکی بجاتے میں ڈی کمپوز کرکے انسانی بصارت کی رینج سے اوجھل کردیا تھا؟'' میں نے بے حد حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''یس.....آف کورس!'' وہ پُروثوق انداز میں بولی۔ ''میری دشمن کو ایک موثر کیلکولسٹ کی مدد سے ہی ڈی کمپوز کیا گیا تھا اور یہ کام میں نے نہیں بلکہ محترم ربی نے کیا تھا۔''

''مم.....مگر کیسے.....'' میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''ربی تو میرے ساتھ اسٹور روم سے باہر کھڑے تھے۔ انہوں نے کس وقت اور کون سا عمل انگیز استعمال کیا تھا؟''

''وہ زیرلب مقدس آیات کا ورد کررہے تھے نا؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''ہاں.....میں نے دیکھا تھا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''وہ عبرانی زبان کے الفاظ کا ورد کررہے تھے۔''

''وہ دراصل مقدس کتاب ''تالمود'' کے بعض مخصوص الفاظ کا ورد کررہے تھے۔'' ڈیلفی نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تالمود دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ ''مشناہ'' کہلاتا ہے۔ مشناہ کے اندر تورہ یعنی توریت کی تفسیر بیان کی گئی ہے جبکہ دوسرا حصہ ''جمارا'' کہلاتا ہے۔ جمارا میں مختلف احادیث کا بیان ہے۔ ان احادیث کا تعلق حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ اور حضرت موسیٰؑ کے فرامین سے ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے قرآن مجید ایک مقدس اور محترم کتاب ہے بالکل ویسے ہی یہودیوں کے نزدیک تالمود کا مقام ہے۔ مسلم اکابرین اور علماء قرآن مجید کی بعض آیات کو مختلف مسائل کے حل کے لیے مخصوص انداز میں ان کا ورد کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح یہودی اکابرین اور ربی حضرات تالمود کی مقدس آیات کو مشکلات کے حل کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم اسے ورد سمجھو یا وظیفہ یا پھر کیلکولسٹ۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ محترم ربی کے مخصوص عمل نے منفی ڈیلفینا کے وجود کو ڈی کمپوز کردیا تھا۔''

''اوہ.....مختلف مذاہب کے بارے میں تمہاری معلومات تو خاصی وسیع ہیں۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

''معلومات رکھنا پڑتی ہیں علی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''اس کے بغیر گزارہ کہاں ہوتا ہے۔''

''پتا ہے میں نے گزشتہ رات تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔'' میں نے اس کی معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اونچی چھتوں والی ایک قدیم سنگی عمارت کا منظر تھا۔ وہاں بہت سے افراد جمع تھے جن میں تم اور ربی آئزک بھی شامل تھے۔ وہ تمہاری تاج پوشی کی کوئی تقریب تھی۔''

''تم نے جس سنگی عمارت کو اپنے خواب میں دیکھا، وہ یروشلم میں ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں یہاں کے بکھیڑے نمٹانے کے بعد سیدھی یروشلم جاؤں گی۔''

''تاج پوشی کی اس تقریب کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟'' میں نے اسے ٹٹولنا چاہا۔

''نہیں.....'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''کیوں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے نیند آرہی ہے۔'' اس نے ایک جماہی لیتے ہوئے موضوع ہی بدل ڈالا۔ ''اب میں سوؤں گی۔''

''اوکے.....'' میں نے ہینڈز اپ ہونے سے پہلے ایک داؤ مارا۔ ''میں تمہارا بیڈروم دیکھنا چاہتا ہوں.....اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو.....!''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر میکانکی انداز میں اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

ہم دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے لیونگ روم سے نکلے پھر کچن کے برابر سے ہوتے ہوئے اس کاریڈور میں آگئے جدھر چند کمرے بنے ہوئے تھے۔ ڈیلفی ایک کمرے کے سامنے رک کر دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''تم میرا بیڈروم دیکھنا چاہتے تھے نا۔ یہ رہا میرا بیڈروم.....دیکھ لو۔''

ڈیلفینا نے جس بیڈروم کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ میرے اندازے کے مطابق عین اس بیڈروم کے عقب میں واقع تھا جہاں میں نے سرخ ٹائی میں ملبوس ڈیلفینا کو محوِ خواب دیکھا تھا، گویا یہ دونوں بیڈروم پشت سے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

''میں تمہارے بیڈروم کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''خاص طور پر وہ جگہ جہاں تم بیٹھ کر میڈی ٹیشن کررہی تھیں.....!''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''تم تو اس وقت ایک انٹیروگیشن آفیسر لگ رہے ہو۔'' وہ مذاق اڑانے کے انداز میں بولی۔ ''یوں محسوس ہو رہا ہے' کوئی فرانزک رپورٹ تیار کرنے والے ہو.....!''

''فرانزک رپورٹ .....'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ایسا ہے تو چلو یہی سمجھ لو۔''

وہ اپنے بیڈروم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ ''آجاؤ۔''

☆☆☆

میں اپنے بیڈروم میں داخل ہوا تو ایک حیرت میری منتظر تھی۔

آج سہ پہر میں' میں نے اپنے بیڈروم کا دورہ کیا تھا جب میرے سر پر ٹنڈ گلاس وال کا معاصل کرنے کا بھوت سوار ہوا تھا۔ اس وقت مبینہ ٹنڈ گلاس وال کی دوسری جانب دیکھنا ممکن تھا۔ میں نے اپنے بیڈروم میں رہتے ہوئے اس بیڈ روم کا منظر بالکل صاف دیکھا تھا۔ سرخ بیڈ شیٹ کی سلوٹیں واضح نظر آرہی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ میں نے بازو والے اس بیڈروم کے اندر جا کر بھی دیکھا تھا اور تبھی مجھ پر یہ راز کھلا تھا کہ وہ ٹنڈ گلاس وال نہیں بلکہ لائٹ براؤن کلر کا ایک عام سا شیشہ تھا اور بہ وقتِ ضرورت ڈارک براؤن کلر کے ایک دبیز پردے کی مدد سے اس شیشے کو ٹنڈ یعنی اندھا بنا دیا جاتا تھا۔ اس راز سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد میں لیونگ روم میں آگیا تھا پھر وہاں سے میں ڈیلفینا کے ہمراہ ڈنر کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ آج سہ پہر میں لگ بھگ تین بجے جب میں اپنے بیڈروم سے نکل کر لیونگ کی طرف گیا تھا تو اس وقت ڈارک براؤن کلر کا وہ پردہ ہٹا ہوا تھا۔ یعنی میرے بیڈروم میں رہتے ہوئے پہلو والے بیڈروم کے اندر بہ آسانی دیکھا جاسکتا تھا لیکن اب .....وہ دبیز پردہ کھنچا ہوا تھا یعنی اس نے لائٹ براؤن کلر کے شیشے کو پوری طرح ڈھانپ کر اسے ٹنڈ گلاس بنا دیا تھا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا..... یا الٰہی، یہ ماجرا کیا ہے!

جب میں اس بیڈروم سے نکل کر لیونگ روم میں گیا تھا، اس وقت ڈیلفی اپنے کمرے میں رٹی کی سلائی ہوئی گہری نیند میں تھی۔ ہم دونوں کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر میں نے اس پردے کو ریموٹ کی مدد سے برابر نہیں کیا تھا تو پھر اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ یہ کام ڈیلفی کا تھا۔ اس بنگلے میں جب سے میں آیا تھا' نت نئی عجیب وغریب چیزیں دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ ایک کے بعد ایک تماشا میرا منتظر ہوتا تھا۔ پہلے رٹی نے میرا شخصی انٹرویو کیا تھا اور اب کوئی ایما اپل بام یہاں تشریف لا رہی تھیں۔ کہنے کو تو وہ ڈیلفی کی دوست تھی اور ''سوسائٹی بہن'' بھی اور اسے اس کی کامیابی پر مبارک باد دینے آرہی تھی لیکن اس کی آمد کا اصل مقصد کیا تھا' یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔

وقت آنے والا ہو یا جانے والا' وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتاتا ہے۔ اس کا ''بتایا'' ہوا چاہے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے، اس سے وقت کو کوئی فرق نہیں پڑتا اور .....ٹھہرا ہوا وقت سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس کی خطرناکی کو ناپنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ میرے جی میں آئی کہ مجھے اپنے بغل والے بیڈروم کا ''وزٹ'' کرنا چاہیے.....!

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈیلفینا خاصی خوف ناک جماہیوں کا ڈیمو دینے کے بعد سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں بند ہو چکی تھی۔ اب اس سے اگلی صبح ہی ملاقات ممکن تھی۔ بنگلے کے اندر گہرے سناٹے کا راج تھا۔ پرسٹن ہالو میں تو دن کے وقت بھی اچھی خاصی خاموشی ہوتی تھی اور یہ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ میں اندرونی تجسس سے مجبور ہو کر اپنے بیڈروم سے باہر نکل آیا۔

کاریڈور میں قدم رکھتے ہی میری نگاہ بے ساختہ سوئمنگ پول کی جانب اٹھ گئی۔ گزشتہ رات کم وبیش اسی وقت میں نے اس سوئمنگ پول میں منفی ڈیلفینا کو بڑے طمطراق کے ساتھ عسلِ نصف شب کرتے دیکھا تھا لیکن آج دوپہر میں سرخ انگارا آنکھوں والی وہ منفی ڈیلفینا اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ چکی تھی۔ میں چونکہ نفسیات کا طالب علم تھا اس لیے ان معاملات کو سمجھنے میں مجھے زیادہ دشواری محسوس نہیں ہو رہی تھی ورنہ میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ایسی باتیں سن کر اس کا دماغ پھٹ جاتا۔

جب دن میں' میں نے اس بیڈروم کا سروے کیا تھا تو اس وقت مجھے اس کے اندر داخل ہونے میں کسی دقت کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا گھمایا تو دروازہ آسانی سے کھل گیا تھا یعنی دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا لیکن اب کی بار معاملہ الٹ نکلا۔

میں نے اچھی طرح گھما پھرا کر چیک کرلیا مگر دروازہ کھلا نہیں۔ اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ دروازہ اندر سے لاک تھا..... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے جانے کے بعد کوئی اس بیڈروم میں آیا تھا لیکن کون.....؟

اگر میں نہیں تو پھر یقیناً.....ڈیلفینا!

میرے جی میں آئی کہ ابھی جا کر ڈیلفی سے اس بارے میں استفسار کروں مگر اگلے ہی لمحے میں نے اس خیال

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کو ذہن سے جھٹک دیا۔ رات کے اس پہر نیند سے بھری ہوئی آنکھوں والی ڈیلفینا کو ڈسٹرب کرنا مجھے مناسب نہیں لگا اور ویسے بھی اب تک وہ گہری نیند میں جا چکی ہوگی۔

میں نے ڈیلفی سے ڈسکس کرنے والے معاملے کو کل صبح تک کے لیے موقوف کر دیا اور دروازے کے ہول سے آنکھ لگا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ یہ میری ایک فوری اور اضطراری حرکت تھی حالانکہ اس بات کے امکانات صفر کے برابر تھے کہ مجھے بیڈ روم کے اندر کچھ دیکھنے کو ملے گا۔ خیر غیر ارادی حرکات اسی طرح کی ہوا کرتی ہیں.....!

مجھے اس بیڈ روم کے اندر تو کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن ایک عجیب سے احساس نے مجھے چونکا دیا۔ شاید رات کے ان پُرسکوت لمحات میں میری قوتِ شامہ کچھ زیادہ ہی تیز ہوگئی تھی۔ میں نے واضح طور پر پیٹرول کی بو محسوس کی تھی اور یہ بو کہیں قریب ہی سے آرہی تھی۔ میں نے نتھنے پھیلا کر پھیپھڑوں کی پوری قوت سے فضا میں پیٹرول کی مخصوص بو کو سونگھنے کی کوشش کی لیکن اس کے ماخذ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ذہن میں یہی آیا کہ شاید ڈیلفی کی گاڑی میں سفر کرنے کے دوران میں میرے لباس کے کسی حصے پر پیٹرول لگ گیا ہوگا اور یہ اسی کی بو تھی۔ ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔

میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو ایک بار پھر میری نگاہ شیشے کی اس دیوار پر جم گئی جسے پہلی نظر میں ٹنٹڈ گلاس وال سمجھا تھا۔ اس دیوار کا راز اب مجھ پر کھل چکا تھا سوائے اس بات کے کہ میرے جانے کے بعد کس شخص نے پردہ کھینچ کر اس دیوار کو دوبارہ ''ٹنٹڈ'' بنا دیا تھا؟

میرے اس سوال کا جواب صرف اور صرف ڈیلفینا ہی دے سکتی تھی اور اس سے کل صبح، ملاقات ممکن تھی۔

آج صبح سے اب تک بلکہ گزشتہ رات سے اب تک ..... نہیں، صحیح معنوں میں جب سے میں اس بنگلے پر آیا تھا جبھی سے اب تک پے در پے عجیب و غریب واقعات جنم لے رہے تھے جن میں حیرت بھی تھی، تجسس بھی اور بے شمار الجھنیں بھی۔ میرا دماغ اچانک ایک ملٹی ڈائریکشنل طوفان کی زد میں آگیا تھا۔

میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند نہیں آئی۔ میں اگر چاہتا تو خصوصی سیشن کے ذریعے خود کو بہ آسانی سلا سکتا تھا لیکن ایسا کرنے کو جی نہیں چاہا۔ میں اپنے بیڈ روم سے نکلا اور لیونگ روم میں آگیا۔

لیونگ روم جوں کا توں تھا جیسا تھوڑی دیر پہلے میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ڈیلفینا والا لیپ ٹاپ سینٹر ٹیبل پر موجود تھا۔

میں نے ایک لائٹ آن کی اور لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف ہوگیا۔ اس وقت میری خصوصی توجہ کا مرکز گوگل بادشاہ کا دربار تھا۔ میں اس دربار میں شرفِ باریابی پانے کے بعد سرفنگ کرنے لگا۔ جب آپ انٹرنیٹ پر آن لائن ہوتے ہیں تو ساری دنیا آپ کی ایک کلک پر ہوتی ہے۔ ایک انٹر مارنے کے بعد آپ یہاں سے وہاں اور وہاں سے پتا نہیں، کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ ان لمحات میں ایک ایسا رابطہ کار بن چکے ہوتے ہیں جس کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں ہوتی۔

میں بھی اگر چاہتا تو انٹرنیٹ کے پلیٹ فارم سے دنیا میں کہیں بھی اور کسی سے بھی رابطہ کرسکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ میں اخلاقی طور پر ڈیلفی سے کیے ہوئے وعدے کی زنجیر میں بندھا ہوا تھا۔ اگرچہ ڈیلفی اس وقت اپنے بیڈ روم میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ ہوتی کہ میں نے کس، کس سے کانٹیکٹ کیا ہے لیکن میرے ضمیر نے مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی۔ میں اس بات کا پابند تھا کہ اس بہتر گھنٹوں کی مدت کے دوران میں مجھے اس بنگلے سے باہر کسی سے رابطہ نہیں کرنا۔ اگر ڈیلفینا اس وقت مجھے نہیں دیکھ رہی تھی تو کیا ہوا، میرا مالک تو ہر سانس مجھ پر ناظر تھا نا۔ سارا کھیل احساس کا ہے۔

میں نے نیٹ سرفنگ پر زیادہ وقت دنیا کی سیکرٹ سوسائٹیز کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے گزارا۔ مختلف ویب سائٹس پر اس حوالے سے بہت سا مواد موجود تھا اور اس میں بعض عجیب و غریب اور ناقابلِ فہم باتیں بھی تھیں۔ میں ڈیلفینا کی اس بات سے کامل اتفاق کرتا تھا کہ نیٹ پر موجود معلومات کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل کام ہے کہ اس میں کیا درست ہے اور کیا غلط اور کتنے فی صد درست یا غلط ہے!

میں نیٹ نوردی میں مصروف تھا کہ مجھے دھوئیں ایسی بو کا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میرے قریب ہی میں کچھ جل رہا ہو۔ لیونگ روم کے نزدیک کچن موجود تھا۔ میں ایک فوری خیال کے تحت اٹھا اور کچن کی جانب بڑھ گیا تاکہ دیکھ سکوں، معاملہ کیا ہے۔

میں نے جیسے ہی کاریڈور میں قدم رکھا، باقاعدہ دھوئیں سے میرا سامنا بھی ہوگیا۔ یہ دھواں کچن سے نہیں بلکہ اس طرف سے اٹھ رہا تھا جدھر میرا بیڈ روم واقع تھا۔ میں نے بے ساختہ اپنے بیڈ روم کی سمت دوڑ لگا دی۔

وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ میرا بیڈ روم تو محفوظ تھا لیکن اس بیڈ روم میں آگ لگی ہوئی تھی جہاں میں نے پچھلی رات

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ڈیلفی کو سرخ نائٹی میں بے باکی کی نیند سوتے دیکھا تھا۔ اس خیال کے ساتھ کہ زیر آتش بیڈروم کی پشت ڈیلفی کے بیڈ روم کی پشت سے ملی ہوئی تھی' میں بے حد پریشان ہوگیا۔ میں تو اپنے بیڈروم سے باہر تھا لیکن ڈیلفینا اپنے بیڈروم میں بے خبری کی نیند سو رہی تھی۔ اگر یہ آگ ڈیلفی کے بیڈروم تک رسائی حاصل کرلیتی تو اس کی جان کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ وہ اس وقت ہائی رسک پر تھی۔

اس خیال نے مجھے گہری تشویش میں مبتلا کردیا اور میں نے آناً فاناً میں ڈیلفی کے بیڈروم کی جانب دوڑ لگادی پھر وہاں پہنچتے ہی اس کے بیڈروم کے دروازے کو پوری قوت سے پیٹنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں اس نے دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ آنکھیں ملتے ہوئے میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''ڈیلفی! بیڈروم سے باہر نکلو۔ بنگلے میں آگ لگ گئی ہے۔''

''آگ لگ گئی ہے!'' اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی ''وہاٹ نان سینس ٹاکنگ یو آر.....؟''

میں نے بے اختیار کلائی سے پکڑ کر اس باہر کھینچ لیا پھر کہا۔ ''آگ ادھر لگی ہے۔ میرے برابر والے بیڈروم میں۔''

اس دوران میں ڈیلفی نے بھی دھواں دیکھ لیا تھا اور اسی دھوئیں کی تیز چبھنے والی بو نے اس کی نیند کیا' ہوش بھی اڑا کر رکھ دیے تھے۔ ہم دونوں پہلو بہ پہلو بھاگتے ہوئے متاثرہ بیڈروم کے سامنے پہنچ گئے۔ اس وقت تک آگ نے پوری طرح مذکورہ بیڈروم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

''اوہ مائی گاڈ.....!'' وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''ہمیں فوراً فائر ڈیپارٹمنٹ کو اطلاع دینا چاہیے ورنہ سارا بنگلا جل کر خاکستر ہوجائے گا۔''

ہم ایک مرتبہ پھر لیونگ روم میں پہنچے۔ ڈیلفی نے ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھالی اور مختلف صفحات الٹتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

''ٹیل۔ گارڈ .....نہیں۔ رچرڈسن فائر ڈیپارٹمنٹ .....نہیں نہیں۔ یہ گرین ول ایونیو پر ہے۔ بہت دیر لگے گی یہاں پہنچنے میں..... یونیورسٹی پارک فائر ڈیپارٹمنٹ۔ یس' یہ ٹھیک رہے گا۔ انہیں یونیورسٹی بلیوارڈ سے یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہ ڈیلس کاؤنٹی کلب کے نزدیک ہی ہے۔''

فائر اسٹیشن کا انتخاب کرنے کے بعد وہ یونیورسٹی پارک فائر ڈیپارٹمنٹ کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ ٹو دن فور نائن ایٹ سیون فائیو تھری ایٹ زیرو۔

دوسری جانب فوراً کال اٹینڈ کرلی گئی۔ ڈیلفینا نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اپنی شکایت درج کرادی اور سیل فون کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔ اس کا مخاطب میں تھا۔

''جس وقت آگ لگی' تم کہاں تھے؟''

''میں ادھر ہی تھا لیونگ روم میں۔'' میں نے اس کے لیپ ٹاپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نیند نہیں آرہی تھی اس لیے ادھر آگیا اور تمہارے لیپ ٹاپ کے ساتھ کھیلنے لگا۔''

''اوہ..... کیا کوئی گیم کھیل رہے تھے؟''

''نیٹ سرفنگ۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اسکل اینڈ بونز کو وزٹ کررہا تھا۔''

''گڈ شاٹ!'' وہ معنی خیز انداز میں بولی پھر کہا۔ ''آؤ بیڈروم کی طرف چلتے ہیں۔''

''بیڈروم'' سے اس کی مراد وہی کمرا تھا جس میں آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ ہم ایک ساتھ چلتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

''ہمیں اس بیڈروم کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔'' وہ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ''تاکہ ہوا کا گزر ہو اور یہ بھی پتا چلے کہ اندر آگ کی نوعیت کیا ہے۔''

تھوڑی دیر پہلے میں نے اس دروازے کو کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن میری یہ کوشش بارآور نہیں ہوسکی تھی کیونکہ وہ دروازہ اندر سے لاک تھا لیکن جب ڈیلفی نے اس پر طبع آزمائی کی تو وہ فوراً کھل گیا۔

یہ میرے لیے حیرت کا مقام تھا۔ کچھ دیر پہلے جو دروازہ لاک تھا، وہ خود بخود کیسے کھل گیا تھا' یہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ کم از کم میں نے تو نہیں کھولا تھا اور ڈیلفی کو میں نے سوتے ہوئے جگایا تھا۔ پھر..... پھر..... کیا ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی اس بنگلے میں موجود تھا؟

اس سوال نے میرے وجود میں ایک لہری دوڑادی۔ کسی تیسرے ذی روح کا تصور بڑا سنسنی خیز اور رونگٹے کھڑے کردینے والا تھا۔

ڈیلفی نے دروازہ کھولا تو بیڈروم کے اندر چاروں طرف دھواں ہی دھواں بھرا نظر آیا۔ آگ کا دائرہ کار بیڈ تک محدود تھا یا پھر گلاس وال والے پردے کو آگ نے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

''مجھے تو یہ شارٹ سرکٹ کا شاخسانہ لگتا ہے۔'' ڈیلفی نے کہا۔ ''صحیح صورتِ حال کا اندازہ تو آگ بجھنے کے بعد ہی لگایا جاسکتا ہے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''ہاں' ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر ڈیلفی کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔''یہ بیڈروم کس کے استعمال میں تھا؟''

''کسی کے بھی نہیں...... کم ازکم میرے استعمال میں تو نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔''میں جب سے اس بنگلے پر آئی ہوں' کبھی اس بیڈروم کو کھول کرنہیں دیکھا۔''

''یعنی......'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔''تمہیں کچھ معلوم نہیں کہ اس بیڈروم میں کیا تھا اور کیا نہیں تھا؟''

''بالکل......'' وہ قطعیت سے بولی۔''میں نے تو آج پہلی بار اس بیڈروم کے اندر جھانکا ہے۔''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بولی۔

''علی! وہ دیکھو' آگ نے کس بری طرح بیڈ اور دیوار والے پردے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے......''

''میں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔''میرے بیڈروم کا انتخاب کس نے کیا تھا؟''

''مجھے اوپر سے ہدایت تھی کہ تمہیں کس بیڈروم میں ٹھہرایا جائے۔'' اس نے بتایا۔''لہٰذا میں نے ہدایت کے مطابق' تمہیں اس بیڈروم میں ٹھہرادیا۔''

''اوپر سے ہدایت تھی...... مطلب یہ کہ ایسا کرنے کے لیے ربی آئزک نے تم سے کہا تھا؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''ربی ہمارے روحانی پیشوا اور راہ نما ہیں۔ انتظامی امور سے ان کا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔''

''انتظامی امور کون دیکھتا ہے؟''

وہ میرے سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بولی۔

''آگ نے بیڈروم کا ستیاناس مار دیا ہے۔''

مجھے یہ سمجھنے میں ذرا مشکل پیش نہ آئی کہ وہ کسی بھی قیمت پر میرے سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے بھی بات کو دوسرے زاویے پر گھمادیا۔

''آگ کا تو کام ہی یہی ہے۔ اگر کوئی اس بیڈروم میں محوِ خواب ہوتا تو یہ خوف ناک آگ بے خبری میں اس کا سوا ستیاناس مار ڈالتی لیکن ایک بات......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی......!''

''کون سی بات؟'' اس نے پوچھا۔

''اس بنگلے میں پانچ چھ بیڈرومز ہیں۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔''پھر میرے لیے خاص طور پر اسی کمرے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟''

''تم اپنے بیڈروم کے انتخاب کو ایشو کیوں بنا رہے ہو؟'' وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔''اوپر والوں کی باتیں اوپر والے ہی جانتے ہیں۔''

''میں اس بیڈروم کو ایشو اس لیے بنا رہا ہوں کہ اس کے برابر والے بیڈروم میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''اوپر والوں کی باتوں پر نیچے والوں کو بھی غور کرنا چاہیے...... کرنا چاہیے یا نہیں؟''

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا کوئی جواب دیتی، فضا مخصوص سائرن کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ سائرن فائر پروٹیکٹرز والوں ہی کا ہوسکتا تھا۔ ڈیلفی کی شکایت دور کرنے کے لیے فائر پروٹیکٹرز اپنی گاڑی کے ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے۔ میں ڈیلفی کو زیرِآتش بیڈروم کے پاس چھوڑ کر بنگلے کے گیٹ کی طرف لپکا تاکہ مدد کے لیے وہاں آنے والوں کو راستہ دکھا سکوں۔

یونیورسٹی پارک فائر ڈیپارٹمنٹ کی گاڑی چار فائر فائٹرز کے ساتھ بنگلے کے اندر پہنچی اور آناً فاناً میں انہوں نے آگ کے سرکش اور بے لگام شعلوں کو شکست دے دی۔ اغلب امکان یہی ظاہر کیا گیا کہ آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی ہوگی۔ ڈیلفی کا اندازہ بھی یہی تھا لیکن میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ اس کام کے اختتام پر سینئر فائر فائٹر نے ڈیلفی سے اپنے رجسٹر پر دستخط لیے پھر وہ لوگ بنگلے سے روانہ ہوگئے۔

یہ بنگلا ڈیلفی کے بہ قول اس کی دوست ڈیلس کاؤنٹی کی سابق میئر سارا ملر کا تھا لیکن ڈیلفینا ہر معاملے کو اس طرح ڈیل کررہی تھی جیسے یہ بنگلا اس کی ذاتی ملکیت ہو۔ حقیقت کیا تھی' یہ صرف مالک جانتا تھا یا پھر ڈیلفی۔

''شکر ہے بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا۔'' ڈیلفی نے بیڈروم کے درودیوار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔''بیڈ اور پردہ جل گیا ہے یا پھر دیواروں اور چھت کا پینٹ قدرے خراب ہوا ہے۔ تھوڑا سا خرچہ ہوگا سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میں کل پہلی فرصت میں اس کام کو کروالوں گی۔ سارا کو یہ بنگلا اسی حالت میں ملنا چاہیے جس حالت میں وہ میرے حوالے کرکے گئی تھی۔''

''یہ کام تمہیں پہلی فرصت میں نہیں بلکہ دوسری فرصت میں کرانا پڑے گا۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''دوسری فرصت۔'' اس نے الجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''بھئی! کل صبح تمہاری دوست اپیل کا بام آرہی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔''میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''پہلی فرصت کا سارا وقت تو تم اسے دو گی...... دو گی یا نہیں؟''

''دوں گی۔''وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر کہا۔''میری دوست کا نام ایما ایپل بام ہے...... ایپل کا بام نہیں!''

''اوکے۔ میں آئندہ خیال رکھوں گا۔''میں نے جلدی سے کہا۔''ویسے بھی ایپل کا بام بن نہیں سکتا۔ کیونکہ ایپل کے اندر مینتھول نہیں ہوتا اور نہ ہی پیپرمنٹ آئل......''

''علی! تم بھی پتا نہیں' کہاں کی کہاں جوڑتے رہتے ہو۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

''تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے۔''میں نے سادگی سے کہا۔''میں جوڑتا ہی ہوں...... توڑتا تو نہیں ہوں نا...... اور ویسے بھی جب انسان کا ذہن مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے......''

''ہر انسان کا ذہن خیالات کی آماجگاہ ہی ہوتا ہے۔''وہ ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولی۔''اگر تمہارے ذہن کی یہ کیفیت ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔''

''نئی بات یہ ہے کہ میرے ذہن میں موجود خیالات میں زیادہ تعداد سوالات کی ہے...... بہت ہی نکیلے اور ترش سوالات......''

''خدا کے واسطے اب تم سوالات کی پٹاری کھول کر نہ بیٹھ جانا۔''وہ نیند بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔''میں مزید گفتگو کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔''

''میرے سوالات سے ڈرتی ہو؟''میں نے پوچھا۔

''نہیں۔''وہ دوٹوک انداز میں بولی۔''مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔ صبح تم ایک ہزار سوال بھی کرو گے تو میں جواب دوں گی۔''

''اوکے...... تم اپنے بیڈ روم میں سو جاؤ۔''میں نے کہا۔''ایک ہزار تو نہیں' میرے ذہن میں جو چند سوالات ہیں ان پر صبح بات ہو گی۔''

''صبح نہیں' دوپہر میں۔''وہ ایک فوری خیال کے تحت بولی۔''میں دیر تک سونا چاہتی ہوں۔ جب تک خود بیدار نہ ہوں' تم مجھے جگانے کی کوشش نہیں کرنا۔''

''اگر ایپل کا بام...... مطلب ایما آ جائے تو پھر بھی نہیں جگاؤں؟''

''وہ آفٹرنون میں آئے گی۔''وہ مخمور لہجے میں بولی۔

''مگر......''میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔''تم نے تو بتایا تھا کہ ایما صبح آئے گی؟''

''میں ابھی سونے سے پہلے اسے ٹیکسٹ کر دوں گی کہ وہ صبح نہیں بلکہ آفٹرنون میں آئے۔''وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''وہ میری بات ٹال نہیں سکتی۔''

''کیا وہ سوسائٹی میں تم سے جونیئر ہے؟''

''کافی جونیئر۔''اس نے بتایا۔''میری ڈگری اس سے بہت اوپر ہے۔''

''ڈگری...... کیا مطلب؟''

''ہماری سیکرٹ سوسائٹی میں ممبرز کو ڈگری سے ناپا جاتا ہے۔ ٹریننگ جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے' ڈگری بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔''اس نے کہا۔''سب سے اونچی ڈگری تھرٹی تھری ہے۔ یہ ڈگری حاصل کرنے کے بعد سوسائٹی ممبر ایگزالٹیڈ یعنی شرف یافتہ ہو جاتا ہے۔ وہ بہت محترم سمجھا جاتا ہے۔ اس کی عظمت کی مناسبت سے اسے بڑے بڑے کام سونپے جاتے ہیں۔''

''تم اس وقت کس ڈگری پر فائز ہو؟''میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میرے خیال میں اب مجھے سو جانا چاہیے۔''وہ خمار آلود آواز میں بولی۔''اور تمہیں بھی...... گڈ نائٹ۔''

''گڈ نائٹ......!''میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

میں واپس اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس بنگلے میں آئے ہوئے مجھے چالیس سے زیادہ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اگر فی گھنٹا ایک واقعہ بھی شمار کیا جاتا تو اب تک میرے ساتھ چھوٹے بڑے چالیس واقعات تو گزر ہی چکے تھے۔ اس وقت میرے ذہن میں جو سوالات کلبلا رہے تھے' میں ڈیلفی سے ابھی پوچھتا یا صبح یا کل سہ پہر' وہ کبھی مجھے سیدھا جواب نہ دیتی۔ وہ کبھی تسلیم نہ کرتی کہ وہ مبینہ تنفذ گلاس وال کے راز سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ دوسرے بیڈ روم میں موجود دبیز پردہ کسی ریموٹ سے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ وہ کبھی میرے سامنے یہ اقرار نہ کرتی کہ گزشتہ شب وہ گلاس وال کی دوسری جانب سرخ بیڈ پر' سرخ نائٹی میں ملبوس میرے حواس پر اپنے خوابیدہ حسن کی بجلیاں گرا رہی تھی۔ وہ کبھی یہ وضاحت نہ کرتی کہ میرے چیک کرنے پر اس بیڈ روم کا دروازہ اندر سے لاک تھا تو آتش زدگی کے بعد اس کے چیک کرنے پر وہ دروازہ کھلا ہوا کیوں تھا؟ جب میں اپنے بیڈ روم سے نکل کر لیونگ روم میں جاتا ہوں تو بغل والے بیڈ روم میں وال گلاس والا دبیز پردہ اٹھا ہوا ہوتا ہے اور ڈنر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے جب واپس آتا ہوں تو وہ پردہ برابر ہو چکا ہوتا ہے اور پھر یہ آگ..... یہ خود بہ خود کیسے بھڑک اٹھی؟

ڈیلفینا کے پاس میرے ان سوالات کے جواب نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو وہ کبھی مجھے جواب دیتی نہیں' کم از کم مجھے اس سے ایسی ہی امید تھی..... تو پھر میں اپنا وقت برباد کیوں کرتا لہٰذا ان امور پر میں نے اس سے سوال نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ڈیلفینا سے کوئی سوال نہ کرنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں گا۔ میرا ساکت و جامد ہوجانا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ اب جو بھی کرنا تھا، مجھے خود ہی کرنا تھا اور اس ''کرنا'' کے لیے کسی انتظار کی ضرورت نہیں تھی۔ رات کے اس آخری پہر بھی بہت کچھ کیا جاسکتا تھا۔

میں نے اپنا سیل فون اٹھایا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ راہ داری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک گہرے اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ میں کسی کو کال کرنے کا ہرگز کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ سیل فون میں اس لیے اپنے ساتھ لایا تھا کہ بہ وقتِ ضرورت اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے میں اندھیرے میں سیل فون کی ٹارچ کو استعمال کرسکوں۔ میرا ارادہ آتش زدہ بیڈروم کی سیر کا تھا.....!

یونیورسٹی پارک فائر ڈیپارٹمنٹ والے آگ بجھا کر واپس جاچکے تھے اور اب اس بیڈروم میں ''امن وامان'' والی صورتِ حال تھی۔ بیڈروم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔

میں نے بیڈروم کی لائٹس آن کرنے کی حماقت نہیں کی اور تاریک کمرے میں اندازے کی بنیاد پر آگے بڑھنے لگا۔ جب میں بیڈ کے نزدیک پہنچا تو میں نے سیل فون کی ٹارچ آن کرلی۔ ٹارچ کی پن پوائنٹ لائٹ بیڈروم کے ایک مختصر سے مخصوص حصے کو روشن کررہی تھی۔ میں نے اس محدود لائٹ میں بیڈ کی حالت کا جائزہ لیا اور یہ دیکھ کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ گزشتہ شب وہ ہنستا بستا اور محوِ خواب جوبن کے سنگین نظارے لٹانے والا سرخ بیڈ اب راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوچکا تھا۔ کم وبیش ایسی ہی حالت اس دبیز ڈارک براؤن پردے کی بھی تھی جس کی ریموٹ کنٹرولڈ کھینچا تانی گلاس وال کو کبھی اندھا اور کبھی آنکھوں والا بنا دیتی تھی۔

میں نے سیل فون کی ٹارچ کو کمرے کے عقبی حصے میں گھما کر دیواروں پر پھینکا تو باتھ روم کا دروازہ فوکس ہوگیا۔ میں نے آج دن میں جب اس بیڈروم کی سیر کی تھی تو واش روم کے دروازے سے کان لگا کر اندر گرنے والے پانی کی آواز سننے کی کوشش بھی کی تھی لیکن میری یہ کوشش بار آور نہیں ہوسکی تھی کیونکہ واش روم کے اندر کوئی موجود ہی نہیں تھا۔

اب کی بار میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے واش روم کے اندر کا جائزہ لینا چاہیے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں دروازہ کھول کر واش روم کے اندر داخل ہوگیا۔

ٹارچ کی محدود روشنی میں، میں نے دیکھا کہ وہ باتھ روم خالی تھا۔ باتھ روم کے پچھلے حصے میں ایک دروازہ دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ کسی باتھ روم میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے لیے عموماً ایک ہی دروازہ بنایا جاتا ہے پھر اس باتھ روم میں دو دروازے کیوں تھے؟

یہ سوال نہایت ہی اہم اور کسی حد تک خطرناک بھی تھا۔ اگر ایک عام سا آدمی بھی اس مسئلے پر غور کرتا تو اس کے ذہن میں یہی بات آتی کہ مذکورہ باتھ روم میں ان آؤٹ کے دو راستے ہیں۔ ایک دروازہ تو اسی بیڈروم میں کھلتا تھا اور دوسرا کہیں اور..... اور سوال یہ تھا کہ کہیں اور کہاں؟

یہ سوال خاصا خوف ناک تھا اور اس کا ایک ہی مطلب تھا' دوسرا دروازہ اس بیڈروم سے باہر کہیں کھلتا تھا کیونکہ اس باتھ روم پر آکر تو بیڈروم ہی ختم ہوجاتا تھا۔ اس سچویشن میں وہ دروازہ شکوک وشبہات کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے ڈیلفینا کے بیڈروم میں بھی باتھ روم کا دروازہ عقبی حصے ہی میں دیکھا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ڈیلفی کا میڈیکل ٹیشن کا مقام دیکھنے اس کے بیڈروم میں داخل ہوا تھا اور اس نے یہ کہہ کر میرا مذاق اڑایا تھا کہ میں اس کے بیڈروم میں فرانزک رپورٹ تیار کرنے آیا ہوں۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ ڈیلفی کے بیڈروم اور آتش زدہ بیڈروم کی پشت ایک دوسرے سے لگی ہوئی تھیں۔ تو کیا..... آتش زدہ بیڈروم والے باتھ روم کا دوسرا دروازہ ڈیلفی کے بیڈروم کے باتھ روم میں کھلتا تھا؟

اس سوال نے میرے رگ وپے میں سنسنی سی دوڑا دی۔ گویا ڈیلفی والے بیڈروم کے باتھ روم سے آتش زدہ بیڈروم کے باتھ روم میں آیا اور جایا جاسکتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی۔ ڈیلفی نے اس حوالے سے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ یا تو وہ خود بھی اس راز سے واقف نہیں تھی اور یا پھر اس نے دانستہ یہ بات مجھ سے چھپائی تھی!

میں نے سیل فون کی ٹارچ کو آف کردیا۔ اگر واقعی ویسا تھا جیسا کہ میں سوچ رہا تھا تو ٹارچ کا روشن ہونا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ بالفرض، عین اسی وقت اگر ڈیلفی اپنے باتھ روم میں ہوتی تو آتش زدہ بیڈروم والے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باتھ روم میں ہونے والی کوئی بھی سرگرمی اس کی پکڑ میں آسکتی تھی' چاہے وہ سیل فون کی ٹارچ لائٹ ہوتی یا میرے جسم کی کوئی ہلکی سی بھی جنبش!

میں نے باتھ روم کے زیر بحث دروازے پر دباؤ ڈال کر دیکھا۔ وہ دوسری طرف سے بند تھا۔ میں نے اس دروازے سے کان لگا کر دوسری جانب کی آوازیں سننے کی کوشش کی مگر کوئی حوصلہ افزا نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ پھر میں نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر دوسری طرف کچھ دیکھنے کی سعی بھی کی اور میری یہ کوشش بھی باوآور نہ ہوسکی۔ میں مایوس سا ہوکر واپس اپنے بیڈروم میں آگیا۔

کہتے ہیں کہ تاریکی چاہے کتنی بھی گہری کیوں نہ ہو' اسی کے بطن سے روشنی کی کرن پھوٹتی ہے۔ ایسا ہی معاملہ امیدی اور ناامیدی کا بھی ہے۔ انسان جب مایوسی کی انتہائی حد کو چھو رہا ہوتا ہے اور اپنی تمام تر کوششوں کو ترک کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے تو اس سے ایک قدم آگے کامیابی اس کی راہ دیکھ رہی ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ قدم اٹھانے کی ہمت کرلیتے ہیں، وہ سرخرو جاتے ہیں اور جو لوگ یہ حوصلہ نہیں کرتے، ناکامی... ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

میں نے زندگی میں ہارنا یا مایوس ہونا نہیں سیکھا تھا لہٰذا نینوی کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے بھی میں اسی ایشو کے بارے میں سوچ رہا تھا اور پھر یکا یک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا سا ہوا۔

جب میں نے آتش زدگی والے واقعے سے تھوڑی دیر پہلے اس بیڈروم کے داخلی دروازے کو لاک پا کر اس کے کی ہول سے اندر جھانکنے کی کوشش کی تھی تو مجھے پیٹرول کی بو محسوس ہوئی تھی۔ اس وقت تو میں نے اس بو کے ماخذ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا لیکن اب روزِ روشن کی طرح مجھے یاد آگیا کہ پیٹرول کی وہ بو کی ہول کے اندر سے آرہی تھی۔

اگر میرا احساس مجھے گمراہ نہیں کررہا تھا تو پھر یہ بات طے تھی کہ اس بیڈروم میں رونما ہونے والا آتش زدگی کا وہ واقعہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ یہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ کسی نے اس بیڈروم کے اندر پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی تھی۔

مگر کس نے.....؟

یہ سوال بہت گمبھیر اور سنسنی خیز تھا۔

اس بنگلے میں صرف دو افراد تھے۔ ایک میں اور دوسری ڈیلفی۔ مجھے تو یقین تھا کہ وہ آگ میں نے نہیں لگائی تھی۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ یہ سب کچھ ڈیلفی کا کیا دھرا تھا.....!

☆☆☆

رات کو میں دیر سے سویا تھا لہٰذا اگلی صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ جب میں نے بستر چھوڑا تو وال کلاک گیارہ کا وقت بتا رہا تھا اور یقیناً یہ دن کے گیارہ بجے تھے کیونکہ بیڈ روم کے باہر ہر طرف تیز چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گویا اس بنگلے میں میرے قیام کو اڑتالیس گھنٹے گزر گئے تھے اور مجھے مزید چوبیس گھنٹے یہاں قیام کرنا تھا۔

رات اپنے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے ڈیلفی نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ دیر تک سوئے گی اور جب تک وہ خود نہ جاگے' میں اسے بیدار کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کے ساتھ ہی ڈیلفی نے اس عزم کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ کل آتش زدہ بیڈروم کو ''ٹھیک'' بھی کروادے گی۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد تھیں۔ وہ یہ دونوں کام بہ یک وقت کیسے کرتی' اس کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

میں بیدار تو ہو ہی چکا تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ فریش ہوکر لیونگ روم کا رخ کرتا ہوں اور ناشتے کے نام پر تھوڑی پیٹ پوجا بھی کرلیتا ہوں۔ اس وقت مجھے ہلکی پھلکی بھوک محسوس ہورہی تھی۔ انسان کے حالات کچھ بھی ہوں، اسے اپنے پیٹ کے ساتھ کبھی زیادتی نہیں کرنا چاہیے ورنہ ردعمل کے طور پر جب پیٹ زیادتی کی راہ اپناتا ہے تو پھر باقی کی زندگی دوائیاں پھانکتے گزرتی ہے۔

میں تیار ہوکر بیڈروم سے نکلا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ڈیلفی مجھ سے پہلے بیدار ہوچکی تھی۔ نہ صرف بیدار ہوچکی تھی بلکہ پوری ہشاشی بشاشی کے ساتھ وہ چند لوگوں کی سپرویژن بھی کررہی تھی۔

جی ہاں ..... میرے پہلو والے بیڈ روم کی ''مینٹیننس'' کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ گلاس وال کے مکھڑے پر نیا ڈارک براؤن آنچل سجا دیا گیا تھا۔ یہ ہو بہو ویسا ہی پردہ تھا جیسا آتش زدگی سے پہلے وہاں لٹکا ہوا تھا۔ اس وقت وہ پردہ برابر تھا یعنی میرے والے بیڈ روم سے اس بیڈروم میں دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں جب سو کر اٹھا تھا تو میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا یعنی بغل والے بیڈ روم میں جھانکنے کا مجھے خیال نہیں آیا تھا۔ سرخ بیڈ شیٹ والا بیڈ بھی عین اسی جگہ بچھا دیا گیا تھا جہاں اس سے پہلے وہ بیڈ بچھا ہوا تھا جسے گزشتہ شب آتش نے نگل لیا تھا۔ علاوہ ازیں دو پینٹرز آگ کی تپش سے متاثر ہونے والی دیواروں کی مرمت کا کام کررہے تھے۔

مجھ پر نظر پڑی تو ڈیلفی نے کہا۔ ''علی! اچھا ہوا' تم

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اٹھ گئے۔''

''مجھے تو اٹھنا ہی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم بھی بیدار ہو چکی ہو حالانکہ تم نے آج دیر تک سونے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''بس یہ ذمے داری سر پر سوار تھی اس لیے میں نیند کے دورانیے کو طویل نہیں کر سکی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''سارا کا یہ احسان کیا کم ہے کہ اس کا یہ عالی شان بنگلا میرے تصرف میں ہے۔ اس میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو صحیح کرانا میرا فرض بنتا ہے تاکہ میں اسے بنگلا اسی حالت میں واپس کروں جیسا اس نے مجھے دیا تھا۔''

''بالکل..... یہ تو اصولی بات ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''لیکن ہو بہو ویسے ہی پردے اور بیڈ کا انتظام کرنا اور وہ بھی اتنے کم وقت میں' واقعی کمال کی بات ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، یہ پردہ اور بیڈ سوختہ پردے اور بیڈ کے جڑواں ہوں.....!''

''یہ کمال سے زیادہ حاضر دماغی کا کھیل ہے علی!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں نے جلے ہوئے پردے اور بیڈ کے ملبے کا اچھی طرح معائنہ کیا تو مجھے ایسے آثار مل گئے جن سے پتا چلایا جا سکتا تھا کہ یہ پردہ اور بیڈ کہاں سے خریدے گئے تھے۔ میں نے دو چار ''بیڈ، باتھ اینڈ کرٹن'' کمپنیز میں فون کیا اور انہیں پردے اور بیڈ کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس کوشش کے نتیجے میں' میں اس کمپنی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جہاں سے وہ پہلے والا بیڈ اور پردہ خریدا گیا تھا۔''

''ویل ڈن!'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''تم بہت حاضر دماغ اور غائب دل ہو.....''

''غائب دل.....'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ ''میں سمجھی نہیں؟''

''مطلب یہ کہ تمہاری کھوپڑی میں کئی انسانوں کی مجموعی ذہانت رکھنے والا دماغ تو موجود ہے لیکن سینے کے اندر وہ حساس دل کہیں نظر نہیں آتا جس میں محبت بھرے جذبات ہوں..... یعنی دماغ آباد' دل برباد۔''

''میں کام کے ہونے پر یقین رکھتی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''چاہے وہ دماغ کی توانائی سے ہو یا دل کے جذبات سے اور یہ جو تمہیں فلسفہ جھاڑنے کا شوق ہے نا.....'' لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''تمہارا یہ شوق آج سہ پہر میں ٹھنڈا ٹھار ہو جائے گا۔ فلسفے کی پروفیسر آ رہی ہے..... وہ تمہارے دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دے گی۔''

''اوہ..... تم اپیل کا بام..... میرا مطلب ہے' ایما کی بات کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے' آ جانے دو پروفیسر صاحبہ کو۔ دیکھ لیں گے' کون کس کے دماغ کی چولیں کستا ہے اور کون کس کے دماغ کی چولیں ہلا کر رکھ دیتا ہے۔''

''میں کچن میں ناشتا بنانے جا رہی ہوں۔'' وہ موضوعِ گفتگو کو تبدیل کرتے ہوئے بولی۔ ''جب تک تم یہاں کام کی نگرانی کرو۔ مجھے امید ہے کہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں دیواروں کی ٹینگ کا کام نمٹ جائے گا۔''

''او کے..... تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں یہاں کے معاملات کو دیکھ رہا ہوں۔''

ڈیلفی کچن کی جانب بڑھی تو میں متاثرہ بیڈ روم کا جائزہ لینے لگا جو کہ اب متاثرہ نہیں رہا تھا۔ اس کی ''مرہم پٹی'' کر کے اسے صحت یاب کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ اس کے جن اعضا کو آگ نے نگل لیا تھا، ان کی جگہ نئے ''اعضا'' ہنگامی ''سرجری'' کر کے لگا دیے گئے تھے۔ اب وہ بیڈ روم آتش زدگی سے پہلے والا بیڈ روم نظر آنے لگا تھا۔ اس بیڈ روم کے ساتھ میری بڑی ''رنگین اور سنگین'' یادیں وابستہ تھیں لہٰذا میں گھوم پھر کر اس کے مختلف حصوں کا معائنہ کرنے لگا۔ مقصد یہی تھا کہ شاید کوئی ایسی شے میرے ہتھے چڑھ جائے جس سے میں اس بیڈ روم کی مسٹری اینڈ ہسٹری کی تہ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔

وہ کیا کہتے ہیں کہ..... نیت صاف' منزل آسان!

میری نیت صاف اور عزم مثبت تھا لہٰذا جلد ہی کامیابی نے میرے قدم چوم لیے۔ مجھے ایک الماری کے اندر سے چند چابیوں والا ایک گچھا مل گیا۔ اغلب امکان اسی بات کا تھا کہ اس ''کی رنگ'' میں موجود چابیاں اسی بیڈ روم کے دروازوں کی تھیں۔ میں نے بڑی صفائی کے ساتھ وہ... کی رنگ پار کر لیا۔ یہ میرے بہت کام کا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب مزدور اپنا کام ختم کر کے بنگلے سے چلے گئے تو میں اور ڈیلفی ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھے۔ یہ ناشتے کا وقت تھا اور نہ لنچ کا۔ یوں سمجھ لیں کہ اس وقت ہم بریک فاسٹ اور لنچ کی درمیانی شکل یعنی برنچ کر رہے تھے۔

میں نے ڈیلفینا کو خوش گوار موڈ میں دیکھا تو کریدنے کا موڈ ہوا حالانکہ میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اب اس سے کوئی سوال نہیں کروں گا لیکن وہ..... ایسی پراسرار ہستی تھی کہ خوامخواہ اس سے چھیڑ خانی کو دل چاہتا تھا۔ یہ انسانی نفسیات

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے کہ جس کام کی راہ میں جتنی زیادہ رکاوٹ نظر آرہی ہو اسے اتنا ہی زیادہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ڈیلفی چونکہ میرے اکثر سوالات کو گول کر جاتی تھی لہٰذا لاشعوری طور پر مجھ پر یہ ضد سوار ہو جاتی تھی کہ میں ایک بار پھر کسی نئے انداز سے اسے ٹٹولوں۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اس بنگلے سے جا چکی ہے؟''

میرا یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ بے ساختہ مستفسر ہوئی۔ ''وہ کون؟''

''ارے بھئی..... وہ تمہاری ڈپلی کیٹ۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جس نے تمہاری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ میرا مطلب ہے..... منفی ڈیلفینا؟''

''تو تمہیں اس بات کا یقین نہیں ہے جو یہ سوال کر رہے ہو؟'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے یقین کرنے اور نہ کرنے کو چھوڑو۔'' میں نے بھی جواباً اس کی ہسپانوی مدھ بھری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔''

''بالکل..... ایک سو ایک فی صد!'' وہ پورے یقین سے بولی۔ ''میں نے محترم ربی کی مدد سے اس بلا سے ہمیشہ ہمیشہ کے چھٹکارا پالیا ہے۔ اب وہ اس دنیا میں باقی نہیں رہی۔''

''تم یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتی ہو..... کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''تو کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے اس بات کا کہ منفی قوت ابھی تک اس بنگلے میں یا کہیں اور موجود ہے؟'' اس نے مجھ سے دریافت کیا۔

''کہیں اور کا تو مجھے پتا نہیں۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے شک ہے کہ وہ ابھی تک اس بنگلے میں موجود ہے۔''

''علی! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

اس وقت تک ہم نے برنچ ختم کر لیا تھا اور گپ شپ کے لیے لیونگ روم میں آبیٹھے تھے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں سراسیمگی تیرتے دیکھی تو گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ڈیلفی جی! تم کوئی ننھی سی بچی نہیں ہو جو میری باتوں سے ڈر جاؤ گی۔ تھرٹی تھری ڈگری نہ سہی مگر تھرٹی ٹو یا تھرٹی ون یا تھرٹی ڈگری کے سلسلے میں تمہاری تاج پوشی ہونے والی ہے اور اس غرض سے بہت جلد تمہیں امریکا سے یروشلم روانہ ہونا ہے جیسے کہ.....''

میری وضاحت سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بے حد اضطراری انداز میں مستفسر ہوئی۔

''جیسے کہ.....کیا؟''

''جیسے کہ ٹائی ٹینک فلم کا ڈائریکٹر جیمز کیمرون تیرہ مارچ انیس سو ستانوے میں بالی ووڈ (کیلی فورنیا) سے بڑی راز داری کے ساتھ فی نکس (ایری زونا) کی ایک خاص سیکرٹ سوسائٹی کی عمارت میں پہنچا تھا جہاں اس کی تھرٹی ٹو ڈگری کے سلسلے میں تاج پوشی کی جانے والی تھی اور یہ بات فلم کے یونٹ میں سے کسی بھی شخص کے علم میں نہیں تھی.....ایم آئی رائٹ؟''

''یو آر ایبسولیوٹلی رائٹ اینڈ ویری ڈینجریس۔'' وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے بولی۔

''اپنے شنگرفی ہونٹوں کا بیڑا غرق نہیں کرو اللہ کی بندی۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیپ ان مائنڈ۔ آئی ایم ناٹ ڈینجریس فار یو۔''

''تم کیا کہہ رہے تھے؟'' وہ بات کو ٹوئسٹ کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں کیوں شک ہے کہ منفی ڈیلفینا ابھی تک اس بنگلے میں موجود ہے؟''

میں نے اس کے سوال کو..نظر انداز کرتے ہوئے الٹا اسی سے پوچھ لیا۔ ''میرے برابر والے بیڈ روم میں کیا تم نے آگ لگائی تھی؟''

''نن.....نہیں!'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں کیوں لگاؤں گی بھلا.....!''

''میں نے بھی نہیں لگائی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا نا کہ اس بیڈ روم میں آگ لگی تھی..... لگی تھی یا نہیں؟''

''یس! آگ لگی تھی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''مگر یہ آگ تم نے لگائی اور نہ میں نے۔ اس آگ کا سبب سامنے آچکا ہے۔ تمہیں معلوم ہے نا فائر فائٹرز نے کیا کہا تھا.....؟''

''شارٹ سرکٹ.....!'' میں نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اونہہ!''

''تمہیں اس بات پر یقین آئے یا نہ آئے لیکن میں اس آتش زدگی کو شارٹ سرکٹ ہی کا شاخسانہ سمجھتی ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''ڈیلفی! میں تمہیں ایسا سوچنے سے روک نہیں سکتا۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا پچھلے دو دنوں میں تم اس بیڈ روم میں گئی ہو جس میں گزشتہ رات آتش

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

زدگی کا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''پچھلے دو دنوں میں کیا' میں نے تو آتش زدگی سے پہلے کبھی بھی اس کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

''میں نے بھی آتش زدگی والے واقعے سے قبل اس بیڈروم میں کبھی قدم نہیں رکھا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس نے پوچھا۔ ''یہ بتا کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا بھی اس بنگلے میں موجود ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''بہ شرط یہ کہ.....!''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ مشتاق لہجے میں بولی۔ ''کیا بہ شرط یہ کہ؟''

''ہم دونوں میں سے کوئی بھی مذکورہ بیڈروم میں نہ گیا ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''تو اس کمرے میں ایسا کیا پیش آیا ہے جس سے تمہیں لگتا ہے کہ ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص اس بیڈ روم کے اندر گیا ہے؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آتش زدگی والے واقعے کے علاوہ.....!''

''ریموٹ کی مدد سے کنٹرول کیا جانے والا وہ ڈارک براؤن دبیز پردہ۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔ ''میں نے اپنے بیڈروم میں رہتے ہوئے اس پردے کو سمٹتے اور پھیلتے دیکھا ہے۔''

''یہ..... یہ تم کیا..... کہہ رہے ہو علی.....؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

''اور جب وہ پردہ پھیلتا تھا تو برابر والے کمرے کا منظر میری نگاہ سے اوجھل ہو جاتا تھا۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پھر جب وہ پردہ سمٹتا تھا تو میں بغل والے بیڈروم میں دیکھنے کے قابل ہو جاتا تھا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بے یقینی اور حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''ایسا ہوا ہے ڈیلفی!''

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی بے یقینی اور حیرت حقیقی تھی یا مصنوعی! یا تو وہ بالکل سچ بول رہی تھی، یعنی اس معاملے میں اس کا ہاتھ نہیں تھا اور یا پھر وہ بہت اچھی اداکارہ تھی جو میں اسے اور اس کے جھوٹ کو پکڑ نہیں پا رہا تھا۔

''ایسا کب ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کل دن میں اور پھر رات میں بھی..... آتش زدگی والے واقعے سے پہلے۔'' میں نے بتایا۔ ''پہلی مرتبہ ایسا اس وقت ہوا تھا جب میں نے سرخ انگارا آنکھوں والی منفی ڈیلفینا کو سوئمنگ پول میں کسی جل پری کے مانند آبی اٹکھیلیاں کرتے دیکھا تھا۔ اسی رات جب میں سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں پہنچا تو وہ ڈارک براؤن پردہ شیشے کی دیوار کے سامنے سے ہٹا ہوا تھا اور اس بیڈروم میں بچھے ہوئے سرخ بیڈ پر میں نے سرخ نائٹی میں کسی کو دیکھا تھا.....''

''کس کو دیکھا تھا؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''تمہیں.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''تم بڑے آزادانہ انداز میں محوِ استراحت تھیں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے علی!'' وہ بگڑ کر بولی۔ ''میں تو وہ پوری رات اپنے بیڈروم میں سوتی رہی تھی۔ تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھ لیا؟''

''پہلے مجھے بھی یہی لگا تھا کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے سرکو معنی خیز جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن پھر جب میں نے خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھا تو مجھے تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ بس' مجھے یقین ہو گیا کہ میں کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ تم حقیقت میں سرخ نائٹی میں محوِ خواب تھیں۔''

''ہو سکتا ہے' وہ منفی ڈیلفینا ہو۔'' اس نے اظہارِ خیال کیا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں' ایسا ہو سکتا ہے مگر.....!''

''مگر کیا؟'' وہ چونک کر مجھے تکنے لگی۔

''مگر اب تو ایسا کچھ عجیب و غریب نہیں ہونا چاہیے نا.....'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کیونکہ اس منفی ڈیلفینا کو تم نے ربی آرک کی مدد سے شکست دے دی ہے اور وہ ڈسپوز ہو چکی ہے..... ڈی کمپوز ہو چکی ہے..... ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو چکی ہے.....''

میں تیز و تند سوالات کی باڑ پر رکھ کر غیر محسوس انداز میں اسے ایک بند گلی میں لے آیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کیا جواب دے۔ میں نے اپنے اعتراضات کی دیوار پر ایک اور رد اچھاڑتے ہوئے کہا۔

''اگر میں نے اس رات سرخ نائٹی میں تمہیں نہیں دیکھا تھا تو پھر وہ منفی ڈیلفینا ہی رہی ہو گی اور اگر اب وہ منفی ڈیلفینا باقی نہیں رہی تو پھر کل دوپہر کے بعد اس بنگلے میں پیش آنے والے ہر حیرت انگیز واقعے کے پیچھے یا تو تمہارا ہاتھ ہے یا پھر میرا اور..... میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

واقعات میں کسی بھی حوالے سے میری ذات ملوث نہیں تو پھر..... گیند تمہاری کورٹ میں چلی جاتی ہے۔''

لمحے بھر کے لیے وہ ''نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن'' والی کیفیت میں گرفتار دکھائی دی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے بڑی صفائی اور مہارت سے خود کو سنبھال لیا اور تشویش بھرے انداز میں ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔

''علی! میں تمہاری باتوں کو جھٹلا نہیں رہی ہوں لیکن ان باتوں نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میں اس سلسلے میں ربی سے بات کروں گی۔''

''اگر منفی ڈیلفینا ڈی کمپوزیا ڈسپوز آف نہیں ہوئی تو تمہیں پہلی فرصت میں ربی آئزک سے رابطہ کر کے ساری صورتِ حال سے انہیں آگاہ کر دینا چاہیے۔'' میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو علی۔'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔

اسی وقت ڈیلفی کے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے یہ بتاتے ہوئے کال ریسیو کر لی۔

''ایما کا فون ہے۔''

پھر وہ اسپیکر کو آن کرتے ہوئے بولی۔ ''ہیلو ایما! تم کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' ایما نے کہا۔ ''تم سناؤ' کیا ہو رہا ہے؟''

پہلی مرتبہ ایما کی آواز میری سماعت تک پہنچی تھی اور اس امر میں کسی شک و شبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ ڈیلفی نے ایما کی آواز مجھے سنانے کے لیے ہی سیل فون کا اسپیکر آن کیا تھا ورنہ گزشتہ رات جب پی۔ ایف چینگو میں ایما کا فون آیا تھا تو اس وقت ڈیلفی نے اسپیکر آن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' ڈیلفی نے اس کے استفسار کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''بس' تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ کب تک پہنچ رہی ہو؟''

''لگ بھگ پانچ بجے تمہارے پاس ہوں گی۔'' ایما نے بتایا۔

''آجاؤ..... تمہیں ایک شخص سے بھی ملوانا ہے۔'' ڈیلفی نے کہا۔

''کس شخص سے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہے ایک نابغۂ روزگار۔'' ڈیلفی نے مجھ پر نگاہ ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہے اور بحث کرنے کا شوقین بھی۔ بہت زیادہ سوالات کرتا ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے' پروفیسر صاحبہ آرہی ہیں۔ تم رات بھر ان کے فلسفے کے ساتھ اپنی نفسیات لڑاتے رہنا۔ سائیکالوجی اور فلاسفی کی جنگ سے میں بھی لطف اٹھاؤں گی۔''

''تم ضرور لطف اٹھانے کے بارے میں سوچو لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لو کہ فلاسفی اور سائیکالوجی کے بیچ کبھی جنگ نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ایک ہی علم کے دو روپ ہیں۔ ہاں البتہ.....'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوئی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''جہاں تک تمہارے لطف اندوز ہونے کی بات ہے تو اس سلسلے میں' میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی.....!''

''اوکے۔ تم آجاؤ۔'' ڈیلفی نے سرسری انداز میں کہا پھر سیل فون کا اسپیکر آف کرتے ہوئے بولی۔ ''باقی باتیں یہاں ایک ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔''

ان کے بیچ مزید ایک آدھ منٹ گفتگو ہوئی لیکن ڈیلفی کی ''ہوں..... ہاں'' سے میں کچھ سمجھ نہیں پایا کیونکہ فون کا اسپیکر آف ہو چکا تھا۔

بات ختم ہونے کے بعد اس نے سیل فون صوفے پر رکھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تو ہم کیا بات کر رہے تھے.....؟''

''میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ یہاں کی صورتِ حال سے فوراً ربی آئزک کو آگاہ کر دو۔'' میں نے یاد دلانے والے انداز میں کہا۔

''ہاں..... یہ تو کرنا پڑے گا۔'' وہ پراگندہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''لیکن فوری طور پر یہ ممکن نہیں۔ اپنی باؤ..... اس معاملے کو کل دیکھیں گے۔ اب میں بھی اردگرد کے ماحول پر گہری نگاہ رکھوں گی اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کروں گی کہ اس جنگلے میں کیا کیا کچھ آؤٹ آف دی وے ہو رہا ہے۔''

''کیا اپیل یام رات ہمارے پاس ہی رکے گی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''کیوں.....'' وہ گڑبڑا کر بولی۔ ''تم نے کس بات سے یہ اندازہ لگایا؟''

اس کے بدکنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں نے اسے چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ایما سے کہا ہے نا کہ وہ رات بھر میرے ساتھ فلاسفی اور سائیکالوجی کی جنگ لڑتی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رہے۔ اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ وہ رات کو اسی بنگلے پر ٹھہرے گی۔''

''ارے' وہ میں نے ایسے ہی محاورتاً کہہ دیا تھا۔'' وہ ایک کھوکھلا قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''ویسے اگر اس کا رات کو یہاں ٹھہرنے کا موڈ بن بھی گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''ہاں، واقعی کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا پھر وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''ارے' باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ... ہی نہیں ہوا۔ ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد تو اپیل بام یہاں پہنچ جائے گی۔''

''وقت چیز ہی ایسی ہے علی .....'' وہ مدبرانہ انداز میں بولی۔ ''اگر اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر نہ بیٹھو تو یہ چپکے سے ایسے پھسل جاتا ہے جیسے مٹھی میں دبی ہوئی ریت۔ اب یہی دیکھ لو۔ تم بہتر گھنٹوں کے لیے اس بنگلے پر ٹھہرے ہوئے ہو۔ اس مدت میں سے کم و بیش چون گھنٹے گزر چکے ہیں اور صرف اٹھارہ گھنٹے باقی ہیں۔ آج تم اس بنگلے پر آخری رات گزارو گے اور کل دن میں گیارہ بجے تمہارے یہاں قیام کے بہتر گھنٹے پورے ہو جائیں گے۔''

''واقعی ..... مجھے تو یہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' میں نے کہا۔

''جو لوگ ذہنی طور پر مصروف زندگی گزارتے ہیں انہیں وقت کے گزرنے کا احساس نسبتاً کم ہوتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہم دونوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ ہے لیکن جن لوگوں کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہوتا اور نہ ہی کچھ سوچنے کی توفیق ہوتی ہے، ان کے لیے یہ وقت ماؤنٹ ایورسٹ بن جاتا ہے۔''

''آج تو تم بھی فلسفہ بول رہی ہو۔'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تو بس بول رہی ہوں۔'' اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''اس میں کتنا فلسفہ ہے اور کتنی نفسیات، اس کا اندازہ تم خود لگالو۔''

اس کی بات پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا پھر ہمارے بیچ وقت کی ستم ظریفیوں اور چٹکاریوں پر بات ہونے لگی۔ اس ریلے میں بہتے ہوئے ہم دونوں ٹائم اینڈ اسپیس کے موضوع کی طرف نکل گئے۔ یہ سیر حاصل گفتگو جاری ہی تھی کہ ڈیلفی کے سیل فون پر میسج ٹون بجی۔

ڈیلفی نے میسج چیک کرنے کے بعد نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا پھر اعلان کرنے والے انداز میں بولی۔ ''پارٹی آ گئی ہے۔''

''پارٹی ..... ؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

''ہاں ..... دوسری پارٹی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب تم اس کا دماغ کھانا، وہ تمہارا دماغ کھائے گی اور ..... میں آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھوں گی۔''

''تمہارا مطلب ہے' اپیل بام یہاں پہنچ گئی ہے؟''

''بالکل' میرا یہی مطلب ہے۔''

''اوہ ..... یہ تو وقت کی بہت پابند ہے۔'' میں نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''پانچ بجے آنے کو کہا تھا اور ٹھیک پانچ بجے یہاں پہنچ گئی ہے۔''

''وقت کی پابندی کرنا بہت اچھی بات ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے، تم گیٹ پر جاؤ اور انہیں اپنے ساتھ اندر لے آؤ۔''

''انہیں ..... کیا مطلب؟'' میں نے الجھن زدہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''ہاں ..... ایک دوست ہے اس کے ساتھ۔'' ڈیلفی نے بتایا۔

میں ڈیلفی کے اصرار پر انہیں ریسیو کرنے گیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے گیٹ کھولا تو ایما اپیل بام کی گاڑی بنگلے کے اندر آ گئی۔ گاڑی پورچ میں رکی اور پھر اس گاڑی کے اندر سے دو خواتین برآمد ہوئیں۔

میں ڈیلفی کے ایما پر ایما کے استقبال کے لیے گیٹ پر آیا تھا۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ان دو خواتین میں سے ایما کون ہے لیکن ان دونوں پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا تھا کیونکہ ان دونوں میں سے ایک کا چہرہ مجھے شناسا محسوس ہوا تھا۔

میرے دماغ کے یادداشتی حصے نے میری راہ نمائی کی اور مجھے یاد آ گیا کہ شناسا چہرے والی وہ خوب رو لیڈی کون تھی۔ میں زندگی میں اس سے کبھی ملا نہیں تھا۔ بس اس کا تذکرہ سنا تھا اور اسے تصویروں میں دیکھا تھا۔

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بری عورت

مہتاب حسان

جس طرح اولاد کو والدین کی کمزوری کہا جاتا ہے اسی تصویر کا دوسرا رخ والدین کے لیے اولاد کا معصوم ذہن ایک ایسا ہتھیار ہے جسے یہ دونوں جس طرح چاہیں استعمال کرلیں۔ وہ بھی ایک ایسی بروکن فیملی کا حصہ تھا جس کے دل و دماغ میں صرف نفرتوں کا ایک الاؤ دھکا دیا گیا تھا جس میں ماضی، حال اور خود ان کا مستقبل جل کر خاک ہوگیا تھا... لیکن ایک فیصلہ کن لمحے نے اس کے تمام آبلوں پر جیسے آگہی کا مرہم دھر دیا۔

ٹوٹے ہوئے گھروں کے بکھرے ہوئے رشتوں کا المیہ

اس کا فون بند تھا۔ وہ کافی دیر سے کوشش کررہی تھی لیکن ہر بار اسے وہی ٹیپ کیا ہوا جواب سننے کو ملا۔ ''آپ کا ملایا ہوا نمبر اس وقت بند ہے، برائے مہربانی کچھ دیر بعد کوشش کیجیے۔'' اس نے فون ایک طرف ڈالا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ آنسو ایک تواتر کے ساتھ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

''نہ جانے وہ اس وقت کہاں ہوگا؟ کیا کررہا... ہوگا؟'' ایک ہوک سی اس کے دل میں اٹھی۔ کاش وہ اس

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وقت کہیں سے اس کے سامنے آجائے، وہ اس سے لپٹ جائے گی۔ اسے بھینچ لے گی' اسے بے تحاشا پیار کرے گی۔" اس نے سوچا۔

"کھانے دو آپا اسے زمانے کی ٹھوکریں' جب دنیا کا اصل چہرہ دیکھے گا تو عقل ٹھکانے آجائے گی۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔" ندیم نے اسے نصیحت کی تھی لیکن کسی نصیحت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

کتنے ہفتے گزر گئے تھے، اسے گھر چھوڑے ہوئے۔ وہ جو ایک لمحہ بھی اس کے بغیر گزارنا مشکل سمجھتی تھی اس سے اتنا عرصہ دور رہی تھی۔ اتنے بہت سارے دن اتنی لمبی راتیں اس نے شیری کو یاد کرتے، اسے پکارتے اور اس کے لیے روتے ہوئے گزاری تھیں اور اس کی اپنی ماں سے نفرت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ گھر ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

شہریار اس کا شیری..... جو اس کی کل کائنات تھا، اس کی زندگی کا محور تھا۔ اچھی سزا دی تھی اس نے جو حرا نے خوب کاٹی تھی کیونکہ وہ ایک بری عورت کے ساتھ رہنا نہیں چاہتا تھا۔

شیری کو اپنے پاپا کے وہ آخری بار کہے ہوئے الفاظ یاد تھے اور جن پر اس نے یقین کرلیا تھا کہ وہ ایک بری عورت ہے۔

"یہ انگوٹھی کہاں سے آئی؟ تو نے تحفے لینے بھی شروع کردیے ہیں؟" وہ کچن میں کھڑی رات کا کھانا بنا رہی تھی جب وہ اس کا پرس ہاتھ میں لیے کچن میں اس کے سامنے کھڑا چلّا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی آفس سے لوٹی تھی اور رستم کو لاؤنج میں بیٹھے اپنا پرس کھنگالتے دیکھ چکی تھی۔

"بتا سیدھی طرح یہ کہاں سے آئی ہے؟"

"یہ انیتا کی ہے۔" اس نے مختصراً کہا اور بدستور کام میں مصروف رہی۔ نہ جانے کس وقت شیری کچن میں داخل ہوا، حرا دیکھ نہیں سکی تھی۔

"جھوٹ بولتی ہے۔"

"میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" وہ بدستور اپنا کام کرتے ہوئے پلٹے بغیر بولی۔

"تو میں بکواس کر رہا ہوں بے شرم....." وہ آگ بگولا ہوتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کب یقین آئے گا۔ میں کچھ بھی کہہ لوں، تمہیں تو شک ہی کرنا ہے۔" وہ بے پروائی سے برتن دھونے لگی۔

اس بات نے اسے اور طیش دلا دیا۔ اس نے ایک موٹی سی گالی دی۔ "کس نے لے کر دی؟" اس نے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں اور اس کا پرس زور سے زمین پر پٹخا۔

شیری سہما ہوا سایہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت محض نو سال کا تھا۔

"شیری! تم اپنے کمرے میں جاؤ..... میں ابھی آتی ہوں۔" اس نے شیری سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اب یہ تماشا رات گئے تک جاری رہے گا۔

"رہنے دو اسے یہاں۔ اسے پتا ہونا چاہیے اس کی ماں کے کرتوت....."

"شیری! آؤ میرے ساتھ....." حرا نے شیری کا ہاتھ پکڑا تو اس کا دوسرا ہاتھ رستم نے پکڑ لیا۔ شیری کبھی ماں کی طرف تو کبھی باپ کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"پہلے میری بات کا جواب دے۔"

"بتایا تو ہے انیتا کی ہے۔ منہ دھوتے ہوئے اس نے پکڑائی تھی۔ میں اسے واپس دینا بھول گئی پھر میں نے پرس میں رکھ لی کہ صبح دے دوں گی۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"الو سمجھا ہے مجھے۔ اتنا بھولا بھالا ہوں کہ تیری جھوٹی سچی کہانی پر یقین کرلوں گا۔"

"تمہیں یقین نہیں تو انیتا کو فون کرکے پوچھ لو۔"

"وہ بھی تیری طرح چالو ہے۔ اسے تو پہلے ہی پکا کرکے آئی ہوگی۔ مجھے سب پتا ہے کہ آج کل کس سے تیرا معاشقہ چل رہا ہے۔" اس نے ایک جھٹکے سے شیری کو اس پر دھکیلا اور باہر نکل گیا۔

حرا نے شیری کی سمت دیکھا جو سسکیوں سے رو رہا تھا۔ اس نے اسے پچکارا سینے سے لگایا اور کمرے میں لے آئی۔

"تمہیں کھلانا اور ذمے داری اٹھانا تو دور کی بات ہے۔ میں کام بھی کروں اور اس کی باتیں بھی سنوں۔" حرا بڑبڑا رہی تھی پھر وہ باہر نکل گئی۔

رستم کو عادت تھی اس کا بیگ' اس کی الماری اور اس کی ڈریسنگ ٹیبل کی درازیں چیک کرنے کی۔ اس نے دیکھا رستم انگوٹھی ہاتھ میں لیے شیری کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ کمرے میں گیا اور دروازہ بند کرلیا۔

"یہ دیکھو شہریار۔" رستم نے شیری کو گود میں بٹھایا اور سونے کی وہ انگوٹھی اسے دکھانے لگا۔ "تمہاری ماں کو کسی نے تحفے میں دی ہے۔ میں تو اتنے مہنگے تحفے نہیں دے سکتا۔ یہ اس کے کسی دوست نے لے کے دی ہے۔ تمہاری

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ماں نہ میرا خیال رکھتی ہے نہ تمہارا۔ پوچھنے پر لڑنے لگتی ہے اسی لیے تو عورتوں کو آزادی نہیں دینی چاہیے مگر میں کیا کرتا ،میری اتنی آمدنی نہیں نا۔ اسی لیے تو یہ فائدہ اٹھاتی ہے۔ تمہاری ماں ایک بدکردار عورت ہے۔''

نو سالہ شہریار سر اٹھائے حیرت سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا اور کسی حد تک سمجھ بھی رہا تھا۔ وہ اتنا نا سمجھ تو نہیں تھا۔

''دروازہ کھولو رستم ..... خدا کے لیے بچے پر رحم کرو۔''

حرا دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے لگی۔ ''وہ نفسیاتی مریض بن جائے گا۔ اپنے بچے پر تو رحم کھاؤ۔''

''اسے تمہارے کرتوت بتا رہا ہوں۔'' رستم نے چلا کر کہا۔ وہ مسلسل دروازہ پیٹے جا رہی تھی جب تک کہ اس نے دروازہ کھول نہیں دیا۔

''کیوں..... تم نہیں چاہتیں کہ اسے سب حقیقت معلوم ہو؟''

حرا اس کی بات سنے بغیر شیری کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے آئی اور دروازہ لاک کر لیا۔ شیری اس دوران سہما ہوا خاموش ہی رہا تھا۔ ہر بار وہ ایسے ہی سہم جاتا تھا۔

''ابو مذاق کر رہے تھے تمہارے ساتھ۔ تم جانتے ہو نا کبھی کبھی انہیں بلاوجہ غصہ آجاتا ہے۔'' وہ شیری کا سر سہلانے لگی۔

شیری کے رویے میں تیزی سے تبدیلی آرہی تھی۔ دن بدن پڑھائی میں اس کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی تھی۔ آئے روز اسکول سے شکایتیں آنے لگی تھیں۔ وہ کلاس کے بچوں سے لڑنے جھگڑنے لگا تھا..... اور تو اور محلے والے بھی اس کی شرارتوں سے تنگ آگئے تھے اور محلے کے بچوں نے اسے اپنے ساتھ کھلانا بند کر دیا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر تل جاتا تھا۔ گویا دھیرے دھیرے وہ اذیت پسندی کی طرف جا رہا تھا وہ تھکی ہاری آفس سے آتی تو شکایتوں کا ایک دفتر اس کا منتظر ہوتا تھا۔

اس نے پیار محبت سے، ڈانٹ ڈپٹ کر سزا دے کر ہر طریقے سے شیری کو سمجھایا تھا مگر اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر گئی تھی لیکن وہ ٹھیک کیسے ہوتا ٹھیک ہونے کے لیے اس کے ماں باپ کا ٹھیک ہونا ضروری تھا اور ایسا ناممکن تھا۔

دس سال پہلے حرا بیاہ کر جب رستم کی زندگی میں آئی تھی تو اسے گمان تک نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اسے کتنی اذیت ناک زندگی گزارنا پڑے گی۔ ان دنوں اس نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کیا تھا جب رستم نے اس کے رشتے کی بات کی تھی۔ وہ ان کا دور پرے کا رشتے دار تھا۔ وہ حیدرآباد جیسے چھوٹے سے شہر میں رہتے تھے جبکہ رستم کی رہائش کراچی میں تھی جہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ بہن بھائی بھی نہیں تھے۔ اکیلا لڑکا سب کا ہی آئیڈیل ہوا کرتا ہے۔ اس رشتے پر حرا کے گھر میں بڑی خوشیاں منائی گئی تھیں۔

ان کا کنبہ تین بہنوں اور ایک بھائی پر مشتمل تھا۔ دونوں بہنیں اس سے بڑی تھیں اور بھائی چھوٹا تھا۔ وہ بہنوں میں سب سے خوش شکل تھی۔ اس کی دونوں بہنیں کنواری بیٹھی تھیں ایسے میں رستم جیسے چھڑے چھانٹ کو سب نے پسند کیا تھا۔ حرا کا باپ ایک مل میں چوکیدار تھا۔ یہ خوش حال تو نہیں مگر خوش و خرم گھرانا تھا۔ آپس میں پیار و محبت کے رشتے سے جڑے ہوئے لوگ تھے۔ تنگ دستی کے باوجود وہ بہت خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے تھے۔

وہ بیاہ کر کراچی جا رہی تھی، اس کی بہنیں اور سہیلیاں اسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ رستم ہٹا کٹا قبول صورت اور چرب زبان شخص تھا لوگوں کو شیشے میں اتارنا خوب جانتا تھا۔ کراچی میں وہ کسی اسٹیٹ ایجنسی میں کام کرتا تھا۔

وہ کراچی پہنچی اور رستم کے گھر کو دیکھا تو اس کے خواب بکھر کر رہ گئے۔ یہ پسماندہ علاقے کے قریب بنی بستی میں ایک کمرے کا ڈربا نما گھر تھا۔ عجیب بے سرو سامانی کا عالم تھا۔ مختصر سے کمرے کے ایک کونے میں جھلنگا سی چارپائی اور دوسرے کونے میں ایک ٹرنک رکھا تھا جس میں رستم کے کپڑے وغیرہ رکھے تھے۔ کمرے کے باہر دو تین فٹ کا برآمدہ اور برآمدے کے ایک کونے میں بنا ہوا چھوٹا سا باورچی خانہ اور باتھ روم تھا۔

دو دن بعد ہی وہ اسے سائٹ میں واقع ایک گارمنٹ فیکٹری میں لے گیا تھا۔ یہاں اسے بارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ اوور ٹائم کرنے پر اکساتا تھا۔ محنت کرنے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا مگر وہ دیکھتی تھی کہ رستم چند گھنٹوں کے لیے جاتا تھا پھر پورے دن گھر پر پڑا رہتا تھا اور وہ کولہو کے بیل کی طرح صبح سے رات گئے تک کام کرتی رہتی تھی۔

وہ اس کی ساری تنخواہ لے لیتا تھا اور چند گنی چنی چیزیں پکانے کے لیے لے آتا تھا۔ وہ کراچی میں اپنے گھر

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے زیادہ غربت اور محنت کا سامنا کررہی تھی۔ رستم کا کہنا تھا کہ اس نے شادی پر بہت قرض لے لیا تھا حالانکہ ان کی شادی بہت سادگی سے ہوئی تھی جس میں رستم کا کچھ خرچ نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر کی سیدھی سادی لڑکی تھی جبکہ رستم چلتا پرزہ ٹائپ کا گھاگ مرد تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک روز جب اس کی انچارج کو پتا چلا کہ وہ پڑھی لکھی ہے تو اس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ پرائیویٹ گریجویشن کرلے اور کمپیوٹر سیکھ لے تو اسے بہتر جاب اچھی تنخواہ کے ساتھ مل سکتی ہے۔ اسے اتنی سخت محنت سے بھی نجات مل جائے گی۔ حرا کو اپنی انچارج کا مشورہ پسند آیا تھا۔ جب گھر جا کر یہ بات اس نے رستم کو بتائی تو وہ بھی بڑا خوش ہوا کیونکہ بات اس کے فائدے کی تھی۔

ان دنوں وہ بڑی سخت محنت کررہی تھی۔ اس نے گریجویشن کی تیاری شروع کردی تھی اور ساتھ ہی ایک کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ بھی جوائن کرلیا تھا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور اس نے کامیابی حاصل کرلی انہی دنوں وہ ماں بھی بن گئی تھی۔ شیری اس کی زندگی میں ڈھیروں خوشیاں لے کر آیا تھا۔ یہ واحد موقع تھا کہ رستم اس کا خیال رکھ رہا تھا۔

حرا کو امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک بڑی فرم کے آئی ٹی ڈیپارٹمنٹ میں بڑی اچھی جاب مل گئی تھی۔ یہاں اس کی تنخواہ بھی دگنی تھی اور ماحول بھی اچھا تھا لیکن تنخواہ اب بھی ساری رستم کی جیب میں ہی جاتی تھی۔ یہاں اس کی جھجک کم ہوئی اور اس نے بولنا اور دوسروں کو سننا شروع کیا تو اسے بہت سی نئی باتوں کی سوجھ بوجھ آنے لگی جو نئی صرف اس کے لیے تھیں۔

آفس اسٹاف میں کئی لڑکیاں تھیں ان میں ایک انیتا بھی تھی جو ان کے باس بہرام ہمدانی کی سیکریٹری تھی۔ وہ بہت خوش اخلاق اور ہمدرد لڑکی تھی۔ حرا کی اس سے کچھ زیادہ ہی دوستی ہوگئی تھی۔ اب وہ اکثر اسے اپنے گھریلو حالات بھی بتادیا کرتی تھی۔

رستم کا مزاج تلخ سے تلخ ہوتا جارہا تھا۔ کبھی کبھار تو وہ اس پر ہاتھ بھی اٹھالیتا تھا۔ شکی مزاج تو وہ شروع سے تھا، وہ اکثر گھر سے بھی غائب رہتا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں پڑوس میں رہنے والی فہمیدہ خالہ اس کے بیٹے کا خیال رکھتی تھیں۔

اس بار دو ہفتے بعد جب وہ آیا تو اس سے کہنے لگا کہ یہاں کام نہیں چل رہا، وہ دبئی جارہا ہے۔ یوں رستم اسے اور شیری کو بے یارومددگار چھوڑ کر چلا گیا۔

ایک سال بعد جب وہ آنے والا تھا تو انیتا کے مشورے پر ہی اس نے گھر بدل لیا تھا۔ ناظم آباد کے علاقے میں دو کمروں اور ایک لاؤنج پر مشتمل یہ گھر بڑا صاف ستھرا تھا اور یہاں کا ماحول بھی اچھا تھا اور کرایہ بھی مناسب تھا۔ یہ گھر اس کی زندگی میں خوشگوار تبدیلی لایا تھا۔

حیرت انگیز طور پر رستم نے آنے کے بعد گھر بدلنے پر کوئی ہنگامہ نہیں کیا تھا۔ اس دن اس کا بھائی ندیم اس کے گھر آیا تھا۔ وہ ایک فرم کے سیلز ڈیپارٹمنٹ میں جاب کررہا تھا۔ وہ کھانا وغیرہ کھا کر لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ حرا نے محسوس کیا کہ بھائی اس سے کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''آپ بتا رہی تھیں کہ رستم بھائی دبئی گئے ہوئے تھے اور دو دن پہلے ہی واپس آئے ہیں؟''

''ہاں؟''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ دبئی گئے تھے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''وہ دبئی نہیں گئے تھے۔ وہ یہیں تھے اسی شہر میں۔'' اس کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں نظر آئیں۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ جھوٹ کیوں بولیں گے۔'' اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میری بھولی آپا..... ایک ہفتے پہلے میں نے انہیں گلشن میں ایک بنگلے سے نکلتے دیکھا تھا۔ انہیں وہاں دیکھ کر میں بھی حیران رہ گیا تھا۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ دبئی گئے ہوئے ہیں۔ بہرحال ان کے جانے کے بعد میں وہاں گیا تھا تاکہ معلوم تو کروں کہ وہ وہاں کیا کررہے ہیں۔''

''پھر؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ بولا۔ ''وہاں ایک خاتون سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ رستم کی بیوی ہیں۔ بعد میں، میں نے آس پاس رہنے والوں سے معلومات کی تو پتا چلا کہ وہ ایک کافی دولت مند بیوہ تھیں انہوں نے رستم سے دوسری شادی کی ہے۔ میں ان کا ایڈریس وغیرہ بھی لے آیا ہوں۔ چاہیں تو آپ بھی معلومات کرلیں۔'' وہ پرتاسف لہجے میں بتا رہا تھا جسے سن کر اس کی رنگت اڑ گئی اور وہ سن سی بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

''تم نے دوسری شادی کی ہوئی ہے؟'' اس دن جب رستم گھر آیا تو حرا نے اس کے بیٹھنے کا بھی انتظار نہیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کیا۔اس کی بات پر وہ کافی دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''مجبوری میں ایک بیوہ سے شادی کی ہے۔بے سہارا تھی، میں نے تو اس کی مدد کی ہے، سہارا دیا ہے۔''

''مدد کرنے کے لیے شادی کرنا ضروری نہیں ہوتا۔''

اس کی بات سن کر وہ غصے سے لال پیلا ہوگیا اور اسے باتیں سنا کر سونے چلا گیا۔حرا نے بالآخر صبر کرلیا پھر کچھ دنوں تک رستم باقاعدگی سے گھر آتا رہا۔گھر کا ماحول بھی ٹھیک ہی رہا۔ایسے دنوں میں شیری بہت خوش ہوتا تھا جب رستم زیادہ وقت گھر پر گزارتا تھا لیکن یہ ماحول تادیر برقرار نہیں رہتا تھا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا..... رستم گھر پر تھا۔وہ آفس سے واپس آئی تو گھر کے باہر رستم، شیری کے ساتھ کرکٹ کھیل رہا تھا۔شیری بہت خوش تھا اور رستم کی کسی بات پر کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔راستے میں ٹریفک جام کی وجہ سے اس کی وین لیٹ ہوگئی تھی۔

''آج تم پھر لیٹ آئی ہو؟'' اسے دیکھتے ہی رستم نے کہا۔

''ہاں، ٹریفک جام تھا۔''

''اچھا بہانہ ہے، روز ٹریفک جام ہوتا ہے۔''

''تم تو گھر سے نکلتے نہیں، باہر جاؤ تو پتا چلے۔'' وہ تھکی ہاری آئی تھی، جھنجلا کر بولی۔

شیری چند لمحے ان دونوں کو دیکھتا رہا پھر اپنا کرکٹ بیٹ زور سے زمین پر پٹخ کر اندر چلا گیا۔پھر وہ تمام وقت اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔حرا نے اسے زبردستی کھلانے کی کوشش کی تو اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔شیری بڑا ہو رہا تھا۔سب دیکھ رہا تھا، سمجھ رہا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ اس کا ردعمل بھی تلخ ہوتا جارہا تھا۔

''آج آپ جلدی جارہی ہیں حرا۔'' وہ اپنی ٹیبل سمیٹ کر بیگ اٹھا کر جانے ہی والی تھی کہ یاسر جو اس کا... کولیگ تھا اس کے پاس آکر بولا۔

''ہاں، شیری کو اسکول کے لیے کچھ چیزیں دلوانی ہیں اسی لیے جلدی جارہی ہوں۔''

''مہوش کی شادی پر اسٹاف نے پارٹی ارینج کی ہے۔اس لیے پیسے دے جائیں۔''

''اوہ ہاں..... یہ لیں، انیتا نے مجھے بتادیا تھا۔'' اس نے بیگ سے چند نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''پارٹی میں سب اپنی فیملی کو بھی لارہے ہیں۔مہوش بتارہی تھی کہ آپ اپنے ہزبینڈ کو ساتھ نہیں لارہیں..... کیوں؟''

''وہ شہر میں نہیں ہیں بھئی۔''

''وہ اکثر ہی شہر میں نہیں ہوتے..... کہیں باہر کوئی چکر نہ چلالیا ہو انہوں نے۔'' وہ مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔

''یاسر صاحب! آپ مذاق اپنی حد میں رہ کر کیا کریں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اور بیگ اٹھا کر چلی گئی۔

بہرام ہمدانی جو اتفاقاً ادھر سے گزر رہے تھے، یہ باتیں سن کر چند لمحے ٹھٹک کر رک گئے تھے۔انہیں حرا کا خوبصورت سادہ اور باوقار انداز بہت پسند تھا۔نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر انہیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ گھریلو طور پر خوش اور مطمئن نہیں ہے۔بعد میں انیتا سے اس کے بارے میں انہوں نے استفسار کیا تو انیتا نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کے بارے میں مختصراً بہرام صاحب کو بتادیا تھا۔

اس کے بعد بہرام صاحب حرا کا بڑا خیال رکھنے لگے تھے۔پروموشن کے ساتھ حرا کی تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوگیا تھا۔یہ خوشگوار تبدیلی حرا کے لیے بڑی خوش آئند تھی۔

بہرام ہمدانی چالیس پینتالیس سال کے ایک صحت مند..... اور ہینڈسم آدمی تھے۔دو سال پہلے ان کی بیوی کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہوکر چل بسی تھی۔ان کی ایک ہی بیٹی تھی جس کی شادی امریکا میں مقیم ایک نوجوان سے ہوگئی تھی۔یوں وہ ملازمین کے سہارے تنہا زندگی بسر کررہے تھے۔ان کے بے تکلف دوست اور امریکا میں مقیم بیٹی بھی انہیں دوسری شادی کا مشورہ دیتے رہتے تھے جسے اب تک وہ ٹالتے رہے تھے۔

پروموشن کے ساتھ حرا کی ذمے داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔اسے پہلے سے زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔انیتا نے اسے خاص طور پر تنبیہہ کی تھی کہ تنخواہ میں اضافے کا رستم کو نہ بتائے۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔شیری کھیلنے کے لیے باہر گیا ہوا تھا۔رستم رات سے گھر نہیں آیا تھا۔وہ گھر کی صفائی میں مصروف تھی جب باہر ایک ہنگامہ برپا ہوا۔اسی وقت ایک لڑکا گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہنے لگا۔

''آنٹی! جلدی چلیں شیری کا کسی لڑکے سے جھگڑا ہوگیا ہے، شیری نے اسے لہولہان کردیا ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ ننگے پاؤں باہر بھاگی۔کیا دیکھتی ہے کہ شیری اس لڑکے کے سینے پر چڑھا بیٹھا تھا اور پے در پے اس کے منہ پر مکے برسا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رہا تھا۔ ساتھ ہی مغلظات بک رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، تیزی سے شیری کو پکڑ کر پیچھے گھسیٹا اور بڑی مشکل سے اس لڑکے کو چھڑایا۔ اتنی دیر میں لڑکے کے ماں باپ بھی آگئے تھے۔

''جنگلی جانور...... اسے پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے۔'' لڑکے کا باپ دھمکانے لگا۔ اپنے بیٹے کا یہ حلیہ دیکھ کر اس کی ماں بھی آپے سے باہر ہونے لگی۔ حرا کی معافی تلافی اور منت سماجت سے وہ کچھ ٹھنڈے ہوئے تھے ورنہ شیری کی خیر نہیں تھی۔ حرا اسے گھسیٹتی ہوئی گھر لے آئی تھی۔

''پہلے ہی میری زندگی میں عذاب کم ہیں جو تم ان میں اور اضافہ کر رہے ہو۔'' اس نے انتہائی غصے سے شیری کو گھورا۔

''میں عذاب ہوں آپ کے لیے......'' اس نے راستے میں پڑی بالٹی کو ایک زوردار ٹھوکر ماری اور چلا گیا۔ بالٹی کا پانی پورے صحن میں پھیل گیا تھا۔

''شیری! آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟'' وہ اس کے پیچھے لپکی۔

''بات نہ کریں مجھ سے۔'' وہ دہاڑا تھا۔ اس وقت وہ رستم کا دوسرا روپ لگ رہا تھا۔ گھر میں ہونے والے جھگڑوں کا اثر باہر بھی پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ روز روز کے ان ہنگاموں سے محلے والے بھی عاجز آگئے تھے۔ خاص طور پر محلے میں شیری کے جھگڑے کے نتیجے میں اس لڑکے کی ماں نے جسے شیری نے مارا تھا، حرا کے گھرانے کو پورے محلے میں بدنام کر دیا تھا۔ محلے والوں نے انہیں اپنی تقریبات میں بلانا ترک کر دیا تھا۔ یہ ایک طرح سے ان کا سوشل بائیکاٹ تھا۔

☆☆☆

''تم مانو یا نہ مانو، شیری کی اس ذہنی حالت کی وجہ رستم ہے۔ وہ اس کے زیر سایہ مزید رہا تو اور بگڑ جائے گا۔ میری مانو تو رستم سے جان چھڑاؤ۔'' اس نے انیتا کو اس تازہ واقعے کے بارے میں بتایا تو اس نے مشورہ دیا تھا۔

''نہیں، میں اپنا گھر نہیں توڑ سکتی۔ تم جانتی ہو بروکن فیملیز کے بچے کیسے ہوتے ہیں۔''

''معاف کرنا، بروکن فیملیز کے بچے جیسے بھی ہوں آپس میں لڑنے جھگڑنے والی فیملیز کے بچے ان سے بھی بدتر ہوتے ہیں۔ بچے ان برائیوں کا بڑا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ شیری ابھی چھوٹا ہے۔ وہ بڑا ہوگا تو جان جائے گا کہ تمہارے لیے طلاق کتنی ضروری تھی۔''

''شیری رستم کو بہت چاہتا ہے۔ میں اس سے اس کا باپ نہیں چھین سکتی اور مجھ سے رستم کا رویّہ کیسا بھی سہی، شیری سے وہ بہت پیار کرتا ہے۔''

''ان دونوں کا پیار تمہیں لے ڈوبے گا۔ شیری کو تمہاری محنت مشقت یاد نہیں رہے گی۔ ہاں، ہفتوں مہینوں بعد ملنے والا باپ کا پیار یاد رہے گا۔''

شیری نے اس کے اور رستم کے درمیان ہونے والی تکراروں اور لڑائیوں کا گہرا اثر لیا تھا۔ وہ رستم کی طرح ہی بدتمیز اور اکھڑ ہوتا جا رہا تھا۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا۔ اس نے اب اور بھی زیادہ کوششیں شروع کر دی تھیں کہ رستم سے اس کی تکرار نہ ہو لیکن وہ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ نہ جانے وہ شیری کے ذہن میں کیسے کیسے زہر گھول رہا تھا۔ کچھ دن پہلے ہی اس نے رستم کو کہتے سنا تھا۔ ''اپنی ماں پر نظر رکھا کرو، میری غیر موجودگی میں کہاں... کہاں جاتی ہے۔''

اس دن موسم صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ وہ آفس میں تھی جب بارش شروع ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہی بارش نے اور شدت اختیار کر لی تھی۔ تمام اسٹاف جا چکا تھا۔ وہ اور انیتا اپنی وین کے انتظار میں بیٹھی تھیں کہ اچانک وین ڈرائیور کا فون آگیا کہ وین راستے میں خراب ہو گئی ہے، وہ لوگ انتظار نہ کریں۔ ابھی وہ بارش رکنے کا انتظار کر ہی رہی تھیں کہ بہرام صاحب اپنے روم سے باہر آئے۔

''ارے آپ لوگ ابھی تک بیٹھی ہیں؟''

''جی سر! ہماری وین خراب ہو گئی ہے۔ ہم بارش رکنے کا انتظار کر رہے ہیں۔'' انیتا جلدی سے بولی۔

''آپ لوگ میرے ساتھ چلیں، میں آپ کو ڈراپ کرتا ہوا گھر چلا جاؤں گا۔'' وہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

حالات ایسے تھے کہ وہ انکار نہ کر سکی لیکن وہ گھبرا رہی تھی۔ انیتا کا گھر پہلے پڑتا تھا اس لیے وہ پہلے اتر گئی۔ رستم آج گھر پر تھا۔ اگر اس نے بہرام صاحب کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر وہ خوف زدہ تھی۔

بہرام صاحب اس کا خوف بھانپ گئے تھے۔

''آپ اطمینان سے بیٹھیں، میں بہ حفاظت آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں گا۔''

وہ گھر کے نزدیک گاڑی سے اتری تو مروتاً بھی بہرام صاحب سے چائے کے لیے نہیں پوچھ سکی۔ اسے ڈر تھا کہ رستم نے دیکھ لیا تو ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ قسمت کی ستم ظریفی کہ عین اسی وقت رستم شیری کے ساتھ سامنے گلی سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

آتا نظر آیا۔ اس نے حرا کو گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ اس کی سرخ آنکھیں غصے سے ابلی پڑ رہی تھیں۔

''مجھے پہلے ہی شک تھا۔ ایسے ہی تو ہن نہیں برس رہا تجھ پر۔ عیش کر رہی ہے عیش۔'' اس نے حرا کو دھکا دیا تو وہ زمین پر گر پڑی۔

شیری سہما ہوا دیوار کے ساتھ ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔

''دیکھ لیے ناشیری اپنی ماں کے کرتوت۔ آج اپنے عاشق کو گھر تک لے آئی۔ اسی لیے تو یہ میرا گھر میں رہنا۔ دوبھر کیے رہتی ہے۔ میرے پیچھے نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی ہوگی۔''

اس نے اپنا بھاری جوتا حرا کے منہ پر رکھ دیا تھا۔ حرا کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ غصے اور توہین کے احساس سے حرا کا چہرہ سرخ ہوگیا اور ایک انجانی سی طاقت اس کے رگ و پے میں بھر گئی۔ اس نے جھٹکے سے خود کو آزاد کرایا اور ہر وہ چیز رستم پر پھینکنی شروع کر دی جو اس کے ہاتھ آئی۔

''مجھے اب ہاتھ لگا کر دکھا رستم۔'' اس نے قریب پڑا کرکٹ کا بیٹ اٹھا لیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا تو بیٹ اس نے رستم کے سر پر دے مارا۔ وہ غصے میں اندھی ہوگئی تھی۔

رستم کے ماتھے سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ ''بھاگ جا شیری...... یہ عورت پاگل ہوگئی ہے۔ یہ بری عورت تجھے بھی مار ڈالے گی۔ تیرے ساتھ بھی یہی کرے گی۔''

شیری ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ حرا نے اسے اندر کمرے میں لے جانے کی کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ یہ آخری منظر تھا جو شیری نے دیکھا تھا اور یہ آخری مار تھی جو حرا نے کھائی تھی۔ اس نے پہلی بار اپنے ابو کو فون کر کے سارے حالات بتائے تھے۔ پھر اپنے گھر والوں کی مدد سے اس نے رستم سے خلع حاصل کر لیا تھا۔ سب کو بتایا تھا کہ اس نے خلع کا فیصلہ کیوں کیا۔ ایک شیری ہی تھا جس کے خیال میں باپ اپنی جگہ صحیح تھا اور ماں ایک بری عورت تھی۔ جس نے اپنے عاشق کی خاطر اس کے باپ کا سر پھاڑ دیا تھا۔

یہ ہمارے معاشرے کا بدترین پہلو ہے کہ طلاق کی صورت میں موردِ الزام عورت کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ حرا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ رشتے دار، عزیز و اقارب، پڑوسی سب اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

باہر وہ اسِ صورتِ حال کا سامنا کر رہی تھی تو گھر میں حالات اس سے بھی بدتر تھے۔ شیری بے حد چڑچڑا اور بدمزاج ہوگیا تھا۔ اس نے حرا سے بات کرنا ترک کر دی تھی۔ اگر بات کرتا بھی تھا تو انتہائی بدتمیزی سے۔ اس نے زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنے خرچ کے لیے پیسے لینا بھی چھوڑ دیے تھے۔

اس دن وہ اس کا اسکول بیگ لیے بیٹھی تھی اور اس کی کاپیاں چیک کر رہی تھی۔ بیگ میں رکھا موبائل فون دیکھ کر وہ چونک اٹھی۔ اسی وقت شیری کمرے میں داخل ہوا۔

''مت ہاتھ لگایا کریں میری چیزوں کو۔'' اس نے تیزی سے بیگ اس کے ہاتھوں سے جھپٹ لیا۔

''یہ فون کہاں سے آیا تمہارے پاس؟'' وہ غصے کو پیتے ہوئے بولی۔

کراچی
ماہنامہ پاکیزہ
میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی...." پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔
تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروا لیں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''پاپا نے دلایا ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور جانے کے لیے پلٹا۔

''تم اپنے پاپا سے ملتے ہو..... لیکن مجھے کبھی بتایا نہیں۔''

''ہاں، ملتا ہوں کبھی کبھار۔'' اس نے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

''یہاں آؤ بیٹھو، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' وہ خاموشی سے بیٹھ گیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تم مجھے قصوروار سمجھتے ہو نا؟ اس دن میں اسے نہ مارتی تو وہ مجھے مار دیتا۔''

''بری عورت کو مار ہی دینا چاہیے۔'' شیری نے اتنی سفاکی سے کہا کہ وہ دل تھام کر رہ گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور چلا گیا۔ یہ وہ کیا کہہ گیا تھا؟ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

انہی دنوں ندیم کا ٹرانسفر کراچی ہوگیا تھا اور اب وہ حرا کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ حرا نے بھی سکون کی سانس لی تھی۔ ورنہ شیری حرا کے ہاتھوں سے نکلا جارہا تھا۔ شیری بھی اب کچھ محتاط ہوگیا تھا کیونکہ ندیم کے سامنے وہ حرا سے بدتمیزی سے اجتناب کرتا تھا۔

آفس میں اس نے محسوس کیا تھا کہ انیتا اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہتے ہوئے ہچکچا رہی ہے۔ آخر اس دن وہ دل کی بات زبان پر لے ہی آئی۔

''حرام نے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچا ہے؟''

''کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں؟''

''مطلب یہ کہ تم اتنی لمبی زندگی اکیلے کیسے گزارو گی؟''

''ماشاءاللہ میرا بیٹا ہے، اسی کے سہارے گزار لوں گی۔''

''دراصل بہرام صاحب تمہیں پرپوز کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم سے بات کروں۔''

''ہرگز نہیں..... میں دوسری شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔''

''تم پھر غلطی کررہی ہو..... بہرام صاحب بہت نائس انسان ہیں۔ سوچو اگر شیری رستم کے پاس چلا گیا تو تم کیا کرو گی۔''

''ایسی بدفالیں تو منہ سے نہ نکالو۔ میرا بیٹا مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گا۔'' اس نے یقین سے کہا۔ ''اور بہرام صاحب سے شادی کا مطلب یہ ہوگا کہ رستم کا شک صحیح تھا۔''

''میں شیری سے خود بات کرلوں گی..... اسے سمجھاؤں گی۔''

''نہیں، ہرگز نہیں۔ تم اس سے کوئی بات نہیں کرو گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''تم اتنے اچھے انسان کو ٹھکرا کر اچھا نہیں کررہیں۔ اپنے بارے میں سوچو، اپنی خوشیوں کے بارے میں۔''

''نہیں انیتا! میں اپنی قربانیوں کو رائگاں نہیں کرنا چاہتی۔ اب مجھے یہاں سے جاب بھی چھوڑنا پڑے گی۔'' انیتا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیوں، جاب کیوں چھوڑو گی؟''

''ظاہر ہے بہرام صاحب کے اس پرپوزل کے بعد میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔''

دوسرے دن اس نے اپنا استعفا بہرام صاحب کو بھجوادیا تھا۔ سہ پہر تین بجے بہرام صاحب نے اسے اپنے آفس میں طلب کیا۔

''بیٹھیں۔'' انہوں نے سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کے سامنے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''اگر آپ جاب اس لیے چھوڑنا چاہتی ہیں کہ میں نے آپ کو پرپوز کیا ہے تو پلیز جاب نہ چھوڑیں۔ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اس شادی سے انکار کردیں۔ میں بڑے خلوص کے ساتھ آپ کو اپنانا چاہتا تھا۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ ''لیکن خیر یہ بات یہیں ختم ہوگئی ہے۔ آپ جاب جاری رکھیں، اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔'' وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہے تھے اور وہ سر جھکائے سن رہی تھی۔

''آپ شادی کررہی ہیں؟'' ایک دو دن بعد شیری نے اس سے پوچھا تھا۔

''تمہیں کس نے کہا؟'' وہ چونک کر بولی۔

''انیتا آنٹی نے مجھے سب بتادیا ہے۔''

''نہیں، میں شادی نہیں کررہی۔ وہ بات ختم ہوچکی ہے۔ انیتا نے تمہیں میرے انکار کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''وہ آپ کا باس ہے نا۔ وہی شخص جو اس دن گاڑی میں آپ کو چھوڑنے آیا تھا۔'' شیری نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ''اسی کی وجہ سے آپ نے پاپا کو چھوڑا۔ پاپا اسی سے ملنے سے منع کرتے تھے نا۔'' وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''اس نے مجھے جاب کرنے سے تو کبھی منع نہیں کیا۔''

''آپ اپنی خوشی کے لیے جاب کرتی ہیں کیونکہ گھر میں آپ کا دل نہیں لگتا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''جس عورت نے تمہیں رزق حلال کھلایا...اپنی زندگی تج دی، وہ گناہ گار عورت ہے؟''

''مجھ سے اپنی ذاتیات کی تفصیل نہیں پوچھیے، میں ان پر بات کرنا نہیں چاہتا۔ سب جانتا ہوں، بچہ نہیں ہوں میں۔ اب آپ کو روکنے والا کون ہے جو تھا اسے آپ نے اپنی زندگی سے نکال دیا۔'' وہ اس کے سامنے تن کر کھڑا کہہ رہا تھا۔ ان چند سالوں میں اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔

''لوگ ٹھیک کہتے ہیں، رستم نے تمہارے اندر زہر بھر دیا ہے۔''

''لوگ آپ کو بھی تو ٹھیک نہیں کہتے۔'' وہ طنز سے بولا۔

طنز کے تیر برساتا اور طنزیہ نظروں سے دیکھتا وہ اس وقت بالکل رستم لگ رہا تھا۔

''آپ ایک بری عورت ہیں۔'' وہ انتہائی حقارت اور نفرت سے بولا۔

حرا کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

''میں نہیں رہوں گا، یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' وہ گال پر ہاتھ رکھے دھمکی آمیز لہجے میں کہتا ہوا چلا گیا۔

پہلے تو ضرورتاً وہ اس سے بات کر لیتا تھا مگر اس واقعے کے بعد اس نے بات کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ وہ گھر میں بہت کم ٹکتا تھا، کھانا بھی باہر ہی کھاتا تھا۔ حرا اس کے لیے رات گئے تک جاگتی رہتی تھی۔

''کہاں تھے تم..... ٹائم دیکھا ہے کیا ہوا ہے؟'' حرا نے اس کے آتے ہی سوال کیا۔

وہ اسے جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ حرا نے پیچھے سے اس کا کندھا پکڑ لیا۔

''میری بات کا جواب دو..... کہاں تھے تم؟'' شیری نے اسے دھکا دیا تو وہ گرتے گرتے بچی۔ ندیم جو کھڑکی سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا تیزی سے باہر آیا اور شیری سے بولا۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے شیری..... بہت دنوں سے تمہارے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہوں۔ تم آپا سے بدتمیزی کر رہے ہو۔''

''آپ کم تھیں جو اپنے حمایتیوں کو بھی بلا لیا۔''

''منہ سنبھال کر بات کرو۔'' ندیم کو غصہ آ گیا۔

''آپ کو کوئی حق نہیں مجھے روکنے ٹوکنے کا۔ یہ میری زندگی ہے جیسے چاہوں گزاروں۔''

''میں تمہارا ماموں ہوں، تمہیں روک بھی سکتا ہوں ٹوک بھی سکتا ہوں اور تمہارا دماغ بھی درست کر سکتا ہوں۔'' ندیم نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔ وہ جو ہکا بکا یہ سب دیکھ رہی تھی تیزی سے آگے بڑھی اور انہیں چھڑانے لگی۔ ندیم نے اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھا۔

''خدا کا واسطہ ندیم رہنے دو۔''

''آپ کی دی ہوئی ڈھیل نے ہی اسے یہاں تک پہنچایا ہے۔ اسے کسی رشتے کی پہچان ہی نہیں۔''

''آپ اپنی بہن کی فکر کریں، میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں۔''

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑایا اور پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔

''آپا! اگر اس پر سختی نہ کی گئی تو یہ بگڑ جائے گا۔ کہیں..... غلط ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔'' ندیم تشویش سے بولا۔

صبح وہ سو کر اٹھے تو شیری کہیں نہیں تھا۔ رات کے کسی پہر وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ایک مختصر سا خط اس کے تکیے کے نیچے سے ملا جس میں لکھا تھا۔ ''میں گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔''

''جانے دو آپا اسے..... زمانے کی ٹھوکریں کھائے گا تو عقل ٹھکانے آ جائے گی۔'' وہ خط پڑھ کر دل تھام کر رہ گئی تھی۔

اس کی جسمانی اور ذہنی حالت بڑی ابتر تھی۔ اس کے ماں باپ بھی اس کے پاس آ گئے تھے۔ وہ ہر وقت تڑپتی رہتی، ہر ایک کے سامنے روتی رہتی تھی۔ آفس جانا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔

''ایک بار شیری کو لے آؤ، اس سے کہو مجھ سے نفرت ہی کر لے بس میرے سامنے رہے۔ میں اس کے بغیر مر جاؤں گی۔''

''اپنے آپ کو سنبھالو بیٹی..... وہ رستم کے پاس ہی گیا ہوگا۔ چند دن صبر کرو، ذرا رستم کی حقیقت اس پر ظاہر ہونے دو پھر ہم اسے جا کر لے آئیں گے۔'' اس کے ابو نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دلاسا دیا تھا۔ وہ بار بار شیری کا نمبر ڈائل کرتی جو مسلسل آف تھا۔

پے در پے پیش آنے والے واقعات نے شیری کو بہت دل برداشتہ کر دیا تھا۔ اس نے رات ہی گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ کافی دن سے اس کا رستم سے رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ اس کا فون آف تھا۔ وہ گھر سے نکل تو آیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ وہ کافی دیر تک ایک پارک میں بیٹھا رہا۔ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے اچانک اس کے سر سے سائبان چھن گیا ہو اور وہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تیز پیتی دھوپ میں کھڑا ہو۔ کچھ بھی ہو، واپس اس عورت کے پاس پلٹ کر نہیں جائے گا' وہ سوچتا رہا۔ وہ اپنے فون کی سم چینج کر چکا تھا۔ اس نے دوبارہ رستم کا نمبر ملایا جو ہنوز بند تھا۔ پھر اچانک اسے اپنے جگری دوست بچل کا خیال آیا۔ اس نے فون پر مختصراً بچل کو اپنی روداد سنائی تو وہ فوراً ہی اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا اور اپنا ایڈریس وغیرہ اسے سمجھا دیا اور ہدایت کی کہ وہ بلا جھجک اس کے پاس چلا آئے۔

بچل کا تعلق لاڑکانہ کے قریب کسی گاؤں سے تھا۔ وہ کراچی میں اپنے کزن کے ساتھ لیاری کی ایک تنگ و تاریک گلی میں رہتا تھا۔ یہ کچا پکا ایک کمرے کا چھوٹا سا گھر تھا۔ اس کا کزن بھاری تن و توش کا تیس پینتیس سالہ ایک گرانڈیل شخص تھا۔ وہ شیری کو دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا تھا۔ کمرے میں ایک جانب زمین پر میلے کچیلے بستر اور ان سے کہیں زیادہ میلے تکیے پڑے تھے۔

''آ بیٹھ یار..... ہمارا غریب خانہ۔'' بچل نے اسے بستر پر جگہ دی۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر اسی بستر پر بیٹھ کر انہوں نے رات کا کھانا کھایا جو بچل کا کزن باہر سے لایا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا بدترین دن تھا۔ وہ بری طرح تھک گیا تھا۔ نہ جانے کس وقت اسے نیند آگئی۔ وہ دیوار کی طرف کروٹ لیے بے خبر سو رہا تھا۔ بچل اس کے برابر میں اور اس کا کزن بھی وہیں لیٹ گئے تھے۔ اسے سوئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی کہ اچانک ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے نیند میں حرا کی آواز سنائی دی تھی جو اسے پکار رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت حرا نے بھی شیری سے متعلق کوئی پریشان کن خواب دیکھا تھا اور وہ بھی چونک کر اٹھ گئی تھی۔ وہ شیری کے لیے اللہ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگنے لگی۔ نہ جانے قدرت نے ماں اور اولاد میں ایسا کونسا کنکشن رکھا ہے جو دنیاوی آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ بہرحال وہ دوبارہ سونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں بچل کے کزن کی آواز آئی جو بہت دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ذرا دیکھ یہ سویا ہوا ہے نا۔'' بچل نے اٹھ کر اسے دیکھا تو شیری نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔

''بے خبر سو رہا ہے۔''

''سن..... اسے صبح کسی بہانے گاؤں لے جائیں گے اور سائیں کے حوالے کردیں گے۔ تجھے پتا ہے نا سائیں کو ایسے لڑکوں کی ضرورت رہتی ہے۔ وہ اس کے بڑے اچھے دام دے گا۔ کسی کو پتا تو نہیں نا کہ یہ یہاں آیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کسی کو نہیں پتا۔ یہ گھر سے ناراض ہوکر نکلا ہے۔ کوئی اس کے آگے پیچھے نہیں، ایک ماں ہے بے چاری بس۔''

''پھر تو چاندی ہوگئی اپنی۔ بیٹھے بٹھائے شکار خود شکاری کے پاس آگیا۔ دھیان رکھنا اس کا۔ اسے شک نہ ہو۔ صبح بہلا پھسلا کر اسے گاؤں لے جائیں گے۔''

یہ سنتے ہی شیری کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور ایک سنسنی سی اس کے تن بدن میں دوڑ گئی۔ یہ گھر سے نکلتے ہی اسے پہلا دھچکا ملا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اسے اپنے جگری یار سے یہ توقع نہیں تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ابھی بہت سے پردے اٹھنے باقی ہیں۔

وہ ان دونوں کے سونے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب وہ سوگئے اور بچل کے کزن کے خراٹے کمرے میں گونجنے لگے تو وہ تاریکی میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر سے باہر نکل کر وہ بگٹٹ ایک سمت بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ بھاگا چلا جارہا تھا بے سمت۔ نہ منزل کا نشان تھا نہ اسے راستوں کی خبر تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا تھا۔ وہ وہیں سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگی تھی۔ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور رستم کا نمبر ڈائل کیا۔ فون بند تھا۔

اس کے پاس امید کی بس اب ایک ہی کرن باقی تھی۔ اسی کی دوسری ماں کا ایڈریس جو اس نے حرا کی ڈائری سے حاصل کیا تھا۔

اسے گلشن اقبال کا یہ ایڈریس ڈھونڈنے میں کچھ وقت لگا تھا مگر وہ اسے مل ہی گیا۔ یہ ایک بہت بڑا اور شاندار بنگلا تھا۔ اس کے پاپا کا گھر جس کے لیے وہ روتا رہا تھا جس سے بات کرنے، جسے دیکھنے کے لیے وہ تڑپ رہا تھا۔

گھبرائے ہوئے انداز میں اس نے گیٹ پر موجود بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک خوبصورت عورت دروازے پر آئی اور مسکرا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں شہریار ہوں۔'' شیری گھبرایا۔ ''پاپا ہیں؟'' اسے یقین تھا کہ پاپا کی بیوی اسے ضرور جانتی ہوں گی۔

''کون پاپا؟'' وہ مسکرائی۔

''رستم زمان خان۔'' شیری بھی مسکرایا۔ عورت کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔

''وہ یہاں کیوں ہوگا؟'' اس بار وہ مسکرائی نہیں مگر جواب اس نے تحمل سے دیا تھا۔

''آپ ان کی بیوی ہیں؟'' شیری تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''تھی..... کچھ عرصہ پہلے ہماری طلاق ہوگئی تھی۔''

شیری کی سمجھ میں نہیں آیا کہ طلاق پر افسوس کرے یا کچھ اور کہے۔ ''اندر آجاؤ.....'' وہ اسے لے کر اندر آگئی۔ وہاں سے گزرتے ہوئے لاؤنج میں اس نے دو بچوں کو بیٹھے دیکھا۔ لڑکا اس سے بڑا تھا جبکہ لڑکی کم سن تھی۔

''تم حرا کے بیٹے ہو؟''

''جی.....''

''تمہارے ماموں ایک بار یہاں آئے تھے۔ ان ہی کی زبانی مجھے حرا کے بارے میں پتا چلا تھا ورنہ تو رستم نے خود کو غیر شادی شدہ ظاہر کیا تھا۔'' وہ تحمل سے بولی۔

''وہ اب کہاں ہیں؟ مطلب ان کا گھر کہاں ہے؟''

وہ گڑبڑا گیا۔

''گھر.....'' وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''وہ سرکاری گھر میں ہیں یعنی جیل میں۔''

یہ سن کر شیری کا سر گھوم گیا اور آنکھیں نم ہوگئیں۔ شیری کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کے جذبات کو بری طرح ٹھیس پہنچی ہے۔

''میری ملاقات رستم سے ایک اسٹیٹ ایجنسی میں ہوئی تھی جہاں میں اپنی جائداد کے کسی مسئلے کی وجہ سے گئی تھی۔ نہ جانے میں کیسے اس چرب زبان شخص کے جال میں آگئی تھی۔ میں اس وقت بیوہ تھی میرے شوہر کا چلتا ہوا کاروبار تھا، جائداد تھی۔ پہلے شوہر سے میرا ایک بیٹا ہے۔ مجھے سہارے کے لیے کسی پُرخلوص انسان کی ضرورت تھی۔ اس نے خود کو غیر شادی شدہ بتایا تھا۔ وہ کافی عرصے سے میرے کاروبار میں ہیرا پھیری کر رہا تھا جب میں نے پوچھا تو اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھالیا پھر تمہارے ماموں سے ملاقات ہوئی تو مجھے شک گزرا میں نے اس کے بارے میں معلومات کروائیں تو اس کی اصلیت کا پتا چلا۔ میں نے اس جیسا بے حس، بے غیرت اور فراڈ شخص نہیں دیکھا۔ اس کی اصلیت سامنے آنے پر میں نے ہی اسے جیل کی ہوا کھلوائی ہے۔ میرے پیسے پر عیش کر کے مجھے ہی آنکھیں دکھاتا تھا۔''

شیری کو حرا یاد آئی۔ اس نے نم آنکھوں سے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا۔ وہ اب بھی خوبصورت تھی۔ وہ پُرسکون تھی اور ایک اس کی ماں تھی، مرجھائی ہوئی حالانکہ وہ اس سے کم عمر تھی۔

''یاد رکھو شہریار..... جس دن تمہاری اصلی رستم سے ملاقات ہوگی تم پھوٹ پھوٹ کر روؤ گے۔'' اس کے ماموں نے جب یہ سب کہا تھا تو اسے یقین نہیں آیا تھا۔ آج آگہی اس پر عذاب بن کر ٹوٹی تھی۔

میز پر رکھی چائے کب کی ٹھنڈی ہوگئی تھی۔

''اگر تم چاہو تو جیل میں مل آؤ رستم سے۔'' شیری نے ایک زخمی نظر اس پر ڈالی تو وہ خاموش ہوگئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ اس کی ماں بے گناہ تھی۔ بے قصور تھی۔ پچھتاووں نے اسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ وہ اس کے قریب آئی اور اسے تسلی دینے لگی۔ ''تم کچھ دن میرے پاس رہو، اپنی بہن سے ملو۔''

وہ بہت شرمندہ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی ماں کا سامنا کیسے کرے گا۔

حرا کے فون پر بیل جارہی تھی۔ ''امی.....'' کال ریسیو ہوتے ہی وہ بولا تھا۔

''اب کیوں فون کیا ہے تم نے۔ حرا کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا ہے۔ ہم اسے لے کر اسپتال آئے ہوئے ہیں۔'' اس کے ماموں کی کرخت آواز آئی تھی۔

حرا بے ہوش تھی۔ ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر رہا تھا۔ حرا کے تمام گھر والے اس کے سرہانے موجود تھے۔ انیتا اور اس کا شوہر بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ سب اس کی ماں کے لیے پریشان اور فکرمند تھے۔ اتنے سارے لوگ اس کی ماں سے پیار کرتے تھے۔ ایک وہ تھا جس نے اسے اتنے دکھ پہنچائے تھے۔ وہ زمین میں گڑا جارہا تھا۔

دو دن بعد حرا کو ہوش آیا تھا۔ شیری اسے اپنا ہاتھ چومتا نظر آیا۔ وہ بار بار اس کا ہاتھ اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے لگا رہا تھا۔

''امی، میری پیاری امی.....'' آنسوؤں سے اس کا چہرہ تر تھا۔ وہ بہت محبت سے اسے پکار رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ شیری سے لپٹ جائے گی مگر وہ اس سے لپٹ رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ اس کا ماتھا چومے گی مگر شیری اس کا ماتھا چوم رہا تھا۔ ''بیٹا مجھے معاف کردو..... میں واقعی بری عورت ہوں۔ اتنی بری کہ اپنے بیٹے کو بھی اپنے وجود کا احساس نہ دلا سکی۔''

''نہیں، نہیں..... آپ بری عورت نہیں ہیں..... برا میرا باپ ہے۔ آپ جیسی ماں تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔''

''انیتا آنٹی.....'' اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی انیتا کو مخاطب کیا۔ ''مجھے رستم نہیں بہرام صاحب جیسے پاپا چاہئیں۔''

انیتا اور حرا کی بیک وقت نظریں ملیں۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرانی کے ساتھ ساتھ خوشی جھلک رہی تھی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی رحمۃ اللہ علیہ

ضیا تسنیم بلگرامی

شاہوں سے دور بھاگنے اور مٹی سے خوش رہنے والے یہ منکسر المزاج لوگ... جن کا اوڑھنا اور بچھونا فقط مخلوق کی خدمت اور خالق کی رضا کے سوا کچھ نہ ہو تو ایسے ہی لوگوں کے قدموں تلے بادشاہت مٹی بن کر رہ جاتی ہے۔ اللہ نے ایسے برگزیدہ بندوں کا ظرف بنایا ہی اتنا اعلیٰ اور مضبوط ہے کہ کائنات کے تمام خزانے ان کی نظروں سے پوشیدہ بھی نہیں اور ان کے دلوں میں ان کی طمع بھی نہیں... یہ سب کرامات ہر انسان کے حصے میں نہیں آتیں... اور جن کے حصے میں آجائیں وہ عام انسان نہیں ہوتے۔ آپ کا شمار بھی ایسی ہی مضبوط اور اعلیٰ مقام ہستیوں میں ہوتا ہے۔

دنیاداری کو ٹھکرانے والے اور آزمائشوں میں خوش رہنے والے

ایک ولی کا قصہ

دوسرا اور آخری حصہ

وہ شخص آپ ہی کے پاس پڑ رہا۔ دوسرے دن اس کی حالت زار میں کسی قدر فرق آیا مگر رہ رہ کر دورہ سا پڑنے لگا تھا۔ رات کو آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''تم جس محلے میں رہتے ہو، اس سے ملحقہ شمالی سمت کے محلے میں چلے جاؤ۔ اس وقت وہاں پینے پلانے کی محفل جمی ہوگی۔ تم بھی اس محفل میں ایک طرف بیٹھ جاؤ۔ جب محفل برخاست ہوجائے اور لوگ جانے لگیں تو تم دیکھو گے کہ طوائفوں کی آمد شروع ہوگئی۔ طوائفوں کے پیچھے ایک بوڑھا ان کے ناچنے گانے کا سامان سنبھالے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ظاہر ہوگا۔ میں تجھ کو ایک خط دے رہا ہوں، تو میرا یہ خط اس بوڑھے کو دے دے گا، پھر وہ بوڑھا جو کچھ کہے، کرنا۔''

اس شخص نے آپ سے خط لیا اور مذکورہ محلے کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس محلے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہاں مے نوشوں نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ یہ شخص ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جب محفل برخاست ہوئی اور لوگ جانے لگے تو اس نے دیکھا کہ طوائفوں کی آمد شروع ہوگئی ہے۔ ان طوائفوں کے پیچھے ایک بڑے میاں طبلہ سارنگی سنبھالے چلے آرہے تھے۔

یہ شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور شاہ صاحب کا خط ان بڑے میاں کے حوالے کر دیا۔ بڑے میاں نے اپنا سامان تو رکھا ایک طرف اور خط پڑھنے سے پہلے ہی بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ''بڑی مصیبت ہے، آدمی کہاں کہاں چھپے، کس طرح بچے..... لوگ تلاش کر ہی لیتے ہیں۔''

اس کے بعد خط کو بوسہ دیا اور کہا۔ ''اے شخص! تو ان کے پاس کیوں گیا تھا؟ تجھ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''آپ اس خط کو پڑھ کر جواب سے سرفراز فرمائیں تاکہ میں واپس جاکے شاہ صاحب کو اصل حال بتادوں۔''

بڑے میاں مسکرائے، بولے۔ ''چالاک نوجوان! میں تیری باتوں کا مطلب سمجھ گیا۔''

بڑے میاں نے زمین پر سے دو ٹھیکریاں اٹھائیں اور ان پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا اور آخر کار یہ دونوں ٹھیکریاں اس شخص کے حوالے کر دیں اور اس کو حکم دیا کہ ان کو یہیں زمین پر رکھ دو، پھر تمہیں عجیب و غریب شکلیں نظر آئیں گی۔ وہ تمہیں ڈرائیں گی مگر تم ڈرنا مت۔ آخر میں ایک شخص تخت نشیں نمودار ہوگا۔ تم ان دونوں ٹھیکریوں کو دور سے اس تخت نشیں شخص کو دکھا دینا بس تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

چنانچہ اس شخص نے ان ٹھیکریوں کو جیسے ہی زمین پر رکھا، مختلف شکلیں نمودار ہو ہو کر اس شخص کو ڈرانے لگیں لیکن وہ نہیں ڈرا اور آخر تخت نشیں نمودار ہوا۔ اس شخص نے دونوں ٹھیکریاں اس تخت نشیں شخص کے روبرو کر دیں۔ تخت نشیں شخص نے حکم دیا۔ ''بڑے میاں کو حاضر کیا جائے۔''

بڑے میاں کو فوراً ہی اس شخص کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ تخت نشیں شخص نے بڑے میاں سے کہا۔ ''حضرت! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ کے طفیل میں نے شاہ عبدالعزیز کا خط پڑھا۔'' اس کے بعد انہوں نے آپ کے خط کو بوسہ دیا اور اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ''دیکھو! اب تم اچھی طرح دیکھ بھال کر کے بتاؤ کہ تم میں کوئی شخص ایسا بھی ہے جو اس وقت حاضر نہ ہو۔''

چند لوگوں نے جواب دیا۔ ''جناب والا! ایک شخص غیر حاضر ہے؟''

تخت نشیں شخص نے حکم دیا۔ ''اس کو میرے روبرو حاضر کیا جائے۔''

جب اس شخص کو تخت نشیں شخص کے حوالے کر دیا گیا تو اس کو ڈانٹ پڑنے لگی۔ اس سے پوچھا گیا۔ ''کیوں رے! تو نے یہ کیا حرکت کی؟ اس شخص کو تو نے کتنا پریشان کر دیا ہے۔''

اس شخص نے اپنا سر جھکا لیا، بولا۔ ''بادشاہ سلامت! جب میں ہوا میں اڑا چلا جا رہا تھا تو اس شخص کے مکان میں سے آواز آئی، پیاری پیاری سریلی اور دلکش۔ چنانچہ ہر کوئی اس آواز کی طرف گوش برآواز ہو گیا۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''بات مختصر کر۔ اصل واقعہ کیا تھا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''جب میں ادھر سے گزر رہا تھا تو میں نے اس شخص کی آواز سنی۔ یہ شخص میرا نام لے کر کہہ رہا تھا..... مجھو! اس کو لے جا۔''

''چنانچہ میں نے اس کی بیوی کو اپنے قابو میں کیا اور اپنی راہ لی۔''

بادشاہ نے کہا۔ ''اے شخص! سچ بتا کیا یہ سچ بول رہا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''یہ سچا ہے۔ اس وقت میں نے اپنے ایک ملازم سے یہ کہا تھا..... مجھو اسے لے جا۔ اس وقت ''اسے'' سے میری مراد یہ تھی کہ اپنی بیوی کا وہ سامان اس کے حوالے کر دوں جو وہ اپنے ساتھ لانے والی تھی۔''

اتنا بتا کے وہ شخص چپ ہو گیا۔

بادشاہ نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ ''تو اس عورت کی پاکبازی کی بابت کیا یقین دلائے گا؟''

ساتھی نے جواب دیا۔ ''حضرت! اب میں اس سلسلے میں کیا عرض کروں۔ عورت موجود ہے، اس سے ہی پوچھ لیا جائے۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی

بادشاہ نے عورت کو بلوا کر پوچھا۔ ''محترم خاتون! آپ کے ساتھ کوئی زیادتی؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''نہیں' زیادتی کوئی نہیں' ہر طرف احسان ہی احسان نظر آتا رہا۔''

عورت نے اپنے شوہر کو اور شوہر نے اپنی بیوی کو بے محابا دیکھا تو مارے خوشی کے دونوں کے ہوش وحواس ہی جاتے رہے۔

بادشاہ نے کہا۔ ''اے شخص! واپس جا کے شاہ صاحب سے کہہ دینا کہ میں بہت شرمندہ ہوں' آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

وہ صاحب اپنی بیوی کو لے آئے اور بیوی کو گھر چھوڑ کر خود شاہ صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور پورا واقعہ گوش گزار کر دیا۔

آپ مسکرائے' فرمایا۔ ''جانتا ہے وہ کون لوگ تھے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''غالباً جن۔''

آپ نے فرمایا۔ ''غالباً نہیں' یقیناً وہ جن تھے۔''

☆☆☆

امرائے دہلی میں سعادت یار خاں اپنے حسنِ خداداد کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ایک دن وہ گھبرائے ہوئے شاہ صاحب کی خدمت میں آئے۔ ان کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ حاضرینِ محفل کو دیکھ کر خود بھی ایک طرف بیٹھ گئے۔

شاہ صاحب نے انہیں اپنے پاس بلایا اور تخلیہ میں لے جا کر دریافت فرمایا۔ ''سعادت یار خاں! کیا بات ہے؟''

سعادت یار خاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' کہنے لگے۔ ''شاہ صاحب! میں ایک مصیبت میں پھنس چکا ہوں۔ ہو سکتا ہے اس میں میری جان تک چلی جائے۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''مت ڈرو نواب! میں جو کچھ کہوں، اس پر عمل کرنا مگر پہلے پورا واقعہ تو بتاؤ۔''

سعادت یار خاں نے عرض کیا۔ ''شاہ صاحب! ہفتہ بھر پہلے کی بات ہے کہ میں اپنے کمرے کے دروازے اندر سے بند کر کے سویا ہوا تھا۔ اس وقت میں نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ معلوم نہیں کس بات پر میری آنکھ کھل گئی اور میں نے دیکھا کہ میرے کمرے کے در بھی آہستہ آہستہ کھل رہے ہیں۔ شاہ صاحب! میں سچ عرض کر رہا ہوں کہ میں نے کمرے کو اندر سے بند کر رکھا تھا۔''

شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''کمرے کے دروازے از خود کھل گئے..... پھر کیا ہوا؟ سچ سچ بتایئے گا۔''

سعادت یار خاں نے بتایا۔ ''دروازے خود بخود کھل گئے اور میرے شب خوابی کے کمرے میں ایک حسین عورت داخل ہوئی۔ اس عورت نے زیور اور لباس نہایت شاندار پہن رکھے تھے۔ وہ میرے پلنگ پر میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔''

سعادت یار خاں نے مزید بتایا۔ ''میں اس عورت سے نالاں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو میرے پاس کیوں آئی ہے؟''

عورت نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے میرا تعارف نہیں پوچھا۔''

سعادت یار خاں نے کہا۔ ''اچھا اب بتا تو کون ہے اور میرے پاس کیوں آئی ہے؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''میں سلطان محبوب شاہ کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ مغربی دامنِ کوہ قاف کے جنوں کا بادشاہ ہے۔ میں عرصے سے تیری چاہت میں مبتلا ہوں۔ میں کوشش کر رہی تھی کہ وقت نکال کر تجھ سے ملوں مگر کوئی موقع نہیں مل رہا تھا۔ آخر آج وہ موقع ہاتھ آ گیا اور میں یہاں تمہارے پاس آ گئی۔''

سعادت یار خاں نے پوچھا۔ ''مگر میرے پاس آنے کا مقصد؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ایک عاشق اپنے محبوب کے پاس کیوں جاتا ہے' تم یہ بھی نہیں جانتے؟''

سعادت یار خاں نے کہا۔ ''میں انسان ہوں اور تو قوم اجنہ سے تعلق رکھتی ہے، کیا ان دونوں میں.....؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''کوئی فرق نہیں پڑتا، میں مدعائے دلی حاصل کر کے رہوں گی۔''

سعادت یار خاں نے تشویش ظاہر کی۔ ''اور اگر تیرے باپ کو یہ بات معلوم ہو گئی تو کیا ہو گا؟''

عورت نے جواب دیا۔ ''تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں' میں اپنے باپ کو منا لوں گی۔ راضی کر لوں گی۔''

سعادت یار خاں نے کہا۔ ''تب پھر میں تجھ کو مشورہ دوں گا کہ پہلے تو اپنے باپ کو راضی کر لے۔''

عورت، سعادت یار خاں کے بالکل قریب چلی گئی، مسکرا کر بولی۔ ''فی الحال میں اس چکر میں نہیں پڑوں گی کیونکہ اگر میرا باپ مجھ سے خفا ہو گیا تو پھر میں تجھ سے زندگی بھر نہیں مل سکوں گی۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سعادت یار خاں نے بے بسی سے کہا۔ ''میرا مشورہ یہی ہے کہ تو اپنے باپ کو سب کچھ سچ سچ بتا کے اس کی رضا حاصل کر لے۔''

عورت ناراض ہوگئی۔ ''اپنے باپ کو میں تجھ سے زیادہ جانتی ہوں۔ اگر تو بخوشی تیار نہ ہوگا تو مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر نواب سعادت یار خاں ملول ہو گئے' بولے۔ ''شاہ صاحب! میں ایک کمزور انسان ہوں، کہاں تک اس سے بچتا، ناکام رہا اور آج تک میں ہر روز شب کے چند لمحات میں اس کی آمد کا منتظر رہتا، پھر جب وہ آجاتی تو وصل واتصال سے محظوظ ہو کر آنکھیں بند کیے پڑا رہتا۔''

شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''پھر تو اس وقت اتنا پریشان کیوں ہے؟''

سعادت یار خاں نے جواب دیا۔ ''شاہ صاحب! میں آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ میں نے اس معصیت میں پورا ایک سال گزار دیا۔ میں ایک شب حسبِ معمول اس کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ عورت اپنے مقررہ وقت کے خلاف آئی۔ وہ بہت پریشان تھی، بدحواس، حواس باختہ۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تیرا یہ حال کیوں ہو رہا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں کیا بیان کروں کہ میرا یہ حال کیوں ہے؟'' وہ رو رہی تھی۔ ''ہم دونوں کے تعلقات کا علم میرے باپ کو ہو چکا ہے۔ میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ میرے باپ نے تمہاری ہلاکت پر ایک جن متعین کر دیا ہے، تم اپنی جان بچاؤ۔''

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''لیکن میں جن سے کس طرح مقابلہ کروں گا؟ میں اس سے کس طرح بچوں گا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گی، میں نہیں جانتی کہ تم اس جن کا کس طرح مقابلہ کرو گے۔''

میں اور زیادہ پریشان ہوگیا' پوچھا۔ ''تم نے جہاں اتنی مہربانی کی ہے' میری ہلاکت کی پیشگی اطلاع دینے آگئی ہو، وہیں اتنی مہربانی اور کرو کہ وہ تدبیر بھی بتاتی جاؤ جس سے میں اپنی حفاظت کر سکوں۔''

اس نے جواب دیا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی، اب میں واپس جا رہی ہوں۔ ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میں جیسے ہی واپس جاؤں گی' فوراً زنجیروں میں جکڑ کر قید کر دی جاؤں گی۔''

''میں اس سے مزید سوالات کرنا چاہتا تھا مگر وہ غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں تلے اندھیرا محسوس کیا، پھر اس مایوسی میں مجھے آپ کا آستانہ یاد آگیا اور میں آپ کے پاس چلا آیا۔ آپ مجھے اس جن سے بچایئے ورنہ میں ہلاک کر دیا جاؤں گا۔''

شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''کیا تجھے میرے مریدوں اور ارادت مندوں نے اندر آنے سے منع نہیں کیا تھا؟''

نواب نے جواب دیا۔ ''منع کرنا کیا معنی؟ انہوں نے تو مجھے روکا تھا لیکن مجھے کچھ پتا نہیں کہ میں کس طرح اندر گھسا چلا آیا۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''اس وقت میں مراقبے میں تھا، تو نے اسے توڑ دیا۔ تو نے جس بدکرداری کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی سزا تجھے ضرور ملنی چاہیے۔''

نواب صاحب، شاہ صاحب کے قدموں میں گر گئے، بولے۔ ''شاہ صاحب! خدا کے لیے مجھ کو بچا لیجیے۔ میں آپ کے قدموں میں اس وقت تک پڑا رہوں گا جب تک کہ میں اس جن کے ہاتھوں ہلاک نہ کر دیا جاؤں یا پھر آپ مجھ کو بچا لیں گے۔''

آپ کچھ سوچنے لگے' پھر فرمایا۔ ''فقیر کسی ملتمس کی التجا کو رد کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری عادت ہے جو مجھے اپنے آباء واجداد سے ملی ہے۔''

اس کے بعد آپ نے نواب کو ایک حجرے میں پہنچا دیا اور کہا۔ ''آج کی رات تو اس حجرے میں رہے گا۔ کچھ دیر بعد میں اس عورت کے باپ کو یہیں بلوا لوں گا اور اللہ نے چاہا تو تیری جان بخشی کرا دوں گا۔''

نواب صاحب کو کسی طرح اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا۔ انہیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ شاہ صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں وہ درست ہے۔ اس حجرے میں خرابی یہ تھی کہ بہت چھوٹا تھا۔ نواب صاحب زمین پر سونے کے عادی نہ تھے۔ یہاں ان کے لیے جو پلنگ بچھایا گیا تھا، وہ آدھا حجرے کے اندر تھا اور آدھا اس کے باہر زیرِ آسماں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''شاہ صاحب! کیا میں مطمئن ہو کر سو جاؤں؟''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''میں تیرے حجرے سے متصل موجود ہوں، ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

نواب صاحب پلنگ پر دراز ہو گئے۔ وہ سونے کی کوشش کر رہے تھے مگر نیند نہیں آ رہی تھی۔ بمشکل ذرا آنکھ لگی ہی تھی کہ ایک

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دھلوی

بہت بڑا پتھر لڑھکتا ہوا آیا اور پلنگ کے بائیں پائنتی کے پائے سے ٹکرا گیا۔ پایہ ٹوٹ گیا اور نواب صاحب گھبرا کر بھاگے اور شاہ صاحب کے حجرے میں داخل ہو کر ان پر جا گرے۔ خوف اتنا طاری تھا کہ فوراً ہی بے ہوش ہو گئے۔ شاہ صاحب نے چند دعائیں پڑھیں اور نواب صاحب پر دم کیا۔ انہیں ہوش آ گیا اور اسی عالم میں انہوں نے دیکھا کہ شاہ صاحب کے روبرو پانچ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی صورتوں سے ان کی سرداری کا احساس ہوتا تھا۔ پانچوں سردار مؤدب بیٹھے تھے۔

شاہ صاحب نے ان سرداروں سے، نواب صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ''یہی تمہارا گناہ گار ہے؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''ہاں شاہ صاحب! یہی ہمارا مجرم ہے اور ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اس کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''میں اس کو کس طرح تمہارے حوالے کر دوں کیونکہ اس وقت یہ میری پناہ میں ہے اور اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں آپ لوگوں سے اس کو معافی دلوا دوں۔''

ایک سردار نے پوچھا۔ ''اگر ہم اس کو نہ معاف کریں تو؟''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''تب پھر یہ کہ اس شخص نے آپ کو جتنا شرمندہ اور ذلیل کیا ہے، اسی طرح آپ میری درخواست رد کر کے مجھے شرمندہ اور ذلیل کر دیں گے۔''

پانچوں سردار آپ کے قدموں میں گر گئے اور عاجزی سے کہا۔ ''ہم نے اسے معاف کیا کیونکہ ہم نہ تو آپ کو شرمندہ دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔''

آپ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے باری باری آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اچانک نظروں سے غائب ہو گئے۔

آپ نے نواب صاحب سے فرمایا۔ ''جا اور آئندہ اس بات کا خیال رکھ کہ کسی کو تیری وجہ سے شرمندہ اور ذلیل نہ ہونا پڑے۔ خدا تجھ کو معاف کرے۔''

نواب سعادت یار خاں شرمندہ و خجل اٹھے اور آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر چلے گئے۔

☆☆☆

شاہ صاحب کی خدمت میں دور دراز سے لوگ آیا کرتے تھے۔ ان میں ایران، افغانستان، ترکی، عرب اور مصر تک کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ ان آنے والوں میں ایک شخص آذربائیجان کا بھی شامل تھا۔ اس شخص کے ساتھ اس کا لڑکا بھی تھا۔ دونوں آپ کے پاس بڑی محبت اور عقیدت سے رہتے رہے۔ آخر ایک دن اس شخص نے جانے کی اجازت چاہی۔ آپ نے فرمایا۔ ''کیا تو اپنے بیٹے کو ساتھ لے جائے گا؟''

اس نے عرض کیا۔ ''حضرت! میں تو آپ کے حکم کا تابع ہوں، جو فرمائیں گے اس پر عمل کروں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اپنے بیٹے کو میرے پاس چھوڑ دو، میں اس کو پڑھاؤں لکھاؤں گا۔''

باپ راضی ہو گیا اور اپنے بیٹے کو آپ کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔

آپ نے اس کو بڑی توجہ سے پڑھایا لکھایا۔ آپ نے اس لڑکے میں ناشکرا پن یا غیر قانع انداز محسوس کیا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''نوجوان! کیا بات ہے؟ کیا تو اس ماحول سے خوش نہیں ہے؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''کیا آپ یہ پسند فرمائیں گے کہ میں جھوٹ بولوں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''نہیں، میں جھوٹ سے نفرت کرتا ہوں۔''

اس نوجوان نے عرض کیا۔ ''حضرت! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہاں جو کچھ بھی پڑھا ہے، اس سے مطمئن نہیں ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کس قسم کا اطمینان درکار ہے تجھ کو؟''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں نے آپ کی بابت بہت عجیب و غریب حکایتیں سنی ہیں۔ ایسے ایسے واقعات کا علم مجھ کو ہوا ہے کہ عقل کو ان پر یقین نہیں آتا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی چیز میں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوں۔''

آپ مسکرائے اور فرمایا۔ ''اچھا، تم آٹھ دن متواتر سورۃ اناافتحنا پڑھتے رہو پھر میں کچھ اور بتاؤں گا۔''

نوجوان نے آپ کی بتائی ہوئی ترکیب کے مطابق سورۃ مذکور کا ورد شروع کر دیا۔ نویں دن اس نے آپ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا۔ ''حضرت! میں نے مذکورہ سورۃ کا ورد کر لیا ہے۔''

آپ نے اسے حکم دیا۔ ''اب تو جہاں بھی جانا چاہے چلا جا اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نوجوان نے پوچھا۔ ''میں کہاں جاؤں شاہ صاحب؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''کہیں بھی چلا جا، جنگل ہی کی راہ لے۔''

نوجوان نے اپنے باپ کی چھری کمر میں باندھی اور جنگل کی راہ لی۔ پھر جنگل سے گزر کر ایک دریا عبور کیا اور دوسرے جنگل میں داخل ہوگیا۔ اس طویل جنگل کو پار کیا ہی تھا کہ درمیان میں ایک ندی آگئی۔ اس ندی کو عبور کیا تو ایک بہت بڑے دریا نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس دریا کو عبور کر کے یہ نوجوان ایک نئے جنگل میں داخل ہوگیا۔ اس کو حیرت تھی کہ وہ ابھی تک کسی واقعے سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بھیڑیے نے سامنے سے آکر اس پر وار کر دیا۔ نوجوان زمین پر لیٹ گیا۔ بھیڑیا دوسری طرف نکل گیا۔ وہ پھر پلٹا اور دوسرا وار کیا۔ نوجوان نے اس وار کو بھی خالی جانے دیا۔ بھیڑیے نے تیسری بار حملہ کر دیا۔ نوجوان ایک درخت کی آڑ میں چلا گیا۔ بھیڑیے نے چوتھا وار کیا اور نوجوان اس بار بھی بچ گیا۔ اسی طرح پانچواں، چھٹا، ساتواں اور آٹھواں وار کیا اور نوجوان برابر بچتا رہا۔ بھیڑیا اس کو دم نہیں لینے دے رہا تھا۔ اچانک اسے اپنے والد کی چھری یاد آئی جو کمر میں اڑسی ہوئی تھی۔ نوجوان نے پھرتی سے چھری نکالی اور کھینچ کر بھیڑیے کو رسید کر دی۔ چھری بھیڑیے کے پہلو میں اتر گئی، وہ پہلو میں پھنسی رہ گئی اور بھیڑیا زخمی حالت میں فرار ہوگیا۔ نوجوان نے سکون کی سانس لی اور نہایت محتاط انداز میں آگے روانہ ہوگیا۔

اس نے کسی نہ کسی طرح جنگل کو پار کیا اور ایک آبادی میں داخل ہوگیا۔ اس شہر کی عمارتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اونچی اونچی عالیشان عمارتیں دیکھ کر نوجوان نے اپنے دل میں سوچا کہ چلیے ایک آبادی تو ملی۔ یہاں سے چل کر وہ بستی میں داخل ہوگیا۔ اس بستی کے لوگ غیر معمولی حسین اور بزرگ نظر آتے تھے۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک بزرگ نے نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پوچھا۔ ''نوجوان! تجھے کس کی تلاش ہے؟''

نوجوان نے گھبرا کر ان بزرگ کو دیکھا اور نرمی سے جواب دیا۔ ''تلاش کسی کی بھی نہیں، میں ایک نو وارد ہوں۔ چلتے چلتے تھک چکا ہوں۔ کیا اس آبادی میں کوئی سرائے ہے؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''اگر تو مسافر ہے تو اس بستی کا ہر گھر تیرا گھر ہے، یہاں سرائے نہیں ہے۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''وہ اس طرح کہ تو میرا مہمان ہے، چل میرے ساتھ گھر چل۔''

نوجوان حیران تھا کہ ایک اجنبی کو یہ شخص کس طرح مہمان بنا رہا ہے، پوچھا۔ ''کیا آپ مجھ سے واقف ہیں؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''میں تم سے بالکل واقف نہیں لیکن یہاں کسی مسافر کے بارے میں، اس سے واقف ہونا ضروری نہیں ہے۔''

نوجوان ان بزرگ کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ اس گھر میں اس کی بڑی خاطر مدارات ہوئی۔ عمدہ عمدہ کھانوں سے اس کی ضیافت ہوئی اور صاحبِ خانہ نے اس سے بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ نوجوان حیران تھا کہ یہ بزرگ اس پر اتنے مہربان کیوں ہیں؟

صاحبِ خانہ بزرگ نے نوجوان سے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم بہت تھکے ہوئے ہو، کچھ دیر آرام کرو میں بعد میں آجاؤں گا۔''

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میں تھکا ہوا ہوں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کی موجودگی مجھ پر گراں گزرے۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''لیکن میں جانتا ہوں کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو، آرام کرو۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوسکتی ہیں۔''

وہ بزرگ اس نوجوان کو گھر میں چھوڑ کر چلے گئے۔

نوجوان نے اس عجیب و غریب گھر کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہاں کی ہر چیز چونکا دینے والی تھی۔ دیواریں دور سے دیکھو تو موہوم سی خیالی خیالی سی معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا گویا یہ مکان اور بستی کی ساری عمارتیں خلا میں ٹکی ہوئی ہیں۔ پانی کی طرح شفاف، ہلکورے لیتی ہوئیں۔ گھر میں الماریاں بھی تھیں اور کئی طاق بھی۔ ان میں رکھا ہوا سارا سامان صاف نظر آرہا تھا۔ الماری میں ہزاروں سال پرانے ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایسے لباس بھی موجود تھے جو اس دور میں متروک ہوچکے تھے۔ اس الماری میں چند مورتیاں بھی رکھی تھیں مٹی اور پتھر کی مورتیاں۔ طاقوں میں دیے رکھے تھے..... لیکن ایک طاق میں اس نے وہی چھری بھی دیکھی جو وہ ایک حملہ آور بھیڑیے کو پھینک کر مار چکا تھا اور چھری بھیڑیے کے پہلو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

میں گھس گئی تھی اور بھیڑیا اس کو لے کر فرار ہو گیا تھا۔

نوجوان کی نیند اڑ گئی، وہ اٹھا اور چھری والے طاق کے قریب گیا۔ پھر اس نے طاق کی طرف ہاتھ بڑھا کر اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر وہ طاق کچھ دیر کے لیے چھری سمیت غائب ہو گیا۔ یہ طاق کے پاس سے ہٹ آیا۔ اس کے ہٹتے ہی طاق اور چھری پھر نمودار ہو گئیں۔ نوجوان ایک بار پھر اس طاق کے پاس گیا۔ وہ طاق کی چھری کو اٹھانا چاہتا تھا مگر طاق اور چھری ایک بار پھر غائب ہو گئیں۔

نوجوان اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ اس کی نظریں بدستور چھری پر لگی ہوئی تھیں ... وہ بہت حیران اور پریشان سوچ رہا تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟

کافی دیر بعد صاحبِ خانہ بزرگ واپس آ گئے انہوں نے نوجوان سے پوچھا۔ ''کہو بھائی! بھوک تو نہیں لگ رہی؟''

نوجوان کو محسوس ہوا، گویا اس کو بڑے زور کی بھوک لگی ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔ ''جنابِ والا! میں بہت بھوکا ہوں، معلوم نہیں کچھ دیر پہلے کا کھایا پیا کہاں چلا گیا۔''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''یہاں کی آب و ہوا ہی کچھ ایسی ہے کہ جو کچھ کھاؤ، فوراً ہضم ہو جاتا ہے۔''

نوجوان نے کہا۔ ''لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔''

بزرگ چلے گئے اور کچھ دیر بعد کھانے کا سامان لے کر حاضر ہو گئے۔ کھانا نوجوان کے آگے رکھ دیا اور بولے۔ ''جناب کھایئے۔''

نوجوان کھانا کھانے لگا۔ اسے ایک بار پھر اپنی چھری یاد آ گئی اور اس کی نظریں دوبارہ طاق پر جم گئیں۔

بزرگ نے پوچھا۔ ''نوجوان! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم اس طاق کی طرف بار بار کیوں دیکھ رہے ہو؟''

نوجوان نے کسی قدر پس و پیش سے جواب دیا۔ ''جناب!! میں کیا عرض کروں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں، وہ حقیقت ہے یا میرا وہمہ ہے۔''

بزرگ نے کہا۔ ''شاید تجھ کو اس چھری نے پریشان کر دیا ہے۔''

نوجوان کے دل کا چور پکڑا گیا تھا، بولا۔ ''بیشک بیشک' میں اس چھری کے بارے میں بہت پریشان ہوں۔''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''وہ چھری تیری ہی ہے اور اسی وقت وہ میں تجھے واپس کر دوں گا۔''

بزرگ نے اٹھ کر وہ چھری نوجوان کے حوالے کر دی اور کہا۔ ''یہ تیری امانت میرے پاس رکھی تھی، اس کو واپس لے لے۔''

نوجوان نے چھری لے لی اور پوچھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ چھری آپ کے پاس کہاں سے آئی؟''

بزرگ نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ''نوجوان! مجھ کو پہچان میں کون ہوں؟''

نوجوان نے ان بزرگ کو غور سے دیکھا تو وہ ہوا کی طرح تحلیل ہونے لگے اور ان کی جگہ ایک بھیڑیا نمودار ہو گیا، اس بھیڑیے کے پہلو میں اس کی چھری پیوست تھی۔ نوجوان سہم گیا، بولا۔ ''اچھا تو اب میں سمجھا۔''

وہ بزرگ دوبارہ انسان بن گئے، بولے۔ ''نوجوان! میں وہی بھیڑیا ہوں جس کو تو نے چھری مار کر زخمی کر دیا تھا۔''

نوجوان کی گھگی بندھ گئی، اٹک اٹک کر بولا۔ ''یہ میں کہاں پھنس گیا آ کر۔ کہیں تم مجھے کوئی سزا دینے تو نہیں آئے؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''شاید میں تجھ کو سزا دیتا کیونکہ تو نے مجھ کو زخمی کر دیا تھا اور میں ان کو قطعی معاف نہیں کرتا جو ہمیں زخمی کرتے ہیں۔ تو بھی سزا دینے کا مستحق تھا۔''

نوجوان نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ ''لیکن آپ نے مجھ کو معاف کیوں کر دیا؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''ہم دونوں کے درمیان شاہ عبدالعزیز آ گئے اور ہم ان کا احترام کرتے ہیں۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''مگر آپ لوگ ہیں کون؟''

بزرگ نے جواب دیا۔ ''ہم کیا ہیں، تجھے کیا بتائیں۔ ہمارا تعارف یہ ہے کہ ہم نہ تو انسان ہیں، نہ فرشتے، نہ جن۔ ہم ان سب سے الگ ایک مخلوق ہیں۔ ہماری بستی عام انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ ہی رہتی ہے۔ میں نے جو کام کیا ہے، ہم اسی قسم کے کام انجام دیتے ہیں۔''

نوجوان بھاگنے کا راستہ تلاش کرنے لگا۔

بزرگ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے نوجوان! تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نوجوان نے جواب دیا۔ ''میری بھوک پیاس اڑ چکی ہے۔''
بزرگ نے پوچھا۔ ''تو کیا چاہتا ہے؟''
نوجوان نے جواب دیا۔ ''اسی وقت شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچنا چاہتا ہوں۔''
بزرگ نے کہا۔ ''اپنی دونوں آنکھیں بند کرلے۔''
نوجوان نے آنکھیں بند کرلیں۔ اسی وقت بزرگ نے حکم دیا۔ ''اپنی آنکھیں کھول دے۔''
نوجوان نے آنکھیں کھول دیں اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اس وقت جامع مسجد شاہجہان آباد کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ وہ یہاں سے چل کر شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور آپ کے قدموں میں گر کر زار و قطار رونے لگا۔
آپ نے اس کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا، فرمایا۔ ''کیا بات ہے؟ تیری تسلی ہوئی یا کچھ اور؟''
نوجوان نے جواب دیا۔ ''اب میں آپ کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔''
آپ نے اس نوجوان کو اپنے پاس ہی رکھا اور کمالاتِ باطنی سے سرفراز فرمایا۔

☆☆☆

ایک دن آپ کے مریدوں نے آپ کو بتایا کہ دریائے جمنا کے کنارے ایک ایسا شخص بیٹھا رہتا ہے جو اپنی وضع قطع اور لباس سے اس دور کا نہیں لگتا۔ آپ نے پوچھا۔ ''وہ بات کس زبان میں کرتا ہے؟''
مریدوں نے جواب دیا۔ ''کسی نے اسے بولتے سنا ہی نہیں، حالانکہ لوگوں نے اس سے طرح طرح کے سوالات کیے مگر اس نے کسی ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''میں اس کے پاس جاؤں گا اور دیکھوں گا کہ وہ میرے سوالوں کے جواب کیوں نہیں دے گا۔''
آپ نے چند مریدوں کو اپنے ساتھ لیا اور اس عجیب و غریب شخص کے پاس پہنچ گئے۔ اس شخص نے آپ کو دیکھا تو احتراماً کھڑا ہوگیا۔
آپ نے اس کو بٹھا دیا۔ یہ شخص لباس اور وضع قطع سے دو ڈھائی سو سال ماضی کا معلوم ہوتا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''اے شخص! یہ معاملہ کیا ہے؟ سنتا ہوں تو کسی سے بات ہی نہیں کرتا۔''
اس شخص نے آپ کی طرف دیکھا اور فارسی میں جواب دیا۔ ''میں کس کو اپنا حال سناؤں، مجھے آج تک ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جو معقول ہوتا اور میں اس کو اپنی داستان سنا سکتا۔''
شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''اب تو مجھے سنا اور اللہ نے چاہا تو تیرا دکھ درد دور کردوں گا۔''
اس نے بیان کیا۔ ''شاہ صاحب! میں جنوبی ہند کا رہنے والا ہوں۔ میرے ساتھ میرا ایک دوست بھی رہتا تھا۔ ہم دونوں میں دانت کاٹی دوستی تھی۔ ایک دن ہم دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ چلو دنیا کی سیر کرلیں، چنانچہ ہم نے کئی ملکوں کی سیر کی اور پھر دہلی واپس آگئے۔ اس دوران میرا دوست بیمار پڑ گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اللہ کو پیارا ہوگیا۔ میں بہت آبدیدہ ہوگیا اور ادھر ادھر روتا پھرا، آخر تجہیز و تکفین کی اور اپنے ہاتھوں سے اس کا کفن دفن کیا۔ میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا اور جب میں نے اس کی میت کو قبر میں اتارا تو میری کمر میں لگی ہوئی کٹار قبر ہی میں رہ گئی، مجھے اس کا ہوش ہی نہ رہا۔
''جب میں واپس آیا تو مجھے اپنی کٹار یاد آگئی۔ میں نے اس کو ادھر اُدھر تلاش کیا اور جب وہ نہیں ملی تو یاد کرنے سے یاد آیا کہ وہ تو دوست کی قبر میں گر گئی ہوگی۔ اس کٹار کی قیمت پانچ سو روپے تھی۔ میں نے منصوبہ بنایا کہ کسی بھی طرح مجھ کو اس کی قبر..... کے اندر اترنا ہوگا۔ چنانچہ میں قبرستان گیا اور لوگوں کی نظروں سے بچ کر اپنے دوست کی قبر میں اتر گیا، اندر لاش کا تو کہیں پتا نہیں تھا، وہاں قبر کی بغل میں ایک کھڑکی ضرور نظر آئی۔ میں اس کھڑکی کے دوسری طرف چلا گیا۔ اس جگہ کا منظر ہی خاصا پُرکیف تھا۔ وہاں میں نے اپنے دوست کو تلاوتِ کلام پاک میں مشغول دیکھا، اس نے مجھ کو آتے دیکھ کر کٹار میری طرف بڑھا دی، بولا۔ ''تم شاید اس کٹار کی خاطر یہاں تک آئے ہو؟''
میں نے جواب دیا۔ ''ہاں، بے شک میں اسی کٹار کی وجہ سے یہاں تک آگیا ہوں۔''
میرے دوست نے خاموشی اختیار کی اور وہاں اور جو لوگ موجود تھے انہیں بھی انگلی کے اشارے سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دوست نے کہا۔ ''دوست! تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے جواب دیا۔ ''میں تو اس پر فضا باغ کی سیر کروں گا۔''

دوست نے کہا۔ ''جیسی تمہاری مرضی لیکن تمہیں بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس سلسلے میں ساری پریشانیاں جھیلنے کو تیار ہوں۔''

دوست نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو جا اور باغ کی سیر کر۔''

میں اپنے دوست کے پاس سے اٹھ کر باغ کی سیر کرنے لگا۔ میں نے اپنے سامنے خاصے فاصلے پر ایک دل خراش منظر دیکھا۔ وہاں بہت سارے لوگ کھڑے تھے۔ ان کے پاس ہی ایک بھیانک شکل کا تنومند آدمی بھی کھڑا تھا۔ وہاں ایک کڑھاؤ بھی رکھا تھا اور اس نے تیل سے لبریز کڑھاؤ میں آدمیوں کو ڈالنا شروع کر دیا۔ میں اس طرف کڑھاؤ کے پاس چلا گیا اور ان سے پوچھا کہ تم ان لوگوں کو کڑھاؤ میں کیوں ڈال رہے ہو؟

ایک نے جواب دیا۔ ''یہ لوگ مقروض تھے۔ دنیا میں نہیں دے سکے تو ہم لوگ یہاں ان سے اپنا قرضہ وصول کر رہے ہیں اور جو لوگ قرضہ نہیں ادا کر سکتے، انہیں کڑھاؤ میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''او خدا کے بندو! ذرا یہ تو سوچو کہ اس جگہ یہ لوگ اپنا قرضہ کس طرح اتاریں گے۔ انہیں معاف کیوں نہیں کر دیتے؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''آخر انہیں یہاں کیوں معاف کیا جائے؟''

اچانک ہجوم میں سے ایک شخص نکلا اور اس نے مضبوطی سے مجھے جکڑ لیا، بولا۔ ''کیا تجھ کو یاد نہیں کہ تو نے ایک بار مجھ سے ایک چیز چار پیسوں کی لی تھی؟''

اس وقت پیسے میرے پاس نہیں تھے اور میں نے وہ پسندیدہ شے قرض خرید لی تھی، پھر میں نے ادائیگی میں تساہل برتا اور میں نے جس شخص سے قرض خریدی تھی، اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ مجھے ساری باتیں یاد آتی چلی گئیں۔ میں نے اس شخص سے کہا۔ ''اس وقت میرے پاس چار پیسے نہیں ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں اپنی کٹار تم کو دے سکتا ہوں۔ اس کی مالیت تقریباً پانچ سو روپے ہے۔''

اس شخص نے کٹار لینے سے انکار کر دیا، کہا۔ ''مجھ کو تو اپنے چار پیسے درکار ہیں۔ میں کٹار لے کر کیا کروں گا۔''

''اس شخص نے میرا ہاتھ اتنی زور سے پکڑ رکھا تھا کہ اس کی انگلیوں کے نشان ابھی تک میری کلائی پر موجود ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی کلائی شاہ عبدالعزیز کے سامنے کر دی۔ وہ کہنے لگا۔ ''میں نے پوچھا کہ یہ کون سی جگہ ہے اور میں تیرا قرض کس طرح اتار سکتا ہوں؟''

ابھی میں اس سے بحث کر ہی رہا تھا کہ میرا دوست بھی وہاں پہنچ گیا اور کہا۔ ''بھائی! یہ میرا دوست ہے اور ابھی اس کا اپنی مادی دنیا سے وجود منقطع نہیں ہوا۔ یہ زندہ ہے اور اتفاق سے میری ملاقات کو آ گیا ہے۔''

''میرے دوست کے کہنے پر اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور میں بھاگ کر باہر نکل آیا۔'' اس نے کٹار شاہ صاحب کو دکھائی، بولا۔ ''اس نے مجھے مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ میں جب بھی مروں گا، وہ شخص مجھ سے اپنے چار پیسے طلب کرے گا۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''تو اس مرحوم کے قریبی عزیزوں کا پتا لگا اور انہیں چار پیسے دے کر اپنا پیچھا چھڑا۔''

اس نے اپنا سر پکڑ لیا، بولا۔ ''شاہ صاحب! مصیبت تو یہی ہے کہ جب میں قبر سے باہر نکلا تو پتا چلا، میں اپنے عہد سے بچھڑ چکا ہوں اور دو ڈھائی صدی آگے نکل آیا ہوں، اس کے قریبی عزیز و اقارب بھی مر کھپ چکے۔''

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ اس شخص کا وحشت سے برا حال ہو رہا ہے، آپ نے فرمایا۔ ''اللہ سے توبہ و استغفار کر، ممکن ہے وہ کوئی نجات کی صورت پیدا کر دے۔ میں تو یہ کر سکتا ہوں کہ تیری وحشت میں کسی حد تک کمی کر دوں۔''

اس کے بعد آپ نے پانی دم کر کے پلایا، اس سے اس کی طبیعت کسی حد تک قابو میں آ گئی۔

اس شخص نے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ ہی کی خدمت میں اپنی بقیہ زندگی بسر کر دوں؟''

آپ نے اجازت دے دی اور وہ شخص آپ ہی کے ساتھ رہنے لگا۔

☆☆☆

آپ کے مدرسے میں چند طالب علم پڑھائی میں مشغول تھے لیکن ان میں ایک نہایت حسین طالب علم کسی شے کو خلا میں دیکھ کر خوفزدہ ہو رہا تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تو ادھر کیا دیکھ رہا ہے؟ وہاں کیا ہے؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

طالب علم نے جواب دیا۔ ''حضرت! کیا عرض کروں۔ ایک عورت مجھ کو بار بار اپنے پاس بلا رہی ہے۔'' پھر اس نے دوسرے طالب علموں سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں بھی عورت نظر آرہی ہے؟''

دوسرے طالب علموں نے انکار کیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''اس عورت سے پوچھو، وہ کیا چاہتی ہے؟''

کچھ دیر بعد طالب علم نے جواب دیا۔ ''عورت کہہ رہی ہے کہ میں تجھ پر عاشق ہوں اور ایک جن مجھ پر عاشق ہے۔ وہ مجھ سے کہہ گیا ہے کہ آج مغرب کی نماز کے بعد میں اس طالب علم کو ہلاک کردوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس عورت سے کہہ دو کہ اس وقت تو چلی جاؤ اور جب چاہے آجایا کرو۔ جن سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

طالب علم نے یہ باتیں عورت سے کہہ دیں۔ عورت چلی گئی۔

مغرب کی نماز کے بعد طالب علم پر ایک دورہ سا پڑا اور وہ چیخنے چلّانے لگا مگر اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی جیسے کوئی اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ شاہ صاحب نے اٹھ کر ایک طمانچہ رسید کیا، طالب علم کی حالت سدھر گئی۔

کچھ دیر بعد وہ عورت ہنستی ہوئی طالب علم کے پاس آئی اور کہا۔ ''شاہ صاحب کے طمانچے نے جن کو زخمی کر دیا ہے۔ شاید اب وہ جانبر نہ ہو۔'' یہ کہہ کر عورت چلی گئی۔

عورت ہر روز طالب علم کے پاس آتی اور بتاتی کہ جن کی حالت بہت غیر ہو رہی ہے۔ اگر وہ اچھا ہو گیا تو شاید ایک بار پھر حملہ آور ہو۔ آپ نے طالب علم کو سمجھایا کہ اس عورت سے بولنے، بات کرنے کی حد تک واسطہ رکھنا، اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔

تقریباً پندرہ دن بعد عورت نے بتایا کہ جن اچھا ہو چکا ہے، کہتا ہے کہ اس بار میں اس طالب علم کو ہلاک کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ تم ہوشیار رہنا۔

طالب علم نے یہ بات شاہ صاحب کو بتائی، آپ نے فرمایا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں' اللہ نے چاہا تو وہ اس بار بھی شرمندہ ہو کر واپس جائے گا۔''

بیس دن بعد طالب علم کا پھر گلا گھٹنے لگا۔ شاہ صاحب نے اس بار اس کے دو طمانچے رسید کیے۔ ایک منہ پر دوسرا گردن پر۔ طالب علم کی حالت سدھر گئی۔ کچھ دیر بعد عورت ہنستی ہوئی آئی اور بتایا۔ ''شاہ صاحب کے دو طمانچوں نے جن کا کام تمام کر دیا۔ اب وہ مر چکا اور میرا اس سے پیچھا چھوٹ گیا۔''

جب عورت خوشی خوشی چلی گئی تو آپ نے طالب علم سے فرمایا۔ ''بیٹے! اس عورت کا آتے رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ کل کوئی اور مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں اور تو اس درس گاہ میں موجود ہے، تیرا دفاع کرتا رہوں گا لیکن میرے بعد یا جہاں میں نہیں ہوں گا، تیرا کیا بنے گا؟''

طالب علم نے کہا۔ ''آپ مجھ کو جیسا حکم دیں گے' میں ویسا ہی کروں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اب جس دن وہ عورت آئے، مجھ سے مل کر اس سے بات کرنا۔''

طالب علم نے جواب دیا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ بہتر ہے۔''

دوسرے دن سہ پہر کو عورت آگئی، طالب علم آپ کے پاس گیا اور مطلع کیا کہ عورت آچکی ہے۔ آپ نے طالب علم کی ہتھیلی پر اپنی کلمہ والی انگلی سے کچھ لکھا اور حکم دیا کہ مٹھی بند کر لے۔

طالب علم نے مٹھی بند کر لی، آپ نے فرمایا۔ ''اب تو عورت کے پاس جا اور اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کھول دے۔''

طالب علم عورت کے پاس پہنچا تو وہ بہت خوش نظر آئی، بولی۔ ''آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ اب ہم دونوں کے درمیان کوئی بھی مخل نہیں رہا۔''

طالب علم نے جواب نہیں دیا اور بند مٹھی کھولنے میں پس و پیش سے کام لیا۔

عورت نے پوچھا۔ ''بات کیا ہے؟ تم خاموش کیوں ہو؟''

طالب علم نے اپنی بند مٹھی عورت کے سامنے کھول دی۔ وہ عورت بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے طالب علم کی طرف دیکھا، پوچھا۔ ''میں نے تم کو کبھی کوئی تکلیف دی؟''

طالب علم نے نفی میں سر ہلا دیا۔ عورت نے پھر پوچھا۔ ''میں نے تم سے کبھی بھی یہ کہا کہ آؤ ہم دونوں اپنے تعلقات کو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وصال واتصال میں بدل دیں؟''

طالب علم نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

عورت نے تڑپ کر کہا۔ ''پھر تم نے یہ کیا کر دیا؟ اگر تمہاری خوشی اسی میں ہے کہ میں آئندہ یہاں نہ آؤں تو میں جاتی ہوں اور یہ وعدہ کر کے جاتی ہوں کہ اب میں کبھی بھی تم سے نہیں ملوں گی۔ تم اپنی مٹھی بند کر لو۔''

طالب علم نے مٹھی بند کر لی تو عورت چلی گئی۔

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''اب وہ کبھی بھی نہیں آئے گی لیکن اگر وہ کبھی بھولے بھٹکے آ بھی جائے تو تم اپنی مٹھی بند کر کے کھول دینا، وہ فوراً چلی جائے گی۔''

طالب علم کو بھی عورت کے چلے جانے کا بڑا ملال ہوا مگر صبر کر کے خاموش ہو رہا۔

☆☆☆

آپ کے خلاف ایک خاص فرقے نے بڑا خطرناک کردار ادا کیا اور آپ کو قتل کرنے کی سازش کی گئی مگر آپ بچ گئے۔ پھر آپ کو گرفتار کر کے آپ کے جسم پر چھپکلی کا ابٹن ملا گیا جس سے آپ کی پٹائی جاتی رہی اور پورے جسم پر سفید داغ پڑ گئے۔ اس عالم میں بھی آپ نے اپنا کام جاری رکھا۔ اسی عالم میں ایک رسالدار لکھنؤ سے آپ کے پاس آئے، یہ آپ کے مرید تھے۔ انہوں نے دوران گفتگو آپ سے کہا۔ ''حضرت! میں نے ایک گھوڑا چھ سو روپے میں خریدا ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''وہ گھوڑا میرے قریب لاؤ۔''

رسالدار نے سوچا، حضرت کو دکھائی تو دیتا نہیں پھر یہ گھوڑا قریب کیوں بلوا رہے ہیں؟ پوچھا۔ ''آپ گھوڑا دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں گھوڑا آپ کے پاس لاؤں؟''

آپ نے فرمایا۔ ''ہاں، گھوڑا میرے پاس لاؤ تاکہ اسے ہم بھی دیکھیں۔''

رسالدار نے گھوڑا آپ کے قریب لا کھڑا کیا۔ آپ نے اس کو ٹٹول کر دیکھا، فرمایا۔ ''کیا اس کی پشت سیاہ ہے؟''

رسالدار نے جواب دیا۔ ''ہاں، اس کی پشت سیاہ ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''اسے چلاؤ پھراؤ۔''

رسالدار نے اس کو چلایا پھرایا تو آپ نے پوچھا۔ ''کیا اس کی قیمت ادا کر دی ہے؟''

رسالدار نے جواب دیا۔ ''ادا کر دی ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ گھوڑا لنگڑا ہو جائے گا۔''

رسالدار کو اس پر تعجب ہوا، آخر کچھ عرصے بعد گھوڑا لنگڑا ہو گیا۔

ایک طالب علم کو کیمیا بنانے کا شوق ہو گیا۔ آپ نے اس کو سمجھایا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں، لیکن وہ باز نہ آیا۔ آخر ایک دن آپ نے فرمایا۔ ''تو شاہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر چلا جا۔''

طالب علم آپ کی باتیں سننے لگا۔ آپ نے مزید فرمایا۔ ''وہاں وضو کر کے مغرب کی نماز ادا کر۔ اس کے بعد دو رکعت نماز مزید پڑھ۔ اس دوران ایک بلی تیرے پاس آئے گی۔ تو اپنی پوری نماز پڑھ چکنے کے بعد سلام پھیرے گا اور پھر اس بلی کو پکڑ کر ذبح کر ڈالنا اور اس کو کپڑے میں لپیٹ کر ہمارے پاس لے آنا۔''

طالب علم نے آپ کی باتوں پر پوری طرح عمل کیا اور جب بلی کو ذبح کر کے کپڑے میں لپیٹ کر آپ کے روبرو پیش کیا تو آپ نے فرمایا۔ ''اس کو کھولو۔''

طالب علم نے کپڑے کو کھولا تو اس میں سے بلی کی جگہ سونا برآمد ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ ''سونا یوں بنتا ہے۔''

طالب علم کو ایک نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔ دوسرے دن پھر اس نے وہی کیا مگر وہاں بلی نہ مل سکی۔ تیسرے دن پھر وہی کیا مگر محروم رہا۔ چوتھے دن، پانچویں دن، اس نے اپنا عمل جاری رکھا مگر پھر کبھی وہ کامیاب نہ ہوا۔ آپ نے فرمایا۔ ''اب کچھ نہیں ہوگا..... کیوں جان گنواتا ہے؟''

☆☆☆

کسی طوائف کا انتقال ہو گیا تھا، اس کی نماز جنازہ کے سلسلے میں لوگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ کچھ کا خیال تھا کہ اس کی نماز جنازہ پڑھانا چاہیے اور کچھ انتہا پسند تھے جو کہتے تھے کہ طوائفوں کی نماز جنازہ جائز نہیں ہے۔ جب یہ مسئلہ طول پکڑ گیا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تو ان لوگوں نے آپ سے رجوع کیا۔ آپ نے ان سب سے پوچھا۔ ''میں تم لوگوں سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ جو مرد ان طوائفوں کے پاس آتے جاتے ہیں، ان کی نمازِ جنازہ جائز ہے یا ناجائز؟''

ان سب نے متفقہ طور پر جواب دیا۔ ''جائز ہے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''جب ان مردوں کی نمازِ جنازہ جائز ہے تو طوائفوں کی نمازِ جنازہ بھی جائز ہے۔''

جب یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہو گیا تو سب نے اس طوائف کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

☆☆☆

ایک دن ایک سوداگر آپ کے پاس پریشان کن پیچیدہ مسئلہ لے کر پہنچا، اس نے کہا۔ ''شاہ صاحب! جب میں باہر جا رہا تھا تو میں نے اپنی بیوی کو منع کیا تھا کہ اپنے باپ کے گھر نہیں جائے گی۔''

اس پر میری بیوی نے پوچھا۔ ''اگر بدرجۂ مجبوری مجھے اپنے باپ کے گھر جانا ہی پڑ گیا تو؟''

میں نے سختی سے کہا۔ ''اگر تو گئی تو میری طرف سے تجھ کو طلاق ہوگی۔''

''اتفاق کی بات ہے کہ میری عدم موجودگی میں میری بیوی کے باپ کا انتقال ہو گیا اور میری بیوی میری اجازت کے بغیر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ میں اپنی بیوی سے انتہائی محبت کرتا ہوں، اب میں کیا کروں؟''

شاہ صاحب نے پوچھا۔ ''علماء کرام نے کیا فتویٰ دیا؟''

سوداگر نے جواب دیا۔ ''ان سب کی متفقہ رائے کے مطابق طلاق ہو چکی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تم مجھے مٹھائی کھلاؤ تاکہ میں بتاؤں کہ طلاق نہیں ہوئی۔''

کچھ دیر بعد آپ نے فرمایا۔ ''باپ کا گھر اس وقت تک تھا جب تک وہ زندہ تھا لیکن جب اس کا انتقال ہو گیا تو وہ باپ کا گھر نہیں رہا۔ چنانچہ باپ کی موت کے بعد تیری بیوی کا اس گھر میں جانا، باپ کے گھر جانا ثابت نہیں ہوتا۔ وہ اب بھی تیری ہی بیوی ہے۔''

جب آپ کا یہ فتویٰ دوسرے علماء کے سامنے رکھا گیا تو وہ سب اپنا منہ لے کر رہ گئے اور آپ کو داد و تحسین کی نظروں سے دیکھا۔

آپ نے زندگی بھر جو کام کیا، اس میں تصنیف و تالیف کا کام بہت گراں مایہ ہے۔ آپ نے اپنی آخری عمر میں سوا تین پاروں کی تفسیر بھی لکھوائی تھی۔ سورۃ فاتحہ سے پارہ دوم کی ربع تک۔ اس کا نام تفسیر فتح العزیز یعنی تفسیرِ عزیزی تھا۔

بستان المحدثین (فارسی)۔ اس میں محدثین کے حالات و کوائف سے بحث کی گئی ہے۔

سرّ الشہادتین (عربی)۔ یہ شہادت و فضائلِ حسنین پر مشتمل ہے۔

فتاویٰ عزیزی (فارسی)۔ یہ آپ کے فتاووں پر مشتمل ہے۔

عجالۂ نافعہ (فارسی)۔ اصول حدیث پر ایک مختصر مگر گراں قدر رسالہ ہے۔

خلفائے راشدین کی سوانح پر آپ کی کتاب ''عزیز الاقتباس فی فضائل اجنار الناس'' بہت مشہور ہے۔

شرح میزان المنطق (فارسی)۔ فنِ منطق کے مبادیات اور اصول پر ایک مختصر کتاب۔

تحفۂ اثنا عشریہ:۔ ایک معرکہ آرا گراں قدر کتاب۔

یہ ہنگامی اور انقلابی شخصیت نواسی سال کی عمر میں، ماہِ شوال ۱۲۳۹ھ کو رحلت فرما گئی۔ بیماری کی ابتدا بخار سے ہوئی تھی۔ نزع سے پہلے آپ نے اپنے اعزہ کو اکٹھا کیا اور اپنا سامان ان میں تقسیم فرما دیا اور اس کے بعد انتقال فرما گئے۔ آپ کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا یہ حال تھا کہ پچپن بار آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔

ماخذات

علمائے ہند کا شاندار ماضی۔ مولانا سید محمد میاں۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز۔ مترجمین: مولوی محمد علی لطفی، مولوی انتظام اللہ شہابی۔ انفاس العارفین۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمٰن علی۔ رودِ کوثر۔ شیخ محمد اکرم

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

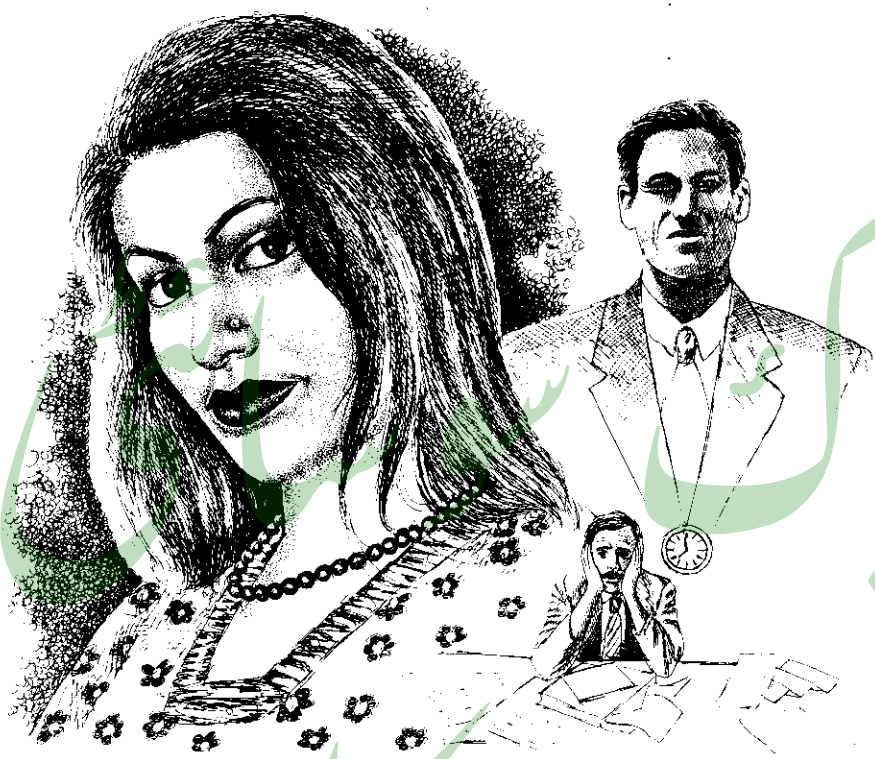

آنکھیں

منظر امام

اکثر خوبصورت تصویر کا دوسرا رخ بڑا بھیانک ہوتا ہے، وہ بھی ہرگز وہ نہیں تھا جو نظر آتا تھا... اور جو نظر آنا چاہیے تھا اسے کسی نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی لہٰذا نتیجہ بھی ویسا ہی نکلا جو نہیں نکلنا چاہیے تھا... بس اسی گھن چکر میں اصل حقیقت کہیں روپوش ہوگئی اور یہ بات... اسے ایک بڑی ٹھوکر کھانے کے بعد سمجھ میں آئی مگر... بہت دیر ہو چکی تھی۔

"دیکھنے والو آنکھیں بڑی نعمت ہیں....." ایک نابینا کا فسانہ

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ عام طور پر اس کے پاس اس وقت کوئی نہیں آیا کرتا تھا۔ گھر کی ملازمہ پورے دن کے لیے صبح آیا کرتی اور گھر کے کام سے فراغت پا کر وہیں ایک کمرے میں بیٹھ جاتی تھی۔ وہی ملازمہ اس کا کھانا بھی بنا دیا کرتی تھی۔ وہ زبیر کے بہت کام آیا کرتی تھی۔ زبیر نے اس کو بہت اچھی تنخواہ پر رکھا ہوا تھا۔

گیارہ بجے تک اس کا اسسٹنٹ آجایا کرتا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ ایک جوان شخص تھا۔ زبیر اس کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا اور کہانیاں لکھوایا کرتا۔ دوپہر میں وہ چلا جاتا تھا۔

زبیر کی سرگرمیاں بہت محدود تھیں۔ ایک جیسی بے لطف زندگی..... صبح اٹھنا، ناشتے کا انتظار کرنا، ملازمہ کے آنے کے بعد ناشتا کرنا۔ پھر اس کا معاون آجاتا۔ وہی زبیر کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتا۔ خبروں پر ہلکے پھلکے تبصرے ہوتے۔ اس کے بعد ڈکٹیشن کا مرحلہ شروع ہوجاتا۔

زبیر ایک ناول نگار تھا۔ اس کے ناول ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ وہ عام سے مسائل کو بہت خوب صورتی اور مہارت کے ساتھ قلم بند کیا کرتا تھا۔ یہی اس کا روزگار تھا۔ اس کو ہر ماہ اتنی انکم ہوجاتی تھی کہ وہ آسانی سے اپنا خرچ چلا لیا کرتا۔

اس دن نہ تو ملازمہ کو آنا تھا اور نہ ہی اس کا اسسٹنٹ آنے والا تھا۔ اسی لیے دستک کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔

اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ ''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

زبیر نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کے فلیٹ کی کھڑکی اس کے فلیٹ کے ایک کمرے کی کھڑکی سے دکھائی دیتی تھی۔ وہ نہ جانے کیوں آئی تھی۔

''جی فرمائیں؟'' زبیر نے پوچھا۔

''کیا میں آپ کے چند منٹ لے سکتی ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ آئیں اندر آجائیں۔'' وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

لڑکی اندر آکر صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جی فرمائیں؟''

''کیا آپ ہی وہ مشہور ناول نگار زبیر حسین ہیں؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میں ہی ہوں۔''

''مجھے آپ کے بارے میں کل ہی پتا چلا۔'' لڑکی نے کہا۔ ''خوشی ہوئی کہ ہماری بلڈنگ کے ایک بلاک میں آپ جیسا مشہور آدمی رہتا ہے۔''

''مہربانی آپ کی۔''

''مجھے بہت دلچسپی ہے آپ جیسے لوگوں کے شب و روز جاننے کے بارے میں۔ میرا مطلب ہے کس وقت اٹھتے ہیں، کس وقت ناشتا کرتے ہیں وغیرہ۔''

''کمال ہے۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''جبکہ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' لڑکی حیران رہ گئی تھی۔ ''اور کیا جانتے ہیں؟''

''مثلاً آپ کی کچھ عادتیں ایسی ہیں جن میں آپ کبھی تبدیلی نہیں کرتیں۔'' اس نے کہا۔ ''جیسے رنگوں کے معاملے میں آپ کا انتخاب کمال کا ہے۔ اتوار کے دن آپ کا پسندیدہ رنگ گلابی ہے۔ سوموار کو آپ ہرے رنگ کا لباس پہنتی ہیں۔ منگل کو زرد... جو آپ پر بہت اچھا لگتا ہے۔ جیسے آج بدھ ہے۔ آج آپ سفید لباس میں ہیں۔ کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں، ہرگز نہیں۔'' لڑکی حیران ہوئی جارہی تھی۔

''لیکن آپ کو کیسے معلوم؟''

''اس طرح کہ اگر میں نے آپ کو بتا دیا تو آپ ناراض ہوجائیں گی۔'' اس نے کہا۔ ''مزید مجھ پر کوئی الزام بھی عائد کردیں لیکن جو کچھ بھی ہے۔ وہ میرے لیے جاننا بہت ضروری تھا کیونکہ میں اپنے آئندہ ناول میں آپ کا کردار پینٹ کررہا ہوں۔''

''واہ، میرے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔'' لڑکی اچھل پڑی۔ ''بتائیں اور کیا کیا جانتے ہیں؟''

''اور بھی بہت کچھ۔'' اس نے کہا۔

''مثال کے طور پر؟''

''مثال کے طور پر یہ کہ آپ کو رات دیر تک جاگنے کی عادت ہے لیکن حیرت انگیز طور پر آپ صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں۔''

''خدا کی پناہ۔ یہ سب آپ کیسے جانتے ہیں؟'' لڑکی کی حیرت بڑھتی جارہی تھی۔

''اگر میں نے یہ راز بتا دیا تو ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے گالیاں دینے لگیں۔ بری طرح ناراض ہوجائیں۔''

''پھر بھی پتا تو چلے۔''

''میں اپنے کمرے کی کھڑکی سے آپ کو دیکھتا رہتا ہوں۔'' زبیر نے بتایا۔

لڑکی اچانک خاموش ہوگئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ وہ کرسی پر پہلو بدل کر رہ گئی۔

''ناراض ہوگئیں نا؟'' زبیر نے پوچھا۔

''کیا آپ کے خیال میں یہ کوئی اچھی بات ہے کہ آپ اس طرح کسی غیر لڑکی کے کمرے میں جھانکتے رہتے ہیں؟''

''میں آپ کو یہ بتادوں کہ آج میں وہ کھڑکی بند کروا رہا ہوں۔'' زبیر نے کہا۔ ''کیونکہ میرا کام مکمل ہوگیا ہے۔''

''کیسا کام؟''

''یہی کسی لڑکی کے شب و روز کے مشاغل کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بارے میں جاننے کا۔ اب میں اپنے ناول میں آپ کا کردار پوری جزئیات کے ساتھ لکھ سکوں گا۔'' زبیر نے کہا۔

''کمال ہے۔ آپ نے صرف اپنے ناول کے لیے اخلاقی حدیں پار کرلیں۔'' لڑکی نے کہا۔ ''جانتے ہیں۔ میں یہی کنفرم کرنے آپ کے پاس آئی تھی۔ یہ درست ہے کہ میں نے آپ کے ناولز پڑھے ہیں۔ آپ کی فین بھی ہوں۔ مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ آپ اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں اور آپ کا فلیٹ میرے فلیٹ کے سامنے ہے۔ آپ کی خواب گاہ کی کھڑکی میری خواب گاہ میں کھلتی ہے لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ آپ جیسا سوبر رائٹر اپنی کھڑکی سے مجھے اس طرح دیکھ رہا ہوگا جو کسی بھی طور مناسب نہیں ہے۔''

''کیا آپ کو برا لگا؟'' زبیر نے پوچھا۔

''کیا برا نہیں لگنا چاہیے.....؟'' لڑکی بھڑک اٹھی تھی۔ ''مجھے شبہ ہوگیا تھا کہ اس طرح مجھے جھانک جھانک کر دیکھنے والے آپ ہی ہیں لیکن میں ڈائریکٹ کسی پر الزام نہیں لگا سکتی تھی۔ اسی لیے میں یہاں آئی اور آپ نے جوش میں آکر خود ہی سب کچھ بتا دیا۔ کیا فائدہ ایسے رائٹر ہونے کا۔ جب آپ کو اخلاقیات ہی سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ کتنی بری اور شرم کی بات ہے کہ ایک غیر مرد کسی لڑکی کے بیڈروم میں جھانکتا رہتا ہے۔''

زبیر خاموش ہوکر اس کی باتیں سنتا رہا۔

لڑکی ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ اس نے لڑکی کو سب کچھ بتا کر حماقت کی تھی۔

''بتائیں نا۔ کیا جواز ہے آپ کے پاس؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''جب آپ نے سب کچھ معلوم کرلیا ہے تو نام بھی معلوم کرلیتے۔'' لڑکی نے کہا۔

''چلو یہ بھی بتا دوں۔ تمہارا نام راحیلہ ہے۔'' زبیر نے کہا۔

''حد ہوگئی۔''

''پلیز دو منٹ کے لیے میری بات سن لو۔ پھر تمہیں جواز بھی معلوم ہوجائے گا۔''

''کمال ہے۔ اس پر بھی جواز؟''

''ہاں۔ پلیز میری بات سن لو۔''

''چلیں بتائیں۔ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ خدا کا شکر کریں کہ میرے ساتھ میرا بھائی نہیں آیا۔ وہ ایک نمبر کا خردماغ ہے۔ وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ آپ کتنے بڑے رائٹر ہیں۔''

''مہربانی تمہاری۔''

''چلیں بتائیں۔''

''راحیلہ! میں ایک تنہا انسان ہوں۔ بہت محدود سی زندگی ہے میری۔ بس یہ کمرا ہی میرے لیے سب کچھ ہے۔ میں اس فلیٹ سے بہت کم باہر جاتا ہوں۔ زندگی میں کوئی چارم نہیں ہے۔ کوئی خوشی نہیں ہے۔ کوئی دل بہلانے والی بات نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ باہر کی دنیا میں کیسے کیسے کردار ہوا کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔''

''محترم! یہ تو کوئی جواز نہیں ہوا نا۔''

''ہاں، یہ کوئی جواز نہیں ہوا لیکن آگے بھی تو سن لو۔''

''چلیں بتائیں۔''

''اب ایک اکیلا اداس اور ڈیپریسڈ انسان اور کیا کرے۔ اس کو بھی تو جینے اور خوش ہونے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔''

''اور یہ خوشی آپ ایک غیر لڑکی کو اس کے کمرے میں دیکھ کر حاصل کیا کرتے ہیں؟'' لڑکی کے لہجے میں طنز تھا۔

''نہیں راحیلہ! تم مجھ کو غلط سمجھ رہی ہو۔''

''میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ ایک مرد میرے کمرے میں جھانکا کرتا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی مرد تمہارے کمرے میں نہیں جھانکتا۔'' زبیر نے کہا۔

''کیوں بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ سب کچھ اعتراف بھی کرلیا پھر بھی یہ کہہ رہے ہیں۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نے کبھی تمہارے کمرے میں نہیں جھانکا۔''

''تو پھر یہ سب کیا ہے؟''

''تمہارے کمرے میں میری ملازمہ جھانکتی ہے اور وہی سب کچھ بتاتی رہتی ہے۔ میں نے اسی کی باتیں سن سن کر اپنے ذہن میں تمہاری تصویر بنالی ہے۔ اس نے مجھے پوری تفصیل سے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے اور میں اس کی باتیں سن کر نوٹ کرتا رہتا ہوں تاکہ ناول میں لکھ سکوں۔''

''واہ۔ یہ تو آپ کا نیا پینترا ہے۔''

''نہیں راحیلہ! یہ کوئی پینترا نہیں ہے۔ یہ سچائی ہے۔ میں کسی کے کمرے میں جھانک ہی نہیں سکتا۔''

''وہ کیوں؟''

''اس لیے کہ میں دیکھ ہی نہیں سکتا۔ میری آنکھیں نہیں ہیں۔'' زبیر نے اپنا چشمہ اتار دیا تھا۔ وہ نابینا تھا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کر دیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہو جائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولو گے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جا سکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ چہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس کے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفرِ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کر دیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے میل تال اور محبتوں کے بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

دوسرا اور آخری حصہ

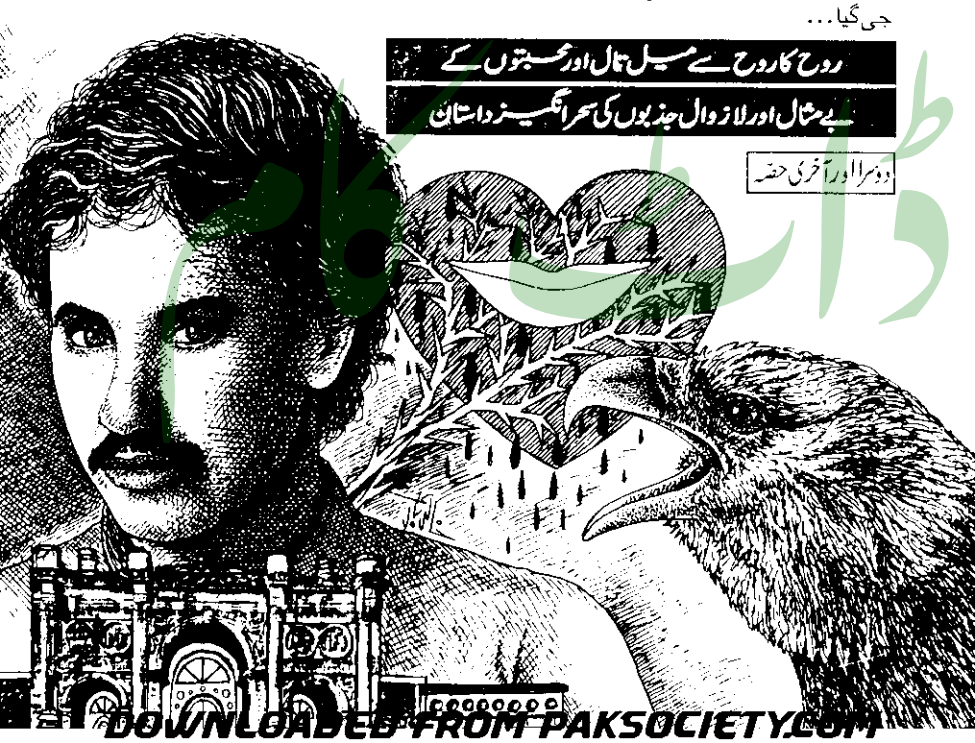

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شاہ زمان جب سے کراچی سے لوٹا تھا، سویرا کو اس کا رویہ بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کرتی تھی۔ ماروی کے نکاح کے بارے میں دونوں میں بس سرسری سی بات ہوئی تھی۔ ابھی پچھلے ماہ میں شاہ زمان نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے کہا تھا..... کہ پھپھو عالیہ اور رمشا کو اب یہاں نہیں رہنا چاہیے..... اس میں ہماری ہی بے عزتی ہے۔ تو سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوگئی تھی۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا..... مگر اگلے چند دنوں میں پھپھو عالیہ اور رمشا حویلی سے کوچ کر گئی تھیں۔ سادہ لوح سویرا نہیں جانتی تھی کہ اس کا ''بڑا سائیں'' دوسری شادی کی راہیں ہموار کر رہا ہے۔ وہ تو بس اس کے ہر فیصلے کے آگے سر جھکاتی چلی جا رہی تھی..... یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی شاہ زمان کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔

یہ بات سویرا کو پریشان کر رہی تھی۔ کیا عورت صرف مرد کی خدمت گزاری کے لیے بنی ہے؟ اس کو خوش رکھنا اس کا خیال رکھنا..... اس کی ضرورتیں پوری کرنا اور مرد کا جب دل چاہا ٹشو پیپر کی طرح اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے..... وہ ایسا ٹشو پیپر نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے تو شادی ایسے آدمی سے کی تھی جو اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اس کے دل میں رہنے کے لیے ہی تو سندھ یونیورسٹی سے اٹھ کر چوڑیرو آ گئی تھی مگر حالات کچھ اور اشارہ کر رہے تھے..... تقدیر کی کتاب کے ورق تیز آندھی کی زد میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور ایسے صفحے نگاہوں کے سامنے آنا چاہ رہے تھے جن میں..... سویرا کے لیے درد ہی درد لکھا تھا..... اور یہ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پوری حویلی میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ چوڑیرو حویلی اور حضور چانڈیو کے بیچ پھر کوئی نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے مگر اس تنازعے کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو خبریں گردش کر رہی تھیں اور جو قیاس لگائے جا رہے تھے، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ پھر سے باز کا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ پرندے کی رقم وصول کرنے کے باوجود چوڑیرو حویلی والے پرندہ حضور چانڈیو کے حوالے نہیں کر رہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ بدعہدی تھی مگر معاملے کی اصل حقیقت چند لوگوں کو معلوم تھی اور وہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ سننے میں یہ بھی آ رہا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان کشیدگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ تصادم کا خطرہ تھا۔ کچھ سمجھدار بڑے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ایک جرگہ بلایا اور دونوں پارٹیوں کے صرف بڑے اس جرگے میں شریک ہوئے۔ باتوں باتوں میں آوازیں بلند ہو گئیں۔ لہجے تلخ تر ہو گئے..... بندوقیں نکل آئیں..... مگر پھر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پیر فضل، رحیم سائیں نے اپنی پگڑیاں اتار کر پیروں میں رکھ دیں..... کچھ ضمانتوں، کچھ شرائط کے ساتھ یہ جرگہ ختم ہو گیا۔

چوڑیرو حویلی والوں کو دو ہفتے کی مہلت چاہیے تھی۔ وہ بالآخر مل گئی.....

اس مہلت کے بعد یوں لگتا تھا..... حویلی میں چھائی تناؤ اور پریشانی کی کیفیت ختم ہو گئی ہے۔ ایک دن حویلی کے زنان خانے میں سیبوں کے چار کریٹ پہنچانے تھے..... ظفری..... دلاور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا..... مگر ظفری ضد پر اڑ گیا۔ اس دن دلاور نے زنان خانے کو پہلی دفعہ اندر سے دیکھا۔ جس وقت وہ کریٹ برآمدے میں رکھ رہے تھے، اوپری منزل کی بالکونی جو صحن کی طرف کھلتی تھی، اس پر سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا لگتا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ دلاور سے ملی، سویرا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی..... دلاور دل تھام کے رہ گیا۔ فنا کی دیواروں سے باہر کے منظر نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

اس نے جلدی سے کریٹ وہاں رکھے اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ظفری اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ ابھی دوپہر تھی، رات ہونے میں کافی وقت تھا..... پستہ قد کانٹوں والی بیری والی جگہ آباد کرنے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔

ظفری کی واپسی وہاں سے ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ آتے ہی چوکڑی لگا کر بستر پر بیٹھ گیا بولا۔

''اتنے دنوں سے جس بات نے میری نیند حرام کی ہوئی تھی، مجھے وہ پتا چل گئی۔'' دلاور نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ ''تمہیں معلوم ہے اس دن جب سب لوگ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹ رہے تھے تو چھوٹے سائیں شیرو کے ساتھ بڑی گہما گہمی میں وہاں آئے تھے..... پتا ہے کیا خبر لائے تھے؟''

''مجھے کیا پتا.....؟'' دلاور بے زاری سے بولا۔

''جو باز انہوں نے ترنڈا کی سفید حویلی کے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا، وہ وہاں سے پھر چوری ہو گیا۔''

''اوہ خدایا..... یہ کیا کہہ رہے ہو؟''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔

''جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے..... اس خبر نے چوڑیرو حویلی کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلا شک شوکت سیال اور حضور چانڈیو پر کیا گیا۔ باز کی چوری پوشیدہ رکھی گئی اور بڑے سائیں نے اپنے گماشتے ہر طرف بھگائے..... بہت جلد ان کو معلوم ہو گیا کہ باز حضور چانڈیو نے چوری نہیں کرایا بلکہ اسے چوری کرنے والے لوگ کچے کے علاقے سے آئے تھے۔ وہ چوری شدہ باز اب راجن پور سے آگے پانی کے بہاؤ سے پار کچے کے علاقے میں ہے۔ پہلے پہلے تو یہ بات حضور چانڈیو سے چھپائی گئی۔ ایک ہفتے تک انہیں جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دیے جاتے رہے مگر جب باز..... پہنچانے والی مہلت ختم ہوئی..... تو حضور چانڈیو نے سنگین نتیجے کی دھمکی دے دی۔ دونوں طرف سے کشیدگی بے حد بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی نئی جنگ شروع ہو جاتی، بیچ میں رحیم سائیں اور پیر فضل کود پڑے۔ انہوں نے ایک جرگے کا اہتمام کیا..... جرگے میں بھی بدمزگی ہو گئی۔ شوکت سیال بدزبان اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے شاہ فرمان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی..... دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں۔ فائر ہوتے ہوتے رہ گیا..... رحیم سائیں اور پیر فضل نے اپنی پگڑیاں اتار کر لڑنے والوں کے پاؤں میں پھینک دیں۔ اس خوفناک صورتِ حال سے نمٹنے کے بعد پیر فضل نے مخالفین کو صاف صاف بتا دیا کہ باز چوری ہو چکا ہے۔ ہم لوگ وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جیسے بھی ہو گا، وہ باز واپس کریں گے اور پھر باز کی واپسی کے لیے دو ہفتے کی مہلت مانگی گئی۔ وہ مہلت اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ اگر شاہ زمان وہ باز دو ہفتوں میں واپس نہیں کرتا تو تین کروڑ کی رقم..... اور خون بہا والی رقم فوری طور پر حضور چانڈیو کو واپس کی جائے.....''

ظفری خاموش ہوا تو دلاور کے چہرے پر حیرانی تھی۔ وہ بولا۔ ''تمہیں ان باتوں کا کہاں سے پتا چلا؟''

ظفری ہنس دیا۔ ''تم آم کھاؤ پیٹر مت گنو..... ہماری پہنچ بھی حویلی کے اندر تک ہے۔'' وہ آنکھ میچ کے بولا۔

☆☆☆

اس دن شاہ زمان، دلاور کو فیروزہ والی کوٹھی کے اندر لے گیا۔ دلاور اک سائڈ پر کرسی پر براجمان تھا۔ دوسری طرف بڑی میز پر بھاری جسامت والا پٹھان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر چٹی سفید عورت بیٹھی تھی جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ ایک میلے سے چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا نام صغراں تھا۔ تیز طرار اور آنکھیں مٹکانے والی صغراں بولی۔

''مفید جان! بڑے سائیں کو تھوڑا وقت اور دو.....''

مفید جان ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ ''ام اپنی طرف سے دو سال دینے کو تیار ہے مگر..... گارنٹی کوئی نہیں ہے۔ وہ حرام کا پلا کسی وقت بھی پہنچ گیا تو..... گڑبڑ ہو جائے گا.....''

''مفید جان! گڑبڑ کو ہم سنبھال لیں گے..... مگر ابھی ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے..... میں صرف بیس بائیس دن ہی تو مانگ رہا ہوں.....'' شاہ زمان نے کہا۔

چٹی سفید عورت بولی۔ ''تم بیس بائیس دن کی بات کرتے ہو..... ہم ایک دو دن کی گارنٹی بھی نہیں دے سکتے..... ادھر ابھی..... ام سے صاف صاف بات کرو..... اور قصہ خلاص کرو..... پرسوں اگر تم برات لے کر آتا ہے تو ٹھیک..... ورنہ ہم یہ شادی کینسل کرے گا.....'' عورت جتنی خوبصورت اور نرم و نازک دکھتی تھی، اس کا لہجہ اتنا ہی کڑوا کسیلا تھا۔

صغراں بولی۔ ''بڑے سائیں! آپ ایسا کریں آج مشورہ کر لیں..... کل..... آ کر ان کو بتا دیں گے.....''

مشورہ کرنے کی بات پر شاہ زمان بھڑک اٹھا..... چوڑیرو حویلی کا ازلی جوشیلا خون اس کے دماغ کو چڑھ گیا۔ غصے کو حتی الامکان دباتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کس سے مشورہ کرنا ہے..... دنیا مجھ سے آ کر مشورہ مانگتی ہے۔ میں یہیں کھڑے کھڑے ہر فیصلہ کر سکتا ہوں۔ وہ تو بس بیچ میں ایک اڑچن آ گئی ہے۔ نہیں تو.....''

طیش میں آنے کے بعد شاہ زمان نے جو فیصلہ کیا وہ سراسر مفید جان وغیرہ کی مرضی کے مطابق تھا۔ طے ہوا کہ صرف دو دن بعد ہفتے کی شام کو شاہ زمان دس پندرہ خاص بندوں کے ساتھ آئے گا اور گل لالہ کو نکاحی بنا کر لے جائے گا۔ اس نے مفید جان وغیرہ کو تاکید کی کہ مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ اس نے ایک موٹی رقم بھی اس سلسلے میں مفید جان کو دے دی۔

اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا شاہ زمان نے کہا تھا۔ ایک شام بڑی رازداری کے ساتھ شاہ زمان خود بروگل لالہ کو اپنی دوہٹی بنا کر چوڑیرو حویلی میں لے آیا۔ جن لوگوں نے نکاح میں شرکت کی تھی ان میں بڑی آپا اور نگینہ بیگم کے علاوہ دو تین ملازمائیں بھی شامل تھیں جو زرق برق کپڑوں میں شاہ زمان کی رشتے دار ہی دکھائی دیتی تھیں۔

یہ ظلم سویرا پر ہوا تھا لیکن وہ جیسے پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔ دو تین دن سے بالکل سکتہ زدہ سی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے یہ سب کچھ سہنا ہے اور سہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

اس حویلی کی دیواریں بڑی اونچی تھیں۔ آج کل اس حویلی میں صرف ایک ناک کٹی نگینہ بیگم موجود تھی لیکن اس سے پہلے بھی یہاں نہ جانے کتنی ناک اور کان کٹیاں اور زندہ لاشیں چلتی پھرتی رہی تھیں، وہ سب کچھ خاموشی سے جھیل گئی تھی، آپا نے اسے یہ تسلی بھی دی تھی کہ ہوسکتا ہے کہ کُڑی کو تین چار مہینے پاس رکھ کر شاہ زمان اسے فارغ کردے۔ یعنی تحفے تحائف دے کر طلاق دے دے مگر ایک راستہ تو کھل ہی گیا تھا نا، ایک کو طلاق ہو بھی جاتی تو تیسری سے بیاہ ہوسکتا تھا۔

دلاور بھی اس صورتِ حال پر ششدر تھا۔

نئی دوہٹی باقاعدہ سجی سجائی اونٹ گاڑی پر بیٹھ کر چوڈیرو حویلی میں آئی تھی۔ شاہ زمان نے حویلی کے چھوٹے بڑے ملازموں میں خوب پیسے بانٹے تھے۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی لالی تھی۔ چند ماہ پہلے سویرا نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور اس کی غیر حاضری میں ماروی کا نکاح پڑھوا کرا سے چلتا کیا تھا...... اس نے بے خوفی کے ساتھ...... شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے کی حرکت کی تھی۔

اس کے جواب میں شاہ زمان نے خاموشی اختیار کی تھی۔ تھوڑا عرصہ صبر کیا تھا اور پھر انتقامی طور پر وہ اپنے سے کئی سال چھوٹی لڑکی کو اپنی دلہن بنا کر اس حویلی میں لے آیا تھا۔ اس رات گلِ لالہ کے پاس جانے سے پہلے وہ سویرا کے پاس آیا تھا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''سویرا! عورتیں ہمیشہ سے خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی آئی ہیں۔ وہ یہ تصور کرلیتی ہیں کہ وہ مردوں کو اپنے اشاروں پر چلاسکتی ہیں مگر میں آج تمہیں بتاتا ہوں ان میں اکثر احمق ہوتی ہیں تمہاری طرح۔'' وہ انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

سویرا بت بنی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گرتے رہے۔ وہ اس زہر کا پیالہ لبوں سے لگائے بیٹھی تھی جس کو پینے کا تصور بھی اس کے وہم وگمان میں نہیں تھا۔ وہ سویرا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''سویرا! تم نے سوکن سے بچنے کے لیے مجھ سے ماروی چھینی لیکن سوکن پھر بھی آئی اور یہ سلسلہ ابھی آگے چلے گا۔''

اس قیامت خیز رات کے بعد سویرا مرگئی۔ سندھ یونیورسٹی میں چہلیں کرنے والی' ہر دم مسکرانے والی سویرا مرگئی۔ اس دن کے بعد وہ ایک زندہ لاش کے مانند ہوگئی۔ وہ زندگی کے تمام معمولات نبٹا رہی تھی مگر اس کے وجود میں کوئی چیز تھی جو فنا ہوگئی تھی۔

شاہ زمان نئی بیوی کے نشے میں مست تھا۔ وہ جو کبھی سویرا کے لیے آہیں بھرا کرتا تھا، آج یوں لاتعلق بنا پھرتا تھا جیسے اس نام کی کوئی لڑکی اس حویلی میں رہتی ہی نہ ہو۔

دلاور دو تین دفعہ گاڑی پر سویرا کو بہاولپور...... عالیہ پھپھو سے ملوانے کے لیے لے کر گیا مگر سارے رستے سویرا نے دلاور سے کوئی بات نہیں کی۔ بس گم صم سی بیٹھی باہر خالی نگاہوں سے گزرتے مناظر کو دیکھتی رہتی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھنا دلاور کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ سویرا خود کو دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورت تصور کرنے لگی تھی...... مگر اس کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کوئی ہزار ہا شدتوں کے ساتھ اسے چاہتا ہے۔ اس کی ایک مسکان کے بدلے اپنی جان لٹا سکتا ہے۔ وہ اس عشق کی شدتوں سے ناواقف تھی جو دلاور کے سینے کی گہرائیوں میں موجزن تھا۔

ایک دن بہاولپور پہنچنے پر جب نڈھال سویرا گاڑی سے اتری تو اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔ دلاور اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھا۔ وہ بے ساختہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا' اس کے چہرے پر پھیلنے والے سائے اور آنکھوں کی بے قراری دیکھ کر سویرا حیران رہ گئی' ان بے قرار آنکھوں میں سیکڑوں افسانے رقم تھے۔ اس پریشان چہرے پر ہزاروں ایسی تحریریں نقش تھیں جو آج سے پہلے سویرا کو نظر نہیں آئی تھیں...... یا شاید...... یہ تحریریں ہمیشہ سے تھیں کبھی سویرا نے انہیں پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ایک سطر پڑھتی گئی اور دل کے نہاں خانے میں جو ندی تھی اور جس کی لہروں میں کبھی کبھار تلاطم پیدا ہوتا تھا، آج وہ تلاطم حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس میں موجود رنگ برنگی مچھلیاں اچھلنے کودنے لگیں۔

سویرا کھڑی ہوئی تو اس کے پاؤں میں لنگڑاہٹ تھی۔ اس نے سنبھلنے کے لیے سہارا لینا چاہا مگر دلاور کے علاوہ آس پاس کوئی ''سہارا'' موجود نہیں تھا۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے دلاور کا ہاتھ تھام لیا۔ دلاور نے ڈگمگاتی سویرا کو تھام لیا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر تک لے گیا۔ سویرا کی آنکھوں میں نمی تھی...... وہ نمی پاؤں کی تکلیف کی تھی یا دلاور کے سہارے کی...... دلاور یہ نہ جان سکا۔

واپسی پر سویرا قدرے بہتر تھی۔ اس نے خاموشی توڑ دی اور بولی۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

''بی بی جی...... کس بات کا......'' وہ عقب نما آئینے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں دیکھ کر بولا۔

''مجھے سہارا دینے کا.....'' وہ ممنونیت سے بولی۔

''میں تو آخری سانس تک آپ کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوں۔'' دل کی بات وہ زبان پر نہ لا سکا بولا۔.....

''بی بی جی.....! ایک بات بولوں۔'' سویرا کا سوالیہ انداز دیکھ کر کہنے لگا۔ ''بی بی جی.....! آپ خوش رہا کریں۔ آپ ایسے خاموش اور پریشان اچھی نہیں لگتیں.....''

سویرا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بالوں کی لٹ کو دھیرے سے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

''دلاور! خوش رہنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہے..... مگر..... میں زندگی سے دور ہوتی جا رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بے پناہ کرب امڈ آیا۔ دلاور اس کا غم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

اس کے جواب میں دلاور کے ذہن میں کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ شیشے کی بلند دیواروں کو پھاندنا نہیں چاہتا تھا..... وہ فنا کی چار دیواری سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلا دن دلاور کے لیے بڑا دھماکا خیز تھا۔ پوری حویلی میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے جب شاہ زمان نئے خریدے گئے اونٹوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ملازمین کی ایک فوج کھڑی تھی۔ دلاور بھی ان میں شامل تھا کہ صدر دروازے کی طرف سے ایک جیپ دھول اڑاتی ہوئی آئی۔ شاہ زمان کے پاس پہنچ کر وہ جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ اس میں سے دو بندوق بردار بڑی سرعت سے نکلے۔ انہوں نے جیپ کی پچھلی جانب سے جھک کر ایک زخمی آدمی کو نکال کر باہر لٹا دیا، وہ ٹیپو ٹیگر تھا۔ وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر وہاں کھڑے سب لوگ ششدر رہ گئے۔ شاہ زمان غصیلے لہجے میں دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اوے..... یہ کیا ہے..... کس نے زخمی کیا ہے اسے!''

''بس بہت گڑبڑ ہوگئی ہے جی۔'' بندوق بردار نے کہا، پھر وہ آگے کو جھک کر بڑی رازداری سے زمان کو کچھ بتانے لگا۔

ٹریگر سیریس حالت میں دکھتا تھا۔ شاہ زمان کے کہنے پر اسے فوری طور پر اسپتال بھجوا دیا گیا۔ شاہ زمان پریشانی میں پیشانی مسلنے لگا۔ اس نے شاہ فرمان کو فون ملایا اور اس سے بات کرنے لگا..... تھوڑی دیر بعد پیر فضل، شاہ فرمان کو لے کر حویلی پہنچ گیا..... تینوں سر جوڑ کر حویلی کی نشست گاہ میں بیٹھ گئے..... ایک گھنٹے بعد شاہ زمان نشست گاہ سے نکلا اور اس نے دلاور کو جلدی سے گاڑی نکالنے کا کہا۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ نزدیکی اسپتال میں تھے۔ ٹیپو ٹیگر آئی سی یو میں تھا اور ہوش میں تھا۔ شاہ زمان کو اندر جانے کی اجازت مل گئی اور کیوں نہ ملتی۔ اسپتال کا ایم ڈی اس کا نمک خوار اور اطاعت گزار تھا۔ دلاور باہر کھڑا کھڑکی سے سب دیکھنے لگا۔ ٹیپو ٹیگر شاہ زمان سے کوئی بات کر رہا تھا جسے شاہ زمان بڑے غور و انہماک سے سن رہا تھا۔ وقفے وقفے سے شاہ زمان اس سے کچھ پوچھنے بھی لگ جاتا..... یہ ملاقات آٹھ دس منٹ تک جاری رہی..... پھر شاہ زمان بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔

واپسی پر دلاور نے پوچھا۔ ''بڑے سائیں، ٹیپو بچ تو جائے گا؟''

شاہ زمان کسی خیال سے چونکا پھر تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے کچھ نہیں ہونے والا۔ ہیر شیر ہے وہ..... حضور چانڈیو کے قبضے میں اتنی دیر رہ کر بچ نکلا ہے تو کوئی بات تو ہے نا اس میں۔''

شاہ زمان چند سیکنڈ تک مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا پھر دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''جیپ ذرا سامنے، ان درختوں میں روکو۔''

دلاور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی جیپ روک دی۔ سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سورج مغربی افق میں چہرہ چھپا چکا تھا۔ دلاور سوالیہ نظروں سے شاہ زمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''دلاور! میں نے ایک دن تجھ سے کہا تھا نا..... کہ تجھ سے ایک بہت خاص کام لینا چاہتا ہوں۔ بس سمجھو وہ وقت آ گیا۔ تو اپنے آپ کو تیار کر لے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ کام بس تو ہی کر سکتا ہے۔''

دلاور کی دھڑکن انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ بولا۔ ''بڑے سائیں! آپ حکم کریں، جان بھی حاضر ہے۔''

شاہ زمان نے سگریٹ سلگایا اور اگلے آٹھ دس منٹ میں شاہ زمان کو جو کچھ بتایا، وہ تحیر خیز تھا۔ یہ بات تو خیر دلاور پہلے ہی جان چکا تھا کہ باز چوری ہو چکا ہے، مگر یہ خبر اسے شاہ زمان کی زبانی ملی کہ ٹیپو ٹیگر کے زخمی ہونے کی وجہ وہ باز ہی ہے۔ دراصل دو دن پہلے شاہ زمان نے اپنے اس دستِ راست کو باز کی بازیابی کے لیے ہی کچے کے ایک دور دراز گوٹھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ وہاں کوئی بہت بڑی اور پرانی حویلی تھی جسے کچا قلعہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علاقے کے ایک بدنام شخص ساجے بھٹل نے وہ باز کچا قلعہ میں رکھا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوا تھا اور وہاں اس کی حفاظت کا محفوظ انتظام تھا۔ شاہ زمان نے جو کچھ کیا تھا پلاننگ کے ساتھ کیا تھا مگر پلاننگ کامیاب نہیں ہوئی اور ٹریگر شدید زخمی ہو کر واپس آ گیا تھا۔ دراصل کل رات، شب برات کی تھی۔ شاہ زمان وغیرہ کو معلوم ہوا تھا کہ اس تہوار کے موقع پر کچا قلعہ میں ساجے بھٹی کے بس دو چار پہریدار ہی موجود ہوں گے اور اگر اس موقع کا فائدہ اٹھا کر شب خون مارا جائے تو باز کو وہاں سے نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیپو ٹریگر پرسوں بڑی رازداری سے اس مہم پر نکلا تھا مگر وہاں پہریدار توقع سے زیادہ تھے۔ یہ لوگ کچا قلعہ کے اندر بھی داخل نہ ہو پائے تھے اور دو طرفہ فائرنگ میں ٹیپو ٹریگر کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

اور اب شاہ زمان یہ کام دلاور کے سپرد کرنے جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس کا علم دلاور کو تھوڑی دیر بعد ہوا۔ شاہ زمان نے کچھ دیر تک سوچ میں غرق رہنے کے بعد کہا۔

”دلاور! کچا قلعہ کا سارا نقشہ میرے پاس ہے۔ یہ ساری عمارت ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ تین طرف تو ساجے کے خطرناک کارندے پہرے پر رہتے ہیں لیکن چوتھی طرف پہرے کا نظام اتنا سخت نہیں ہے۔ اس طرف ایک بڑی برساتی جھیل ہے۔ چوڑائی کوئی آدھ فرلانگ کے قریب ہوگی، لمبائی ایک ڈیڑھ میل ہے۔ اگر کوئی اچھا تیراک چوڑائی کی طرف سے اس جھیل کو احتیاط سے پار کر لے تو کچے قلعے کی پچھلی طرف سے اندر گھس سکتا ہے۔“

”احتیاط سے پار کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے جناب؟“

”میری معلومات کے مطابق یہ حرامزادے رات کے وقت بھی جھیل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہاں جنریٹرز ہیں اور سرچ لائٹس وغیرہ بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ جھیل پار کرنے والے کو پانی کے اوپر آئے بغیر تیرنا پڑے گا اور پتا نہیں کیوں...... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تمہارے اندر اس کام کو کرنے کی خداداد صلاحیت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، مجھے وہ منظر زندگی بھر نہیں بھولے گا......“

اس کے بعد شاہ زمان اس واقعے کی تفصیل میں کھو گیا جب دلاور نے زبردست پیراکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ زمان اور سویرا کو پانی کی بے رحم موت سے بچایا تھا۔ اب ساری کڑیاں مل رہی تھیں اور بات دلاور کی سمجھ میں آ رہی تھی ...... وہ دونوں جیپ کے نیم گرم ماحول میں بیٹھے تھے۔ شاہ زمان اور دلاور کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوئی۔ شاہ زمان نے دلاور کو کچا قلعہ کا وہ نقشہ بھی دکھایا جو ہاتھ سے بنایا گیا تھا۔ اس میں اس خاص جگہ کی نشاندہی بھی تھی جہاں وہ نہایت قیمتی پرندہ موجود تھا۔ ایک ایسا پرندہ جس کے حصول کے لیے دو شخصوں نے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ پرندے کو کچا قلعہ کے ایک محفوظ حصے میں رکھا گیا تھا لیکن اگر کوئی شخص پانی کی طرف سے کچا قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے لیے پرندے تک رسائی چنداں مشکل نہ رہتی اور یہ بڑا اہم نکتہ تھا۔ شاہ زمان اور دلاور نے اس سارے معاملے پر بے حد تفصیل سے بات کی اور بہت سی جزئیات طے کر لیں۔

☆☆☆

یہ دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ وہ ایک سرد تاریک رات تھی۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تھا۔ دلاور اپنے ساتھی بالے کے ساتھ شام کے فوراً بعد ہی کچا قلعہ کے نواح میں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں، ایک ایسے لوڈر کے ذریعے یہاں آئے تھے جو یہاں دودھ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے لوڈر میں جان بوجھ کر نقص پیدا کر دیا تھا اور اسے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اقبال عرف بالا لوڈر میں ہی تھا۔ دلاور جھیل کے کنارے سرکنڈوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے چست پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک فٹ کا دو دھاری خنجر اس کی ریگ زین کی جیکٹ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ واٹر پروف ٹارچ اور چھوٹا پسٹل بھی تھا جسے پانی کی زد سے بچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچا قلعہ کا نقشہ بھی ایک پولیتھین میں لپیٹ کر اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا واٹر کولر تھا جسے دلاور نے بیلٹ کے ذریعے اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ یہاں اس دنیا میں تھا بھی کون اس کو رونے والا۔ اسے وہ مہربان عورت یاد آئی جس کے کچھ بال سفید اور کچھ مہندی رنگے تھے۔ وہ اس کی ماں کی طرح تھی۔ اس عورت سے دلاور کے دل کے بہت سے تار جڑے ہوئے تھے۔ جب وہ عورت اس دنیا سے رخصت ہوئی تو بہت سے تار ٹوٹ گئے لیکن بہت سے اب بھی سلامت تھے۔ اب ایک اور عورت سے اس کے دل کے تار جڑے تھے اور یہ سویرا تھی اور یہ تار اتنے مضبوط تھے کہ شاید...... دلاور کی موت پر بھی نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔ وہ ان دنوں جو کام بھی کرتا تھا، جس طرف بھی جاتا تھا، اسے اپنے سامنے سویرا ہی نظر آتی تھی۔ اب بھی یوں تو وہ شاہ زمان کے کہنے پر ایک ”کام“ کے لیے نکلا تھا مگر اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سویرا کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خاطر سب کچھ کررہا ہے۔ یہ کیسا ناتا تھا، کیسا رشتہ تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، جب سویرا کی شادی ہوگئی تو دلاور نے چوڑیرو حویلی چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا مگر پھر شاہ زمان کے اصرار نے اسے روک لیا اور شاید وہ خود بھی رک جانا چاہتا تھا۔ خود کو اذیت دینے کے لیے یہ ایک ایسی خواہش تھی جسے وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا اور اب تو صورتِ حال ایسی ہوگئی تھی کہ دلاور ہر صورت یہاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، شاہ زمان کی دوسری شادی کے بعد سویرا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے، مرجھاتی جارہی ہے، اس کی جڑیں سوکھ رہی ہیں۔ وہ اسے ایسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر نہیں جاسکتا تھا۔ وہ اس کے آس پاس رہنا چاہتا تھا...... حویلی میں رہنا چاہتا تھا اور حویلی میں رہنے کے لیے اسے شاہ زمان کا اعتماد جیتنا تھا۔ اس پر ثابت کرنا تھا کہ وہ اس کی ضرورت ہے اور یہی ثابت کرنے کے لیے وہ آج دیوانہ وار اس سرد جھیل کے کنارے موجود تھا۔

اس نے جھیل کی خاموش سطح کو دیکھا ...... ہاں وہ پانیوں کا شناور تھا۔ سرفودم گھٹ کے ''ساتھ'' اور اس کی سخت تربیت نے اسے پیراکی کے ہنر میں طاق کردیا تھا...... وہ گہرے پانیوں کی مچھلی کی طرح ہوگیا تھا۔ گہرے پانیوں کی مچھلی جو سخت دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے۔ بس اپنا یہی ایک ہنر تھا جس پر وہ ناز کرسکتا تھا۔

اللہ کا نام لے کر وہ پانی میں اترا۔ غوطہ لگایا اور نیچے ہی نیچے تیرنا شروع کردیا۔ اس کے پاس قدرت کا تحفہ تھا۔ وہ پانیوں کے نیچے سانس روک لیتا تھا اور اتنا روکتا تھا کہ کناروں پر کھڑے اس کی زندگی سے مایوس ہوکر چلانے لگتے تھے۔ آج بھی وہ اپنے اس Skill کو استعمال کررہا تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنا سر سرد پانی سے باہر نکالا ...... اپنے رخ کا تعین کیا اور پھر ڈبکی لگادی۔ دوسری مرتبہ بھی قریباً پانچ منٹ بعد ہی وہ بے آواز ...... سطح آب پر ابھرا۔ ایک فکس سرچ لائٹ کی روشنی جھیل کے اس حصے کو مسلسل روشن رکھے ہوئے تھی۔ اوپر فصیل نما دیوار پر کوئی پہریدار حرکت کررہا تھا۔ وہ ایک بار پھر پانی میں روپوش ہوگیا ...... اس مرتبہ اسے زیادہ دیر پانی میں رہنا تھا۔ اس کے پھیپھڑے آکسیجن کی طلب میں پھٹنے لگے لیکن یہ مشکل ترین مرحلہ بھی بالآخر گزر گیا۔

وہ بلند دیوار کی جڑ میں اس بارشی پانی کے پائپ کے پاس پہنچ چکا تھا جس کی نشاندہی نقشے میں موجود تھی۔ یہ کوئی 30 انچ قطر کا قدیم پائپ تھا۔ شاید انگریزوں کے دور کا۔

دلاور اس پائپ میں داخل ہوا اور اپنی پنسل ٹارچ روشن کرلی۔ پائپ کے اندر بھی پانچ چھ انچ تک بدبودار پانی موجود تھا۔ جگہ جگہ جالے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مینڈکوں اور چوہوں سے بھی سابقہ پڑا مگر وہ ان سارے مسائل کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوکر آیا تھا۔ وہ کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر عمارت کے ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچ گیا جہاں کئی چھتوں کے پرنالے آکر گرتے تھے۔

اب دلاور نے اپنا پستول نکال لیا اور ہر آمدہ خطرے کے لیے تیار ہوگیا۔ رات کے اس پہر کچا قلعہ کے بیشتر مکین یقیناً سورہے تھے۔

حقیقی خطرے سے دلاور کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ عمارت میں قریباً سو میٹر اندر آچکا تھا۔ ایک پرچھائیں اس پر جھپٹی۔ یہ ایک مسلح شخص تھا۔ دلاور کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پھرتی سے نہ صرف خود کو حملہ آور کے وار سے بچایا بلکہ اسے گھما کر اتنی زور سے ایک دیوار کے ساتھ مارا کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمیں بوس ہوگیا۔

آواز پیدا ہوئی تھی۔ دلاور نے ایک تاریک کونے میں چھپ کر کچھ دیر ردعمل کا انتظار کیا پھر مطمئن ہوکر باہر نکل آیا۔ پہریدار کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک تو ہوش میں نہیں آئے گا۔ دلاور نے اس کی شلوار قمیص کی تلاشی لی۔ واسکٹ کی ایک جیب سے چابیوں کا گچھا نکلا۔ ان میں سے ایک چابی بھاری بھرکم محرابی دروازے کی تھی۔ دلاور نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ بے ہوش پہریدار کو گھسیٹ کر تیل کے ڈرموں کے پیچھے گھسیڑا اور پنسل ٹارچ سے نقشہ دیکھنے کے بعد آگے بڑھنے لگا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

سب کچھ ٹھیک جارہا تھا۔ دلاور کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مطلوبہ کمرے تک پہنچ جائے گا۔ مزے کی یہ بات تھی ...... سامنے کی طرف تو ہر طرح کے حفاظتی انتظامات تھے لیکن عقبی جانب کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کمرے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پالتو طوطوں کی چوں چوں سنائی دی۔ بے شک یہی باز والا کمرا تھا۔ دلاور نے پستول جیکٹ میں رکھ کر دودھاری خنجر ہاتھ میں لے لیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے غنودگی بھری آواز آئی۔

دلاور نے دوبارہ دستک دی۔ ایک جوان لڑکے نے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دروازہ کھولا اور بچی بچی آنکھوں سے دلاور کو دیکھا۔ ایک دم اس کی نگاہ دلاور کے چمک مارتے خنجر پر پڑی۔ اس نے شاید چلّانے کے لیے ہی منہ کھولا تھا لیکن اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ دلاور نے اسے جکڑ لیا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دائیں ہاتھ میں خنجر تھا اور یہ لڑکے کی عین شہ رگ پر تھا۔

لڑکے کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ دبلا پتلا لیکن زور والا تھا۔ دلاور نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا اور پھنکارا۔ ''زور مارو گے تو گردن کاٹ دوں گا، ابھی لاش پڑی نظر آئے گی۔''

وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور دلاور کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی دلاور نے پھر سرسراتی سرگوشی کی۔ ''گردن کٹ جائے گی تیری کسی کا کچھ نہیں جائے گا۔''

لڑکے میں ہوش کم اور جوش زیادہ تھا۔ وہ پھر بے طرح پھڑکا، دونوں گرتے گرتے بچے۔ اب دلاور کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ خنجر استعمال کرتا مگر لڑکے کی کم عمری دیکھتے ہوئے اسے ترس آیا۔ کسی ماں کا بیٹا تھا، ابھی تو اس نے جینا شروع کیا تھا..... ابھی تو شاید کسی سویرا نے اس کی زندگی میں آنا تھا، ابھی تو شاید.....

اس نے گردن کے بجائے لڑکے کے پیٹ کے نچلے حصے کو نشانہ بنایا۔ خنجر پہلے لڑکے کے سویٹر پھر کپڑے اور پھر گوشت میں گھسا۔ لڑکے کی خطرناک مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ تب دلاور نے پستول کے دستے سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں اور بوسیدہ فرش پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ اردگرد کی آہٹیں سنتا رہا پھر کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں اس مستطیل کمرے میں تین چار چھوٹے بڑے پنجرے تھے۔ ایک بڑے پنجرے میں کونجیں تھیں۔ ایک میں طوطے تھے۔ ایک بڑے پنجرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں ایک مقامی شکرا بند تھا، دوسرے میں وہ نایاب عقاب تھا جس نے ان گنت لوگوں کی زندگی حرام کر رکھی تھی۔ وہ واقعی بے مثل پرندہ تھا۔ پروں کی چوڑائی حیران کن تھی۔ اسے دیکھ کر دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوتی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ ایک بار پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

اس پنجرے میں اس نایاب پرندے کے آرام و آسائش کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ اسے بے قراری سے بچانے کے لیے اس کے سر پر مخمل کی اندھیاری چڑھائی گئی تھی۔ اس اندھیاری نے دلاور کا کام آسان کر دیا۔ دلاور نے اپنی پشت سے بندھا ہوا چھوٹا واٹر کولر اتارا، اس کا ڈبل ڈھکنا کھولا اور کولر کو پنجرے کے بالکل سامنے کر دیا۔ جونہی دلاور نے پنجرے کا دروازہ کھولا، پرندہ آگے بڑھا..... چند لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر کولر میں داخل ہوگیا۔ دلاور نے کولر کے دونوں ڈھکنے بند کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس واٹر کولر میں اتنی آکسیجن تو بہرحال موجود تھی کہ یہ نایاب پرندہ اگلے ایک گھنٹے تک زندہ سلامت رہ سکتا تھا۔

لڑکا بے ہوش تھا۔ اس کے زخم سے خون تو بہہ رہا تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ دلاور امید کر سکتا تھا کہ اسے بچا لیا جائے گا۔ واٹر کولر کو ایک بار پھر اپنی پشت سے باندھنے کے بعد دلاور نے پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور واپس چل پڑا۔ ابھی وہ ڈکیتوں کے اس ڈیرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی جھیل میں بھی نہیں اترا تھا لیکن اس کی چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگی تھی کہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہوچکا ہے۔

☆☆☆

دلاور نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ بغیر کسی بڑے خون خرابے کے وہ ساجے جیسے خطرناک شخص کی کچھار میں گھس کر اس کو ایک ''زبردست چیز'' لگا آیا تھا اور گوہر مطلوب حاصل کرلیا تھا۔ وہ باز واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور اگر اس کی وجہ سے دو شیخ دست و گریباں تھے تو بات سمجھ میں آتی تھی۔

باز کو شاہ زمان کے حوالے کرنے کے بعد دلاور ایک طرح سے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوگیا تھا۔ اس کے بعد دلاور نے اس امر میں زیادہ دلچسپی نہیں لی کہ باز کہاں پہنچایا گیا، کس نے پہنچایا اور اس کے نتائج کیا نکلے۔ بس ایک دن پیر فضل کی زبانی اسے اتنا پتا چلا کہ پرندہ حضور چانڈیو کو مل گیا ہے اور وہ تنازعہ جو دن بدن شدت اختیار کرتا جارہا تھا، اب تقریباً ختم ہے۔

اس واقعے کے بعد حویلی والوں کی نگاہ میں اور خاص طور سے شاہ زمان کے نزدیک دلاور کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک روز دلاور کو زبردست سرپرائز ملا۔ اسے شاہ زمان نے بلایا۔ وہ اس کی بیٹھک میں پہنچا تو وہاں اس کے کئی عام اور خاص ملازم موجود تھے۔ ان سب کے سامنے شاہ زمان نے دلاور کے شانے پر ایک خاص قسم کی شال رکھی اور چھوٹے چھوٹے شیشوں سے مزین ایک نہایت قیمتی ٹوپی اسے پہنائی گئی۔

''تم آج سے میرے ''کارِ خاص'' ہو۔'' شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سب حاضرین نے اسے مبارک باد دی۔ ''کارِ خاص'' کا لفظ حویلی میں دراصل اہم ترین ملازم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسے ایک طرح سے شاہ زمان کا مشیر اور ملازمین کا انچارج بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ ''اعزاز'' اس سے پہلے ٹیپو ٹریگر کو حاصل تھا مگر زخمی اور بیمار ہونے کے بعد ٹریگر کی کارکردگی وہ نہیں رہی تھی لہٰذا اسے آرام دیا جارہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ یہ آرام ٹیپو ٹریگر کو ہضم نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں ہی دلاور کو اندازہ ہوگیا کہ ٹریگر اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت چمکنے لگی ہے۔ بہرحال دلاور ایسی باتوں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ حقیقی معنوں میں اگر اس حویلی میں اسے کسی کی پروا تھی تو وہ صرف اور صرف سویرا تھی۔ سویرا بھی جانتی تھی کہ دلاور نے شاہ زمان کے کہنے پر خود کو ایک زبردست خطرے میں جھونکا ہے اور ساجے کے ڈیرے سے قیمتی باز نکال لایا ہے..... جس کے صلے میں اسے ''کارِ خاص'' بنایا گیا ہے۔ وہ اس صورتِ حال پر خوش تھی۔ شاہ زمان کی دوسری اچانک شادی نے سویرا کو کچھ دیر کے لیے بالکل مرجھا ڈالا تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس صدمے سے سنبھلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس چال میں کتنا بھی پھڑ پھڑائے گی، خود کو زخمی کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پائے گی۔ ایک ناک کٹی عورت یہاں پہلے ہی موجود تھی، وہ دوسری بننا نہیں چاہتی تھی۔ کسی وقت سویرا سے دلاور کا آمنا سامنا ہوتا تو سویرا کی حسین آنکھوں میں دلاور کو اپنے لیے کئی خاموش سوال نظر آتے۔

وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھتی، کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں تنہا درخت کی طرح اکیلے ہو؟ کیوں کسی بچھڑی ہوئی کونج کی طرح دل گرفتہ ہو؟ کیوں اپنی زندگی کو سنبھالتے نہیں ہو؟ کیوں اپنے ویران گلشن کو آباد نہیں کرتے ہو؟ زندگی اتنی بے وقعت تو نہیں، اسے یوں برباد کیوں کررہے ہو؟

ان سارے خاموش سوالوں کا دلاور کے پاس ایک ہی جواب تھا اور پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی دلاور کو یقین ہونے لگتا کہ وہ بھی اس جواب کے بارے میں جانتی ہے.....

شاہ زمان اب دلاور کو اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا اور عموماً اس سے حویلی کے اہم معاملات میں مشاورت بھی کرتا تھا۔ ایک رات دیر تک وہ نشست گاہ میں دلاور کے ساتھ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ گفتگو کے دوران میں ایک بار پھر ساجے اور اس کے کرتوتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ دلاور نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑے سائیں! ایک سوال بڑے دنوں سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے۔ کافی عرصہ پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ دلاور، تم سے ایک خاص کام لینا ہے اس لیے حویلی میں ہی رہوں..... آپ نے کہا تھا نا.....؟''

''ہاں کہا تھا..... اور کام لیا بھی تو ہے۔ تمہیں ساجے کے ڈیرے میں گھسایا اور تم نے وہ کر دکھایا جو شاید کوئی دوسرا نہ کرپاتا۔''

''یہی تو سوال ہے سائیں! آپ نے حویلی میں رہنے والی بات مجھ سے کافی عرصہ پہلے کہی تھی، اس وقت تو باز چوری نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی آپ کو یہ پتا تھا کہ اسے چوری کرنے والا اسے کہاں لے کر جائے گا.....''

''مجھے پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی پتا تھا۔'' شاہ زمان ہولے سے مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

''سمجھو کبھی کبھار مجھے آنے والے وقت کا پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ جیسے الہام سا ہوجاتا ہے۔ میرے دل میں اچانک یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ فلاں کام ہوگا اور اس طرح ہوگا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ بات پختہ ہوتی جاتی ہے، بس ساجے بھل والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا.....''

اس نے اس سلسلے میں کچھ اور مثالیں بھی پیش کیں۔ اس نے کہا کہ شروع میں جو جیپ والا حادثہ پیش آیا تھا، اس سلسلے میں بھی اس کے ذہن میں پہلے سے ایک بڑا مضبوط شک اور خوف موجود تھا۔ وہ ایک طرح سے غیب دانی کا دعویٰ کررہا تھا لیکن وہ غیب دان نہیں تھا..... کیونکہ اس واقعے سے بے خبر تھا جو اگلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والا تھا۔

اس رات شاہ زمان اور دلاور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاہ زمان نے بتایا کہ اس نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر سے بات کی ہے۔ کچھ دنوں تک ساجے کے خلاف ایک بڑا آپریشن ہوگا اور علاقے سے یہ ''بیماری'' دور ہوجائے گی۔ اس کے بعد کچے میں ایک دو بڑے رقبے خریدنے اور ان کو آباد کرنے کی راہ ہموار ہوجائے گی۔ اس کے ذہن میں اس حوالے سے ایک دو شاندار منصوبے تھے۔ وہ علاقے کی سیاست کے بارے میں بھی پُرجوش تھا۔ وہ ایک ایسے شخص پر سرمایہ کاری کرنے کا منصوبہ رکھتا تھا جو ایک صوبائی نشست آسانی سے جیت کر اس کے دستِ راست کا کردار ادا کرسکتا تھا۔ شاہ زمان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! میں تمہارے آنے والے دن بڑے چمکدار دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے اندر کوئی خاص بات ہے..... اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس حویلی میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہارا صحیح مقام ملے۔''

دلاور ممنونیت سے سر جھکا کر رہ گیا تو شاہ زمان بولا۔

''میں نے شیرو سے اور بالے سے کہہ دیا ہے۔ رائفلیں تیار رکھو۔ صبح ہم نے بصیرت پور کے میلے میں سور کے شکار کے لیے جانا ہے...... تم نے بھی شکار کیا ہے...... سور کا......؟''

دلاور کے نفی کے جواب میں شاہ زمان بولا۔ ''بڑا مزے دار اور بڑا دل جگرے والا شکار ہوتا ہے یہ...... تمہیں یہ سب کچھ آنا چاہیے......'' پھر شاہ زمان آخری سگریٹ بجھاتا ہوا اٹھ گیا اور بولا۔ ''جاؤ آج جلدی سو جاؤ...... صبح شاید جلدی نکلنا پڑے۔'' شاید اسے خود بھی اپنی نئی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ کل سویرا سے ملنے کے بعد وہ حد سے زیادہ مضطرب تھا۔ آج نیند کہاں آنی تھی...... آج بہت دنوں بعد اس کا رخ پستہ قد بیریوں کی جانب ہو گیا۔ وہ اپنی جائے پناہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ ریت کے بلند ٹیلے سے پار نہیں اترا تھا کہ ایک مخصوص سرسراہٹ، ایک ہلکے شور نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ یکایک اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں...... اس کے سر سے عین اوپر تارے جگمگا رہے تھے مگر مشرق کے افق کی جانب تارے ناپید تھے اور اس کی جگہ سیاہی اور دھول سی تھی۔ دلاور کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ریت کا طوفان تھا۔ ایسا ہی ایک طوفان پہلے بھی آیا تھا۔ وہ سرعت سے واپس پلٹا اور اس نے حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے اس نے کندھے پر رکھا کپڑا ڈھاٹے کی صورت چہرے اور سر پر لپیٹ لیا۔ اس کے حویلی میں داخل ہونے اور کمرے میں پہنچنے تک ریتیلا طوفان شروع ہو گیا۔ کھڑکیاں دروازے بجنے لگے۔ ہوا سیٹیاں بھرنے لگی۔ ظفری بے خبر سو رہا تھا۔ دلاور بستر میں دبک کر بیٹھ گیا۔

ہوا میں ایسی آوازیں تھیں جیسے بہت سی عورتیں کہیں بین کر رہی ہوں۔ بین کی آوازیں ہمیشہ اسے پریشان کرتی تھیں۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بھی عورتوں نے بہت بین کیے تھے۔

تب سے وہ بین کی آوازوں پر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے کانوں پر دونوں ہاتھ جما دیے تھے۔ چند منٹ تک ایسے ہی چلتا رہا پھر ہوا کا شور رک گیا...... اس نے کھڑکی کھول دی اور جالی کے ساتھ منہ لگا کر باہر کے ماحول کا اندازہ لگانے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کسی کے چلانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ اس نے اسے وہم جانا...... مگر ایک مختصر لمحے کے بعد آواز میں شدت آ گئی...... وہ کسی بچے یا کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں۔ دلاور چھلانگ لگاتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا، رائفل اتار کر ہاتھ میں لی اور باہر دوڑتا چلا گیا...... آندھی تھم چکی تھی مگر ہوا ہنوز چل رہی تھی۔ وہ جوں جوں آواز کی سمت چلتا گیا۔ رونے اور واویلا کرنے کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ یہ کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں جو حویلی کے کسی کمرے سے آرہی تھیں۔ دلاور کے پاؤں بجلی کی سی تیزی سے اٹھنے لگے، ابھی وہ کوریڈور میں پہنچا تھا کہ کوئی وزنی چیز اس کے کندھے سے اس زور سے ٹکرائی کہ رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ کوئی اٹھائیس تیس سالہ جوان تھا جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ صاف، آنکھوں میں سرمہ اور سر پر تلے والی ٹوپی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ سرمہ لگی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور وار سیدھا دلاور کے سینے پر کیا۔ دلاور نے خنجر والی کلائی پکڑ لی پھر اپنی ٹانگ کا وار اس کے پیٹ پر کیا۔ وہ اچھل کے گرا اور دہرا ہو گیا۔

خنجر ابھی اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ہمت کر کے دوبارہ کھڑا ہوا، بے دریغ خنجر چلاتے ہوئے ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا...... دلاور واپس پلٹا۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ ابھی وہ حملہ آور کی طرف سیدھی کرنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ حملہ آور بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں دلاور کی طرف دیکھا پھر خنجر سے اپنی شہ رگ کاٹ لی۔ وہ دو چار قدم چلا پھر کوریڈور کے چپس لگے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں حویلی کے ملازمین جاگ چکے تھے اور بھاگم بھاگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف ہلچل تھی۔ دلاور کوئی موقع ضائع کیے بغیر اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں سے ابھی تک رونے اور بین کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ آواز کا اندازہ لگاتا ہوا دلاور ایک کمرے کے پاس پہنچ گیا...... دروازہ کھلا ہوا تھا اور رونے کی آوازیں اندر سے آرہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا اندرونی منظر لرزا دینے والا تھا۔ شاہ زمان آدھا بیڈ پر اور آدھا کارپٹ پر تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور انتڑیاں باہر نکلی پڑی تھیں۔ بیڈ کا ایک کونا خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ کارپٹ کا ایک حصہ بھی خون سے لتھڑ چکا تھا۔ نئی نویلی کم سن دلہن کا گلا رو رو کر بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ ہذیانی انداز میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اِدھر اُدھر بکھری چیزوں کو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دیکھ رہی تھی۔ دلاور نے اس چھوٹی سی عمر کی دلہن کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکال دیا۔ کمرے سے باہر عورتوں کا جمگھٹا لگ چکا تھا، پھر کچھ عورتیں سراسیمہ حالت میں کمرے میں داخل ہوئیں۔ اچانک جیسے کلیجا پھاڑ دینے والے بین شروع ہو گئے۔

دلاور کی آنکھوں میں نمی تھی۔ چوڈیرو حویلی کا بڑا سائیں اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ جو رات کو شکار کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور دلاور کے آنے والے کل کے لیے پیش گوئیاں کر رہا تھا، اپنے کل سے کتنا بے خبر تھا۔ وہ بے خبر انسان آج دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ یہ ساری کہانی مختصراً یوں تھی...... جس کم سن خوبرو لڑکی کو شاہ زمان اپنی دلہن بنا کر لایا تھا، اسی کا منگیتر بنوں سے چلا آیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر حویلی میں گھسا تھا۔ سوچے ہوئے منصوبے کے تحت اس نے شاہ زمان کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنی منگیتر کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی کے شور مچانے اور مزاحمت کرنے پر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں اس کا ٹاکرا دلاور سے ہو گیا تھا۔ دلاور سے لڑائی کے دوران اس نے اپنی شہ رگ کاٹ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ شاید اسی لڑکے کی وجہ سے لڑکی کے والدین چاہتے تھے کہ شاہ زمان جلد سے جلد برات لے کر آ جائے۔ وہ ساری گفتگو دلاور کے ذہن میں گونجنے لگی۔ شاہ زمان نے ایک دن سویرا سے کہا تھا۔ ''عورتیں خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی ہیں مگر وہ اصل میں احمق ہوتی ہیں، تمہارے جیسی......'' اس نے سویرا کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تھا۔

وہ عورت تھی، کمزور تھی۔ وہ تب خاموش رہی تھی۔ نوعمر دلہن کے حویلی میں آنے سے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی مگر آج وہی دلہن شاہ زمان کی موت کا سبب بن گئی تھی۔ آج کوئی غائبانہ آواز کہہ رہی تھی.... مرد خود کو بہت دانا اور سمجھ دار سمجھتے ہیں مگر ان میں سے بھی کچھ احمق ہوتے ہیں۔ تمہاری طرح۔ ''شاید'' یہی مکافاتِ عمل تھا۔ کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے ختم ہوئی تھی کہانی اس حویلی کے وڈے سائیں کی۔ دلاور کو یقین نہیں آ رہا تھا...... کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ہوائیں بدل گئی تھیں، موسم بدل گیا تھا۔ روہی سے آگے جو کیکر کے درخت تھے، ان پر بور آنا شروع ہو گیا تھا۔ اب روہی کی جانب سے چلنے والی ہواؤں میں ٹھنڈک ہوتی تھی۔ شاہ زمان کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ چھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ شاہ فرمان ''بڑے سائیں'' کی ''گدی'' سنبھال چکا تھا۔ پیر فضل اکثر علیل رہتے تھے۔ خاوند کی موت کا شدید صدمہ سہنے کے بعد سویرا اب سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ نوعمر بیوہ اپنے وارثوں کے پاس واپس جا چکی تھی۔

دلاور حویلی کا کارِ خاص ہونے کے ناتے تمام حویلی والوں کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا۔ وہ پھر سے باتونی اور ہر ایک کا دل بہلانے والا بن چکا تھا مگر اندر تو وہی اندھیرے تھے۔ اب بھی جب گھٹن حد سے بڑھ جاتی تھی، ... رات کے اندھیرے میں، جب روہی کی فضائیں سوتی تھیں۔ حویلی کے مکین خوابِ خرگوش کے مزے لوٹتے تھے، وہ پستہ قد بیریوں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ نشہ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ عرصہ پہلے سویرا کو لکھا ہوا خط آج بھی اس کی پاکٹ میں موجود تھا۔ وہ خط جو اپنی ''منزل'' پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ آج بھی اپنی نارسائی پر روتا ہوا پلاسٹک کے کور میں محفوظ تھا۔ وہ خط دلاور نے پہلے دن سے خود سے جدا نہیں ہونے دیا تھا...... اور...... وہ کیسے ہونے دیتا۔ اس پرانے خط میں اس کی سانسیں قید تھیں۔ اس خط کو اس کی موت کے بعد ہی منظرِ عام پر آنا تھا۔ وہ اکثر رات کے سناٹے میں بیریوں کے نیچے بیٹھا سویرا کی لکھی ہوئی نظم دہراتا تو اسے یوں لگتا کہ سویرا اسے بہت پہلے سے جانتی ہے۔ شاید سیکڑوں...... شاید ہزاروں سال پہلے سے...... جب اس روہی کی جگہ بستیاں آباد تھیں۔ وہ انہی بستیوں کے کسی نیم تاریک گھر کے کسی ویران کونے میں بیٹھ کر اپنے ''محبوب دلاور'' کے لیے ایک نظم تخلیق کرتی ہے اور وہ اشعار لکھتے وقت نہیں جانتی کہ ہزاروں سال بعد یہاں کوئی بستی نہیں ہوگی...... صرف اور صرف ریت ہوگی اور روہی کی بیکراں وسعتیں ہوں گی...... اور رات کی خاموش تنہائی میں جب سارا جگ سوتا ہوگا کوئی دلاور پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھا یہ اشعار دہرا رہا ہوگا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک میں بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے......
صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ ان دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ ان دیکھے سے سائے ہیں
جو سنگ سنگ میرے چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اک گرم دوپہر کی مستی میں
اِک خام خیال سی ہستی میں
کچھ اَن چھوئے سے جذبے ہیں
اَن جانے سے موسم ہیں
جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے!

سویرا اسے بھولنے کا کہتی تھی۔ وہ بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی سانسوں میں، اس کی نس نس میں سویرا سما چکی تھی۔ ایک عورت کی جدائی اس نے روتے ہوئے برداشت کر لی تھی مگر تب وہ چھوٹا تھا، نا سمجھ تھا مگر اب کی بار وہ دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ ماں بچے کو چھوڑ کر جانے لگے تو وہ روتے ہوئے اس کا دامن تھام لیتا ہے، پلکتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی بچہ بن چکا تھا۔ ہر رشتے سے محروم دلاور سویرا کو اپنی نگاہوں سے دور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ اور نہیں چاہتا تھا۔ بس اس کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ بس ایک فاصلہ رکھ کر اس کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

ٹیپو ٹریگر جنت یاب ہو کر حویلی میں آ چکا تھا۔ وہ شاہ فرمان کا بہت خاص اور لاڈلا تھا۔ حویلی میں جو کچھ ہو رہا تھا، دونوں دیکھ رہے تھے۔ دلاور یہاں ہر دلعزیز تھا۔ حویلی کے مکین اس سے بے حد خوش تھے اور خاص طور سے سویرا کی نوازشیں تو بے انتہا تھیں۔ سویرا اس سے یوں رویہ رکھتی تھی جیسے وہ حویلی کا ملازم نہ ہو بلکہ کوئی بہت قریبی رشتے دار ہو۔ شاہ فرمان کو یہ باتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ ایسے موقعوں پر کچھ کر نہیں سکتا تھا، صرف جل بھن کر رہ جاتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سویرا ہمیشہ سے من موجی ہے اور وہی کرتی ہے جو اس کے دل میں آتا ہے۔ سویرا ایک پڑھی لکھی ہوش مند لڑکی تھی۔ شاہ فرمان اس پر زیادہ سختی کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ ورنہ حویلی کی عام عورتوں کے حوالے سے وہ بڑا سنگدل تھا۔ چند دن پہلے اس نے اپنی ایک جوان ملازمہ کو پانچ گھنٹے کے لیے ایک کتے کے ساتھ ''ڈاگ ہاؤس'' میں بند کر چھوڑا تھا۔ ملازمہ کا خوف سے جو حال ہوا، بیان سے باہر تھا۔ ملازمہ کا تصور صرف اتنا تھا کہ اس نے شاہ فرمان کے اس لاڈلے کتے کو باورچی خانے میں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی ..... شاہ فرمان من پسند ملازماؤں سے تعلقات استوار کرنا بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔

ایک دن تنہائی میں شاہ فرمان ٹریگر سے بولا۔ ''تو دل چھوٹا نہ کر..... میں نے کچھ سوچا ہے اور بہت جلد ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔''

''بڑے سائیں! دلاور بڑا چالباز ہے۔ اس نے سویرا بی بی کو اپنے ہاتھوں میں کیا ہوا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے ..... کہیں..... لوگ باتیں بنانا نہ شروع ہو جائیں۔''

''میں نے کہا نا..... خود کو حوصلے میں رکھ..... یہ کام جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ ہر جگہ طاقت ہی مسئلے حل نہیں کرواتی..... کبھی کبھی اس سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔'' شاہ فرمان اپنی انگلی کنپٹی سے ٹکراتے ہوئے بولا۔

''تو کیا ..... دلاور..... کو باہر ..... باہر سے ہی.....'' ٹیپو ٹریگر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''اونہیں اوئے..... تو بھی کسی سورنی کا بچہ ہے۔ ہر وقت..... خون خرابا..... قتل وغارت۔ میں نے پہلے بھی تجھے کہا ہے۔ ہوش سے کام لے..... دلاور کو چاچا پیر فضل کی تھپکی بھی ہے۔ ان کو کسی گڑبڑ کا پتا چل گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''تو پھر..... آپ کے دل میں کیا ہے؟''

''کل کا دن انتظار کر میں پرسوں تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔'' شاہ فرمان کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ٹیپو ٹریگر ان آنکھوں کی کہانی پڑھ رہا تھا۔

سویرا دلاور سے ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ دلاور انجان تھا..... وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سویرا اس کے احساسات سے لاعلم ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں سویرا نے اس کی الماری کی تلاشی لی تھی اور وہاں سے برآمد ہونے والے رومال..... گھڑی..... ٹوٹی چوڑیوں..... اور ایک ورق پر لکھی ہوئی نظم نے سارے راز کھول دیے تھے..... یہ چیزیں اس کا پول نہ بھی کھولتیں تو ایک عورت کی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ دلاور کے دل میں کچھ ہے۔ سویرا دلاور کے لیے جو کچھ کر رہی تھی، اس کی وجہ یہی رہی تھی۔ اس کے دل میں ابھرنے والے انجان جذبے جب زور پکڑتے تھے اور وہ جو ایک دل کے نہاں خانے کی ندی تھی، اس کے پانیوں میں خوفناک اچھال پیدا ہوتا تھا تو وہ حد سے زیادہ پریشان ہو جاتی تھی۔ متضاد کیفیت کا شکار ہو جاتی تھی..... وہ سر تھام کر بیٹھ جاتی تھی..... بھیانک چیخیں اس کے وجود میں گونجنے لگتی تھیں..... خود کو مجرم عظیم سمجھنے لگ جاتی تھی..... جب جب ایسی حالت ہوتی تھی، تب تب وہ نماز پڑھتی تھی۔ کفارے کے طور پر دلاور کی بے پناہ دل جوئی میں لگ جاتی تھی لیکن ساتھ ساتھ ڈرتی بھی تھی کہ لوگ غلط مطلب نہ لینے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لگیں۔ وہ بھی ایسی ہی ایک شب تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ آنسو بھی اس کی خاموش محبت کی طرح نہ سمجھ آنے والے تھے۔ وہ ایسی محبت کا شکار ہو چکی تھی..... جس کی اسے خود بھی خبر نہ تھی اور اگر تھی بھی..... تو اس پر معاشرتی جبر کا اتنا موٹا اور دبیز پردہ پڑا ہوا تھا کہ پہچان ناپید تھی۔

اس نے آنسو پونچھے اور ایک ڈائری نکال لی جس پر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظم درج تھی..... تم کب تک مجھ کو بھولو گے۔

وہ نظم دہرانے لگی۔ اچانک ساتھ والے کمرے میں کھٹکا ہوا..... پہلے اس نے وہم جانا..... مگر دوبارہ آہٹ ہونے پر وہ اٹھی اور دبے پاؤں دروازے تک گئی۔ جس دروازے پر سویرا کھڑی تھی، وہ جڑواں کمروں کا درمیانی دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ اس دروازے میں تھوڑی سی درز موجود تھی۔ سویرا ڈرتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر باہر نگاہ دوڑائی..... باہر مہیب سناٹا اور روہی کی جانب سے آنے والی مدھر ہوا تھی..... اس نے دل میں سوچا شاید وہ رات کو دروازہ لگانا بھول گئی ہے۔ اس نے کنڈی چڑھائی اور واپس پلٹی۔ ابھی وہ چار پانچ قدم ہی چلی تھی کہ الماری کے پیچھے سے ایک ہیولا برآمد ہوا۔ وہ ایک ڈھاٹا پوش تھا۔ اس نے اپنا سر، کان، چہرہ ایک موٹے کالے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے اشارے سے سویرا کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ خوف سے سویرا کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں..... سخت گھبراہٹ کے عالم میں سویرا کی نگاہ ڈھاٹا پوش کے عقب میں پڑی جہاں ایک کالے رنگ کا تھیلا..... زیورات اور نقدی سے بھرا ہوا تھا۔ ساری بات سویرا کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چیخی..... ڈھاٹا پوش بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھا..... وہ پچھلے قدموں پلٹی اور بھاگی..... ڈھاٹا پوش نے ایک جست لگاتے ہوئے اسے دبوچ لیا..... سویرا بری طرح چیخنے چلانے اور ہاتھ پیر مارنے لگی۔ وہ اس کی گرفت سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ بند کرنا چاہ رہا تھا۔ سویرا نے کئی تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیے اور ناقابل یقین انداز میں اسے ایک دھکا دیا..... وہ دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا..... وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ ڈھاٹا پوش نے اسے عقب سے تھام لیا اور اٹھا کر بیڈ پر پھینکا۔ سویرا کے ہاتھ میں شیشے کا لیمپ آ گیا۔ اس نے گھما کر ڈھاٹا پوش کے سر پر وار کیا۔ وہ جھکائی دے کر سر بچا گیا..... شیشے کا لیمپ اس کے کندھے پر لگ کر چکنا چور ہو گیا۔ وہ دوسرا لیمپ بھی آزمانا چاہتی تھی کہ وہ جست لیتا ہوا بیڈ پر چڑھ گیا۔ اس نے لیمپ سویرا کے ہاتھ سے چھینا اور دو تین تھپڑ جڑ دیے۔ وہ چکرا کر اس کے ساتھ آ لگی..... ڈھاٹا پوش غصے سے دیوانہ ہو چکا تھا۔ شیطانی حس بیدار ہوئی اور وہ سویرا پر پل پڑا۔ وہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ سویرا کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ لانبی نسواری زلفیں بکھر کر منتشر ہو گئیں۔ اس کی پیش قدمی نہیں رکی۔ سویرا اسے خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ مگر وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سویرا کو نیچے گرا لیا تھا..... وہ چیخ رہی تھی۔ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اسی دوران باہر کا دروازہ بجنے لگا۔ ڈھاٹا پوش اپنی جگہ پر ٹھٹکا۔ پھر اس نے سویرا کو چھوڑ دیا۔ بڑی سرعت سے دوسرے کمرے میں گیا۔ نقدی اور زیورات والا تھیلا اٹھایا اور دوسری طرف والا دروازہ کھول کر کسی چھلاوے کی طرح تاریکی کا حصہ بن گیا۔

دروازہ دھڑ دھڑانے والی بڑی آپا تھیں۔ سویرا نے دروازہ کھولا۔ بڑی آپا اندر آئیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سویرا کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ بڑی آپا نے کلیجا تھام لیا۔ چیختے ہوئے بولیں۔ ''سویرا! کیا ہوا ہے تجھے؟''

سویرا جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بڑی آپا کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ صبح تک یہ خبر پوری حویلی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کہانی تھی کہ رات سویرا بی بی کے کمرے میں کوئی بندہ گھسا تھا۔ پہلے اس نے تجوری خالی کی۔ اس کے بعد سویرا بی بی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔

وہ تو شور شرابے سے بڑی آپا کی آنکھ کھل گئی اور وہ موقع پر پہنچ گئیں..... نہیں تو..... سویرا بی بی کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا..... بہت بڑا۔

شاہ فرمان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ہر قیمت پر اس بندے کو ڈھونڈ نکالوں گا..... اور پھر ایسی سزا دوں گا کہ اس کی اگلی پچھلی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس نے حویلی کی بہو کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اپنی قبر خود کھودی ہے۔ ڈکیتی سے اگلے دن شاہ فرمان نے دو نہایت

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تربیت یافتہ کھوجی بلا لیے..... آتے ہی انہوں نے اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا۔ صدر دروازے کے محافظین کے مطابق ڈکیت باہر سے نہیں آیا تھا۔ دو گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد کھوجیوں نے صدر دروازے کے محافظین کی بات کی تصدیق کر دی..... ڈکیت حویلی کے اندر ہی موجود تھا۔ کھرا ڈھونڈتے ہوئے انہیں ایک پرانا لائٹر..... ایک سرخ رنگ کا بال پوائنٹ ملا تھا۔ شاہ فرمان نے حویلی کے تمام داخلی دروازوں کو بند کروا دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا جب تک تفتیش مکمل نہیں ہو جاتی، حویلی کا کوئی بندہ باہر نہیں جائے گا..... ڈکیت کو ڈھونڈنا شاہ فرمان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ حویلی کو سیل کر دیا گیا..... کھوجیوں نے اپنا ایک اور ساتھی بہاولپور سے بلوا لیا۔

شاہ فرمان نے حویلی کے نچلے درجے کے تمام ملازمین کو ایک کمرے میں اکٹھا کر لیا۔ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”اوئے کتے کے پترو..... مجھے صاف صاف بتا دو..... یہ کام کس کا ہے..... بندہ تو میں نے ڈھونڈ ہی نکالنا ہے۔ اگر خود بتا دو گے تو سزا کم اذیت ناک ہوگی..... ورنہ تم سور کے تخم مجھے اچھی طرح جانتے ہو..... دندوں والی چھری سے کھال اتر واؤں گا میں تمہاری سب کی..... بولو اوئے..... جواب دو کوئی.....“ شاہ فرمان نے ایک دو کے منہ پر تھپڑ جڑ دیے۔ ایک کے زیر ناف ایسی ٹانگ ماری کے وہ دہرا ہو گیا۔ ٹیپو ٹریگر بھی ان پر پل پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو چار کے منہ پھٹ گئے۔ ایک ملازم آنکھ پہ ہاتھ رکھ کر بے تحاشا چلانے لگا۔ شاہ فرمان دوبارہ گرجا۔ ”اوئے ننگا کرو اوئے ان سب کو..... میں ان کی ماں کی.....“

پانچ چھ ملازمین جو ان میں تگڑے تھے، ان کے کپڑے اتروا لیے گئے۔ صرف جسم پر ایک انڈرویئر رہنے دیا گیا۔ الٹا لٹکا کر ٹیپو ٹریگر انہیں بید کے ڈنڈے سے پیٹنے لگا۔ ان کی چیخ و پکار سے دلاور کا دل گھبرانے لگا، آدھ گھنٹے تک بہیمانہ تشدد چلتا رہا۔ کسی نے اعترافِ جرم نہیں کیا۔

شام نے ابھی اپنے پر نہیں پھیلائے تھے۔ روہی کی طرف سے اٹھنے والی ہواؤں میں ابھی ہلکی سی حدت برقرار تھی۔ کھوجیوں نے شاہ فرمان کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ بیگار کے کش لیتا ہوا وہاں پہنچا تو ایک اہم خبر اس کی منتظر تھی..... کھوجیوں نے انتھک محنت کر کے ڈکیت کے جوتی کے نشانوں کا کھرا ڈھونڈ نکالا تھا اور ان نشانوں کی نشاندہی حیرت انگیز طور پر ٹیپو ٹریگر نے کی تھی۔ وہ حویلی کا پرانا ٹمک حلال تھا۔ ایسے معاملات میں اس کی حس بے حد تیز تھی۔ یہ پشاوری جوتی کے نشان تھے جو کوریڈور سے نکلتے ہوئے باغیچے میں آئے تھے۔ پھر درختوں سے پرے چلے گئے تھے۔ کھوجیوں نے سفوف ڈال کر ان نشانات کو مزید واضح کر لیا تھا۔

اگلا مرحلہ نہایت اہم اور دلچسپ تھا۔ حویلی کے تمام ملازمین کی جوتیاں ایک جگہ اکٹھی کر لی گئیں۔ یہاں تک کہ دلاور اور ٹیپو ٹریگر کی جوتیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ ایک گھنٹے کی مزید عرق ریزی کے بعد نتیجہ صفر نکلا..... کسی جوتی کے تلے کا ڈیزائن مطلوبہ نشانوں پر پورا نہیں اترا.....

شاہ فرمان عجیب کشمکش کا شکار ہو گیا۔ وہ پریشانی سے پیشانی مسلنے لگا۔ دلاور اور ٹیپو ٹریگر اس کے قریب کھڑے تھے۔ وہ دھیرے سے ان سے مخاطب ہوا بولا۔ ”کہیں وہ بندہ حویلی کے باہر سے تو نہیں آیا تھا؟“

دلاور نے شاہ فرمان کے خدشے سے اتفاق کیا مگر ٹیپو ٹریگر..... ایک نہایت ہوشیار اور تیز رفتار آدمی کا نام تھا۔ جھٹ سے بولا۔ ”بڑے سائیں! سب ملازمین کے کمروں کی تلاشی لی جائے، کیا پتا..... مطلوبہ جوتی کہیں سے برآمد ہو جائے۔“ ٹیپو ٹریگر کی بات پر شاہ فرمان یوں چونکا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ہو۔ اس نے تعریفی نظروں سے ٹیپو ٹریگر کی جانب دیکھا پھر اگلے چند منٹوں میں ٹیپو ٹریگر کے دیے ہوئے مشورے پر عمل شروع ہو گیا۔

تین کھوجی اور حویلی کے چار بڑے ملازمین حویلی میں ملازمین کے ہر کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ جوتی دلاور کے کمرے کی الماری کے عقب سے برآمد ہو گئی..... ظفری پچھلے ایک ہفتے سے کراچی میں تھا۔ اسے شاہ فرمان نے کسی ضروری کام سے وہاں بھیجا ہوا تھا۔

زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھوم گئے..... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ..... یہ کیا ہے.....؟“

”یہ وہ چپل ہے جس کی تلاش میں ہم سب مارے مارے پھر رہے ہیں۔“ ٹیپو ٹریگر غصیلے لہجے میں بولا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے کھوجی کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا بڑا پرچہ جھٹکے سے چھین لیا۔ جس پر زمین پر جا بجا نمودار ہونے والے ”فٹ پرنٹ“ کو کاپی کیا گیا تھا۔ ادھیڑ عمر شاہ فرمان کے ماتھے پر کئی سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں۔ وہاں موجود سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ٹیپو ٹریگر نے جوتی کا ایک پیر ”فٹ پرنٹ“ پر رکھ دیا۔ جوتی کا وہ پیر پورا پورا ”فٹ پرنٹ“ پر بیٹھ گیا۔

شاہ فرمان کا رخ اب دلاور کی جانب تھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے..... پھنکارتے لہجے میں بولا۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اوئے..... یہ..... سب کیا ہے..... یہ جُتی تیری ہے۔''

''بڑے سائیں! یہ جوتی میری ہی ہے..... مگر یہ یہاں کیسے آئی..... میں نہیں جانتا..... میں خدائی قسم کھا کر کہتا ہوں۔''

''اوئے پر یہ جُتی..... یہاں کیا انڈے دے رہی ہے۔'' شاہ فرمان حلق کے بل چیخا۔

''بڑے سائیں! مجھے پھنسایا جارہا ہے۔ میں اس حویلی کا نمک حلال ہوں..... اس حویلی کے لیے میں اپنی جان پر بھی کھیلا ہوں۔ میں ..... بھلا یہ سب کیسے کرسکتا ہوں..... آپ کی سوچ پر افسوس ہورہا ہے۔''

''اوئے میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ تو ہے کیا..... تو نے کب سے اس گھر کی عزت پر آنکھ رکھی ہوئی ہے۔ اوئے میں تیری آنکھیں چہرے سے نکال کر زمین پر ڈال دوں گا۔'' ٹیپو ٹیگر جو شیلے انداز میں دھاڑتے ہوئے آگے بڑھا تو شاہ فرمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ بولا۔

''اوئے نہیں اوئے.....! اسے اپنی صفائی کا موقع ملنا چاہیے..... اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا ہے۔''

دلاور کا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دم توڑ گئی تھیں۔

حویلی کے تمام داخلی اور خارجی دروازے بند کردیے گئے تھے۔ تفتیش نے جو نیا رخ اختیار کیا تھا، اس نے سب کو حیران کررکھا تھا۔ دلاور باری باری حویلی کے سب بڑوں کے پاس گیا۔ شاہ فرمان، پیر فضل، بڑی آپا..... اس نے سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ تو اس حویلی کے لیے اپنی جان قربان کرسکتا ہے۔ وہ سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت کرے۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ ''آپ جانتی ہیں مجھ سے پہلے ٹیپو ہی حویلی کا ''کارِ خاص'' تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اللہ بخشے شاہ زمان صاحب نے یہ ذمے داری مجھے دے دی۔ ٹیپو اور اس کے ساتھیوں نے دل میں میرے لیے رنجش پالی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش کررہے ہیں۔''

بڑی آپا نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں تم ایسے نہیں ہو۔ تم نے حویلی کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ پر اب ..... جو کچھ سامنے آرہا ہے اس کا کیا مطلب لیا جائے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ابھی ملازم فرزند نے بتایا ہے کہ تمہارے کمرے میں سے شراب کی بوتلیں بھی نکلی ہیں۔ کئی ایک نے گواہی دی ہے کہ تم کبھی بھی اتنا نشہ کرتے ہو کہ تم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے اسی نشے میں کیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''بڑی آپا! میں آپ کو ماں کی طرح سمجھتا ہوں، یقین کریں ایک عرصے سے میں نے اس گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ایک چھوٹا سا دور آیا تھا جب میں نے پریشانیوں سے گھبرا کر اس منحوس چیز کا سہارا لیا تھا لیکن اب تو.....''

اچانک دلاور کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک اندرونی کمرے سے سویرا نکلی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی..... رنج وغم کی تصویر..... آنکھیں سوجی ہوئیں۔ اس نے دلاور کی طرف نہیں دیکھا۔

دلاور نے جیسے تڑپ کر کہا۔ ''بب..... بی بی جی۔ آپ ہی بتائیں۔ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ مجھ پر جو الزام لگایا جارہا ہے، وہ درست ہوسکتا ہے؟ آپ اپنے دل سے پوچھیں..... آپ کا دل کیا کہتا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آپ کا دل جو بھی کہے گا وہ میں مان لوں گا۔ چاہے وہ گناہ میں نے کیا ہو یا نہ کیا ہو۔''

وہ عجب دل گرفتہ آواز میں بولی۔ ''میں کیا کہوں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ میں اندھی، گونگی اور بہری ہوچکی ہوں۔ میرے بارے میں جو کچھ بھی کہنا یا کرنا ہے، دوسروں نے کرنا ہے۔'' وہ سسکی اور ایک دم پلٹ کر واپس چلی گئی۔

وہ رات دلاور نے جاگ کر گزار دی۔ جب وہ حد سے زیادہ پریشان ہوتا تھا تو..... رو ہی میں بلند ٹیلے سے پار پستہ قد بیریوں کے پاس چلا جایا کرتا تھا مگر حویلی کے کرتا دھرتاؤں نے آج اس سے یہ حق بھی چھین لیا تھا، کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھٹن بڑھنے لگی تو وہ باہر نکل گیا۔

اس کا رخ سیبوں والی حویلی کی جانب ہوگیا۔ سیبوں والی حویلی کے اندر ایک بلند گھاٹی سی تھی جس پر بیٹھ کر روہی کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ رات کے اس پہر اس گھاٹی پر پہنچ گیا۔ وہ وہاں بیٹھ کر پستہ قد بیریوں کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر حویلی سے باہر مہیب تاریکی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جس طرح حویلی کے لوگوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا، آج دشت کے نظارے اور پستہ قد بیریوں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جیسے آپس میں سب ملے ہوئے تھے۔

وہ وہاں بیٹھا رہا۔ شاید ایک گھنٹا، شاید ڈیڑھ دو گھنٹے۔ صرف اجنبی سناٹے ہی تھے جو اس کے دل کی زبان پڑھ رہے تھے..... اور کیوں نہ ہوتے ..... وہ اس کا پہلا عشق جو تھے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ کسی نے اس کے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر نگاہ اوپر اٹھائی تو وہ حویلی کا ملازم بالا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ اضطراب تھا بولا۔ ''چلو...... تمہیں بی بی جی بلا رہی ہیں۔''

''کون بی بی جی...؟'' دلاور نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

''سویرا بی بی نے تمہیں بلایا ہے۔'' وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ دلاور کے اندر یکا یک امید کی کرن جاگی۔ اسے لگا کہ سویرا کی طرف سے اس کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آئے گا اور شکوک کے وہ سارے زہریلے بادل بکھر جائیں گے جو اس کی سانس روک رہے تھے۔

مگر جب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زنان خانے میں سویرا کے روبرو پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی منظر نظر آیا۔ آنسو سویرا کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور آنکھوں میں دنیا جہان کی دکھ آمیز حیرانی سمٹی ہوئی تھی۔ وہ عجب دردناک لہجے میں بولی۔ ''دلاور! میں اب بھی یقین نہیں کر پا رہی۔ مجھے اب بھی آس ہے کوئی ایسی بات سامنے آجائے گی جو سارے حالات کو غلط ثابت کر دے گی......''

''آپ...... کن حالات کی بات کر رہی ہیں؟''

اس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ایک طلائی نیکلس دلاور کے سامنے کیا اور بولی۔ ''یہ بڑی آپا کی ملازمہ صفیہ سے ملا ہے۔ مار کھا کر اس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نیکلس بدھ کی رات تم نے اسے تحفے میں دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ بہاولپور چلے تم اسے عیش سے رکھو گے......'' آخری الفاظ کہتے کہتے سویرا کا گلا رندھ گیا۔

دلاور تڑپ کر بولا۔ ''یہ جھوٹ ہے...... سراسر الزام ہے۔ اسے...... میرے سامنے لائیں، مجھے اپنی مری ماں کی قسم ہے بی بی...... یہ سفید جھوٹ ہے، مجھے نہیں پتا۔ یا تو اس کڑی کو بہت مارا پیٹا گیا ہوگا...... یا اس نے لالچ میں آکر یہ بیان دیا ہوگا...... آپ...... آپ مجھے یہ بتائیں، آپ کا اپنا دل کیا کہتا ہے؟ میں ایسا نیچ ہو سکتا ہوں؟ میں یہ سب کر سکتا ہوں......؟''

سویرا نے جیسے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں پریشانی، تذبذب اور رنج کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ اور کہتا، بڑی آپا تیزی سے اندر آئیں۔ بڑی آپا کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ چلّا کر بولیں۔ ''بس...... بس اب صفائیاں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہمیں تمہاری صفائیاں سننے کی ضرورت ہے۔ سب کچھ چٹے دن کی طرح سامنے آگیا ہے...... سب کچھ......''

سویرا نے ذرا تعجب سے بڑی آپا کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان، پیر فضل اور ٹیپو ٹریگر وغیرہ بھی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ شاہ فرمان نے سویرا کو بتایا کہ اس کا سارا چوری شدہ زیور دلاور کے کمرے کے فرش سے نکلا ہے۔ اینٹیں اکھاڑ کر زیور وہاں دبایا گیا تھا اور اینٹیں دوبارہ بڑی صفائی سے جوڑ کر اوپر جستی پیٹی رکھ دی گئی تھی۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے کئی گہنے شاہ فرمان کے ہاتھ میں تھے۔

اس سے پہلے کہ دلاور اپنے دفاع میں کچھ کہتا بڑی آپا تیزی سے آگے آئیں اور ان کا زناٹے دار تھپڑ دلاور کے رخسار پر پڑا۔ وہ بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ تھپڑ پڑنے کی دیر تھی کہ یکا یک شاہ فرمان کے تنومند کارندے دلاور پر جھپٹ پڑے۔ وہی کارندے جن کا وہ ''کارِخاص'' تھا۔ جو کل تک اسے سلام کرتے تھے، اس کا حکم مانتے تھے، اسے لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ بے دردی سے پیٹنے لگے۔

ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ بڑی آپا کی چلاتی ہوئی آواز جیسے کوسوں دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی...... ''ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں۔''

ہاں اسے بے دردی سے مارا جا رہا تھا۔ اسے سویرا کے سامنے مارا جا رہا تھا۔ ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کے دوران میں اس نے ایک دو بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے پھر گرا دیا گیا۔ سر پر لگنے والی ضربات نے جیسے اس کی نظر کو دھندلا دیا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک سرخ دھند سی پھیل گئی تھی۔ سماعت سے وحشی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

''ماردو اسے...... جان سے مار ڈالو۔''

''ٹکڑے کردو، کتوں کے آگے ڈال دو۔''

''پولیس کو بلاؤ...... ایس پی کو فون کرو۔''

''نہیں نہیں...... خود درانتی ڈالو اس کمینے کی گردن میں......''

اور وہ دیکھ رہی تھی...... یقیناً دیکھ رہی تھی۔ رائفل کا ایک دستہ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں لگا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا احاطے میں جا گرا۔ وہ اسے غلیظ ترین گالیوں سے نواز رہے تھے۔ اسے مارتے اور گھسیٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اسے اس کمرے تک لائے جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ کمرے کا اینٹوں کا فرش کھدا پڑا تھا۔ ''یہ دیکھ حرامزادے...... یہ ہیں تیرے کرتوت......'' شاہ فرمان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس نے دیکھا، اس کے سامان والا صندوق بھی اٹھا کر برآمدے میں پٹخ دیا گیا تھا۔ سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ ایک دھکا کھا کر اپنے سامان کے اوپر ہی گرا۔ اس کا ہاتھ اس چوبی ڈبے سے ٹکرایا جس میں اس کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ اس نے جنونی سے انداز میں وہ ڈبا اپنے سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے اسے مارتے چلے گئے مگر وہ ڈبے کو تھامے رہا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ مارنے والے ہاتھوں میں سے کسی کی کوئی سخت چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی جس سے سر پھٹ گیا تھا اور خون پھٹی ہوئی شرٹ کے کالر کو بھگو رہا تھا...... پھر اس کے لڑکھڑاتے جسم کو بازوؤں سے تھام کر جیپ میں ڈالا گیا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ جیپ قریباً آدھا گھنٹا چلتی رہی۔ جیپ رکی تو اسے نیچے اتار لیا گیا۔ پاس ہی کہیں سے پانی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ جیپ سے اتار کر اسے پھر لاٹھیوں سے پیٹا جانے لگا۔ ایک لاٹھی اس کی کلائی پر پڑی تو ڈبا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر کر کھل گیا...... چیزیں بکھر گئیں۔

وہ دیوانوں کی طرح ان چیزوں کو سمیٹنے کے لیے جھکا تو اس پر لاٹھیوں، ڈنڈوں کی بارش ہوگئی...... وہ گھڑی کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو ہاتھ پر ڈنڈا پڑتا۔ رومال یا کاغذ کے ٹکڑے کو چھونا چاہتا تو ضربات سے ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑا جاتیں......

تم کب تک مجھ کو بھولو گے...... اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے...... اس نے ڈنڈے کھاتے ہوئے بھی رومال اور وہ پرچہ اپنے ہاتھ میں کر لیا مگر پھر ایک لاٹھی کی جان لیوا ضرب اس کے سر پر لگی تو اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا...... وہ مر چکا تھا یا مرنے والا تھا۔ بس کہیں دور، بہت دور سے کچھ سرسراہٹیں سی تھیں۔ اس کے جسم کے ساتھ کسی رسا ٹائپ چیز سے کوئی وزنی شے باندھی جا رہی تھی۔ کچھ آوازیں آرہی تھیں۔ ”اوئے شیرو! ایکسل ٹھیک طرح سے باندھ...... یہ کھل گیا...... تو یہ کمینہ پانی پر واپس اوپر آجائے گا۔“ یہ آخری آوازیں تھیں جو اس کے ڈوبتے ذہن میں سنائی دیں...... اس کے بعد یوں لگا کہ اس کا وجود پانی کے اندر کہیں نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔ بہت سی ملی جلی سرگوشیاں پانی کے دباؤ میں ابھرنے لگیں۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے......

”چلو آج ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے میں اور تم اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے مجھے سویرا بی بی نہیں، صرف سویرا کہو گے......“

”دلاور! میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔ تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔“

”دلاور! تم خود کو اکیلا مت سمجھو...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں......“

”دلاور! میں نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ دیکھنا آنے والے دنوں میں تم حویلی کے بہت ہی خاص بندوں میں شمار ہوگے......“

”دلاور! میں تمہارے لیے کچھ الگ طرح سے سوچتی ہوں۔“

دلاور پانی کی تہ میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا.. جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے مگر وہ زندہ کب تھا۔ وہ تو مر رہا تھا۔ فرشتۂ اجل کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ان جان لیوا لمحوں میں ایک کھڑکی سی دلاور کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے کھل گئی۔ یہ اس کے ماضی کی کھڑکی تھی...... گرمی کی چمکتی دوپہر تھی۔ لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے بائیں طرف ایک تنگ گلی اوپر کو چڑھتی تھی۔ بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں اور بوسیدہ مکانوں کا ایک گورکھ دھندا تھا۔ انہی تنگ گلیوں کے ایک بوسیدہ مکان میں جس کے برآمدے کے ایک کونے میں سنہری دھوپ اترتی تھی، وہاں پر ایک ٹوٹی چارپائی کو آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت ٹھیک کرتے ہوئے مسکراتی ہے...... کیونکہ سرفو دم گھٹ نے اس کی جھولی میں ایک ننھا بچہ لا کر ڈالا ہے۔

”لے سنبھال اسے...... صبح جب میں راوی پر گیا تھا تو ایک کشتی میں روتا ہوا ملا تھا یہ مجھے...... دوپہر تک اس کے مالکوں کو ڈھونڈتا رہا...... مگر کوئی نہیں ملا...... تو پال اسے...... تھوڑا بڑا کر اسے...... دیکھ...... پھر میں اسے کیسا ٹوبا بناتا ہوں...... لوگ سرفو کو بھول جائیں گے۔“

”دلاور پتر! جا بازار سے مجھے سبزی لا دے......“

”آ میرا پتر ادھر...... تو نال والے پپو کے ساتھ نا کھیلیا کر...... دیکھ تیرے پنڈے پر لاس ڈال دی ہے۔“

”ماں...... مجھے چاچا سرفو کے ساتھ نہیں جانا...... مجھے پانی میں ڈبکیاں دیتا ہے۔ میری ناک میں پانی گھس جاتا ہے۔ میری آنکھوں سے پانی بھی بہنے لگتا ہے۔ وہ مجھے بڑی دیر پانی میں رکھتا ہے......“

”میرا پت تو بڑا بہادر ہے۔ دیکھ دلاورے! دل چھوٹا نہ کریا کر...... تیرا چاچا تیرے پھیدے کے لیے ہی سب کچھ کرت ہے۔ وہ تجھے کچھ سکھانا چاہتا ہے...... بنانا چاہتا ہے۔“

سرفراز عرف سرفو دم گھٹ جدی پشتی ٹوبا تھا۔ گہرے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پانیوں میں زیادہ سے زیادہ دیر رہنے کا فن نسل در نسل اس میں منتقل ہوا تھا...... اور اب وہ یہ فن...... آٹھ سالہ دلاور میں منتقل کر رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے دلاور کو دوبارہ پانی میں غوطہ دیا۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چلانا چاہتا تھا مگر منہ کھولتا تو ڈھیروں پانی اس میں چلا جاتا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ سانس اپنے سینے میں روک لیا۔ دس سیکنڈ...... بیس سیکنڈ...... تیس سیکنڈ...... چالیس پینتالیس سیکنڈ...... اس کے ننھے وجود میں آواز گونجنے لگی۔

”چاچا...... مجھے چھوڑ دے...... چاچا ہاتھ ہٹالے...... میں مرجاؤں گا...... میرا دم گھٹ رہا ہے...... میرا سینہ پھٹنے والا ہے۔ چاچا...... مجھے پانی سے نکال لے...... میں مر رہا ہوں...... میں مر رہا ہوں......“ ایک جھٹکے کے ساتھ وہ ہوش میں آگیا...... چوڈیرو حویلی کے ”غنڈوں“ کی بدترین مار کھانے والا دلاور ہوش میں آگیا...... گہرے پانی کی مچھلی...... گہرے پانیوں کا شناور...... سرفو دم گھٹ کا ”لے پالک“ ہوش میں آگیا۔

اس کے جسم کا ایک ایک حصہ اذیت کے سپرد تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ پانی حلق کے راستے اس کے جسم میں چلا گیا تھا۔ صورتِ حال خطرناک تھی۔ اس کے پھیپھڑوں کو ہوا درکار تھی...... جو پانی کی اس تہ میں ناپید تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سطح آب پر آنا چاہا مگر اس کے کرم فرماؤں نے ایک نیکی یہ بھی کی تھی کہ اس کی کمر کے ساتھ ایک رسّا باندھا گیا تھا۔ رسّے کا دوسرا سرا کسی گاڑی یا ٹریکٹر کے آہنی ایکسل کے ساتھ منسلک تھا۔ دلاور نے تیر کر اوپر آنا چاہا مگر وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلانے کے باوجود ایک فٹ بھی اوپر نہ جاسکا۔ یہ بڑے اہم اور کٹھن لمحے تھے۔ دلاور نے رسّے کو پکڑ کر کھینچا اور ایکسل تک پہنچ گیا۔ اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے ایکسل کو اٹھایا۔ ایک ڈیڑھ فٹ اوپر لایا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ایکسل کو چھوڑ دیا۔ اب وہ کمر کے گرد بندھے رسّے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے رسّے کو پکڑ کر زور زور سے کھینچا...... شاید رسّا ایکسل سے جدا ہوجائے...... مگر قسمت کی دیوی مہربان نہیں ہوئی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا اور رسّے کو جھٹکے دینے لگا......

”چاچا...... چاچا...... مجھے باہر نکال لے...... میں مر رہا ہوں...... میرا سینہ پھٹنے والا ہے چاچا...... بس کر چاچا! میں مرجاؤں گا...... مجھے پانی سے نکال لے......“

اس نے تصور میں دیکھا، اس کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ اس پر ایک خوشبودار چادر تھی۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور بہت سے لوگ کندھوں پر اس چارپائی کو اٹھائے بھاگے جارہے تھے۔ یوں لگتا تھا سب کو بہت جلدی ہے۔ ہر طرف سر ہی سر ہیں اور لوگ دیوانہ وار بھاگے چلے جارہے ہیں۔ یہ اس کا جنازہ تھا۔ یکایک منظر غائب ہوگیا۔ مہلت مل گئی۔ رسّے کی گرہ تو نہیں کھلی مگر وہ ایکسل سے جدا ہوگیا۔ پانیوں کا بادشاہ...... پانی کو پچھاڑتے ہوئے سطح آب پر آگیا...... وہ کنارے پر رینگتا ہوا خشکی پر آگیا...... یہ کوئی بیلا تھا...... ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ اس کے ڈوبتے ذہن نے ایک فائر کی آواز سنی پھر اس کا ذہن اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوبارہ اس کی حسیات بیدار ہوئیں تو اس نے کچھ لوگوں کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

”لگتا ہے...... اب بچ جائے گا یہ......“

”اسے اسپتال لے جاتے ہیں......“

”مگر یہ پولیس کیس ہے۔ کہیں......؟“

”اوئے دیکھ لیں گے...... کیس...... کو بھی...... پولیس کو بھی...... پتا نہیں کس مائی کا لال ہے...... ڈالو اسے جیپ میں، ابھی اسپتال لے کر چلتے ہیں۔“

پھر دلاور نے خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا۔ جب بھی کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ بھاری دھند کے پار سے کوئی روشنی کی کرن نمودار ہوتی تو دلاور کو اس میں کچھ مناظر نظر آتے...... ڈاکٹر اس پر جھکے ہوتے...... نرس گلوکوز کی بوتل میں سرنج کے ذریعے کوئی پیلا سا محلول انجیکٹ کر رہی ہوتی۔ کبھی کچھ اجنبی سے لوگ اسے اپنے اردگرد منڈلاتے نظر آتے۔

یہ دھوپ چھاؤں پتا نہیں کتنے دن چلتی رہی۔ جب باقاعدہ اس نے آنکھ کھولی تو خود کو ایک درمیانے درجے کے کمرے میں پایا۔ اس نے پردہ سرکا کر دیکھا تو دن کی روشنی میں اسے کپاس کا ایک بلند پہاڑ نظر آیا۔ کچھ بندے سیدھے بیلچوں کی مدد سے کپاس کو اکٹھا کر رہے تھے۔ وہاں کچھ عورتیں بھی تھیں جنھوں نے موٹے دبیز کپڑوں کے جھولا نما بڑے بڑے فراک پہن رکھے تھے۔ ان میلی کچیلی عورتوں نے بڑی بڑی بالیاں پہن رکھی تھیں اور ناک کی درمیانی جھلی میں دو، دو...... تین، تین چھوٹی بالیاں پرو رکھی تھیں۔ کچھ ننگ دھڑنگ بچے اودھم مچا رہے تھے...... پتا نہیں کیوں...... اس کو یہ منظر بھلا لگا...... شاید...... یہ زندگی تھی......

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور وہ...... اس ''چارپائی'' سے اتر کر آرہا تھا جس کو بہت سے لوگ بڑی تیزی سے بھگائے لے جارہے تھے۔

دلاور اپنے حواس میں آیا...... سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں...... تو گزرے ہوئے واقعات کی فلم پوری جزئیات کے ساتھ اس کے دماغ میں چل گئی۔ اس کو غم سے نڈھال ہوجانا چاہیے تھا۔ درد سے بے حال ہوجانا چاہیے تھا مگر اس کے من میں ٹھہراؤ ڈیرے ڈال چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس چارپائی سے نیچے اتر کر آرہا تھا جسے لوگ بھگائے لے جارہے تھے۔ شاید اس نے دوسرا جنم لیا تھا۔

دلاور کو اسی دن معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی جان بچانے والے لوگ حضور چانڈیو کے کارندے تھے، جو صبح ہونے سے پہلے مرغابیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ شکار کے دوران میں ان کی نظر نیم مُردہ دلاور پر پڑی اور وہ اسے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ دلاور سات آٹھ دن اسپتال میں رہا تھا۔ اسپتال میں ہی حضور چانڈیو کے ایک کارندے نے دلاور کو پہچان لیا۔ جب حضور چانڈیو تک خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دلاور کو سبز حویلی لایا جائے۔

سبز حویلی میں یہ اس کا دوسرا دن تھا۔ دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ یہی وہ حضور چانڈیو ہے جس کے ساتھ شاہ زمان اور شاہ فرمان کی خونی دشمنی چل رہی تھی۔ دونوں پارٹیوں کے کئی بندے قتل ہوچکے تھے اور ایک دوسرے پر درجنوں کیس بنے ہوئے تھے۔ پہلے حضور چانڈیو کے ''کارِ خاص'' افضل بھگا نے دلاور سے سوال جواب کیے پر حضور چانڈیو خود دلاور کی کتھا سننے کے لیے آن موجود ہوا۔ حضور چانڈیو قدرے سانولے رنگ اور اونچی ناک والا ایک درمیانی عمر کا چودھری تھا۔ وہی وڈیروں والی تن فن اور اونچے شملے والی پگڑی...... بہرحال فی الوقت وہ دلاور کا محسن اور میزبان تھا۔

دلاور نے اپنی کہانی کے کچھ حصے چھوڑ کر باقی سب کچھ چانڈیو کے گوش گزار کردیا۔ دلاور نے اسے بتایا کہ اس پر کتنا گھناؤنا الزام لگا کر اور کس طرح جان بلب کر کے چوڈیرو حویلی والوں نے اسے پانی کی نذر کردیا تھا۔

حضور چانڈیو نے کہا۔ ''سو حرامزادوں کو اکٹھا کیا جائے تو ان کا ایک حرامزادہ یہ شاہ فرمان بنتا ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے، اس نے چھوٹے بھرا کی موت کے بعد اس کی زنانی (سویرا) پر بھی اپنی گندی نظر رکھی ہوئی ہوگی۔ تم دیکھ لینا، وہ بہت جلد چھیتی پانچویں شادی بھی کھڑکا دے گا۔''

ان باتوں کے دوران میں ہی چانڈیو کی ایک ملازمہ ٹرے میں دودھ کی سردائی کا ایک بڑا جگ اور ایک گلاس رکھ کر لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ حضور چانڈیو کا ''سردائی ٹائم'' ہے۔ ملازمہ کا نام بعد ازاں سندری معلوم ہوا۔ وہ کالے رنگ کی تھی لیکن بہت تیکھے نقوش اور تیز طرار۔ وہ انہی عورتوں کے قبیلے سے لگتی تھی جن کو دلاور نے کپاس کے بلند ڈھیر کے پاس دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ میلی کچیلی تھیں مگر یہ خوب لشکی پشکی ہوئی تھی۔ جیسے سیاہ بوٹوں کو پالش کردیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں۔ وہ بھی سر پر تیل چوپڑے، کس کے بال باندھے، آنکھوں میں کاجل لگائے ایسے ہی دمک رہی تھی۔

پچھلے چند ہفتوں میں دلاور کو بہت اچھی طبی امداد ملی تھی۔ ورنہ جس بے دردی سے اسے مارا گیا تھا، شاید وہ کئی ماہ تک بستر سے نہ اٹھ سکتا۔ اس کے جسم کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مسل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ کم از کم دو جگہ ہڈیوں میں ہیئر لائن فریکچر تھے۔ بے شمار اندرونی اور بیرونی چوٹیں تھیں۔

جب وہ اکیلے میں ان مناظر کو یاد کرتا تو اس کے سینے کے اندر جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرنے لگتا۔ اسے وہ قیامت کے لمحے یاد آتے جب شاہ فرمان کے چہیتے ٹیپو ٹریگر نے دیگر کارندوں کے ساتھ مل کر اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ دلاور کے لیے سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ سویرا کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اس ہستی کی موجودگی میں جس کے لیے وہ اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ جس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینا اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔

آہ...... وہ یہ سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کیا دلاور کے دل سے کوئی راہ سویرا کے دل تک نہ جاتی تھی؟ اگر جاتی تھی تو پھر اس کی آنکھوں میں نمی کیوں نہیں آئی تھی؟ اس کے قدم اسے چھڑانے کے لیے کیوں نہیں اٹھے تھے؟ کیوں وہ پتھر کا بت بنی کھڑی رہی تھی؟

وہ جب یہ سب کچھ سوچتا تھا تو دل ہی دل میں کراہ اٹھتا تھا...... سویرا! کیا تم نے بھی وہی سمجھا جو دنیا والوں نے سمجھا...... کیا ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا...... کیا دل سے دل تک جانے والی کوئی راہ نہیں تھی؟ یہ بات روزِ روشن کی طرح بالکل عیاں تھی کہ اس کے خلاف گھناؤنی سازش ہوئی تھی۔ اسے پھنسایا گیا تھا۔ اسے پھنسانے کے لیے جو ڈراما رچایا گیا، اس کا ڈائریکٹر یقیناً شاہ فرمان تھا اور ٹیپو ٹریگر نے اہم ترین رول ادا کیا تھا...... ایک دن وہ بستر پر لیٹا اسی طرح

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے خیالوں میں گم تھا کہ چونک گیا۔ کھڑکی میں سے سبز حویلی کے سرسبز لان میں اسے دور کچھ درختوں کے نیچے حضور چانڈیو نظر آیا۔ وہی دوھریوں جیسا بڑا پگڑ اور کلف دار کرتی ہوئی شلوار قمیص..... حضور چانڈیو کے ساتھ ایک بارعب عربی شیخ تھا۔ اس نے اماراتی طرز کا لمبا لبادہ پہن رکھا تھا اور سر پر ڈبی دار رومال تھا۔ اردگرد مؤدب ملازمین تھے جن میں افضل بھگا بھی شامل تھا۔ شیخ کے ہاتھ پر دستانہ تھا اور دستانے پر وہی بے مثال باز پھڑ پھڑا رہا تھا جسے ایک دن کچا قلعہ کی اونچی دیواروں سے نکالنے کے لیے دلاور نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ باز کے سر پر مخملی اندھیاری یعنی غلاف تھا۔ موقع پر موجود ہر شخص بے حد اشتیاق سے اس نایاب پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ سارے لوگ درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئے۔

دلاور نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شیخ تھا جس نے اس پرندے کے حصول کے زندگی موت کا مسئلہ بنا رکھا تھا اور جس کے لیے ضد میں آکر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے ادا کیے گئے ہیں۔ یہ شیخ ابھی تک اس سبز حویلی میں موجود تھا۔ یا شاید دوبارہ یہاں آیا تھا۔

شام کو جب افضل بھگا سے دلاور کی ملاقات ہوئی تو اس سے اس بارے میں بات ہوئی۔ شیخ صاحب کا نام بن باقر معلوم ہوا۔ افضل بھگا نے بتایا۔ ''یہ لوگ اب واپس دبئی جارہے ہیں۔ کافی سیر سپاٹے کرلیے ہیں انہوں نے۔''

''یہ لوگ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا شیخ صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''ہاں ان کی سب سے چھوٹی بیگم دو ملازم بھی ہیں۔ چھوٹی بیگم بہت زیادہ لاڈلی ہے۔ شیخ صاحب اس کی ہر بات مانتا ہے۔ وہ پاکستان دیکھنا چاہتی تھی، خاص طور سے وہ علاقے جہاں شکار وغیرہ ہوتا ہے، اس کی فرمائش پوری ہوئی لیکن اس کی کوئی ایک فرمائش تھوڑی ہے۔ ہر روز نئی فرمائش ہوتی ہے۔ کبھی کسی میلے میں جاتی ہے، کبھی پہلوانوں کی کشتیاں دیکھتی ہے۔ کبھی کسی کچی بستی میں جاکر رات گزارنا چاہتی ہے۔ اب اس کی ایک تازہ فرمائش ہے جسے سن کر شاید تمہیں بھی حیرانی ہو۔''

''کیا؟''

''پانی کے جہاز کے ذریعے واپس دبئی جانا چاہ رہی ہے۔ اب شیخ کے بندے بھاگ دوڑ کررہے ہیں کہ سمندری سفر کا بندوبست کیا جائے.....''

افضل اور دلاور میں یہ گفتگو سبز حویلی کے پچھلے احاطے میں ہورہی تھی۔ دونوں گھاس پر آلتی پالتی مارے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اچانک افضل کے چہرے کا رنگ بدلا، وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ''لو بھئی..... بڑی لمبی عمر ہے شیخ صاحب کی..... وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔''

وہ دونوں جلدی سے کھڑے ہوگئے۔ حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر چند ملازموں کے ساتھ تشریف لارہے تھے۔ حضور چانڈیو نے دلاور کی طرف اشارہ کرکے بن باقر سے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ بن باقر کے ملازم نے بن باقر تک پہنچایا۔ بن باقر کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوئی، حضور چانڈیو نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ ''اوئے دلاور! ادھر آ.....''

دلاور اور افضل بھگا، حضور چانڈیو کے پاس پہنچے۔ دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ شیخ کی نگاہیں بدستور دلاور کا طواف کررہی تھیں۔ حضور چانڈیو نے کہا۔ ''دلاور سے، شیخ صاحب تیری سخت جانی کا سن کر بڑے حیران ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ شاہ زمان کے غنڈوں نے تجھے مردہ سمجھ کر ڈونگے چھپڑ میں پھینک دیا تھا اور تیرے پنڈے کے ساتھ کوئی دو من کا لوہے کا ایکسل باندھ دیا تھا مگر تو پھر بھی ہمت کرکے نکل آیا.....''

بن باقر نے عربی میں کچھ پوچھا۔ اردو دان ملازم نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب شیخ تم سے پوچھ رہے ہیں کہ ملازمت کرنا پسند کرو گے؟''

دلاور نے کہا۔ ''میں تو چانڈیو صاحب کا بے دام کا غلام ہوں۔ اگر وہ آگ میں چھلانگ لگانے کا کہیں گے تو ابھی لگادوں گا۔''

دلاور کا جواب شیخ تک پہنچا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ دلاور کے سراپا کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گھوڑا، اونٹ یا باز وغیرہ خریدنے سے پہلے اسے دیکھا جاتا ہے۔ دلاور کو یہ انداز اچھا تو نہیں لگا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھا کرتا تھا۔

شیخ نے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے دلاور سے کہا۔ ''شیخ صاحب فرماتے ہیں، وہ تمہیں ساتھ لے جانے کے بارے میں سوچیں گے.....''

افضل بھگا اور دلاور نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا..... وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس دن شیخ بن باقر تلور کا شکار کھیلنے کے لیے پوری پلٹن کے ساتھ رحیم یار خان سے کچھ آگے مالن پور کے بیلے میں موجود تھا۔ چھوٹی بیگم بھی ساتھ تھی۔ بن باقر چالیس سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پینتالیس کے پیٹے میں تھا جبکہ چھوٹی بیگم بمشکل بائیس تیئس سال کی تھی۔ اس کی ایک فرمائش ابھی پوری نہیں ہونے پاتی تھی کہ دوسری کا تقاضا شروع ہوجاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس نے ایک مقامی میلے میں جانے کی فرمائش کردی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ بن باقر کا قافلہ، اندرونِ شہر سے گزر رہا تھا۔ وہاں ایک کھلی جگہ پر میلے کا اہتمام تھا۔ روایتی پنگوڑے...... مقامی کھانے...... انوکھے کھیل تماشے...... چھوٹی بیگم نے انگلی سے میلے کی جانب اشارہ کردیا۔ پھر کیا تھا۔ بن باقر کے حکم سے قافلے کا رخ میلے کی طرف ہوگیا۔

پاکستان سے روانگی میں تین دن باقی تھے اور آج چھوٹی بیگم کی شکار دیکھنے کی خواہش سب کو مالن پور لے آئی تھی۔ دلاور اور افضل بھگا بھی شکار پارٹی میں شامل تھے۔ شکار تین چار گھنٹے تک جاری رہا۔ پندرہ بیس پرندے تو صرف شان باز کے ذریعے شکار ہوئے۔ دلاور سارا دن غم کی تصویر بنا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج اتنے دنوں بعد اس کے دل کے موسم میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ سویرا بے طرح اسے یاد آرہی تھی۔ ہاں وہی سویرا جس نے اسے عشق کی ایک ایسی سولی پر چڑھایا تھا، جو مارتی نہیں تھی بس جاں کنی کے عالم میں رکھتی تھی۔ وہی سویرا جس کی موجودگی میں اس پر تشدد کی انتہا کردی گئی تھی۔ جس حویلی سے وہ مرتے دم تک نہیں نکلنا چاہتا تھا وہاں سے اسے نکال باہر کیا گیا تھا۔ روہی کے اجنبی سناٹے اس سے جدا ہوگئے تھے۔ پستہ قد بیریوں سے وہ بہت دور چلا آیا تھا اور اس ہوا سے بھی جس میں اس کا بے رحم محبوب سانس لیتا تھا...... شاید کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لمبے پنڈے اوکھیاں راہواں عشق دیاں......

اگلی رات حضور چانڈیو نے اسے نشست گاہ میں طلب کرلیا۔ دلاور نشست گاہ میں پہنچا تب بھی بے حد دل گرفتہ تھا۔ حضور چانڈیو نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''نہیں حضور سائیں!'' دلاور نے آہستگی سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔

''میں کہوں گا کہ تم بن باقر کے ساتھ دبئی چلے جاؤ......''

دلاور کچھ دیر سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''حضور سائیں! میں چوڈیرو حویلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں...... اپنے اوپر لگے ہوئے جھوٹے الزام کو مٹانا چاہتا ہوں۔''

حضور چانڈیو بڑی کرسی پر براجمان ہوگیا۔ اپنے سگریٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''شاہ فرمان بہت کمینہ آدمی ہے۔ جہاں تمہاری سوچ ختم ہوتی ہے، اس کی کمینگی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیپو ٹریگر اس کا خطرناک پتّہ ہے۔ چوڈیرو حویلی جاؤ گے تو اس بار وہ تمہاری آخری سانس تک نکال لیں گے۔ میرا کہا مانو تو ابھی ادھر ادھر ہوجاؤ۔ اگر ان کنجروں کو بھنک بھی پڑگئی کہ تم زندہ ہو...... تو وہ بھوکے بگیاڑوں کی طرح تمہارے پیچھے پڑجائیں گے اور تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس ویلے ان کا زور چل رہا ہے۔''

جواب میں دلاور خاموش رہا۔ حضور چانڈیو نے بات جاری رکھی۔ ''شیخ باقر بہت چنگا آدمی ہے۔ اس کی ملازمت کرکے بڑے فائدے میں رہو گے تم۔ تمہارے علاوہ سندری اور شاید دو لڑکے اور بھی جائیں گے۔ بس عام سا چھوٹا موٹا گھر کا کام ہوگا......''

دلاور کی نگاہوں میں یکا یک وہ تمام مناظر روشن ہوگئے جب اسے بدترین مار پیٹ کا نشانہ بنا کر پانی میں پھینک دیا گیا تھا۔ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ یہ بھی ایسا ہی لمحہ تھا۔ دلاور کے ذہن نے مختصر وقت میں سارے حساب کتاب جوڑے اور وہ تین دن بعد پاکستان چھوڑنے کے لیے تیار ہوگیا۔ ہاں...... وہ اس زمین...... اس دھرتی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوگیا جہاں اس کا سنگ دل محبوب رہتا تھا اور جہاں اس نے اپنی زندگی کے ان گنت سال گزارے تھے۔ وہ ایسی غربت کی ماری، لاچار زندگی جینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر کچھ بدل چکا تھا۔

☆☆☆

جدید طرز کا تفریحی بحری جہاز کھلے سمندر میں دبئی کی طرف رواں تھا۔ گلف ڈریم نامی یہ جہاز درمیانے سائز کا تھا۔ اس میں قریباً 60 کمرے تھے اور ڈیڑھ سو مسافروں کے سفر کی گنجائش تھی۔ ان کا یہ سفر قریباً پانچ روز کا تھا۔ دلاور کو معلوم ہوا تھا کہ ویسے تو کراچی سے دبئی تک کا سمندری راستہ 1200 کلومیٹر سے کچھ کم ہی تھا اور یہ سفر ایک ڈیڑھ روز میں طے ہوسکتا تھا لیکن اس جہاز کو بہت ایزی اسپیڈ پر کھلے سمندر کی سیاحت کرتے اور کچھ جگہوں پر رکتے ہوئے جانا تھا۔ بن باقر پاکستان سے جن چار ملازموں کو ساتھ لے کر جارہا تھا، ان میں دلاور کے علاوہ سندری، اس کی ماں اور ایک مکرانی لڑکا تھا۔ گلف ڈریم نے پاکستانی حدود کو چھوڑا تو دلاور کی آنکھوں میں نمی لہرا گئی۔ دور...... روہی کی ریتیلی زمین پر کھڑی پستہ قد بیریوں کے آس پاس آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کچھ سرگوشیاں تھیں...... تم کب تک مجھ کو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھولو گے..... صحرا کی جھلسی دوپہروں میں کچھ اَن دیکھی سی راہیں ہیں.....

یہ سفر کے دوسرے روز کی بات ہے۔ دلاور رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔ مکرانی لڑکا دلاور کے ساتھ والے بیڈ پر چھوٹے کیبن میں سو رہا تھا۔ لگژری جہاز بحیرۂ عرب کے سینے کو چیرتا ہوا منزل کی طرف گامزن تھا۔ رات آخری پہر دلاور کی آنکھ لگ گئی مگر پھر اچانک کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی وہ تھوڑی دیر سویا ہے۔ باہر دن کا خوبصورت اجالا پھیل چکا تھا۔ کچھ بلند آوازیں باہر سے سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی تیز عربی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ دلاور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ بڑی شاندار دھوپ تھی، اور گہرا نیلا آسمان۔ شیخ بن باقر اپنے ایک عربی ملازم سے سخت لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک جدید پنجرے میں وہ شان نامی نایاب باز ٹہل رہا تھا جس کے لیے کروڑوں روپے ادا کیے گئے تھے۔ باز کی چونچ خون سے سرخ نظر آ رہی تھی۔ عرشے کے فرش پر بلی کا ایک معصوم سا بلونگڑا شدید زخمی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں۔

معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باز کو پنجرے سے نکالا گیا تھا۔ بن باقر کے عربی ملازم نے غلطی سے باز کی اندھیاری (آنکھوں کو ڈھانپنے والی تھیلی) اس کے سر سے ہٹادی۔ یہ بدقسمت بلونگڑا قریب ہی موجود تھا۔ باز اپنی تربیت کے مطابق اس پر جھپٹ پڑا اور چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اب اس کی ماں حسرت کی تصویر بنی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

دلاور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے لگا کہ ان چودھریوں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی اکثریت، شکاری باز جیسی فطرت ہی رکھتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی کمزور پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ معاشرہ اور قانون وغیرہ بس چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اسی اثنا میں دلاور کی نظر حضور چانڈیو پر پڑی اور اسے پہلی بار یہ پتا چلا کہ وہ بھی اس جہاز میں موجود ہے۔ دلاور نے حضور چانڈیو کو دیکھ کر حیرانی ظاہر کی۔ وہ ایک آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں تو بس سیر سپاٹے کے لیے جا رہا ہوں دلاور..... دس پندرہ دن رہ کر ہوائی جہاز سے واپس آ جاؤں گا اور اگر تیرا دل نہ لگا تو بے شک تو بھی آ جانا۔ پر میری صلاح تو یہی ہے کہ تو سال دو سال کے لیے وہاں ٹک جا۔''

شاید حضور چانڈیو کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں شیخ باقر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں آ گیا۔ چوکس ملازموں نے مستعدی سے دو تین مزید لگژری کرسیاں وہاں رکھ دیں۔ شیخ باقر کے ساتھ اس کے دو کویتی دوست بھی تھے۔

حضور چانڈیو نے مترجم کے ذریعے دلاور کا تعارف کرایا۔ آخر میں بولا۔ ''جناب عالی! جنات جیسا کام کیا ہے اس نے۔ ان ظالم دشمنوں نے کوئی تین من لوہا باندھا تھا اس کے پنڈے کے ساتھ..... اور یہ سخت زخمی بھی تھا۔ پر نکل آیا زندہ سلامت۔ یہ بہادر جیسی ہمت ہے جی اس کی۔''

شیخوں کی دلچسپی اس میں بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے مؤدب کھڑا رہا۔ اس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انسان نہیں خچر، گھوڑا یا کوئی اعلیٰ نسل کا پالتو جانور ہے اور حضور چانڈیو دوسروں کے سامنے اس کی ملکیت پر فخر محسوس کر رہا ہے۔ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے..... دیکھو یہ میرا ہے، میرا مطیع ہے، میرا محکوم ہے، میرا پالتو ہے، دیکھو ذرا میری پسند کو۔

مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھتا تھا..... اور بڑی آپا بھی..... اور شاہ فرمان بھی..... اور شاید..... شاید..... نہیں..... وہ ایسی نہیں تھی، وہ نہیں تھی ایسی..... لیکن اگر وہ ایسی نہیں تھی تو پھر.....

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو جاتا تھا..... یہ سمندری سفر کی تیسری رات تھی۔ گلف ڈریم تاریکیوں کو چیرتا ہوا منزل کی طرف رواں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد حضور چانڈیو کو بدن دبوانے کی عادت تھی مکرانی لڑکے کو بخار تھا اور الٹیاں آ رہی تھیں۔ مٹھی چاپی کی ذمے داری دلاور پر آ گئی۔ حضور چانڈیو کے لگژری روم میں وہ ایک گھنٹا اس کی مٹھی چاپی کرنے اور اس کی زبانی شاہ فرمان کی شان میں ''قصیدے'' سننے کے بعد وہ اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا جب اس نے سندری کو دیکھا۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ اس لگژری اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جہاں بن باقر کا کویتی دوست مقیم تھا۔ دلاور احتیاط سے پیچھے گیا اور ایک منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نہائی ہوئی اور قدرے بنی سنوری سندری بڑی خاموشی کے ساتھ کویتی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ بے شک وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے لیکن بہت ڈری سہمی ہوئی ہے۔

پتا نہیں کیوں باز اور معصوم بلونگڑے والا سین پھر دلاور کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہاں، باز طاقتور تھا اور بلونگڑا کمزور۔ اسے باز کے پنجوں میں آنا ہی آنا تھا۔ سندری کالی سیاہ تھی لیکن تروتازہ اور چمکدار تو تھی..... اور کالا انگور بھی تو

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

Downloaded From Paksociety.com

ہوتا ہے۔ پھلوں کے شوقین ہر طرح کا پھل چکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دلاور ایک طویل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

صبح وہ ایک نامانوس سا شور سن کر جاگا تھا۔ وہ کیبن سے باہر نکلا اور چند زینے طے کر کے عرشے پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ بن باقر کی نوجوان چلبلی بیوی ایک طرف کرسی پر بیٹھی بھوں بھوں رو رہی تھی اور بن باقر اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی دو بندے غوطہ خوری کے لباس میں کھڑے تھے۔

بیوی کو چپ کرانے کی ناکام کوشش کے بعد بن باقر غوطہ خور ملازموں پر برس پڑا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ ''لگژری شپ ہے یہ..... اور اس میں انتظامات کیا ہیں تم لوگوں کے۔ آکسیجن سلنڈر تک کام نہیں کر رہا تم لوگوں کا۔ ہزاروں ڈالرز سیکیورٹی کے کھاتے میں لیتے ہو تم لوگ..... کیا ہے تمہاری مینجمنٹ؟''

''سوری سر! ہم نے کوشش تو پوری کی ہے۔'' ایک ''سی ڈائیو'' بولا۔

''کوشش کو میں نے چاٹنا ہے۔ مجھے میری چیز چاہیے۔ کہاں ہے تمہارا کیپٹن..... کس کی گود میں گھس کر سویا ہوا ہے۔ اسے بلاؤ۔''

اس مکالمے سے جو کچھ دلاور کی سمجھ میں آیا اور جو کچھ اسے اردگرد موجود لوگوں سے معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ بن باقر کی چلبلی بیوی عروسہ چڑھتے سورج کی نرم روشنی میں اپنی سیلفیاں لینے کے لیے عرشے پر آ گئی۔ اس کے پاس قیمتی جیولری سے بھرا ہوا ایک ہینڈ باکس بھی تھا۔ وہ ایک ایک زیور اس میں سے نکال کر پہنتی۔ اپنی سیلفیاں لیتی اور اسے دوبارہ باکس میں رکھ دیتی۔ وہ اس خود ستائشی میں اتنی مگن ہوئی کہ عرشے کے بالکل کنارے پر چلی گئی۔ باکس اس کے قریب ہی فرش پر رکھا تھا۔ ایک چوکس ملازم بھی قریب ہی کھڑا تھا مگر دونوں چوک گئے۔ جڑاؤ زمرد والا ایک نیکلس پہن کر جب عروسہ سیلفی لے رہی تھی، اس کے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر جیولری باکس کو لگی اور وہ چکنی سطح پر پھسل کر تیس فٹ نیچے سمندر میں جا گرا..... جہاز کو وہیں روک لیا گیا تھا۔ اسے تھوڑا سا ریورس چلا کر موقع واردات پر لایا گیا تھا۔ اب پچھلے قریباً ایک گھنٹے سے جہاز کی سیکیورٹی کے غوطہ خور قریباً تیس میٹر تک نیچے جا کر باکس کو تلاش کرتے رہے تھے۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اب مزید تلاش اس لیے روک دی گئی تھی کہ ''سی ڈائیونگ'' میں استعمال ہونے والے ایک سلنڈر کے میکنزم میں خرابی واقع ہو گئی تھی اور دوسرے کا ماؤتھ پیس کسی نکیلے پتھر سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔

..... اسی دوران میں کیپٹن کا معاون ''کیپٹن'' کو بلا کر عرشے پر لے آیا۔ نشے کی وجہ سے کیپٹن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بمشکل ہی اٹھ پایا تھا۔ بن باقر، کیپٹن پر بھی برسنا شروع ہو گیا۔ وہ اسے ناقص انتظامات کے طعنے دے رہا تھا اور دیر سے یہاں آنے پر بھی لتاڑ رہا تھا، کیپٹن پہلے تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے بھی چند سخت جملے کہے۔ وہ بولا۔ ''میڈم کو اس خطرناک انداز میں سیلفیاں لینے کے لیے کس نے کہا تھا۔ اگر جیولری کی جگہ خدانخواستہ ان کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ اس طرح کی سیلفیاں بہت سے لوگوں کی جان لے چکی ہیں۔''

جہاز رکا ہوا تھا۔ ہنگامہ جاری تھا۔ شیخ کی دو ملازمائیں روتی دھوتی عروسہ کو اس کے کمرے میں لے گئیں۔ پتا چلا کہ باکس میں عروسہ کی تقریباً تمام جیولری موجود تھی۔ اس میں ہیروں کے سیٹ اور ''اینٹیک پیسز'' بھی تھے۔ کچھ نہایت بیش قیمت خاندانی گہنے اس کے علاوہ تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی ان اشیا کی قیمت اسّی نوّے کروڑ کے قریب تھی۔ حضور چانڈیو اور شیخ کے کوئی دوست بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ جہاز کا ترک کیپٹن..... ٹرانسلیس کے ذریعے کسی اردگرد کے جہاز یا لانچ وغیرہ سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ غوطہ خوروں کا انتظام کیا جا سکے۔ مایوس کن اطلاع یہ تھی کہ علاقے میں طوفان کی آمد تھی اور قرب و جوار میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی مدد کو پہنچ سکتا۔ اچانک حضور چانڈیو کی نظر دلاور پر پڑی اور دلاور نے حضور چانڈیو کی نگاہ میں ایک تیز چمک نمودار ہوتے دیکھی۔ وہ کچھ دیر تک دلاور کو دیکھتا رہا پھر سیدھا اس کی طرف آیا۔ ''دلاور ے! یہ نئے فیشن کے غوطہ خور تو بکری بن گئے ہیں پر..... مجھے لگتا ہے کہ تو کوئی کام دکھا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی پنجابی ٹوبے کا پتر ہے تو۔ بڑی مشہوری ہے تیری اس بارے میں۔''

وہ ٹھٹک کر حضور چانڈیو کو دیکھنے لگا۔ ''ٹن..... نہیں چودھری جی! میں چھوٹے موٹے چھپڑوں، تالابوں میں تو چلا جاتا ہوں، پر یہ تو سمندر ہے۔''

''سمندر ہے، پر زیادہ ڈونگا تو نہیں ہے نا۔ وہ دیکھ اس پاسے ایک پتھر بھی نظر آ رہا ہے۔''

دلاور نے دیکھا جہاز سے کوئی آدھ کلومیٹر دور کسی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چٹان کا نوک دار سرا سمندر کے نیلے پانی میں سے نکلا ہوا تھا۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے کسی عقاب کی مڑی ہوئی چونچ ہو۔ اس سے پہلے کہ دلاور جواب میں کچھ کہتا، حضور چانڈیو لپکتا ہوا ابن باقر کی طرف چلا گیا اور مترجم کے ذریعے بن باقر کے ساتھ جوشیلے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بڑے فخریہ انداز میں دلاور کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تیزی سے دلاور کی طرف آیا، اس کا کندھا تھپک کر جوش سے بولا۔ ''ان کو یقین نہیں آ رہا کہ تو سلنڈر شلنڈر کے بغیر پانی میں لمبی ڈبکی لگا سکتا ہے۔ پر مجھے پتا ہے تو لگا سکتا ہے۔ تو کر سکتا ہے۔''

''مم...... مگر چودھری جی......''

''اوئے اگر مگر کیا...... اب مجھے شرمندہ کرے گا؟ یہ بڑا زبردست موقع ہے اپنا آپ منوانے کا۔ اگر سچ مچ وہ ڈبا مل گیا تو شیخ کی اکھیوں کا تارا بن جائے گا تو۔ لمبا انعام شام بھی ملے گا۔''

دلاور سوچ میں تھا، حضور چانڈیو نے پھر اس کا شانہ تھپکا۔ ''اوئے سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ پنجابی شیر ہے تو۔ اگے ودھ اور دکھا دے اپنی چھاتی کا زور۔''

......قریباً پندرہ منٹ بعد سرفودم گھٹ کا تربیت یافتہ دلاور نیلے پانی میں اترنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی کمر سے ایک لمبا رسا باندھ دیا گیا تھا اور وہ کنارے پر اپنے ننگے پاؤں جمائے کھڑا تھا۔ پانی میں کام کرنے والی ایک ٹارچ اس نے بیلٹ کے ذریعے اپنے پیٹ سے باندھ لی تھی۔ درجنوں مُتجسس نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں جن میں حضور چانڈیو کی نگاہ بھی تھی۔ اس کی نگاہ میں ایک امید بھری فخریہ چمک تھی۔ دلاور نے اپنی سانس باہر نکالی۔ پانی میں جست لگائی اور نیچے اترتا چلا گیا...... ہاں پانی کی مچھلی۔ ایک فطری پیراک...... جسے ایک خاندانی ٹوبے نے اپنی بے رحم تربیت سے کندن بنا ڈالا تھا۔ یہ کندن برسوں سے خاک میں رل رہا تھا...... لیکن آج اس کی زندگی میں ایک سنہری موقع آیا تھا۔

وہ پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھ کر اکثر سوچا کرتا تھا...... اللہ نے اسے کس لیے بنایا ہے۔ وہ کس مرض کی دوا ہے؟ نہ ڈھنگ سے پڑھ سکا، نہ کوئی فن سیکھ سکا...... نہ کوئی ایسا ہاتھ تھامنے والا اسے ملا جو دنیا کی تیزی طراری اور آگے بڑھنے کے ہنر اسے سکھاتا۔ کیا اس کی قسمت میں معمولی کام اور چودھریوں کی چھوٹی موٹی ملازمتیں ہی لکھی ہیں؟ لیکن جب سے اس نے مرحوم شاہ زمان کے حکم پر کچے کی جھیل پار کی تھی اور ساجے ٹھل کے چنگل سے باز نکال کر چوڈیر ولایا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔

وہ سر کے بل سمندر کے پانی میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ مناظر دھندلا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اسے سمندری نباتات اور چھوٹے بڑے پتھر نظر آنے لگے۔ ان پتھروں میں مچھلیاں اور دیگر آبی حیات متحرک تھیں، یہ اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ بالآخر اس نے ٹارچ یعنی واٹر لائٹ روشن کر لی۔ اب اسے پانی کے اندر قریباً چار منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اس کے پھیپھڑوں نے ہوا کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مونگے کی چٹانوں اور کائی لگے پتھروں کے درمیان تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں دیوانہ وار اس باکس کو تلاش کر رہی تھیں جو گلابی رنگ کے فائبر کا بنا ہوا تھا اور جس کا ہینڈل چمکیلے پلاٹینم کا تھا۔ واٹر لائٹ کا دائرہ ہر طرف حرکت کر رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی اور بیلٹ میں اڑس لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسی سانس کے ساتھ پانی کی سطح تک پہنچ بھی سکتا ہے یا نہیں۔

...... اور وہ پہنچ گیا۔ بچھڑی ہوا، دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی۔ وہ بے طرح ہانپ رہا تھا۔ درجنوں سوالیہ نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر وہ لوگ جان گئے کہ کم از کم اس غوطے میں تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

حضور چانڈیو کی پکارتی ہوئی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہمت نہیں ہارنی شیرا! آج کچھ کر کے دکھا دو۔ میرا سر نیچا نہ ہونے دینا۔''

حوصلہ افزائی کی کچھ مزید آوازیں بھی اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ اوپر اسے عرشے پر عروسہ کی پریشان صورت بھی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر بھی امید و بیم کے سائے تھے۔ طوفان ابھی دور تھا لیکن سمندر میں ہلکی لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

تین چار منٹ تک سانس درست کرنے کے بعد دلاور نے اوپر عرشے پر ان تین تنومند ملازموں کو دیکھا جنہوں نے اس کی کمر سے بندھا ہوا رسا تھام رکھا تھا۔ انہیں اشارہ کر کے دلاور پھر سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ زیادہ تیزی سے پانی میں اترا اور تہ میں پہنچ کر تلاش شروع کر دی۔ سانس الجھنے لگی تھی، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یکایک واٹر لائٹ کا روشن دائرہ پتھروں کے درمیان کسی چمکیلی چیز پر پڑا۔ دلاور کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی سے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پاس گیا..... رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ وہ گلابی باکس ڈھونڈنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ قریباً ڈیڑھ کیوبک فٹ کا باکس دو نکیلے پتھروں کے درمیان ٹکا ہوا تھا اور ایک آبی پودا اس کے اوپر ہلکورے لے رہا تھا۔ دلاور نے اس کے پلاٹینم کے ہینڈل کو ہاتھ لگایا تو کامیابی کی ترنگ جسم میں پھیل گئی۔ ابھی وہ سطح آب پر نہیں پہنچا تھا لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ عرشے پر کھڑے لوگوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے ہیں۔ وہ تالیاں بجا رہے ہیں اور نعرے بلند کر رہے ہیں۔ حضور چانڈیو کی خوشی دیدنی ہے۔ وہ فخریہ انداز میں عربی اور دیگر مسافروں کی طرف دیکھ رہا ہے اور دلاور کی پیٹھ تھپتھپاتا چلا جا رہا ہے۔

دلاور نے باکس پتھروں میں سے نکالا۔ اب اس کا اوپر کا سفر شروع ہوا چاہتا تھا لیکن اچانک ..... بالکل اچانک ..... اس کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ ہو گیا ہے۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ ایک فقرہ کسی آتشیں تیر کی طرح اس کے تصور میں لہرایا اور دماغ میں پیوست ہو گیا۔

یہ چوڈیرو حویلی کی بڑی آپا کی آواز تھی ..... ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں.....

یہ آواز نہیں تھی، پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کانوں کے راستے اس کے دماغ میں اترا اور اسے پتھر کا گیا۔ سانس اس کے سینے میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ حرکت نہ کر سکا۔

..... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں، وہ برسوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرا دیتے ہیں۔ چند ساعتوں کے اندر اندر دلاور کے ذہن نے جیسے مدتوں کے تشیب و فراز دیکھ لیے۔ سارے بھوکے ننگے ایک جیسے نہیں ہوتے ..... لیکن اگر بقول بڑی آپا ہوتے ہیں، تو پھر اکثر سرمایہ دار بھی ایک جیسے ہوتے ہوں گے۔ حضور چانڈیو بے شک شاہ زمان اور شاہ فرمان کا دشمن تھا لیکن فطرت تو اس کی بھی ان جیسی ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی للکارے تھے، اسے بھی اپنے اردگرد کیڑے مکوڑے ہی نظر آتے تھے۔ وہ بھی دلاور کی تعریفیں اسی انداز میں کرتا تھا جس انداز میں کبھی شاہ زمان کیا کرتا تھا۔ یہ میرا کارندہ ہے، یہ میرا پالتو ہے، بڑی اچھی نسل کا ہے..... ہاں یہ سب ایک جیسے ہی تھے۔ بڑی آپا ہو، شاہ فرمان ہو، حضور چانڈیو ہو، یا پھر شیخ بن باقر ہو اور عروسہ ہو..... ان سارے بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے..... ایک جیسی ہوتی ہے..... آواز دلاور کے کانوں میں گونجتی چلی جا رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ پانی میں پسینا نہیں آتا لیکن اسے لگا کہ اسے پسینا آ رہا ہے..... دیوانی سوچیں اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگیں..... اس نے شاہ فرمان اور شاہ زمان کی بے دام کی غلامی کی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی پروا بھی نہ کی۔ لاکھوں ریال کی مالیت کا ''باز'' اپنی جان پر کھیل کر واپس لایا..... اس کے صلے میں اسے کیا ملا؟ صرف ''کارِ خاص'' کا خطاب..... اور جھوٹی تعریفیں..... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی کایا کلپ ہوتے ہیں۔ وہ برسوں کا فاصلہ ساعتوں میں طے کرتے ہیں۔ دلاور نے یہ فاصلہ طے کر لیا..... اس نے بیش بہا جیولری باکس کو دوبارہ پتھروں کے درمیان پھنسا دیا۔ چوڑے پتوں والا آبی پودا اس کے اوپر کسی شیش ناگ کی طرح لہرانے لگا.....

دلاور کا سینہ آکسیجن کی طلب میں پھٹ رہا تھا۔ اسے پانی میں اترے کم از کم دس منٹ ہو چکے تھے اور ابھی سطحِ آب تک پہنچنے میں اسے کم از کم تین منٹ مزید درکار تھے۔ کیا وہ تین چار منٹ تک سمندر کے قاتل پانی کو اپنے جسم میں داخل ہونے سے روک سکے گا؟ یہ بے حد سنگین سوال تھا.....

بے حد مہلک ..... سرفو دم گھٹ نے کہا تھا..... پانی ٹوبے کو نہیں ڈبوتا، اس کی کم ہمتی ڈبوتی ہے..... پانی کے اندر اس وقت تک رہنا سیکھو جب تک تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر نہ کھلنے لگے۔ جب اندھیرے کی چادر کھلنے لگے تو پھر اوپر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کر دو.....

.....اور دلاور نے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کر دیے۔

وہ اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے خوفناک غوطہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے خود کو دیوانہ وار حرکت دیتا چلا گیا۔ وہ اوپر اٹھتا چلا جا رہا تھا..... ہمت کر دلاور..... چند فٹ..... صرف چند فٹ۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اسے روشنی نظر آ رہی تھی، یہ سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ پانی سے باہر لہرایا..... اور پھر ڈھیروں پانی اس کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ اندھیرے کی چادر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ جہاز کے عرشے پر ایک سائبان کے نیچے چت لیٹا تھا۔ بارش ہو رہی تھی اور سمندر میں اچھال تھا۔ دن میں ہی رات کا سماں بنا ہوا تھا۔ سب

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مسافر اور عملے کے زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ جہاز درمیانی رفتار سے لہروں پر ہچکولے کھاتا بڑھتا چلا جارہا تھا۔ دلاور کے قریب مکرانی لڑکے رشید کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''اپن کو بڑی فکر لگی ہوئی تھی، شکر ہے تم ہوش میں آگئے۔''

''کیا ہوا تھا؟'' دلاور نے پوچھا۔ (ویسے اسے ہر بات یاد آچکی تھی)

''وڈی تمہارا ہاتھ تو نظر آگیا تھا لیکن پھر تم ڈبکی کھا گیا، تم کو رسّے سے اوپر کھینچ لیا گیا..... تمہارے پیٹ سے پانی نکالا گیا اور ڈاکٹر نے ایک ٹیکا بھی لگایا.....'' مکرانی رشید اسے تفصیل بتانے لگا اور ساتھ ساتھ اس کے کندھے دبانے لگا۔

''چودھری جی کہاں ہیں؟'' دلاور نے پوچھا۔

رشید ذرا چپ رہنے کے بعد بولا۔ ''وڈی کہاں ہوتا ہے۔ اپنے کمرے میں ہوگا۔ تمہاری وجہ سے وہ کچھ شرمندہ بھی ہوا ہے۔ شیخ صاحب سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔ چلو چھوکرے نے کوشش تو کیا ہے۔''

''باقی کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہنا کیا تھا، بس منہ لٹک گئے تھے سب کے..... شیخ صاحب اور ترکی کیپٹن میں تھوڑا سا منہ ماری بھی ہوا۔ سمجھو کہ لڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شیخ صاحب ابھی کچھ دیر اور وہاں رکنا چاہتا تھا مگر کیپٹن صاحب کا خیال تھا کہ سمندر میں ہلچل آرہی ہے۔ اپن زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ یہ نہ ہو کہ جیولری ڈھونڈتے ڈھونڈتے جان کا لالہ پڑ جائے۔''

ان باتوں کے دوران میں سیاہ رنگت والی سندری بھی وہاں آگئی۔ اسے بھی اس بات کا افسوس تھا کہ نیم بے ہوش دلاور کو یہاں عرشے پر چھوڑ کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ حضور چانڈیو بھی اپنے حال میں مست تھا اور کھا پی رہا تھا۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ دلاور اب کہاں ہے؟

سندری نے ہولے سے کہا۔ ''یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہوتت ہیں۔ جب تلک مطلب نا ہیں نکلتا بڑا کھیال رکھتے ہیں، مطلب نکل جاوے تو پھر میں کون تو کون؟''

دلاور نے سندری کی طرف دیکھا۔ اس کا چمکیلا پن کچھ ماند تھا۔ وہ مرجھائی مرجھائی سی نظر آتی تھی۔ شاید وہ ''ہڈ بیتی'' ہی بیان کررہی تھی..... یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہوتت ہیں.....

''تھوڑی سی گرم چائے مل جائے گی؟'' دلاور نے مکرانی رشید سے پوچھا۔

رشید کے بجائے سندری نے جواب دیا۔ ''میں ابھی لے کر آوت ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپس مڑی لیکن پھر رک کر بولی۔ ''ویسے بھائی! تم نے کوشش تو پوری کی ہے۔ سب کو حیران کردیا تھا اتنی دیر پانی میں رہ کر۔ وہ جو جہاز کا بڑا افسر ہے۔ اس کا تو ایک رنگ آوت تھا ایک جاوت تھا۔''

وہ چائے لینے چلی گئی۔ دلاور نے خود کو آرام کرسی پر ذرا نیم دراز کیا۔ رشید نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ یہ مکرانی رشید بڑا ہمدرد لڑکا تھا۔ سات آٹھ ماہ سے حضور چانڈیو کے ایک مچھلی فارم پر کام کررہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک شپنگ کمپنی کا پانڈی یعنی ''لوڈر'' تھا..... بیکڑوں دفعہ سمندر کے راستے دبئی جاچکا تھا۔ حضور چانڈیو نے مچھلی فارم ختم کردیا تھا اس لیے وہ دوبارہ شپنگ کمپنی کی ملازمت کا ارادہ رکھتا تھا۔

سندری چائے لے آئی لیکن پتا نہیں کیوں دلاور کا چائے پینے کو دل نہیں چاہا۔ اسے سندری پر ترس آرہا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے چاری غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہے۔ اسے لگا سندری کی ساری بے بسی، لاچاری اور ناپاکی اس چائے میں بھی در آئی ہے۔ اس نے سندری کا شکریہ ادا کرکے چائے ایک طرف رکھ دی۔

سندری چلی گئی۔ دلاور اسی طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ بارش ہلکی تھی لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ لہروں میں اچھال تھا۔ لہروں پر نگاہیں جمائے ہوئے دلاور نے رشید کو مخاطب کیا..... اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''رشید! جس جگہ ہم کو رکنا پڑا، وہ کون سی جگہ تھی؟''

''جہاں جیولری باکس گرا تھا؟'' رشید نے وضاحت چاہی۔ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ رشید بولا۔ ''وڈی اس کو ''برڈ سائٹ'' کہوت ہیں۔ شاید آپ نے دیکھا ہووے گا، ادھر دائیں طرف ایک اونچا پتھر پانی میں سے باہر نکلا ہوا ہے۔ کسی پرندے کی چونچ کے ماپق لگتا ہے۔''

''ہاں دیکھا تھا میں نے۔'' دلاور نے بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''یہ جگہ مسقط اور برکا سے پچیس تیس ناٹ شمال کی طرف ہے۔ ناٹ سمجھتا ہے نا آپ؟ یہ سندری میل کو کہوت ہیں۔ پچھلے سال کی بات ہے۔ ایک دفعہ اپن ادھر سے گزر رہا تھا.....''

مکرانی رشید اپنی روانی میں بولتا چلا جارہا تھا۔ کسی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پرانے سفر کی روداد سنا رہا تھا۔ رشید کی آواز دلاور کے کانوں تک پہنچ رہی تھی لیکن دماغ تک نہیں جا رہی تھی۔ اس کا دماغ تو کہیں اور تھا۔ کہیں دور نمکین اور تاریک سمندر کی گہرائی میں...... جہاں مونگے کی چٹانوں کے پیچھے، کالے اور مٹیالے رنگ کے پتھروں کے درمیان ...... کچھ موجود تھا۔ اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بارش برس رہی تھی اور گلف ڈریم لہروں پر ہلکورے لیتا منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وقت ہمیشہ آگے کی طرف رواں رہتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتی رہتی ہیں۔ رات اور دن ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ بہاریں اور خزائیں ایک دوسرے کے عقب سے نمودار ہوتی ہیں۔ چوڑیرہ میں بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ کھیتوں کھلیانوں، کچے پکے...... گھروندوں اور دھول اڑاتے راستوں پر دھوپ اور چھاؤں کی بساط سجتی رہی...... اور اسی طرح چار برس گزر گئے......

چوڑیرہ حویلی کی بلند دیواروں کے اندر جو تنی ہوئی گردنوں والے لوگ بستے تھے، ان کی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ الگ رہن سہن، الگ رسمیں اور آسائشوں میں گھرے ہوئے الگ شب و روز لیکن اس حویلی میں ایک لڑکی دوسروں سے جدا تھی۔ وہ ہمیشہ سے جدا تھی لیکن پچھلے تین چار برسوں میں تو اور جدا ہوگئی تھی۔ اس کا نام سویرا تھا۔ جس سیاہ رات میں حویلی کے اندر طوفان بپا ہوا تھا، چنگھاڑیں گونجی تھیں، للکارے بلند ہوئے تھے، دلاور کو جانوروں کی طرح مارا گیا تھا اور پھر نیم مردہ کر کے ایک جیپ میں پھینک دیا گیا تھا...... اس سیاہ رات میں سویرا کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کرچی کرچی ہو کر اس کے جسم اور اس کی روح میں پیوست ہوگیا تھا۔ اس کے اندر ایک خون سا رستا رہتا تھا۔ وہ سوچتی تھی...... اس رات وہ بھی مر کیوں نہ گئی...... کیوں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ لیکن...... لیکن وہ بالکل کھڑی تو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک بار بے ساختہ آگے بڑھی تھی لیکن بڑی آپا اور ایک ملازمہ نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ بالکل ہی پتھرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہی دیکھا تھا...... وہ جیپ میں اوندھا پڑا تھا، اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا تھا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ لوگ اسے لے گئے تھے۔ دفن کرنے کے لیے یا پھر کسی قاتل پانی میں غرقاب کرنے کے لیے۔

...... اور وہ پتھرائی رہی تھی...... شاید وہ اب تک پتھرائی ہوئی تھی۔ غم کے شدید ریلوں کے بعد اب اس کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آنا شروع ہوگیا تھا۔ وہ جیسے سمجھ گئی تھی کہ یہ زندگی اسے ایسے ہی گزارنی ہے۔ شاہ زمان کی موت کے بعد وہ بیوہ ہوگئی تھی۔ ایسی جوان بیوہ جس کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے کا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اگر وہ سوچتی بھی تو اسے اس حویلی کی اونچی دیواریں کون پار کرنے دیتا۔ یہاں کی رسمیں الگ تھیں۔ نہ طلاق کی صورت میں رہائی تھی، نہ بیوگی کی صورت میں...... بلکہ شاید مر کے بھی رہائی نہیں تھی کیونکہ یہ حویلی اتنی بڑی تھی کہ اس کا خاندانی قبرستان بھی اونچی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ دلاور زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ پہلے تو یہی کہا جاتا تھا کہ وہ اسی رات مار دیا گیا تھا...... لیکن پھر تین چار ماہ بعد کچھ اڑتی اڑتی سی باتیں سویرا کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ بچ گیا تھا اور حضور چانڈیو کے لوگ اسے اٹھا کر اپنی سبز حویلی میں لے گئے تھے مگر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ان باتوں کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بار یہ اڑتی اڑتی بھی سنی گئی کہ وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ حضور چانڈیو نے اسے مڈل ایسٹ بھیج دیا ہے...... پھر ایک مرتبہ سویرا کو اپنی پروفیسر پھپھو کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے کراچی کی ایک سڑک پر دلاور کی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار تھا اور اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ بس یہ ساری باتیں اور مفروضے ہی تھے۔ غالب گمان اور تلخ حقیقت شاید یہی تھی کہ وہ نومبر کی اسی تاریک شب میں مار دیا گیا تھا۔ اس کا نام ان بہت سے لوگوں میں شامل ہوگیا تھا جو ان وڈیروں کی اونچی دیواروں والی حویلیوں میں جان ہارتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی پرچہ درج ہوتا ہے، نہ کوئی تفتیش ہوتی ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ان کی قبر بھی نہیں ہوتی......

وہ دلاور کو اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں، وہ اسے بھولتا نہیں تھا۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی ناتے سے وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ خون میں لتھڑا ہوا اور زخموں سے بھرا ہوا۔ وہ اس سے پوچھتا تھا۔ ''بی بی جی! کیا آپ بھی وہی سمجھتی تھیں، جو لوگ سمجھتے تھے؟ کیا آپ کا خیال بھی یہی ہے کہ میں نے منہ چھپا کر آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا؟''

وہ سسک اٹھتی۔ دل ہی دل میں کہتی۔ ''مجھے کچھ پتا نہیں، میں سماج کی باندی ہوں۔ میں ایک گونگی بہری اندھی عورت ہوں۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ کہتا۔ ''لیکن آپ کا دل تو ہے بی بی جی، کیا آپ کے دل سے کوئی راہ میرے دل کی طرف نہیں آتی تھی؟''

وہ تڑپ اٹھتی، خیالی ہیولے سے مخاطب ہوکر کہتی۔

''ہاں آتی تھی..... ہاں آتی تھی، وہ اب بھی ہے..... شاید ہمیشہ رہے گی۔ لیکن وہ راہ ہمیشہ سات پردوں میں چھپی رہتی ہے اور وہ چھپی ہی رہے گی۔''

وہ بے آواز رونے لگتی۔ ایسے میں دل کے نہاں خانوں میں جو خاموش سی ندی تھی، اس میں اچھال پیدا ہوتا اور اونچی پگڑیوں اور بلند دیواروں کے خوف سے اس کا سارا وجود لرز جاتا۔

شروع کے ایک دو برسوں میں شاہ فرمان نے کوشش کی تھی کہ اس حویلی کی پرانی رسموں کے مطابق اپنے بھائی کی بیوہ کو اپنے گھر میں ڈال لے لیکن جب اس نے دیکھا کہ بڑی آپا کی کوششوں کے باوجود سویرا سخت مزاحمت کررہی ہے اور اس مزاحمت میں خودکشی کی حد تک جانے کو تیار ہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ مگر حویلی کی قید تو بہر حال موجود تھی..... ناک کٹی نگینہ بیگم کی طرح اس نے بھی اس قید کو آہستہ آہستہ قبول کرلیا تھا..... شاہ فرمان کی دوسری بیوی سے اس کا بیٹا شاہ بابر اب بالغ ہوچکا تھا اور شاہ فرمان اسے مستقبل میں مختار کل بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاہ بابر میں بھی اپنے باپ اور چچا کی ساری جاگیردارانہ خصوصیات موجود تھیں۔ آج کل وہ ایک سنگین چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ ساجے ٹھل اور چوڈیرو والوں کی دشمنی ہنوز موجود تھی۔ گاہے بگاہے کوئی کھڑاگ بھی ہوجاتا تھا۔ ایسے ہی ایک کھڑاگ میں پچھلے سال نیپو ٹریگر گولیوں سے چھلنی ہوچکا تھا۔ ظفری ایک کیس میں چار سال کے لیے جیل چلا گیا تھا۔ بڑی آپا پہلے کی طرح حویلی میں دندناتی تھی اور شاہ فرمان بھی کبھی رات کو شکار کے لیے نکلتا تھا لیکن یہ ''شکار'' جنگل میں نہیں حویلی کے اندر ہی ہوتا تھا اور اس کا نشانہ اکثر کوئی اچھی شکل والی ملازمہ یا بہاولپور وغیرہ سے آئی ہوئی طوائف بنتی تھی۔

وہ فروری کی ایک خنک شام تھی۔ سویرا کے کندھوں پر سفید شال تھی۔ وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ بڑی آپا جو پچھلے کئی دنوں سے کافی خوش تھی، روتی ہوئی سویرا کے پاس آئی اور بولی۔ ''سویرا بہت برا ہوا ہے۔ حاجی اشرف نے راضی نامہ کرنے سے انکار کردیا ہے۔ انہوں نے دوٹوک بات کردی ہے۔ پرسوں والی پیشی پر وہ عدالت میں نہیں گئے..... تو..... تو بابر لٹک جائے گا، وہ نہیں بچے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے بڑی آپا کی آواز بیٹھ گئی اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

سویرا بے حد حیران تھی، کانپتی آواز میں بولی۔ ''لیکن..... لیکن وہ تو مان چکے تھے۔ سب کچھ طے ہوگیا تھا.....''

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ وہ بالکل لوہے کے تھن بن گئے ہیں۔ مجھو انہوں نے دھکے مار کر شاہ فرمان اور پیر فضل کو گھر سے نکال دیا ہے..... یہ سب کچھ اسی شاہ لاہوری کی طرف سے ہورہا ہے۔ وہ خبیث ہاتھ دھوکر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ نہیں تو حاجی اشرف کے خاندان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ راضی نامہ نہ کرتے۔ یہ سب کچھ اسی کمینے کا کیا دھرا ہے۔ پہلے ہماری زمین پر نظر تھی، اب کنجر ہمارے پتر کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

بڑی آپا جس کو شاہ لاہوری کہہ رہی تھی، اس کا نام پچھلے سال ڈیڑھ سال سے ہی سننے میں آرہا تھا۔ وہ زیادہ تر لاہور میں ہی رہتا تھا مگر اس کے منیجر اور کارندے یہاں بڑا زبردست کام کررہے تھے۔ انہوں نے چوڈیرو والوں کی زمینوں کے ساتھ ہی بہت سی زمین خریدی تھی اور وہاں ایک بڑی کاٹن جننگ فیکٹری لگائی تھی۔ فیکٹری کی تعمیر کے دوران میں شاہ فرمان کا فیکٹری مالکوں سے زبردست جھگڑا بھی ہوا تھا۔ وہی زمین کی حد بندی کے معاملے تھے کوئی اور ہوتا تو شاہ فرمان اور پیر فضل وغیرہ اسے کہاں نکلنے دیتے مگر شاہ لاہوری ایک بہت بڑی پارٹی تھا اور لوگ صحیح کہتے ہیں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ شاہ لاہوری تو لاہور میں تھا، اس کے دست راست منیجر سلطان واہلہ نے ہی چوڈیرو والوں کو تارے دکھا دیے تھے۔ بہر حال وہ معاملہ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر طے ہوگیا تھا۔ اب یہ بابر والا نیا کیس شروع ہوگیا تھا۔

بڑی آپا ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس نے سویرا سے کہا۔ ''مجھ سے تو حاجرہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ڈر لگ رہا ہے کہ اسے کچھ ہو ہی نہ جائے..... کلا کلا پتر ہے۔ اللہ خیر کرے۔ اسے کچھ ہوگیا تو وہ تو جیتے جی مرجائے گی۔''

سویرا نے کہا۔ ''اور بھائی فرمان کی بھی تو جان ہے بابر میں۔ جب سیشن کورٹ نے سزا بولی تھی بابر کو..... آپ کو پتا ہی ہے ان کی کیا حالت ہوگئی تھی۔''

''اب بھی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے، گولیوں کے پھکے مار رہے ہیں۔ کسی وڈے سرکاری افسر کو لے کر ایک بار پھر حاجی اشرف کی طرف جارہے ہیں۔''

سویرا بولی۔ ''ہم عورتوں کو ان باتوں کا زیادہ پتا تو نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے لگتا ہے بڑی آپا کہ حاجی اشرف وغیرہ

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے بات کرنے کے بجائے اس شخص سے بات کی جائے جو اس مصیبت کی جڑ ہے۔ شاہ لاہوری یا پھر اس کے کسی بااختیار بندے سے رابطہ کیا جائے۔''

''میں نے کہا ہے پیر فضل سے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے، بلکہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ان بڑے لوگوں سے ملنا کون سا آسان کام ہوتا ہے۔''

بابر کی شکل سویرا کی نگاہوں میں گھومنے لگی ..... کیا واقعی..... اسے پھانسی ہو جائے گی؟ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اٹھارہ سال اور شاید چند مہینے..... یا پھر انیس پورے ہو گئے ہوں گے۔ ابھی مسیں ہی بھیگی تھیں۔ اونچا قد، نمایاں طور پر اونچی ناک اور آنکھوں میں وہی تیز چمک جو چوڑیروحویلی والوں کی خاصیت تھی۔ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کا نتیجہ نکلا تھا۔ بالغ ہوتے ہی اس کے مزاج میں کچھ عجیب تبدیلی ہوئی تھی..... اسے کھیتوں سے دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا تعلق لہلہاتی فصلوں سے نہیں، گاؤں کی خوش شکل لڑکیوں سے تھا مگر پھر جب بات اس کی اپنی بہن پر آئی تھی تو وہ ایک ''باغیرت'' بھائی بن گیا تھا اور سارے چولستان کی آگ اس کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کی بہن مہرین کا نام ایک لڑکے عاطف کے ساتھ آ گیا تھا۔ عاطف ساتھ والے گوٹھ کے ایک درمیانی درجے کے زمیندار حاجی اشرف کا بیٹا تھا اور زرعی کالج میں پڑھتا تھا۔ عاطف اور مہرین ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ لیکن ان وڈیروں کی تو اپنی ہی ''معاشرت'' ہوتی ہے۔ اپنے لیے کچھ اور اصول..... دوسروں کے لیے کچھ اور ضابطے۔ بابر نے کچھ ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لیا اور ایک دن منڈ بھیرو کے قریب عاطف پر ٹوٹ پڑا۔ عاطف کے ساتھ اس کا بڑا بھائی شاہد اور ایک دوست تھا۔ انہوں نے عاطف کو بچانے کی کوشش کی۔ اس لڑائی میں بابر کی سیون ایم ایم رائفل سے چلنے والی دو گولیوں نے عاطف کے بڑے بھائی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ عاطف کے بازو میں بھی گولی لگی۔ بابر گرفتار ہوا۔ ثبوت بڑے واضح اور ناقابلِ تردید تھے۔ سیشن کورٹ سے بابر کو پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد کے مراحل میں بھی برقرار رہی اور اب وہ پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنے انجام سے دہشت زدہ، ایک زندہ لاش کی طرح موجود تھا۔ تین چار ماہ قبل، پہلی مرتبہ اس حوالے سے امید کی کچھ کرنیں پیدا ہوئی تھیں..... ایک مقامی سیاست دان کے توسط سے حاجی اشرف کے گھرانے سے بات آگے بڑھی تھی۔ خون بہا اور دیت کے قانون کے مطابق اگر وارث مجرم کو معاف کر دیتے تو بابر کی پھانسی ٹل سکتی تھی۔ یہ بات چیت مسلسل ڈیڑھ دو مہینے جاری رہی تھی۔ بالآخر چوڑیروحویلی میں خوشی کے شادیانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ مدعی پارٹی نے کچھ شرائط کے ساتھ معافی نامے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی..... ان شرائط کے مطابق شاہ فرمان نے بیس مربعے زرعی اراضی حاجی اشرف کی فیملی کو دینا تھی۔ مقتول کی بیوہ کے لیے ایک کروڑ روپیہ نقد بھی طے ہوا تھا۔ ایک شرط یہ بھی طے کی گئی تھی کہ مقتول کے گوٹھ کو جانے والا قریبی راستہ جو شاہ فرمان کی زمینوں کی وجہ سے بند تھا، آمدورفت کے لیے کھول دیا جائے گا۔

..... یہ سارے معاملے تقریباً طے پا چکے تھے اور چوڑیروحویلی میں ایک بار مٹھائی بھی تقسیم کی جا چکی تھی لیکن اب اچانک اطلاع آئی تھی کہ مدعی پارٹی نے مزید بات چیت سے انکار کر دیا ہے..... اور خون بہا لینے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ چوڑیروحویلی میں تقریباً سب ہی جان گئے تھے کہ اس انتہائی تشویشناک تبدیلی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔

☆☆☆

منظر ایک سجے سجائے وسیع ڈرائنگ روم کا تھا۔ یہ ڈرائنگ روم جس کوٹھی کا تھا، وہ چوڑیروحویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہی کوئی سات کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ یہ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی اور شاہ لاہوری نے یہاں اپنے عارضی قیام کے لیے اپنی جننگ فیکٹری کے پہلو میں تعمیر کرائی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بے حد رقت آمیز منظر تھا۔ بابر کی ماں حاجرہ جو تاک پر بھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، اپنی چادر پھیلا کر شاہ لاہوری کے دست راست سلطان واہلہ کی منتیں کر رہی تھی۔ شاہ فرمان اور پیر فضل بھی جو کچھ دیر پہلے تھوڑا ترش بولے تھے اب بھیگی بلی بنے کھڑے تھے۔ ان کی پگڑیوں کے اونچے شملے بھی جیسے ان کی طرح ہی مرجھائے ہوئے تھے۔ شاہ فرمان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''واہلہ صاحب! اتنی گل کا تو ہم کو بھی پتا ہے کہ حاجی اشرف میں خود اتنا دم نہیں ہے، وہ جو کچھ کر رہا ہے آپ لوگوں کی رائے اور مشورے سے کر رہا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، ہم اس لڑائی کو اور لمبا کرنا نہیں چاہتے۔''

''نہیں..... آپ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔'' سلطان واہلہ نے اپنی رعب دار مونچھوں کو سہلایا اور اندازِ بے نیازی سے بولا۔

بڑی آپا جیسے تڑپ گئی۔ ایک دم آگے بڑھ کر بولی۔ ''نہیں بھائی صاحب! ہم تو آپ لوگوں کے سامنے اپنی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جھولی پھیلانے آئے ہیں۔ بابر کو اللہ نہ کرے پھانسی ہوئی تو ایک نہیں دو موتیں ہوں گی۔ یہ کرماں سڑی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی قبر میں اتر جائے گی۔'' بڑی آپا نے بابر کی بیمار ماں حاجرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں بلند آواز میں رونے لگیں۔ سویرا بھی یہاں موجود تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں۔ وہ بھی دونوں جیٹھانیوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ پیر فضل نے انہیں بہ مشکل چپ کرایا اور سلطان واہلہ سے مخاطب ہوکر ملامت سے بولا۔

''واہلہ صاحب! حاجی اشرف نے جو تین شرطیں کہی تھیں وہ ہم نے پوری کی پوری مان لی تھیں۔ اب اگر وہ کوئی اور شرط رکھتے ہیں تو ہم اس پر بھی ابھی غور کرنے کو تیار ہیں۔ سنا ہے کہ وہ ایک دو اور شرطوں کی بات کررہے ہیں.....''

''یہ آپ لوگوں سے کس نے کہا ہے؟'' سلطان واہلہ درشت لہجے میں بولا۔ ''وہ تو سرے سے کوئی بات کرنے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اپنے جوان پتر کا لاشا دیکھا تھا وہ آپ کے پتر کا بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''خدا دا واسطہ اے..... خدا رسول دا واسطہ اے۔ ایسی گل نہ کرو۔'' بابر کی ماں حاجرہ نے روتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ شاہ فرمان کا لشکارے مارتا ہوا رنگ بھی مٹی ہورہا تھا۔

سلطان واہلہ نے سگریٹ سلگا کر اپنے بیش قیمت طلائی لائٹر کو جیب میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی نرمی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بولا۔ ''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ آپ..... ایک دفعہ بڑے صاحب سے بھی بات کرکے دیکھ لیں۔ لیکن آج کل تو وہ بہت مصروف ہیں۔ اگلے ہفتے انہوں نے یہاں فیکٹری کے کام سے آنا ہے۔ میں ان سے آپ کے لیے ٹائم لینے کی کوشش کروں گا۔''

پیر فضل ہراساں لہجے میں بولا۔ ''پر تب تک تو بڑی دیر ہوجائے گی۔ وکیل پراچہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے، اتوار کے دن تک کرلو۔ ورنہ.....'' شاید وہ آگے بھی کچھ کہتا مگر روتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ کر چپ ہوگیا۔

پیر فضل نے بڑی عاجزی سے سلطان واہلہ کو اشارہ کیا کہ وہ علیحدہ ہوکر اس کی بات سن لے۔ دونوں کوریڈور کی طرف چلے گئے۔ پانچ دس منٹ بعد دونوں کی واپسی ہوئی تو پیر فضل کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی ڈاڑھی پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ لیکن دونوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جہاندیدہ اور مکمل مزاج پیر فضل کسی حد تک سلطان واہلہ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سلطان واہلہ نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں کہ بڑے صاحب (شاہ لاہوری) اتوار کے بجائے منگل یا بدھ کو یہاں کا چکر لگالیں۔ زیادہ لوگوں کو لانے کی ضرورت نہیں۔ یہی جو پانچ لوگ یہاں ہیں، وہی آجائیں..... اور ایک دفعہ بات کرکے دیکھ لیں۔ حاجی اشرف کی فیملی تو بالکل کوئی بات نہیں سن رہی لیکن میں کوشش کروں گا کہ حاجی اشرف کو کسی طرح یہاں بلالوں۔ آگے آپ کی قسمت۔''

پھر وہ سویرا سے مخاطب ہوکر بولا۔ ''بہن جی! آپ بھی ضرور آئیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں آپ ہی پڑھی لکھی ہیں..... اور آسانی سے بات کرلیتی ہیں۔''

وہ سب کے سب اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرپا رہے تھے۔ ان ابتلا کی گھڑیوں میں ان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چوڈیرو کی اسی اونچی حویلی کے مکین ہیں جو گردنوں کو خم کرنا نہیں جانتے، جن کو ہوا بھی چھو کر گزرنے سے ڈرتی ہے اور جن کی ایک دھاڑ سے نیچ لوگوں کے کپڑے گیلے ہوجاتے ہیں۔ آج وہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ شخص کے پنجے میں تھے۔ ہاں..... اونٹ پہاڑ کے نیچے تھا۔

☆☆☆

بدھ تک کا دن ایک ایک پل گن کر کاٹا گیا تھا۔ چوڈیرو حویلی میں جہاں بس گھنگرو ہی چھن چھناتے تھے، ایک درجن حفاظ قرآن شب و روز تلاوت میں مصروف تھے۔ عیاشی کی دعوتوں کی جگہ لنگر جاری کیا گیا تھا۔ ترنڈا.. منڈ بھیرواور نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اس لنگر پر آرہے تھے اور ''کایا کلپ'' پر تبصرے کررہے تھے۔ چوڈیرو حویلی والے اچھی طرح جان چکے تھے کہ اس خوفناک تالے کی اصل کنجی اس شاہ لاہوری کے پاس ہے۔ ورنہ حاجی اشرف اور اس کے خانوادے کی کیا حیثیت تھی۔ ان کو تو کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لینا تھا چوڈیرو والوں نے۔

خدا خدا کرکے وہ گھڑیاں آئیں، جب حویلی کی روتی سسکتی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ شاہ لاہوری کے سامنے پہنچیں۔ انہیں وسیع ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد اندرونی دروازہ کھلا۔ دراز قد شاہ لاہوری اپنے منیجر اور مسلح گارڈ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ کاٹن کی شاندار شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا..... چھوٹی چھوٹی نفیس ڈاڑھی اور فریم لیس عینک میں بڑا وجیہہ لگ رہا

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا۔ سویرا نے دھیان سے اسے دیکھا اور اسے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کہیں وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ یا پھر...... اس کی نگاہ درست کام نہیں کر رہی تھی۔ اسے لگا کہ جو شخص رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سامنے اٹالین صوفے پر بیٹھا ہے، وہ دلاور ہے۔ وہی دلاور جو چوہدری حویلی کا ڈرائیور رہا تھا، گارڈ رہا تھا.. کارِخاص رہا تھا اور پھر ایک گناہ کے الزام کے ساتھ مار دیا گیا تھا۔

سویرا نقاب میں تھی لیکن اس کی آنکھیں اور پیشانی تو دکھائی دے ہی رہی تھی۔ اس نے چادر کھینچ کر اپنی پیشانی کو کچھ اور چھپایا...... لیکن اسے لگا کہ یہ چھپانا بے کار ہے...... وہ جو کوئی بھی تھا، اسے دیکھ چکا ہے اور پہچان چکا ہے۔

''جی کہیں۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' وہ ٹھہری ہوئی بھاری آواز میں بولا۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔

کون تھا جو اس کی بات کا جواب دیتا۔ سب کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا۔

شاہ فرمان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تم...... تم...... آپ؟'' اس سے آگے اس کی زبان بند ہو گئی۔

سویرا نے دیکھا، پیر فضل اور بڑی آپا بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ رعب دار آواز میں بولا۔ ''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو اڑتی اڑتی سی باتیں آپ نے سنی تھیں کہ دلاور بچ گیا ہے...... دلاور حضور چانڈیو کے پاس ہے...... دلاور باہر ہے...... وہ غلط نہیں تھیں۔ میرا جرم تو بہت بڑا تھا اور مجھے واقعی مر بھی جانا چاہیے تھا لیکن...... بس اللہ کی مرضی تھی۔ اس تالاب میں سے نکلتے وقت میں بالکل مُردہ نہیں تھا، کوئی دو چار سانسیں باقی تھیں میرے اندر......''

یہاں کون تھا جو اس کی باتوں کا جواب دیتا...... یا اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ بھی سکتا۔ وہ سب لرزاں و ترساں کھڑے تھے یوں کہ کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں۔ اگر کوئی کم لرزاں اور کم حیران تھا تو وہ سویرا تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔

...... وہ پھر اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ کیوں اس کے سامنے آ گیا تھا؟ ہزاروں سال پہلے جب اس روہی کے گرد قدیم بستیاں تھیں، وہ شاید ان بستیوں میں بھی نظر آتا تھا۔ بار بار اس کے سامنے آجاتا تھا...... دور رہ کر بھی اس کے آس پاس ہی ہوتا تھا......

تم کب تک مجھ کو بھولو گے

اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے
صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ ان دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ ان دیکھے سے سائے ہیں، جو ساتھ مرے ہی چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں، اک گرم دوپہری مستی میں
اک خام خیال سی ہستی میں
کچھ ان چھوئے سے جذبے ہیں، جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

وہ اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔ اردگرد سے بے خبر ہو کر سب سے جدا ہو گئی تھی۔ کمرے میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ حاجرہ اور بڑی آپا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور تو اور...... شاہ فرمان کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ وہ دلاور سے پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا مگر سارے لفظ عاجزی کے تھے...... شکست کے تھے اور منت کے تھے۔ شاہ فرمان کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سویرا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ٹوٹے ٹوٹے سے فقرے تھے...... ''اللہ نے تجھے بڑی اُچی شان دے دی ہے دلاور۔ ہم سے پرانے بدلے نہ لے۔ جو ہو گیا ہم نے اس پر مٹی ڈال دی، تم بھی ہمیں معاف کردو۔ جرم تھا تو بھی کردو، نہیں تھا تو بھی کردو۔''

پیر فضل بھی اسی طرح کے جملے بول رہا تھا۔ کچھ جملے سویرا کی سمجھ میں آ رہے تھے، کچھ نہیں آ رہے تھے۔ پھر اچانک بڑی آپا بری طرح چلا اٹھیں۔ بابر کی ماں حاجرہ، شاہ لاہوری کے پاؤں پکڑنے آگے بڑھی تھی اور وہیں پر بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

بابر کی والدہ کو آدھ گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔ پیر فضل وغیرہ اسے بہاولپور اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن وہ دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بچے کے لیے معافی نامہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔ اگر جان جاتی ہے تو چلی جائے۔

...... آخر فیصلہ کن مرحلہ پہنچ گیا۔ شاہ لاہوری یعنی دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تین شرطیں ایسی ہیں جن کو مانے بغیر یہ مسئلہ کسی صورت بھی حل نہیں ہوسکتا......''

بابر کے لواحقین تناؤ اور دکھ کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ حاجرہ بیگم نے یہاں تک کہہ دیا۔ ''دے میرے پتر!

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مجھے تیری شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ تو بس میرے بابر کی گردن سے پھانسی کا پھندا نکلوا دے۔'' وہ بلک رہی تھی۔

دلاور نے کہا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ شرطیں سن لیں۔ ویسے یہ کوئی ایسی شرطیں نہیں ہیں جو آپ نہ مان سکیں اور ایک شرط تو بالکل معمولی ہے۔''

''تم بتاؤ دلاور! ہم سن رہے ہیں۔'' پیر فضل بے قراری سے بولا۔

''جو زرعی زمین آپ لوگ ہڑپ جانے میں دے رہے ہیں، وہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہے۔ وہ کم از کم چالیس مربعے ہونی چاہیے۔ پچاس پچاس مربعے زمین تو آپ کے گھر کے ایک ایک بچے کے پاس ہے۔''

یہ شرط فوری طور پر مان لی گئی۔

اس کے بعد دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''دوسری شرط یہ ہے کہ..... حاجی اشرف کا بیٹا عاطف اور آپ کی بیٹی مہرین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی کوئی بے جوڑ رشتہ نہیں ہے۔ آپ لوگ ان دونوں کے راستے کی دیوار نہ بنیں، ان کی شادی کردیں۔''

شاہ فرمان کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے..... لیکن کچھ بھی تھا شیر لوہے کے جال میں تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ روہی کا سرکش وڈیرا مکافات کے شکنجے میں تھا۔ سب خاموش تھے..... اور یہ خاموشی بوجھل ہو رہی تھی۔ بڑی آپا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات پہلے بھی ہمارے کانوں میں پڑ چکی ہے دلاور..... اور ہم اس بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اب تم نے بھی یہ بات کہہ دی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام بھی ہوجائے گا۔ بس ہم حویلی میں تھوڑا سا مشورہ کرلیں۔''

''مشورہ کس سے کرنا ہے آپ نے؟'' دلاور چیخ کر بولا۔ ''مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ سارے ''مشورے والے'' اسی جگہ یہاں موجود ہیں۔ جو کچھ ہوجانا ہے' اب یہیں پر ہوجانا ہے یا پھر نہیں ہونا۔''

دلاور کو برہم دیکھ کر ایک بار پھر چوڑیر حویلی کے سرخیلوں کے رنگ اڑ گئے۔ حاجرہ بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ شاہ فرمان، پیر فضل اور بڑی آپا وغیرہ نے تھوڑی دیر تک سر جوڑ کر باتیں کیں۔ اس دوران میں ڈرائنگ روم کے اندر عجیب سنسنی خیز ماحول رہا۔ آخر شاہ فرمان نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔ ''جس میں بچے خوش ہیں، ہم بھی اس میں خوش ہیں۔ ہمیں یہ شرط منظور ہے۔''

سویرا ایک طرف بیٹھی مبہوت، سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اب سب کو تیسری شرط کا انتظار تھا۔ دل دھڑک رہے تھے۔ دلاور نے کہا۔ ''تیسری شرط بھی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہے لیکن یہ میرے لیے بہت بڑی ہے۔'' اس نے چند لمحے رک کر بڑی آپا کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ ''میں ایک بھوکا ننگا غریب تھا اور بھوکے ننگے غریبوں کے لیے عزت سے قیمتی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس یہی ان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ آپ کو اچھی طرح پتا ہے، چار سال پہلے آپ کی اُچی حویلی میں مجھ سے یہ سرمایہ چھینا گیا۔ مجھ پر چوری کا الزام لگا اور اس سے بھی بڑا الزام یہ لگا کر میں نے..... اپنی مالکن کو بے عزت کرنے کی کوشش کی۔ وہ مالکن جس کو میں آنکھ بھر کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا.....'' دلاور کی آواز بوجھل ہوگئی۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ سب سکتہ زدہ تھے۔ دلاور نے شاہ فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس بات کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ شاہ فرمان! تمہیں ابھی سب کے سامنے اس رات کی اصل حقیقت بتانا ہوگی۔ یہی تیسری شرط ہے۔''

شاہ فرمان کی صورت دیدنی تھی۔

..... اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہی کچھ ہوا جو دلاور چاہتا تھا۔ اپنے اندر کی ساری تڑپ پھڑک کے باوجود شاہ فرمان کو یہ تیسری شرط بھی ماننا پڑی۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار اپنی کسی غلطی کو تسلیم کیا ہوگا..... سویرا آنسوؤں میں ڈوبی یہ سب کچھ سنتی رہی۔ شاہ فرمان نے اعتراف کیا کہ وہ ٹیپو ٹیگر اور دو تین قریبی کارندوں کی باتوں میں آ گیا تھا۔ نشے کی حالت میں اس سے ایک غلط فیصلہ ہوگیا۔ وہ گول مول بات کر رہا تھا مگر دلاور کے کاٹ دار نہایت تیکھے سوالات کے جواب میں شاہ فرمان کو بتانا پڑا کہ دلاور کو سویرا کی نظر سے گرانے اور حویلی سے نکالنے کے لیے اسے یہ منصوبہ بنانا پڑا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس رات چہرہ چھپا کر لاٹھوں کے بھتنے چوری کرنے والا اور سویرا پر حملہ کرنے والا ٹیپو ٹیگر تھا.....

شاہ فرمان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

سویرا انقلاب کے اوپر سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہی تھی..... تم کون ہو..... تم کہاں سے آئے ہو..... ہزاروں سال پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ شاید اسی روہی کے کنارے..... شاید انہی ریتیلے کھنڈروں کے آس پاس..... میرے دل کی اتھاہ گہرائی میں جو ایک بے نام ندی بہتی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے، اس کا پانی تمہیں جانتا ہے۔ میں نہیں جانتی لیکن وہ تمہیں جانتا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے تم ہمیشہ سے ایسے ہی بے خوف ہو۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن میں جو کچھ ہوا، بڑی تیز رفتاری سے ہوا۔ بلکہ حیران کن تیز رفتاری سے ہوا۔ نہ صرف زرعی زمین کے سلسلے میں ضروری کاغذات تیار ہوگئے بلکہ چند افراد کی موجودگی میں عاطف اور مہرین کا نکاح بھی ہوگیا۔ طے ہوا کہ رخصتی چند ہفتے بعد اچھے طریقے سے کی جائے گی۔ بابر کے ڈیتھ وارنٹ تک جاری ہوچکے تھے۔ مقتول کے لواحقین نے عدالت میں پیش ہوکر معافی نامہ اور دیگر ضروری دستاویزات پیش کردیں۔

شاہ فرمان کے اکلوتے بیٹے کے گلے سے پھانسی کا پھندا نکل گیا۔ مگر وہ فالج کے سبب خود بستر پر جا پڑا۔ شاید اپنی گردن جھکانے اور شرطیں ماننے کا صدمہ بھی اسے اسی طرح ہوا تھا جس طرح بیٹے کی پھانسی کا ہوتا۔ اسپتال میں ہی اسے فالج کا دوسرا شدید اٹیک بھی ہوگیا..... اور وہ کچھ بھی نگلنے کے قابل نہ رہا۔ ایک پہلو شروع میں ہی بے جان ہوگیا تھا۔

دلاور ابھی اپنی فیکٹری والی کوٹھی میں ہی تھا۔ ایک روز وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیکریٹری منشا ریاض اندر داخل ہوا بولا۔ ''جناب! ایک خاتون آپ سے ملنے پر اصرار کررہی ہے۔ داہلہ صاحب نے اسے لان میں بٹھایا ہے۔''

''کون ہے؟'' دلاور نے اخبار دیکھتے ہوئے کہا۔

''کسی بڑے اخبار کی رپورٹر ہے۔ کہتی ہے کہ اس کے پاس آپ کے لیے کچھ مفید اطلاعات ہیں اور وہ آپ کو براہ راست دینا چاہتی ہے۔''

دلاور کے چہرے پر پہلے تو بیزاری کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتا ہوا لان کی طرف بڑھ گیا۔

سرسبز لان پر سرما کی نرم سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ دیدہ زیب سفید میز کے گرد فاسبر کی سفید کرسیاں دھری تھیں۔ ایک کرسی پر ایک برقع پوش خاتون بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ ہاتھ میں فائل تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ رسمی کلمات کے بعد دلاور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے محترمہ۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں تم سنو گے یا نہیں۔''

دلاور نے چونک کر دیکھا۔ برقعے کے نقاب میں سے بس آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا لیکن اگر اس سے بھی کئی گنا کم نظر آرہا ہوتا تو وہ پہچان لیتا اور اس آواز کو بھی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ سویرا تھی۔

وہ سکتہ زدہ سا اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ بولی۔ ''دلاور! اس طرح دیکھو گے تو کسی کو شک ہوجائے گا۔ کوئی بات کرو۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فائل اپنے سامنے میز پر پھیلالی۔

وہ اپنی لرزش کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ امید تو تھی کہ آپ سے ملاقات ہوگی لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ اس طرح ہوگی۔''

''میں تم سے ملنا چاہتی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔'' وہ بوجھل آواز میں بولی۔ ''کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہوگا مجھ سے بات کرنے کے لیے؟''

دلاور کا دل بھر آیا۔ بے ساختہ بولا۔ ''سویرا بی بی! آپ کہیں تو ساری زندگی اسی طرح بیٹھ کر آپ کی بات سن سکتا ہوں۔''

وہ کبھی سویرا بی بی کہنے پر ناراض ہوجایا کرتی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، بس نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔ ''دلاور..... سب سے پہلے تو..... تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے..... تم نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مجھے..... ایک ایک بات یاد ہے..... میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

''آ..... آپ شرمندہ کررہی ہیں۔ آپ تو مالکن ہیں۔ میری وجہ سے رسوائی ہوئی آپ کی..... دکھ ملا آپ کو..... معافی تو مجھے مانگنی ہے۔''

سرسبز گراسی لان کے اوپر سرما کا سورج تھا۔ روہی کی طرف سے آنے والی ہوا دھوپ کو مزید خوشگوار کررہی تھی۔ وہ دونوں جیسے اردگرد کی ہر چیز، ہر منظر سے کٹ گئے تھے۔ بس ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے اور ایک دوسرے کو سن رہے تھے۔ دل کے پھپھولے پھوٹنا شروع ہوئے تو پھوٹتے چلے گئے۔ ایک موقع پر سویرا نے اشک بار آواز میں کہا۔ ''میں اس بات پر خود کو کبھی معاف نہیں کرپاؤں گی کہ وہ لوگ تمہیں میرے سامنے بے دردی سے مار رہے تھے اور میں تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرپا رہی تھی۔ پچھلے چار سالوں میں وہ بات شاید ایک پل کے لیے

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھی میرے ذہن سے نہیں نکلی دلاور.....''

دلاور نے کہا۔ ''میرے ان سارے زخموں پر، آپ کی بس یہ ایک بات ہی مرہم رکھ رہی ہے کہ آپ کو کبھی مجھ پر لگنے والے الزام کا یقین نہیں ہوا.....''

گفتگو طویل ہوتی جارہی تھی۔ لمحے پَر لگا کر اڑ رہے تھے۔ ایک ملازم دو دفعہ چائے رکھ کر جا چکا تھا اور اب دلاور اسے تیسری مرتبہ طلب کرنے والا تھا۔ سویرا کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ اب جاننا چاہ رہی تھی کہ اس رات کے لہولہان آغاز کے بعد دلاور پر کیا بیتی۔ وہ کہاں کہاں سے ہوتا ہوا ''لاہوری انٹر پرائزز'' کی شاندار منزل تک پہنچا اور اس کے دیگر حالات کیا ہیں؟

دلاور تو ہمیشہ سے سویرا کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ جن کی ذات سے عشق ہوتا ہے، ان سے کچھ بھی چھپایا نہیں جاتا۔ شاید چھپایا جا ہی نہیں سکتا۔ دلاور نے دھیرے دھیرے سب کچھ سویرا کے گوش گزار کر دیا۔ وہ حیرت میں غلطاں سنتی رہی۔ کئی من وزنی آہنی ایکسل کے ساتھ دلاور کا پانی سے نکلنا، حضور چانڈیو کی سبز حویلی میں پہنچنا، زخموں کا علاج کرانا، پھر حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر کے ساتھ بحری سفر..... بحری سفر میں پیش آنے والا وہ سنسنی خیز واقعہ جب بے شمار مالیت کا جیولری باکس سمندری پانی میں گرا۔ دلاور کا باکس کو ڈھونڈ لینا لیکن پھر اسے وہیں پر چھپا رہنے دینا..... دلاور نے سب کچھ سویرا کو کہہ سنایا۔

وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا اور بول رہا تھا..... ''میرے اندر کچھ بدل چکا تھا سویرا بی بی.....! ان اُجی حویلی والوں نے مجھے اندر سے تبدیل کر دیا تھا۔ ورنہ میں نے تو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں حضور چانڈیو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ دبئی پہنچ گیا۔ وہاں میں اور مکرانی رشید دو مہینے سے زیادہ نہیں رکے۔ رشید نے ایک زخمی عربی کو خون دیا تھا۔ ان لوگوں نے بخشش کے طور پر اسے کوئی پندرہ ہزار ریال دیے۔ کچھ ریال ہم نے ویسے کمائے تھے۔ یہ ساری رقم لے کر ہم دبئی سے واپس ''برکا'' پہنچے۔ مکرانی رشید بحری جہاز کا لوڈر رہا تھا اور کئی ملاحوں سے اس کی واقفیت تھی۔ میں نے اسے جیولری باکس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر کے ایک لانچ کا بندوبست کیا..... اور ایک نقشے کا انتظام بھی کر لیا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ایک روز کے پُرخطر سفر کے بعد ہم کھلے سمندر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پرندے کی چونچ جیسا بڑا پتھر سمندر میں سے نکلا ہوا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اس جگہ کو ''برڈ سائٹ'' کہتے ہیں۔ غوطہ خوری کا کچھ سامان بھی ہماری لانچ پر موجود تھا مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ تیسرے غوطے میں ہی میں پتھروں میں پھنسے ہوئے اس جیولری باکس تک پہنچ گیا.....

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کافی کچھ سمجھ گئی ہوں گی۔ مجھے اس منزل تک پہنچانے میں اس جیولری باکس نے بہت مدد کی ہے۔ میں نے بن باقر فیملی کے کچھ خاندانی زیورات کو چھوڑ کر باقی جیولری مسقط، دوہا اور کراچی میں مختلف جگہوں پر فروخت کی۔ میرے پاس ایک کافی بڑی رقم آ گئی۔ میں اس رقم کو کہیں لگانا چاہتا تھا۔ آخر میں نے اسے ایک محفوظ کاروبار میں انویسٹ کر دیا۔''

''کون سا کاروبار؟'' سویرا نے پوچھا۔

''مجھے معلوم تھا آپ یہ سوال کریں گی۔'' دلاور نے کہا اور کچھ کھو سا گیا۔ چائے کی دو چسکیاں لے کر بولا۔ ''شاید آپ کو عجیب لگے گا کہ میں نے آسان کاروبار چھوڑ کر ایک مشکل میدان کیوں منتخب کیا..... سویرا بی بی! میں نے دبئی میں ''سی ڈائیونگ'' کا ایک بڑا ٹریننگ سینٹر خریدا اور اس کو مزید وسیع کر دیا۔ یہ امارات میں غوطہ خوری کے چند بڑے تربیتی مراکز میں سے ایک ہے۔''

''میں..... واقعی حیران ہو رہی ہوں۔'' وہ بھی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

دلاور نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ روہی کی ہوا نے بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھیر دیں۔ اس نے کہا۔ ''سویرا بی بی! مجھے اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں پانی ہی کا بیٹا ہوں۔ جس ٹوبے سرفو دم گھٹ کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، اس نے مجھے دریائے راوی کے پانیوں سے ہی تو نکالا تھا اور اپنی بانجھ بیوی کی گود میں ڈالا تھا۔ وہی جس کا آدھا سر سفید تھا اور آدھے بال مہندی رنگے تھے۔ وہ میری سگی ماں نہیں تھی لیکن اس نے سگی ماؤں کی طرح ہی میری پرورش کی تھی۔ چاچا سرفو لاہور کا بلکہ شاید پورے پنجاب کا نامور ٹوبا تھا۔ اپنی جوانی میں اس نے بڑے یادگار کام کیے تھے۔ بڑھاپے میں اس نے اپنا فن مجھے سونپ دیا۔ اس نے مجھے گہرے پانیوں کی مچھلی بنا دیا۔ لیکن یہاں میرے فن کی قدر کرنے والا کون تھا۔ میں باہر کے کسی ملک میں ہوتا تو شاید مجھے گولڈ میڈل ملتے..... مجھ پر ڈالروں کی بارش ہوتی لیکن یہاں مجھے ناقدری اور غربت کی بارش نے کچلون (نمک) کی طرح کھور دیا۔ ایک بار میں

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ملازمت کے لیے ایک محکمے میں گیا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ ایک بار تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لینا چاہا لیکن ناکام ہوا..... پرائیویٹ ایف اے کرنے والے کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ آخر در بدر ہوگیا۔ پیٹ پالنے کے لیے چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے لگا۔ بڑی آپا اور شاہ فرمان جیسے سخت مزاج لوگوں کا چاکر ہوگیا۔ شاید یہی وجہ تھی..... کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنے ''غوطے'' کی پوری قیمت وصول کی۔ برڈ سائٹ پر اس طوفانی شام میں وہ ''غوطہ'' صرف میں لگا سکتا تھا اور میں نے لگا لیا.....''

وہ چند سیکنڈ چپ رہ کر بولا۔ ''سوری سویرا بی بی! بات دوسری طرف نکل گئی۔ میں بتا رہا تھا کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے بھی میرا ناتا پانی سے ہی تھا۔ اس لیے جب میرے پاس سرمایہ آیا تو میں نے اسے اس فن میں لگایا جو میرے اندر موجود تھا۔ میں نے ''سی ڈائیونگ کی ٹریننگ'' کے کام کو چکایا اور وہ ایسا چمکا کہ مجھے نہال کر گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مجھے اتنی جلدی اتنی بڑی کامیابیاں ملیں گی۔ اب خلیج میں میرے آٹھ بڑے ٹریننگ سینٹر ہیں۔ ایک سینٹر کراچی میں تیار کروا رہا ہوں جس کا سارا چارج مکرانی رشید کے پاس ہے۔ وہ ایک بہترین دوست اور پارٹنر ثابت ہوا ہے۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے میں دبئی میں شیخ بن باقر سے ملا تھا۔ میں نے پہلے اس سے معافی مانگی پھر اس کا سارا پیسا، منافع سمیت اسے واپس کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اسے مزید خوشی اس بات کی تھی کہ اسے اس کے باقی خاندانی زیورات بھی جوں کے توں واپس مل گئے تھے۔ آج کل ..... میں کچھ اور چھوٹے موٹے کام بھی کر رہا ہوں۔ جیسے آپ کے گوٹھ کے پاس یہ فیکٹری.....''

سویرا اور دلاور کی گفتگو کو بریک لگ گئے، تازہ چائے آ گئی تھی۔ سویرا نے ابھی تک صرف ایک کپ پیا تھا۔ دلاور کے اصرار پر اس نے دوسرے کپ پر آمادگی ظاہر کی۔ دلاور نے خود چائے بنائی ..... اور کپ اس کی طرف بڑھایا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ..... کہ کہیں وہ اپنی انگلیوں سے اس کی انگلیوں کو نہ چھو لے۔ وہ نقاب کو ذرا سرکا کر چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ ناگاہ دلاور کی نگاہ اس کے ہونٹوں پر پڑی۔ وہ جیسے سرتاپا جھنجھنا اٹھا۔ وہ اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ ان حسین گداز ہونٹوں سے اس کا ایک پرانا ناتا تھا۔ ایسا ناتا جس سے ''ہونٹوں والی'' بھی بے خبر تھی۔ دلاور کو لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی آ گئی ہے۔

موبائل فون کے سگنلز نے دلاور کی مشکل آسان کی۔ یہ فون سویرا کے شولڈر بیگ میں گنگنایا تھا۔ اس نے اسکرین دیکھی لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ اب مضطرب نظر آنے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے حویلی سے نکلے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب اسے جانا ہوگا۔

دلاور نے کہا ''کیا آپ دوبارہ آ سکیں گی؟''

''پتا..... نہیں۔'' وہ تذبذب سے بولی۔

''آپ نے تو مجھ سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ ایک دو باتیں میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔'' دلاور کے لہجے میں درخواست تھی۔

اس نے ایک بار دلاور کی آنکھوں میں دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ''اچھا..... دو تین دن میں کوشش کروں گی.....''

پھر وہ عجلت میں چلی گئی۔ وہ دو تین دن کا کہہ رہی تھی، وہ دو تین زندگیاں انتظار کر سکتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کورے کار کو خود ڈرائیو کر کے آئی تھی، اسی پر واپس روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

چوڈیرو والی کوٹھی کے عقبی لان میں دلاور نے ایک چھوٹا سا خوبصورت تالاب بنوا رکھا تھا۔ نیلے ٹائلوں والا۔ اس میں اترنے کے لیے چمکیلے اسٹیل کی سیڑھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے پانی کے اوپر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پانی کی جانی پہچانی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ وہ ایک بے مثال غوطہ خور تھا۔ اس نے عشق کے پانیوں میں بھی ایک طویل ..... بہت طویل غوطہ لگایا تھا مگر گوہرِ مقصود آج بھی اس سے اتنا ہی دور تھا، جتنا بہت برس پہلے تھا..... شاید ہزاروں برس پہلے تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ سیکریٹری منشا نے آ کر اطلاع دی کہ اس دن والی میڈم آئی ہیں۔ دلاور کے سینے میں جلترنگ سا بج اٹھا۔ وہ پل پل اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد دلاور اور سویرا سنہری دھوپ والے ہرے بھرے لان میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ملازم چائے اور لوازمات لے آیا تھا۔

''آج میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دلاور! تم کیا کہنا چاہتے تھے؟'' سویرا نے آدھے نقاب کی اوٹ سے پوچھا۔ آواز میں کسی بے نام دکھ کی لہر تھی۔

دلاور بات کو کسی دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو سوچا ہوتا ہے۔ دلاور کے منہ سے بھی بے ساختہ جو بات نکلی،

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ کچھ اور تھی اس نے دفعتاً کہا۔ ''سویرا! میں اپنی حیثیت جانتا ہوں اور آپ کا مرتبہ بھی..... ہم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن کیا..... کسی طرح، ایسا ہوسکتا ہے کہ..... یہ زمین اور آسمان..... مل سکیں؟''

ایک چھناکا سا ہوا۔ جیسے ہزار ہا قمقموں والا کوئی فانوس دھماکے سے فرش پر گرے اور چکنا چور ہوجائے۔ وہ سکتہ زدہ نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ دلاور بھی پتھرایا ہوا تھا۔ اس کے لیے کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ گردش جب دوبارہ بحال ہوگی تو کس ڈھنگ سے ہوگی؟ سویرا کا ردعمل کیا ہوگا؟ خاموشی طویل اور بوجھل ہوتی چلی گئی۔ دلاور کے ضبط کے تار تناؤ کے سبب ٹوٹنے لگے۔ آخر وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔ ''تم نے یہ کیسے سوچ لیا دلاور؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے..... مم..... مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ تم سے..... کوئی ایسی بات سنوں گی۔''

نہ جانے اتنا حوصلہ دلاور کے اندر کہاں سے آ گیا تھا۔ شاید یہ حوصلہ اسے اس کی انوکھی اور سچی محبت نے دیا تھا جو برسوں بڑی خاموشی سے اس کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی۔ وہ بولا ''سویرا! اگر آپ نہ چاہیں تو کچھ نہیں ہوسکتا..... اور اگر آپ چاہیں تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ہر رکاوٹ گر سکتی ہے، ہر دیوار رستہ دے سکتی ہے۔ سب کچھ آپ پر ہے۔ صرف آپ پر۔''

وہ گم صم تھی، بس اس کی خوبصورت آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کا اور دکھ کا مدوجذر تھا۔

وہ بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ خوف ہماری خوشیوں کو کھا جاتا ہے سویرا..... اور عورت کا خوف تو اس کی پوری زندگی برباد کردیتا ہے۔ اس خوف سے نکل آنا ہی، اصل میں جینا ہے۔ آپ کی بہت سی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ چوڈری وحویلی کی وڈیرا شاہی دم توڑ رہی ہے۔ وڈا چودھری ایک زندہ لاش کی طرح اسپتال میں پڑا ہے۔ آپ کے پنکھ ہیں، آپ اڑ سکتی ہیں..... اگر آپ اڑنا چاہیں.....'' اس نے سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے حد اعتماد سے کہا۔ ان لمحوں میں وہ صرف دلاور نہیں تھا..... دلاور شاہ لاہوری تھا۔

سویرا نے نہایت بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ کسی صورت نہیں۔ تم جانتے نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم ایسی بات کہو گے۔ یہ تو آگ میں چھلانگ لگانے والی باتیں ہیں۔ مم..... میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا تھا.....''

''آپ غلط کہہ رہی ہیں..... آپ غلط کہہ رہی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر زور دے کر بولا۔ اس کا سارا وجود اندرونی اضطراب سے لرزنے لگا تھا۔

سویرا نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں، وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو بری طرح مروڑ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انداز مستحکم تھا۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے..... جانا چاہیے.....''

روہی کی ہوا کراہ اٹھی۔ دھوپ کا رنگ ہلدی جیسا ہوگیا۔ اونچے پیڑوں نے اور چھوٹے قد کے دکھوں نے دکھ سے اپنے سر جھکا لیے۔ دلاور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی واسکٹ میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہی ایک خط میں نے برسوں پہلے آپ کو دینے کے لیے لکھا تھا۔ وہ آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کی جگہ یہ خط دے رہا ہوں۔ میری آخری درخواست ہے کہ اس خط کو ایک بار پڑھ ضرور لیجیے گا۔''

سویرا نے خط نہیں تھاما تو دلاور نے اسے اس کے شولڈر بیگ کی بیرونی پاکٹ میں ڈال دیا۔ ''خدا حافظ!'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''خدا حافظ!'' دلاور نے خود کو بمشکل سنبھال کر کہا۔ وہ مین گیٹ کی طرف چل دی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے...

☆☆☆

روہی کے اوپر گہرے تاریک آسمان پر تاروں کے جھرمٹ تھے۔ کیکروں، ٹاہلیوں اور بیریوں سے گزر کر آنے والی ہوا، دلاور کے بالوں کو اس کی پیشانی پر لہرا رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی کی چھت پر نواڑ کی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ ابھی ابھی سلطان واہلہ نے اسے اطلاع پہنچائی تھی کہ شاہ فرمان اسپتال سے لاعلاج ہوکر حویلی آ گیا ہے۔ اب اس نے جتنی دیر بھی جینا تھا، شاید بستر پر ہی جینا تھا۔ بڑی آپا نے حویلی کی باگ ڈور اپنے کمزور ہاتھوں میں لے لی تھی۔ بابر ابھی جیل میں تھا۔ ویسے بھی ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ باپ کی پگڑی سر پر رکھ سکتا۔ باقی اولاد اس سے بھی چھوٹی تھی۔

پرسوں جو خط دلاور نے سویرا کو دیا تھا، اس کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا۔ یہ خط اس نے پرسوں اس وقت جلدی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جلدی گھسیٹا تھا جب ایک فون سننے کے بہانے وہ سویرا کے پاس سے اٹھ کر اندر گیا تھا۔ وہ خط کچھ اس طرح تھا۔

''سویرا! میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جو کچھ ہے بس آخری بار ہے۔ ہفتے کی شام جل گوٹھ میں سائیں رحیم کے بیٹے کا ولیمہ ہے۔ آپ کے گھر سے بھی لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ بھی جا رہی ہوں گی۔ آپ کو یاد ہوگا جب کئی برس پہلے آپ نے مجھے تحفے میں گھڑی دی تھی تو میں نے بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ہمت دکھائی تھی اور آپ کو گلابی پھولوں والی ایک کشمیری شال کا تحفہ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ وہ اوڑھیں گی مگر میں نے وہ کبھی آپ کے جسم پر نہ دیکھی۔ اگر آپ نے میری جسارتوں کو نظر انداز کر کے، میری التجا کے بارے میں کچھ سوچا ہے..... اور اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی ہے تو پلیز ..... مجھے بے خبر نہ رکھیں۔ میں نے اس شال کا ذکر بھی اسی حوالے سے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ ہاں سویرا..... ہفتے کی شام میری زندگی کے لیے بہت اہم ہوگی..... بہت ہی اہم۔ میں جانتا ہوں وہ شال اب بھی آپ کے پاس موجود ہے ..... اگر آپ وہ شال اوڑھ کر آئیں گی تو میں اپنی قسمت پر ناز کروں گا..... روئے زمین پر مجھ جیسا خوش قسمت اور کوئی نہ ہوگا اور اگر آپ نہیں اوڑھیں گی تو..... میں سمجھ جاؤں گا کہ مجھے اب کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھانی۔ میں ہمیشہ کے لیے پاکستان سے نکل جاؤں گا لیکن سویرا! اس میں بھی آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ ہاں سویرا! مجھے ..... اپنی مری ہوئی ماں کی قسم ہے، میں کوئی گلہ نہیں رکھوں گا۔ آپ نے محبت کی جو دولت مجھے دے رکھی ہے، وہ ملاپ یا جدائی کی مرہونِ منت نہیں..... اور نہ کبھی ہوگی۔

خدا حافظ!''

خط کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا، اس کے ذہن میں پیوست تھا۔ اس کے جدید سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس کے لیے دبئی سے اس کے ایک منیجر کی کال تھی۔ وہ کوئی پاکستانی ہی تھا بولا۔ ''سرسنگاپور سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چیف انسٹرکٹر سے ملنا ہے۔ وہ ''سی ڈائیونگ'' کے حوالے سے ایک بڑا شو کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس میں چند منٹ کی پرفارمنس دیں۔ چار پانچ منٹ کی لائیو پرفارمنس کے لیے وہ ایک لاکھ ڈالرز کی آفر کر رہے ہیں۔''

''کب ہے شو؟''

''اتوار کی دوپہر۔''

''ریجیکٹ کر دو۔ میں اتوار کے روز یہاں سے نکل سکتا ہوں۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رحیم سائیں کے گاؤں کا نام جل گوٹھ تھا۔ رحیم سائیں نے بیٹے کی شادی تو عام سے انداز میں کی تھی مگر ولیمے میں ساری کسر نکال دی تھی۔ گوٹھ سے باہر دور تک قناتیں اور خیمے لگے ہوئے تھے۔ جنریٹرز کی مدھم گھوں گھوں میں ہر طرف بجلی کے لشکارے تھے۔ ڈھول تاشے، ناچ گانا، آتش بازی، غرضیکہ خوشی کا ہر رنگ یہاں موجود تھا۔ ڈیڑھ ہزار مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صوبائی وزیر، ایم این اے، سابق ایم این اے، ایم پی اے، اعلیٰ سرکاری افسران، نامی گرامی وڈیرے، ہر طرح کے لوگ یہاں موجود تھے۔ دلاور شاہ لاہوری، ان لوگوں میں سے تھا جنہیں یہاں خاص الخاص مہمانوں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اردگرد کیمرے بار بار چکارے مار رہے تھے۔ رنگ و روشنی کی اس برسات میں دلاور کی نگاہیں کسی کا انتظار کر رہی تھیں..... دھڑکنیں زیر و زبر تھیں۔ پل پل ایک پہاڑ تھا۔ بالآخر چوڈیرو حویلی کی دو پجارو گاڑیاں نظر آئیں۔ دلاور ہر طرف سے کٹ کر ان گاڑیوں کو دیکھنے لگا..... جسم نگاہ بن گیا۔ سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ گاڑیوں میں سے چوڈیرو حویلی کے لوگ اترنے لگے۔ پہلے زرق برق لباس میں بڑی آپا اتریں پھر حاجرہ بیگم، پھر نگینہ بیگم اور دیگر عورتیں..... ایک ایک کر کے سب اتر گئے۔ گاڑیاں خالی ہوگئیں۔ دلاور کا دل ڈوب گیا۔ ہر طرف تاریکی چنگھاڑنے لگی۔ تو کیا وہ آئی ہی نہیں؟ اس نے خود کو حویلی کی اونچی دیواروں میں محصور کر لیا ہے..... وہ دیوانہ سا ہو کر مہمانوں کے درمیان سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خیموں سے آگے نکل گیا۔ اسے پتا چلا کہ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ چوڈیرو حویلی سے شاید ایک یا دو گاڑیاں مزید آنا تھیں۔

اس کی دھڑکنیں زیر و زبر تھیں۔ سانسیں الجھ رہی تھیں۔ وہ ریتیلے ٹیلوں میں تھوڑا آگے نکل گیا۔ چند قدم کی دوری پر وہی تالاب تھا جہاں دلاور نے سویرا کو پہلی بار دیکھا تھا..... مرحوم شاہ زمان اور سویرا، جیپ سمیت بارشی تالاب میں گر گئے تھے ..... یہیں پر..... ہاں یہیں پر وہ یادگار واقعہ ہوا تھا جس نے دلاور کے جسم و جاں میں لازوال عشق کا بیج بویا تھا۔ پاکیزہ..... بے غرض..... اور فاصلے کا عشق ..... اجنبی سناٹوں کی طرح خاموش ..... یکسر خاموش۔ یہی وہ پیڑ تھے جن کے نیچے اس نے نیم بے ہوش سویرا کو لٹایا تھا..... اور ..... اس کے نایاب ہونٹوں کو چھوا تھا۔ یہیں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی ..... اور شاید آج

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسے...... یہیں پر ختم ہوتا تھا۔

روہی کا ذرہ ذرہ منتظر تھا۔ بابا فرید کی آواز جیسے نشیب وفراز میں گونج رہی تھی ...... یہ عشق آسان نہیں۔ مٹی نہ... پھرول فریدا ...... یار گواچے نئیں لبھدے (لیکن اس کا یار تو ابھی گم نہیں ہوا تھا)

اور پھر اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ چوڈیرو حویلی کی ایک اور ٹویوٹا جیپ عظیم الشان خیموں کی ''مین انٹرنس'' کے سامنے آن کر رکی تھی۔ کائنات کی گردش تھم گئی اور اسی کائنات میں اس کا دل بھی تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ان لوگوں کو دیکھتا جارہا تھا جو جیپ سے اتر رہے تھے...... پھر ایک چودھرانی کے عقب میں اسے سویرا نظر آگئی۔ دلاور کی جان لبوں پر آگئی۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا کہ وہ بھسم ہوگیا ہے اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ ہلکے نسواری اور کریم لباس والی سویرا نے ایک پتلی سی سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ وہی سفید شال جو بیوگی اور اندوہ کی علامت ہوا کرتی ہے...... دلاور کی ٹانگیں بے جان ہوگئیں۔ وہ جیسے بے دم ہوکر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ دوبارہ جیپ کی طرف دیکھا۔ سویرا ادھ کھلے دروازے کے عقب میں تھی۔ اس نے سفید چادر اتار کر جیپ میں رکھی ...... اندر سے، نفاست سے تہ کی ہوئی گلابی پھولوں والی کشمیری چادر نکالی۔ عجیب دلنشین انداز میں سر جھکائے ہوئے اس نے یہ شال اوڑھ لی۔ اسے کندھوں پر درست کیا اور دیگر عورتوں کے ساتھ شامیانوں کی طرف بڑھنے لگی۔

تھمی ہوئی کائنات دوبارہ گردش میں آگئی۔ روہی کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ دلاور کا دل دوبارہ متحرک ہوگیا۔ آسمان پر کروڑ ہا ستاروں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ خوف کے پتھر پر قطرہ قطرہ گرنے والی محبت نے اس میں سوراخ ہی نہیں کیا تھا، اسے چکنا چور بھی کردیا تھا۔ دلاور نیم تاریکی میں کھڑا مسلسل سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بے مثل چاہ تھی اس دیکھنے میں۔ کسی درویش کے بول دلاور کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔

تیرے عشق دے وچ معشوق تا ہو، نئیں اَج تک غلط نگاہ کیتی
تیری ہر ملاقات میں اَنج کیتی جیویں موسیٰ نال خدا کیتی
اک تینوں رب نئیں کہہ سکدا باقی ساری رسم ادا کیتی

اے میرے محبوب! میں نے آج تک تجھے غلط نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے ساتھ میری جو بھی ملاقات تھی وہ ایسی ہی تھی جیسی موسیٰ اور خدا کے درمیان ہوتی تھی (اپنے شوق اور جذب کا بیان کیا کرو) میں بس تمہیں خدا ہی نہ کہہ سکا ورنہ دل میں تیرا رتبہ خدا کے قریب قریب ہی رہا ہے......

''سویرا......!'' دلاور نے دل ہی دل میں کہا اور شامیانوں کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

منظر اسی کوٹھی کے ڈرائنگ روم کا تھا جہاں آج کل دلاور قیام پذیر تھا۔ دلاور کے سامنے سویرا کی پھپو پروفیسر عالیہ بیٹھی تھیں۔ عینک اور تین چوتھائی سفید بالوں والی انتہائی سمجھدار اور زیرک خاتون، وہ مسلسل رو رہی تھیں اور بار بار اپنے سفید رومال سے آنسو پونچھتی تھیں۔ یہ یقیناً خوشی کے آنسو تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''دلاور! خدا گواہ ہے، مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ یہ سب ہو چکا ہے...... مجھے لگتا ہے کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ سویرا تم سے شادی پر رضامند ہوچکی ہے۔ اس کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا ہے اپنے پنجرے سے نکلنے کا...... اپنے جال کو توڑنے کا۔ لیکن وہ اب بھی بہت ڈری ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے ایک دو باتیں کہی ہیں جو میں تم تک پہنچانا چاہتی ہوں بیٹا۔'' وہ عجب محبت بھری عاجز آواز میں بولیں۔

''آپ حکم کریں پھپو! میں سویرا کو اپنانے کے لیے ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ ہر حد تک جاسکتا ہوں۔''

پھپو عالیہ، دلاور کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔ ''وہ شرطیں منوانے والی نہیں ہے دلاور، وہ تو...... وہ تو تمہاری محبت میں سر سے پیر تک ڈوبی ہوئی ہے۔ میں پھر کہوں گی، مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ میں یہ سب کچھ اپنے ہوش و حواس میں دیکھ رہی ہوں...... میں جو کچھ کہہ رہی ہوں دل کی پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر تم اس سے یہ کہو کہ یہ جو کچھ ہے یہ سب تمہارا نہیں ہے کسی اور کا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ چل کر کسی جھونپڑا بستی میں رہنا شروع کردے تو وہ خوشی سے راضی ہوجائے گی۔ ایسی تبدیلیاں دو چار مہینوں یا برسوں میں نہیں آتیں دلاور۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان ...... بہت پہلے سے ...... کچھ موجود تھا۔ تم دونوں کے دلوں کی گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔''

وہ خاموش رہا مگر اس کے دل سے آواز آرہی تھی ......

شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ہزاروں سال پہلے جب روہی میں بستیاں تھیں...... چمکیلی گرم دوپہروں میں نیم عریاں جسموں والے جفاکش لوگوں کے سائے یہاں حرکت کرتے تھے، اس وقت بھی ہماری روحیں یہاں بھٹکتی تھیں۔

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ پھر موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''سویرا کیا کہتی ہیں پھپو؟''

''وہ کہتی ہے بیٹا! جو کچھ بھی ہونا ہے یہ جلد ہو، اس میں جتنی دیر ہوگی، اتنا ہی غلط ہوگا۔ دوسری بات وہ یہ کہتی تھی کہ شادی بہت سادگی سے ہو اور بہاولپور میں ہو۔ اس کے والدین تو بس نام کے ہیں پچھلے کچھ عرصے سے تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کی شرکت کا ذکر تو بے معنی ہے...... تیسری بات اس کے دماغ میں یہ بیٹھی ہوئی ہے کہ شادی کے بعد تمہیں اور اسے زیادہ دیر یہاں پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی بس ایک ہی شرط ہے...... اور وہ یہ کہ شادی کے بعد چند دن کے اندر وہ تمہارے ساتھ پاکستان سے چلے جانا چاہتی ہے......اور یہ بھی چاہتی ہے کہ تم یہاں اپنے کاروبار کو وائنڈاپ کردو یا کسی دوسرے کے حوالے کردو مکمل طور پر......کم ازکم اگلے دس سال کے لیے۔''

دلاور چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پھپو! سویرا کو جن لوگوں کا خوف ہے، ان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ان کی طرف سے ہونے والی ہلکی سی مزاحمت کا بھی میں انہیں منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں لیکن سویرا کا کہا ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں ان کی ان ساری باتوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اور عین اس کے مطابق چلوں گا۔''

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کی مجازی تکمیل کے لیے وہ کہاں تک جاسکتا ہے۔ اگر سویرا اس سے کہتی کہ وہ انہی کپڑوں میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دے۔ دنیا کی آخری حد پر بسی ہوئی کسی بستی میں جا بسے اور کبھی ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھے تو اسے یہ بھی دل وجان سے قبول تھا۔

......چوڈیرو حویلی کی اونچی دیواریں اب سویرا کو روک نہیں سکی تھیں۔ شاہ فرمان تو زندہ لاش کی صورت بستر پر تھا۔ فیملی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ باہمی بٹوارے شروع ہوگئے تھے۔ دلاور کے کہنے پر مقامی ایم این اے نے خود جاکر ''بڑی آپا'' سے بات کی تھی اور اس نے معمولی پس وپیش کے بعد سویرا کو آزادی کا پروانہ جاری کردیا تھا۔ حویلی کے اصولوں کے مطابق اسے کئی مربعے اراضی سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس نے خوشی سے یہ جائداد حویلی والوں کی جھولی میں پھینک دی تھی۔ پیش کیے گئے کاغذات پر دستخط کردیے تھے۔

......اور یہ محبت کی تکمیل کی رات تھی۔ بہاولپور کی ایک کوٹھی میں سادگی سے سجائے گئے ایک حجلۂ عروسی کا منظر تھا۔ ایک چاند دلاور کے ہاتھوں میں تھا اور وہ ان گھڑیوں میں روئے زمین کا سب سے خوش قسمت شخص تھا۔ اس کے اردگرد ایک طلسماتی گلابی دھند تھی۔ اس نے اپنی پیشانی چاند کی پیشانی سے ٹکائی......وہ ان سرخ ہونٹوں کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو صرف اس کے اور ان ہونٹوں کے درمیان تھا......

وہ ہولے سے بولا۔ ''سویرا! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

''نہیں دلاور!'' اس نے پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔ پھر توقف سے بولی۔ ''دلاور! تمہاری محبت نے میرے خوف کو چکنا چور کردیا ہے لیکن اس کی کرچیاں اب بھی میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے یہاں سے دور لے جاؤ۔''

''آپ نے جو کہہ دیا......وہ ہوگیا۔'' وہ ڈوب کر بولا۔

وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ہولے سے بولی۔ ''اب مجھے آپ نہ کہو دلاور۔''

''زندگی کی آخری سانس تک کہوں گا۔ آپ کے لیے کوئی اور لفظ میری زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنی پیشانی سویرا کے ان ہاتھوں پر ٹیک دی جو اس کے گھٹنوں پر دھرے تھے۔

یہ محبت تھی...... پرستش تھی...... مجازی عشق کی معراج تھی...... یا اس سے بھی آگے کی کوئی چیز......

اگلے چند روز دلاور اور سویرا کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ ان شب وروز کی کیفیت کو وہ شاید دونوں ہی لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے تھے۔ بہاولپور کی یہ کوٹھی ان دونوں کے لیے ہر طرح سے محفوظ تھی۔ اونچی چاردیواری، خاردار تار، سکیورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز۔ پھپو عالیہ بھی ان دونوں کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔ ایک روز وہ دونوں بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور پرواز کرگئے۔ دلاور نے سویرا کی ایک دیرینہ خواہش پوری کی۔ اسے اندرونِ لاہور کے وہ گلی کوچے دکھائے جہاں وہ کھیلا کودا اور پروان چڑھا تھا۔ انہی تنگ گلیوں میں وہ بوسیدہ مکان بھی تھا جہاں کبھی سرفو دم گھٹ رہتا تھا۔ جو اس کا چاچا بھی تھا، باپ بھی اور استاد بھی......

دلاور ان گلیوں میں اپنی یادیں تازہ کرتا رہا اور ماضی کے دھندلکوں میں گھومتا رہا۔ وہ ایک خطیر رقم کا چیک بھی اس بستی کی حالت سدھارنے کے لیے لایا تھا۔ ذمے دار لوگوں کو یہ چیک سپرد کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ جیسے ایک قدیم بوجھ اس کے کندھوں سے اتر گیا۔ وہ دونوں شاہراہ قائداعظم کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پورے تین روز لاہور کی سیاحت کرتے رہے۔ شاہ لاہوری اور اس کی دلہن بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور کی سڑکوں پر تھے لیکن سڑکوں پر کہاں تھے، وہ تو جیسے فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ دن میں کئی بار دلاور اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا تھا، کیا زندگی اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے؟ اتنے دلکش دن؟... اتنی طلسماتی راتیں؟ کسی وقت سویرا ایک دم چپ سی ہوجاتی تھی۔ وہ اس چپ کی وجہ سمجھتا تھا۔ سویرا کو ایک بات کا قلق تھا جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا..... چار برس پہلے وہ اس وقت بے عملی اور تذبذب کی کیفیت میں کیوں رہی جب چوڈیرو حویلی میں اسے اس کے سامنے زخموں سے چُور کر کے موت کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ وہ ان لمحوں میں اس کے لیے کھڑی کیوں نہ ہوسکی..... کبھی کبھی اس کے اچانک چپ ہوجانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اب جلد از جلد پاکستان سے پرواز کرجائیں۔ بہاولپور جا کر سویرا نے پھر یہی بات کہی تو دلاور بولا۔ ''سویرا! آپ کے اور پھپھو کے کاغذات تیار ہوچکے ہیں۔ مجھے صرف تین روز کی مہلت اور دے دیں۔''

''وہ کس لیے دلاور؟'' وہ ذرا اداسی سے اس کے ہاتھ پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھ کر بولی۔

''جمعے کے دن میرا ایک بہت پرانا سپنا پورا ہونے والا ہے۔ کراچی کے ''سی ڈائیونگ سینٹر'' کا افتتاح۔ میں یہ افتتاح خود کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے اس سینٹر کا نام کیا ہے؟''

وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس کا نام ہے سرفراز ہی ڈائیونگ ٹریننگ سینٹر۔ سرفراز..... جسے لوگ سرفو دم گھٹ کے نام سے جانتے ہیں اور میں جس کے تصور کو کبھی اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر مسکرا کر چپ ہوگئی۔

وہ دونوں بیش قیمت صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا سر دلاور کے شانے سے ٹکا دیا۔ ذرا کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''دلاور! کسی وقت بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے؟'' وہ اس کی نسواری زلفوں کو اس کے کانوں کے پیچھے اڑس کر بولا۔

''پتا نہیں کس سے۔''

''ان لوگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ اب میری اور آپ کی ہوا کو بھی چھو سکیں۔''

''لیکن دلاور! میری نانی کہا کرتی تھیں، روہی رنگ رنگیلڑی ہے..... اور زہریلی بھی۔ اور جب یہ اپنے زہریلے روپ میں ہوتی ہے تو ناگن بن جاتی ہے اور اس کے بہت سے منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس منہ سے ڈس لے، کسی کو پتا نہیں ہوتا۔''

''آپ..... کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ چوڈیرو والے نہ سہی، کوئی اور ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

کراچی کے ساحل پر عظیم الشان ٹریننگ سینٹر کا افتتاح کرنے کے بعد دلاور نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب اس کی سوچوں کا رخ خلیج عمان کی ایک الگ تھلگ اور پُرسکون جگہ ''برکا'' کی طرف تھا۔ یہاں سمندر کے قریب ایک درمیانے سائز کے لیکن نہایت خوبصورت بنگلے کو اس نے اپنی مستقل رہائش کے لیے منتخب کیا تھا..... اس کے حکم پر اس کے اماراتی منیجر نے اسے دنیا کی ہر سہولت سے آراستہ کردیا تھا..... وہ فی الحقیقت ایک جنت نشاں جگہ بن گئی تھی۔ اس سے بہتر رہائشی آئیڈیا دلاور کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ صرف بیس دن کے مختصر وقت میں اس نے اس جگہ کو اپنی سویرا کے شایانِ شان بنا ڈالا تھا۔

وہ بہاولپور والی کوٹھی میں دلاور کی آخری شام تھی، ٹکٹ کنفرم تھے۔ پھپھو عالیہ، ڈرائیور اور دو گارڈز کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں..... سویرا ملازمہ کی مدد سے پیکنگ میں مصروف تھی۔ دلاور حسبِ عادت رات کے کھانے سے پہلے سوئمنگ پول میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہنے کا ہنر جانتی ہے۔ ریلیکسیشن کے لیے وہ سانس باہر نکال کر پانی کی تہ میں چلا جاتا تھا اور دس پندرہ منٹ کے لیے آنکھیں موند لیتا تھا۔ باہر کی آوازیں ناقابلِ فہم سرسراہٹ کی طرح اس کی سماعت تک پہنچتی تھیں۔ اسے لگا کہ سویرا اسے پکار رہی ہے۔ اسے دن میں کئی مرتبہ اس طرح کا دھوکا ہوتا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جو ملاپ سے کم نہیں ہورہی تھی، بڑھ رہی تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ عارضی اضافہ نہیں ہے۔

اچانک اسے دوبارہ آواز کا شک ہوا۔ اسے پتا چلا کہ اس مرتبہ دھوکا نہیں، وہ تیر کی طرح پانی کی سطح پر آیا۔ اس نے ایک قیامت خیز منظر دیکھا۔ سفید شلوار قمیص والا ایک کرخت چہرہ لڑکا چلّا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دو دھاری خنجر تھا۔ سویرا اس کے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے دلاور کی طرف آنے سے روک رہی تھی۔ اس کے ساتھ گتھم گتھا چلی آرہی تھی۔ لڑکے کی عمر بمشکل چودہ پندرہ سال رہی ہوگی مگر اس کا تن و توش اچھا تھا۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''دلاور..... دلاور۔'' سویرا کے پہلو میں اس کی

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سفید پھولوں والی قمیص پر خون کا ایک بڑا داغ دکھائی دے رہا تھا۔ یکا یک بجلی سی چمکی۔ لڑکے نے دلاور کو پانی سے نکلتے دیکھا تو جھلا کر پلٹا اور سویرا کی کمر اور گردن پر خنجر کے پے در پے تین وار کیے۔ تب تک دلاور کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ دیوانہ وار حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا۔ سویرا نے ابھی تک حملہ آور کے قدم نہیں چھوڑے تھے۔ دلاور اوپر اور حملہ آور نیچے تھا۔ اس نے اتنی وحشت سے حملہ آور کی کلائی مروڑی کہ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی دوران میں گارڈز اور دو ملازم لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ چکے تھے۔ وہ حملہ آور سے لپٹ گئے۔ وہ چنگھاڑنے لگا۔ ''شاہ پرویز نام ہے میرا..... شاہ فرمان کا پتر ہوں۔ ہم اپنی دشمنی بھولتے نہیں ہیں۔ قبر تک پیچھا کرتے ہیں..... قبر تک کرتے ہیں.....''

چوڑے چکلے جسم کا وہ نوعمر لڑکا کسی پکی عمر کے مرد کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔ دلاور، سویرا کی طرف لپکا۔ اس کا سارا لباس خون سے تربتر تھا۔ اردگرد کی ہر چیز..... اور اس کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اس نے خونچکاں سویرا کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''سویرا.....'' وہ دیوانوں کی طرح پکارا۔ ''گاڑی نکالو..... جلدی کرو۔'' اس کی آواز کوٹھی کے در و دیوار میں گونجتی چلی گئی..... اس کے گارڈز نے حملہ آور کو پوری طرح چھاپ رکھا تھا۔

چند منٹ بعد ٹویوٹا کی جیپ برق رفتاری سے اسپتال کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سویرا کا خونچکاں چہرہ دلاور کی گود میں تھا۔ سویرا نے اپنا مہندی لگا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ست رنگی چوڑیاں اس کی کلائی میں چھنک اٹھیں۔ وہ دلاور کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''دلاور..... جب چوڑیرو حویلی میں آپ کو..... بے دردی سے مارا جا رہا تھا..... میں کچھ نہ کر سکی تھی..... دیکھتی رہ گئی تھی..... آج..... شاید میں نے..... کچھ نہ کچھ تو..... کفارہ ادا کر دیا ہے..... کر دیا ہے نا؟''

دلاور نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ اسی طرح اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے دوبارہ بولی۔ ''ہم نے دیر کر دی دلاور! ہم نے دیر کر دی نا..... آپ سے کہا تھا نا..... یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں..... خود کچھ نہ کر پائے..... تو..... کسی اور طریقے سے کریں گے..... ان کے..... بہت سے..... منہ ہیں دلاور.....'' اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی۔ گاڑی کے پہیے بہاولپور کی سڑکوں پر چرچرا رہے تھے۔

دلاور نے ڈرائیور کو گاڑی اور تیز چلانے کا حکم دیا۔ پھر وہ سویرا کی پیشانی چوم کر بولا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو بچنا ہے..... آپ کو زندہ رہنا ہے..... میری خاطر..... میری خاطر سویرا..... نہیں تو میں بھی نہیں رہوں گا۔''

اس نے لمبے لمبے سانس لیے۔ جیسے چاہتی ہو کہ اس کی سانسوں کی ڈور ٹوٹنے نہ پائے۔ اپنی روح کو اپنے جسم سے منسلک رکھنے کی کوشش کر رہی ہو..... وہ جیسے پوری جان کے ساتھ دلاور سے لپٹ گئی مگر موت کا فرشتہ زیادہ زور آور ہوتا ہے..... وہ اپنا کام کر گزرا..... وہ اسپتال کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے مر گئی.....

او کھے پینڈے لمبیاں راہواں عشق دیاں..... ورد جگر سخت سزاواں عشق دیاں.....

☆☆☆

منظر بہاولپور شہر کے ایک قبرستان کا تھا۔ اس قبرستان میں سویرا ابدی نیند سو رہی تھی۔ وہی سویرا جو عشق کے ایک انجانے بندھن کی اسیر تھی..... معروف رومانی کردار صاحباں کی طرح اس نے بھی اپنے مرزا سے کہا تھا کہ وہ دیر نہ کرے، وہ یہاں سے نکل جائے، وہ جلدی کرے۔ لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ یہاں بھی ہو کر رہی تھی۔

سویرا کو اس قبرستان کا مکیں ہوئے اب دو ماہ گزر چکے تھے۔ روزانہ شام سے پہلے اس کی قبر پر آنا دلاور کا معمول تھا۔ دلاور کی شیو بڑھ کر اب چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سر کے بال لمبے ہو چکے تھے۔ ایک عجیب صوفیانہ رنگ ساچڑھتا جا رہا تھا اس پر..... لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بزنس اور اپنے معمولات سے بالکل علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ کراچی میں اپنے ٹریننگ سینٹر اور چوڑیرو میں جننگ فیکٹری کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے یہیں بہاولپور شہر میں ایک مناسب گھر خرید لیا تھا۔

وہ قبر کے قریب گم صم کھڑا تھا جب کسی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، یہ اس کا عزیز ترین دوست اور بزنس پارٹنر رشید تھا، رشید مکرانی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ واقعی ایک جواں سال بزنس مین نظر آتا تھا۔

''تم یہاں؟'' دلاور نے پوچھا۔

رشید نے کہا۔ ''دلاور بھائی! اپن کا وکیل پورے سندھ میں نمبر ایک ہے۔ اس لونڈے کی عمر کم ہے۔ پھانسی کی سزا تو نہیں ہوگی، مگر تیرہ چودہ سال سے پہلے باہر آ گیا تو قسم ہے..... نام بدل دینا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

وہ جس کو لونڈا کہہ رہا تھا..... یہ وہی نہایت غصیلا ''چودھری زادہ'' تھا جو دو ماہ پہلے دلاور کو قتل کرنے کی نیت سے اس کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اسے تو قتل نہ کر سکا مگر اس کا دو دھاری خنجر سویرا اور ایک گارڈ کی جان لے گیا۔ واردات کے وقت اس تنومند لڑکے نے چلا چلا کر کہا تھا..... میرا نام شاہ پرویز ہے۔ میں شاہ فرمان کا پتر ہوں.....

وہ شاہ فرمان کا بیٹا نہیں بھانجا تھا..... اس کی بہن کا بیٹا۔ حویلی کی زہریلی فضا نے اس کے کچے ذہن میں زہر بھرا تھا۔ غرور، نفرت اور کینے سے بھری ہوئی وہ حویلی اپنے مکینوں کو اور مکینوں کے بچوں کو اور دے بھی کیا سکتی تھی۔ شاید سویرا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ رنگ رنگیلڑی روہی جب زہریلی ناگن کا روپ دھارتی ہے تو اس کے کئی منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس طرف سے اور کس منہ سے ڈس لے گی، کچھ پتا نہیں ہوتا۔

رشید آنکھوں میں نمی لے کر عجیب نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے سامنے ایک کاغذ کرتے ہوئے بولا۔ ''دلاور بھائی! یہ آپ کا ٹکٹ ہے۔ آپ نے اپن سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ ٹائم گزر جائے ..... پھر آپ سوچیں گے۔ اپن کا خیال ہے کہ اب وہ ٹائم آ گیا ہے۔ وڑی وہاں دبئی میں آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کو جانا چاہیے۔''

دلاور نے ٹکٹ کا پرنٹ رشید کے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر پھاڑ کر پھینک دیا۔ ''تم اپنے نام کا ٹکٹ بنواؤ رشید۔''

''آپ ..... کیا کہہ رہے ہو بھائی؟'' رشید سخت حیرت میں تھا۔

''میری جگہ تم وہاں جاؤ گے رشید..... تمہاری جگہ میں یہاں رہوں گا..... وہ دیکھو..... وہ وہاں سو رہی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔''

رشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پچھلے چار پانچ برسوں میں وہ اس کا رمز شناس ہو چکا تھا۔ وہ دلاور کے اس لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سمجھ گیا کہ اس نے جو کچھ کہہ دیا ہے، وہ حتمی ہے۔ دونوں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ سورج جنتر، کیکر اور بیری کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ شہر خموشاں پر اس کی آخری کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ رشید نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''یہ بات اپنے مغز میں آ گئی ہے کہ اب آپ یہاں سے نہیں جائے گا لیکن آپ اپن کو بس ایک بات بتا دیں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کا یہاں رہنا کتنا خطرناک ہے۔ بہاولپور اور چوڑیرو میں کوئی بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہ آگ جو آپ کے اردگرد سلگ رہی ہے اور ان گوٹھوں میں ہر جگہ جس کی چنگاڑیاں ہیں، آپ کو کسی بھی ٹائم نقصان پہنچا سکتی ہیں۔''

دلاور کی نگاہ چند میٹر دور سویرا کی قبر پر تھی۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''اب میرے پاس گنوانے کو کچھ نہیں ہے رشید! میں اب یہیں رہوں گا۔ انہی شاہ فرمانوں، شاہ پرویزوں اور ساجے ٹھلوں کے درمیان۔'' اس نے عجب پُرعزم لہجے میں کہا ..... اور جیکٹ کے نیچے اپنے بھرے ہوئے کولٹ پسٹل کو چھوا۔

کچھ دیر بعد جب رشید مکرانی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو دلاور دبے دبے کرب کے ساتھ بولا۔ ''وہاں جا کر ایک کام کرنا ہے رشید..... برکا کے اس بنگلے کو ختم کر دینا جہاں جا کر ہم نے رہنا تھا۔''

''آپ ..... کا مطلب ہے فروخت کر دیں؟''

''نہیں۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''اسے ختم کر دینا ہے۔ بالکل مسمار ..... میں اگر کبھی وہاں جاؤں تو مجھے اس کی ایک اینٹ بھی نظر نہیں آنی چاہیے۔''

رشید نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گارڈز کے ساتھ اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر چلا گیا تو دلاور بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ سویرا کی قبر پر گرے ہوئے خشک پتوں اور گھاس وغیرہ کو ہٹایا، اس پر تھوڑا سا چھڑکاؤ کیا۔ گلاب کی چند پتیاں اس پر بکھیریں اور گم صم سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ روہی کی تھوڑی سرد تھوڑی رنگیلی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس ہوا میں بیتے دنوں کی خوشبو تھی اور پھر وہ چند پُرمسرت دن جو کئی صدیوں پر بھاری تھے اور آخر میں وہ جانکاہ صدمہ۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ ''آپ ہمیشہ مجھ سے پوچھتی رہی ہیں۔ شاید صدیوں سے پوچھتی رہی ہیں..... تم کب تک مجھ کو بھولو گے؟..... آج میں آپ کو بتاتا ہوں۔ میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں بھول سکتا ہی نہیں۔ یہ میرے بس میں ہے ہی نہیں۔

''دنیا میں ایسا ہوتا تو نہیں ہے لیکن آپ دیکھ لینا..... جب تک میری سانس ہے، میں آپ کو یہاں اپنے آس پاس ہی نظر آؤں گا..... ہاں سویرا! جب تک سانس ہے اور جب سانس نہیں رہے گی ..... تو پھر ..... تو پھر آپ کو پکاروں گا، آپ کو تلاش کروں گا۔''

DOWNLOADED FROM PAKSOCIETY.COM